

مکمل کتابخانہ کے آرکائیو شدہ نسخہ

# سے افق

ماہنامہ

کری

URDU TV

HOME OF ENTERTAINMENT

WWW.URDUVAAS.COM

aanchalpk.com aanchalnovel.com



رنگارنگ کہانیوں کے آراستہ دلچسپ جریہ



رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی  
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز  
رکن چیف ممبر آف کامرس

پاکستان (فی پرچہ) ..... 50 روپے  
پاکستان (مہالانہ) ..... 600 روپے

اشتراکات اور دیگر معلومات

0300-8264242

[aanchalpk.com](http://aanchalpk.com)

[aanchalnovel.com](http://aanchalnovel.com)

 [naeyufaqonlinemagazine](https://www.facebook.com/naeyufaqonlinemagazine)

[aanchalpk.com/blog](http://aanchalpk.com/blog)

[editorufaq@aanchal.com.pk](mailto:editorufaq@aanchal.com.pk)

مدیر اعلیٰ  
محمد طارق امجد  
مدیر  
انچال  
گوب اینڈ  
ٹیلی ویژن  
سینئر  
ذوالفقار

جلد 42

شمار 10

نومبر 2018





گفتگو

اقبال بیٹی

12

دستک

مشتاق احمد قریشی

10

خول ریز

امجد جاوید

22

اقراً

طاہر قریشی

20

پگی کا پیار

ریاض بٹ

72

انتقام

خلیل جبار

60

www.urdurubes.com

درد کا داماں

خالد شاہین

100

وہ تیس دن

عسارہ خان

84

سراب

زارا رضوان

114

پبلشر مشتاق احمد سٹریٹی پرنٹرز جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی  
دفتر کا پتہ: 7- مندرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

تاریک راہیں

میتاب خان

142

ہمیں بیاں کیسے کرو گے

سلمان بشیر

128

فن پارے

ادارہ

161

میراث

طیبہ عنصر مغل

154

خوش بوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

188

ذوق آگہی

سپاس گل

184

گوشہ ابن صفی

ادارہ

224

بینا نائینا

زورین قمر

192

کترینیں

000

خط و کتابت کا پتہ: "آئینہ" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 "فون: 021-35620771/2  
فیکس: 021-35620773 کے از مطبوعات نئے آفاق پبلی کیشنز ای میل: info@aanchal.com.pk



# دستک

مشتاق احمد قریشی

ختم نبوت اور حکومت

وزیر اعظم عمران خان مملکت اسلامیہ پاکستان کو مدینہ کی ریاست میں بدلنا چاہتے ہیں، لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا، مدینہ کی ریاست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو خاتم النبیین ہیں، ان کا سکہ مدینہ منورہ میں چلتا تھا۔ ان کے حکم احکام کے آگے پوری امت سر تسلیم خم کرتی تھی۔ کوئی کسی جیلے بیہانے سے بھی کسی طرح کی سرتابی نہیں کرتا تھا۔ منافقین جو کہتے تھے وہ کرتے نہیں تھے۔ وزیر اعظم صاحب آپ اگر واقعی مملکت خداداد اسلامیہ پاکستان کو اللہ کے رسول کی نسبت سے بدلنا چاہتے ہیں اور نیا پاکستان بنانا چاہتے ہیں تو یقیناً یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن یہ مشکل بھی نہیں ہے۔ آپ کئی بار اپنے عزم کو دہرا چکے ہیں۔ آپ کی نیت پر شک نہیں کیا جاسکتا لیکن آپ کے ہمراہی آپ کی ٹیم کے ارکان آپ کی طرح نہیں سوچ رہے نہ آپ کی طرح سے اظہار کر رہے ہیں یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں بہت سی اقلیتیں رہتی تھیں۔ پارسی، عیسائی، یہودی، ہندو، سکھ، زکری، اور دیگر کئی اقلیتیں لیکن ختم نبوت کے حوالے سے ایک آئینی اقلیت قادیانیوں کی ہے جسے آپ کے ارکان حکومت بھی اپنی صفائی کے طور پر اقلیت کہہ رہے ہیں۔ وطن عزیز کے طول و ارض میں آپ کے مشیر کی تعیناتی جو قادیانی اقلیت سے تعلق رکھتا ہے کے باعث شدید بے چینی و اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس اضطرابی کیفیت کا آپ کے وزراء کو بخوبی اندازہ ہے۔ وہ ان مشیر کی طرف سے انہیں اقلیتی رکن بنا کر عوام کو سلی دینے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ اس ساری کارروائی سے نا صرف وزیر صاحبان بلکہ آپ پر حرف آ رہا ہے۔ آپ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سوشل میڈیا پر بھی جارہی ہیں۔ اس حقیقت سے آپ بھی بخوبی آگاہ ہوں گے کہ قادیانی اقلیت کو آئینی طور پر کافر یعنی اقلیت قرار دیا گیا ہے۔ جسے وہ قطعی طور پر تسلیم نہیں کرتے بلکہ اپنے آپ کو اقلیت کے بجائے اکثریت میں شمار کرتے ہیں جو قانون و آئین سے انحراف ہے۔ ان کا خود کو اقلیت تسلیم نہ کرنا ہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ اگر نئے مقرر کئے گئے مشیر مالیات خود کو اقلیتی فرد تسلیم کر لیں اور آئین پاکستان کی پاسداری کا اعلان کر دیں تو سارا مسئلہ ہی حل ہو سکتا ہے، لیکن وہ ایسا ہرگز اس لئے نہیں کریں گے کہ یہ ان کا اور ان کی جماعت کے موقف کے خلاف بات ہے۔ کیونکہ ان کی جماعت ختم نبوت سے اختلاف کرتی ہے۔ جب کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نبی نہیں آنے والا، دین مکمل ہو گیا ہے کسی نئے نبی کی گنجائش ختم کر دی گئی ہے۔

قرآن کریم سے پتہ چلتا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں جن میں انبیاء علیہ السلام مبعوث ہوئے ہیں۔ اول یہ کہ کسی قوم میں پہلے بھی کوئی نبی نہ آیا ہو اور نہ کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی ان تک نہ پہنچا ہو۔ دوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم بھلا دی گئی ہو یا اس میں تحریف ہوگئی ہو اور اس کے نقش قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔ سوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم و ہدایت لوگوں کو نہ ملے ہو اور تکمیل دین کے لیے مزید انبیاء کی ضرورت ہو۔ چہارم یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی ضرورت ہو۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے اب کوئی ضرورت باقی نہیں رہی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام عالمین کے لیے رحمت بنا کے مبعوث کیے گئے ہیں۔ قرآن کریم میں بھی ارشاد ہوا ہے۔

”دنیا کی تمدنی تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے

ہیں کتاب صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تمام قوموں تک پہنچ رہی ہے۔ اس لیے اب کسی قوم، کسی علاقے کے لیے کسی بھی نبی کے آنے کی حاجت و ضرورت ختم ہو چکی ہے۔ قرآن حکیم اس پر بھی گواہ ہے اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تبارک تعالیٰ نے خود لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے حافظ لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں دنیا بھر میں موجود ہیں اور قرآنی تعلیمات کے فروغ اور تبلیغ دین کے لیے جماعتیں متحرک رہتی ہیں۔ گزشتہ کتب الہیہ کے مقابلے میں قرآن کریم میں کسی قسم کی تحریف و تہذیبی ممکن نہیں۔ اس لیے اب کسی نئی کتاب الہی یا اسے لانے کے لیے کسی بھی رسول، یا پیغمبر کی بھی ضرورت ختم ہو گئی ہے۔

قرآن کریم کے حوالے سے ختم نبوت اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔ جس کے ماننے یا نہ ماننے پر ہی ایمان اور کفر کا انحصار ہے۔ کوئی اگر نبی ﷺ کو نہ مانے تو کافر اور اگر کوئی جھوٹے نبوت کے دعوے دار کو مانے تو بھی کافر۔ اے نازک معاملے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے کسی بے احتیاطی کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اگر نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اللہ خود قرآن میں صاف صاف تشریح فرماتا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کے ذریعے یوں اعلان عام فرماتا اور نہ نبی کریم آخری نبی یا خاتم النبیین کے تشریف لاتے۔

ختم نبوت کا عقیدہ مسلمانوں کو یہ بھی بتانے کا عقیدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئیگا اور قرآن کریم اللہ کی آخری اور مکمل کتاب ہے۔ قرآن مجید نے تمام سابقہ کتب الہیہ کو منسوخ کر دیا ہے۔ قرآن کریم کے تمام احکامات الہی مکمل طور پر جمع کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اب نہ کوئی نئی کتاب آئے گی نہ ہی کوئی کتاب لانے والا آنے والا ہے۔ قیامت تک کا لورہ بند دست اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے۔

نبی آخر زمان صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ”اے نبی کہہ دو کہ اے انسانو، میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں (سورۃ الاعراف ۵۸) بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل کیا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے متنبہ کرنے والا ہو (الفرقان ۱) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں ہیں۔ مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے (احزاب ۴۰)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں میں کذاب ہوں مگر جن میں سے ہر ایک نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں (ابوداؤد، کتاب النبیین)

نئے پاکستان کے نئے وزیر اعظم جناب عمران خان جو نئے پاکستان کو ریاست مدینہ کی مانند بنانا دیکھنا چاہتے ہیں تو انہیں بڑے بڑے اہم معاملات و مسائل کے ساتھ اہم عوامی مذہبی، امور پر بھی غور و فکر کرنا چاہیے جیسا کہ انہوں نے تعلیم کے میدان میں دینی مدارس کو دیگر غیر دینی مدارس کے معیار کے مطابق بنانے کے ارادے کا اعلان کیا ہے۔ اسی طرح وہ اگر قادیانی فرقے کے بارے میں پھیلانے والا یا پھیلانے جانے والی خبروں کو بھی بنیدگی سے سنیں اور اپنے ارد گرد کے افراد کو تائید کر دیں کہ مذہبی معاملات میں زبان درازی سے احتیاط برتے جیسا کہ آپ بار بار کہہ چکے ہیں کہ پاکستان دنیا کے نقشے پر واحد ملک ہے جو خاص ایک اسلامی نظریے پر قائم ہوا ہے۔ اس نے مذہب اور قوم و ملت کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس نازک مسئلے کے حل کا کوئی مناسب ہندوستان کریں اور قادیانی جماعت کو پابند کریں کہ وہ خود کو ایک غیر مسلم اقلیت تسلیم کرے۔ تمام اہل پاکستان کی دعائیں لیں اور عوام کے دل جیت لیں۔ اللہ تعالیٰ اہل پاکستان کا وطن عزیز کا حامی و ناصر ہو اور اس دجالی فتنے کو ختم فرمائے۔ آمین۔





# گفتگو

اقبال بھٹی

”حضرت انسؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ جس شخص میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کو سب سے زیادہ ہو دوسرے یہ کہ صرف اللہ کے لیے کسی سے دوستی رکھے تیسرے یہ کہ دوبارہ کافر بننا سے اتنا ناگوار ہو جیسے آگ میں جھونکا جانا۔“  
(البخاری باب حلاوة الایمان)

عزیزان محترم..... سلامت باشند۔

تبدیلی کے خواب کو لوگوں کی آنکھوں میں سجانے کے لیے پی ٹی وی نے بائیس سال محنت کی اور آج اس محنت کے نتیجے میں جب لوگ تبدیلی کی شدید خواہش میں مبتلا ہو گئے تو یہ تبدیلی محض گازیوں اور بھینسوں کی فروخت گورنر یاؤس کے دروازے کھلنے تک ہی محدود نظر آ رہی ہے کفایت شعاری اور سادگی کا جو پرچار کیا گیا تھا وہ نئے وزرا کے بھاری بھر کم اسٹاف کے بوجھ تلے کیس کہیں دب کر رہ گیا ہے فیض صاحب کی ایک نظم ہے جس میں وہ نئے سال سے شکایت کرتے ہیں کہ اس میں نئی بات کیا ہے وہی ٹیل نہار ہیں وہی دل اور اس کی آرزو میں تو نیا کیا ہے۔

وطن عزیز میں آنے والی تبدیلی کو دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ تبدیلی کہاں آئی ہے محض حکمرانوں کے چہروں کی تبدیلی، تبدیلی ہے؟ بجلی کا وہی عالم ہے جانی ہے تو آنا بھول جاتی ہے پانی کا بحران عروج پر ہے عوام صحت، صفائی اور بنیادی سہولیات سے محروم ہیں، وہی مہنگائی کا جن ہے جس نے غریبوں کی جان اپنے بس میں کر رکھی ہے۔ چوری، ہیرا پھیری، لوٹ مار، اسٹریٹ کرائم، گلشن کا کاروبار اسی طرح جاری و ساری ہے اس وقت سب سے زیادہ سوچ کی تبدیلی کی ضرورت ہے خواب اور امید کو حقیقت میں ڈھالنے کے لیے عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ گزشتہ حکمرانوں کی کرپشن اور لوٹ مار کی کہانیاں بہت ہو چکیں اب عوام عملی اقدامات کے منتظر ہیں اقتدار ایک امانت کی حیثیت رکھتا ہے عمران خان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ مالی معاملات میں انتہائی سچے اور کھرے ہیں لہذا حکومت کا پہلا فرض ہے کہ وہ امید کے ان چراغوں کو بجھنے نہ دے جو اس نے عوام کی آنکھوں میں جلائے ہیں بلاوجہ کی مخالفانہ سیاست کو ختم کر کے عوامی مسائل کے حل کی طرف توجہ دی جائے عام آدمی کی زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے کے اقدامات کیے جائیں تاکہ تبدیلی کے ثمرات سے سب مستفید ہوں۔

حافظہ رضیہ رمضان..... لاہور۔ رحمتوں بھرے سلام کے ساتھ امید ہے کہ نئے افق کے تمام ساتھی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے میں نئے افق کی نئی ممبر ضرور ہوں لیکن کاغذ قلم کے حوالے سے میرا اور آپ کا رشتہ نیا نہیں ہے اور اس کا سارا کرینڈٹ نئے افق کو جاتا ہے کیونکہ اگر اس فورم پر میری حوصلہ افزائی نہ ہوتی تو شاید میرے اندر لکھنے کی ہمت نہ آتی یہ حوصلہ افزائی اگر یونہی جاری رہی تو مجھے امید ہے کہ نئے افق میں لکھنے والے چمکتے ہوئے ستاروں کے ساتھ میرا نام بھی جگمگاے گا۔ دعا ہے کہ نئے افق کی ٹیم اور تمام لکھاری سلامت رہیں انہی دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہوں گی، ان شاء اللہ آئندہ بھر پور تبصرے کے ساتھ حاضری دوں گی۔

جادوگرنی ہے یا پرستان کی کوئی پری  
سینے پہ ہاتھ رکھ کے خوفزدہ سی ہے کھڑی  
بھیڑیا بھی ہموا ہے دہشت کی علامت  
پورے سرورق میں ہے رومی پر اسراریت بھری

بھان متی نے کنبہ جوڑا اور خوب جوڑا بھی سچی بات ہے ہمیں تو اس خلای مخلوق اور نادیدہ قوتوں سے بہت پیار ہے جو تحفظ ختم نبوت ﷺ کو اہم جانتی ہیں اور پاکستان کی سلامتی کو عزیز جانتی ہیں باقی جہاں تک نئی حکومت آئی ہے تو اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ باریاں لینے والوں سے تو بدل کر آئی ہے اللہ تعالیٰ انہیں صحیح معنوں میں پاکستان کی باگ ڈور سنبھالنے کی توفیق دے انکل مشتاق احمد قریشی کو سلام ہے جنہوں نے اتنا اچھا اور سچائی پر مبنی ادارہ لکھا بہت عمدہ۔ گفتگو میں اقبال بھی صاحب کو سلام جو ہمارے لیے اتنی پیاری حدیث شریف کا انتخاب کرتے ہیں اپنے ارد گرد ہونے والے مختصر حالات بیان کرتے ہیں اور ہمارے خطوط کو ہمہ جہتی سے مرتب کرتے ہیں ذاکر حسین کی جدائی کی خبر نے افسردہ کر دیا سرورق کے مصور ذاکر حسین ہا کمال مصور تھے اور اپنے فن کے فنکار تھے اللہ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ایڈیٹر الیاس شاہر بھی اللہ کو پیارے ہو گئے اللہ تعالیٰ انہیں بھی جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے محمد رفاقت نے خوب صورت تبصرہ کیا اچھا لکھاریا ضبٹ تو ایسے لگے جیسے سامنے بیٹھے ہاتھ کر رہے ہوں بہت عمدہ تبصرہ کیا ہے پرنس افضل شاہین قطع کے ساتھ بہترین تبصرہ کرتے ہیں اور انکل ریا ض حسین قمر کے تو کیا کہنے آپ کی شاعری تو ہا کمال ہوتی ہے تبصرہ بھی بہت عمدہ کرتے ہیں جنت کے حوالے سے بہت اچھا لکھا اس پر تو یہی کہیں گے کہ انڈیا ہمارے صبر کا امتحان لے رہا ہے آخر میں جاوید احمد صدیقی کا تبصرہ بھی بہت پیارا تھا کیا بات ہے اس دفعہ صرف باقی تبصرہ نگار ہی حاضر تھے بھی بھی غیر حاضر بھی اپنی انٹری دیں دیکھو میں بھی تو دو تین ماہ بعد حاضر ہوا ہوں نا اپنی غیر حاضری پر معذرت خواہ ہوں سب سے، افرامیں اللہ سبحان و تعالیٰ کے خوب صورت نام العظیم پر خوب صورت اور علم و دانائی سے بھرپور باتیں دل میں گھر کر گئیں بے شک اسلامی تعلیمات اور احکام الہی انسان کی بہتری کے لیے ہی ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مرشد ہی پڑھی حجاب بی بی سے حجاب سرکار کا انوکھا نام رکھنا مرشد کی حجاب سے محبت اور عقیدت کی عمدہ مثال ہے دوسری طرف میرا ارشد اللہ کا حسن آرا کی طرف جھکاؤ آغا فیملی کے لیے بھونچال ثابت ہو رہا ہے باپ بیٹے کی ٹکڑا میں بیٹے کا پلڑا بھاری ہو رہا ہے دیکھو یہاں محبت کی بارنگ دکھائی ہے جادو کے حصار میں ٹائیٹ شیعہ کی ہوئی اور پھر جیسے ہی باپے کرامت کا گناہ سامنے آیا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر تب تک دیر ہو چکی تھی اس کے پروردہ بھائی نے ہی اس کو مار دیا اور سارا حصار بھی ٹوٹا ٹائیٹ نے ذیشان سے معذرت کی اور واپس شیعہ کو ہی قبول کیا جبکہ فرزانہ کو ذیشان نے اپنے حصار میں لے لیا احمد جاوید کی کہانی عمدہ رہی بہرہ و پیے فضل بابا نے مہمہ جبین کی عزت تار تار کر کے اس کی جان لے لی اور اس کے جاہل شوہر اور اس کی باپا پراندہا اعتماد کرتے رہے اگر عام لوگ بھی باشعور ہوں تو ایسے کالے کر تو توں والے باپے بھی بے نقاب ہو جائیں گے، جانیں بچانے والے ڈاکٹر بلال مغرور ہوئے تو ساجد احمد کو اپنی بے بروائی کی بھینٹ چڑھا دیا اور سیر نے اپنی آواز بلند کر کے ڈاکٹر بلال کو قانون کے شکنجے میں دبے دیا مگر نئی نوبلی ڈیٹن فائزہ کا سہاگ تو اجڑ ہی گیا مہتاب خان کی زندگی اچھی رہی۔ وہ تیس دن میں وقاص اینڈ فیملی پر اسراریت میں پھنس گئے ہیں ویسے عجیب بات ہے نادیدہ مخلوق بی کی شکل میں ان سے برابر آنکھ پھولی بھی کھیل رہی دیکھو اب ان کا کیا بنتا ہے عمارہ خان کی کہانی زبردست جاری ہے کہانی میں کہیں کہیں لفاظی غلطی بھی آ رہی ہے جیسے بھی کبھی کبھی بھی لکھنا وغیرہ ایسا کہتی جگہ ہوا ہے اس کا بھی خیال کریں باقی کہانی عمدہ ہے مستقبل کے لکھاری میں میتھو



اور اس کے باب نے عمدہ کہانی لکھی جس میں الازنین کی صورت جیتے جاگتے کردار کو حصہ بنایا بعد ازاں الازنین کے  
 نگشاف نے میٹھو کو توڑ کے رکھ دیا مگر وہ دونوں اپنی محبت کو دل سے نہ مناسکے الازنین آخر وقت میں بھی الازنین کو  
 بیمار کر کے داغ مفارقت دے گئی زین قمر کی کہانی بہت اچھی لگی ماہ رخ ارباب کی مختصر کہانی چاہے ٹٹل بھی عمدہ رہی  
 شیات کی لت میں لگے شاہدہ کے بیٹے منیر کو تو اس کی ماں نے نشے سے نہروکا انا مقبول کو کھری کھری سنا دی اور  
 ہر ایک دن اس کا بیٹہ منیر بھی مر گیا۔ عکس ذات میں تابش نے جتنا خود کو پار سار کھا اور صحرائی مشقت اٹھائی وہ اپنی  
 بی کوششوں کی قدر نہ کر سکا خزانہ ملنے اور بوسا کے سہر کا بھونے پر وہ بھٹک گیا مگر ایک ڈاکو فیروز اور طوفانہ زندگی  
 گزارنے والی یوسارہ راست پر آ گئے اور اللہ نے ان کی مشکلات کا ازالہ بھی کر دیا اور تابش صورت کے منہ میں  
 پلا گیا عرفان رائے کی کہانی عمدہ رہی، فن پارے میں پہلی کہانی عمدہ رہی آخری رات میں زوار نے ایک میچر،  
 ٹٹل، نیلوفر، ماریہ، ندا، سارا اور انعم سے اپنی محبت کی کہانی سنا کر اپنی بیوی حبیبہ کو ایک کہانی دینی چاہی تو وہ یہ سب  
 داشت نہ کر سکی اور زوار کو چھوڑ گئی، وہ دن بھی وہ جو کوئی بھی تھی اس کے لیے فرشتہ ثابت ہوئی اور اس لقاے پہنچنے  
 الے کی زندگی بنا گئی تھی عثمان غنی کی کہانی اچھی لگی، نریمانے خود کو تو روک لیا مگر آنکھوں کو چھلکنے سے نہ روک سکی  
 ایک مشرقی ڈاکٹر شان مغربی لڑکی کے احساسات اور محبت کو نہ سمجھ سکا اور ٹرپیا بھی اس کی جدائی برداشت نہ کر سکی  
 اور اس کی جدائی کے دن ہی آسانوں میں گم ہو گئی اسحاق جنجوعہ کی نمکین کافی سب سے عمدہ رہی ذوق آگہی میں  
 بیس حبیب خان، مہرین آصف اور ریاض چوہان کے مراسلے جبکہ خوش بوئے سخن میں رابعہ بصری، چوہدری قمر  
 نبھاں اور حمیرا فاضا کا کلام اچھا رہا۔

**ایم حسن نظامی**..... **قبولہ شریف**۔ سلام الفت امید ہے آپ اور ہمارے پرچے سے  
 نئے بھی احباب خیریت سے ہوں گے اکتوبر کا من پسند میگزین مقررہ وقت پر جلوہ گر ہوا اچھا معیاری اور خوب  
 صورت پایا پرچے سے وابستہ سبھی احباب نے اپنی بیکراں محنتوں، کوششوں اور دل لگی کا ثبوت دیا اور اسی کے سبھی  
 سلسلے اور تحریروں انمول موتیوں کی حیثیت اختیار کرتے چلے گئے مشتاق احمد قریشی صاحب ہمیشہ کی طرح اس بار بھی  
 مفرد انمول اور معیاری پیغام دیتے نظر نواز ہوئے جو بلاشبہ بہترین پایا۔ گفتگو میں نبھتی صاحب نئے سال کی  
 مبارکباد دے رہے تھے جی ویکم خدا کرے یہ سال ہمارے لیے اقلتا دمسترون کا پیام ثابت ہو، ہم سبھی مل کر بار بار  
 ساتھیوں کو آواز دے چکے ہیں کہ آؤ اور ہم سبھی مل بیٹھ کر نئے افق کے پلیٹ فارم پر گفتگو کریں مگر چند گئے تھے  
 باب ہی ہر ماہ اس بزم کا حصہ بن رہے ہیں بقیہ کہاں غیر حاضر ہیں؟ محمد رفاقت، ریاض بٹ، پرنس افضل  
 شاہین، ریاض حسین قمر اور جاوید احمد صدیقی صاحب پر معنی اور شیریں گفتگو کرتے پائے سبھی احباب کو میرا سلام  
 قبول ہو خدا کرے آپ یونہی منکراتے رہیں اور زندگی کی ہر مسرت بہارین دیکھتے رہیں، طاہر قریشی صاحب کسی  
 مبلغ کی طرح قرآن و سنت کی روشنی میں العلیم کے معانی اور تشریح فرما رہے تھے جس سے سبھی جذبے معطر اور  
 متادمان ہوتے چلے گئے۔ حصار کے آخری حصے نے بے حد متاثر کیا اس کے ہر کردار میں شگفتگی اور توانائی پائی  
 ندگانی کے کھن اور دشوار سفر میں کیا کچھ ہو رہا ہے ماہتاب خان نے اس پر خوب صورتی سے روشنی ڈالی، عرفان  
 اسے کا شمار آج کے عمدہ لکھاریوں میں ہوتا ہے ان کا قلم خوب صورت تحریروں پر تراشا ہے میں نے ان کی بیشتر  
 معیاری تحریروں پڑھی ہیں یوسا جیسے کردار ہمارے معاشرہ کے عکاس ہیں خلیل جبار بھی لکھنے میں اپنا تاننا نہیں رکھتے  
 ہر وہ مفرد دگر بھی تو عمارہ خان بھی دھیرے دھیرے پانچویں منزل طے کر رہی تھیں جو سنسنی سے بھرپور ہے۔  
 دال بیٹ بھی سدا عمدہ تحریروں کے سنگ وارد ہوتے ہیں جو بامعنی ہوا کرتی ہیں زین قمر صاحبہ محبت جیسے لازوال  
 جذبے پر اپنا نوکیلا قلم چلا رہی تھیں انہوں نے بہت سی مفرد باتوں سے پردہ اٹھایا مگر اینڈ پرانگر بڑی کے لفظ اردو پہ  
 غالب دکھائی دیے ماہ رخ ارباب اور صبا احمد کان بھی اچھے روپ میں جلوہ گر پائیں۔ فن پارے میں سبھی تحریروں



ایک سے بڑھ کر ایک تھیں ابن صفی پہ لکھی جانے والی تحریر بھی پسند آئی کبھی احباب کا مجھے یاد کرنے اور میری نگارشات سرائے پر ڈھیروں شکریہ۔ ذوق آگہی میں معیاری اقتباسات پڑھنے کو ملے کبھی احباب کی محفل عمدہ کجی خوش بوئے سخن کی شاعری بھی اچھا سلسلہ ہے آخر پر مرشد کے سفر ساتھ شامل ہوئے اور اسے اپنا مسافر عمدہ پایا۔ قابل قدر میں نے دو تحریریں ”حکومت اور قانون“ اور ”نونی مالا کے تارے“ جانے کب سے آپ کو ارسال کی تھیں مگر آپ مسلسل میری تحریروں کو نظر انداز کر رہے ہیں جبکہ مجھ سے بعد میں بھیجی جانی والی تحریریں شامل اشاعت ہیں۔ سر کیا میرے لفظوں، فقروں اور پلاٹ میں جان نہیں ہے جو میں آپ کے پرچے کار وادار نہیں مہربانی فرما کر میری تحریروں کو منظر عام پر لاتے ہوئے مجھے سرخرو فرمائیں اس آخری شعر کے ساتھ اجازت

جن اپنوں پر ناز تھا ہمیں  
وہی جینے کی سزا دیتے ہیں  
مر مر کے جینا ہے مقدر حسن  
ہمیں کب لوگ وفا دیتے ہیں

ایم رفاقت..... واہ کینٹ۔ محترم جناب اقبال بھٹی صاحب اور نئے افق کے تمام اسٹاف کو میری طرف سے السلام علیکم قبول ہو۔ اللہ تعالیٰ رسالے نئے افق کو مزید ترقی دے آمین۔ محترم اقبال بھٹی صاحب کو اور آپ کے تمام عزیز و اقارب کو اللہ صحت و تندرستی دے آمین، محترم عالی خان صاحب نے بہت محنت سے ابن صفی کے کردار پر روشنی ڈالی ان کے ہم شکر گزار ہیں تقریباً پچاس سال پرانے ان کرداروں کو زندہ کیا اور اسے سے گزارش ہے کہ ابن صفی کا یہ سلسلہ چلتا رہنا چاہیے ایک بات اور جس کے لیے ادارہ مبارک باد کا کاغذ ملے کہ پچاس روپے میں اتنی مزے دار کہانیاں پڑھنے کو مل رہی ہیں مگر کہانیاں معیار کے مطابق نہیں آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو جناب امجد جاوید صاحب کی حصار بھی مکمل ہوئی اچھی کہانی بھی میٹاب خان صاحب کی زندگی اور محمد عرفان رامے صاحب کی عکس ذات کہانیوں نے بہت متاثر کیا بہت اچھی کوشش تھی پسند آئی، بہرہ و پیہ، چاہ نمل، چاہت بھی رسالے میں اپنی موجودگی کا پتا دے رہی ہیں اچھی ہیں، فن پارے کی کہانی، آخری رات حمیرا افسانے بہت خوب صورت انداز میں پیش کی یہ عورتوں کی عادت ہے جس کو وہ بہت خوب صورت انداز میں استعمال کرتی ہے اور مرد بے چارے اس کے جال میں پھنس جاتے ہیں بڑی بڑی سلطنت ان مردوں کے ہاتھوں سے نکل گئیں یہ ان کے اس جادو کا اثر تھا مرد سب کچھ لٹا دیتے ہیں آگے کیا لکھوں کہیں کوئی ناراض نہ ہو جائے کہانی بہت اچھی تھی اس لیے تبصرہ بھی کر دیا، محمد شعیب کی کہانی تمہارا کزن، عثمان غنی کی وہ کون تھی اسحاق ججنوہ کی تمکین پانی، میسونہ صدف کی سزا محترم عارف شیخ کی ہول، ماہوش طالب کی وہ کچھ اور تھا سب ہی محنت سے لکھی گئی ہیں اور سب ہی اچھی ہیں، ذوق آگاہی میں اپنا نام پہلے نمبر پر دیکھ کر بہت خوش ہوئی، ریاض بٹ، شجاعت حسین، افراجٹ، پرنس افضل شاہین، ایس جیب خان، ایم حسن نظامی، ارم کمال، دعا باغی، مہرین آصف بٹ، بلی شاہد، نیلہ چوہدری، شگفتہ خان، پروین افضل شاہین اور محترم ریاض چوہان صاحب کے جنت میں لے جانے والے نمل اور دوسروں کی کوشش سے بہت معلومات ملیں سب کا شکریہ۔ خوش بوئے سخن میں غزلیں جناب شاہد ذکی، جواد شیخ، رابعہ بصری، احمد جہانگیر، ایم نظامی، ریاض حسین قمر، رفاقتوں کے سفر میں عناد ڈرتا ہوں کہ نگار پرے دنگا فساد ڈرتا ہوں جی بہت خوب محمد نعیم، کول جو سیہ کی پسند آئی اور راؤ تہذیب حسین تہذیب کا قطع، نشان حیدر بہت اچھا تھا اور نظم میں فیاض اسحاق کی پسند آئی، محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے جو بھان متی نے کتبہ جوڑا، جو کچھ ارشاد فرمایا ہے آنے والا وقت اس بات کی تصدیق کر رہا ہے انکو رکھتے ہوں یا بیٹھے یہ کچھ بھی نہیں چھوڑیں گے اس سے پہلے ان لوگوں نے پاکستان کو قلمی خون میں ڈبو دیا ہے یہ پاکستان کو ترقی پر جاتا نہیں دیکھ سکتے اب یہ ہی دیکھیے کہ ہم



پاکستانی قوم چندہ جمع کر رہی ہے مگر یہ لوگ مخالفت کر رہے ہیں ان کو یہ پتا نہیں کہ یہ ڈیم کسی دوسرے ملک میں نہیں بن رہا یہ پاکستان میں بن رہا ہے اور اس سے پاکستانی فائدہ اٹھائیں گے محترم اقبال بھٹی صاحب اس دفعہ بھی گفتگو میں حاضری کم تھی اور میرا خط آپ نے پہلے نمبر پر رکھ کر مجھے بہت خوش بختی جناب کا بہت بہت شکریہ اور جن لوگوں نے بھی میرے خطوط کو پسند کیا میں دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آتے ہیں تیری بزم میں ہر بار  
کہ دوستوں سے ملاقات ہی ہو جائے

**سلمان عبداللہ..... کھروڈ پکا۔** قابل احترام اقبال بھٹی صاحب۔ السلام علیکم امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ دیگر احوال زیر قلم ہے کہ اکتوبر کا تازہ شمارہ نئے افق 24 تاریخ کو ملا، بھٹی صاحب ادب کیا ہے ہمیشہ کے لیے اس کو سیکھنے کی کوشش کی نئے افق کو دیکھا پڑھا ہے ہمیشہ کیلئے نزدیک پایا۔ اس سے ادب شناسی کی روشنی پائی نئے افق وہ ادبی جریدہ ہے جس کی خوشبو سے یہ ادبی محبت مہک اٹھی ہے اور من کے اندر زمزمہ پرواز گیت گنگناتا ہے۔ انیسویں صدی میں انسانی ادب سے داستان گوئی کا رجحان ختم ہو گیا اور اس کے مقابلے میں ناول منظر عام پر آیا ناول کو ہم داستان کی ارتقائی شکل کہہ سکتے ہیں جو اطالوی زبان کے لفظ Navella سے مشتق ہے۔ یہ ناول انگریزی ادب کے اثرات سے اردو ادب میں منتقل ہوا۔ ناول نگار کے نقطہ نظر اور نظریہ حیات کا عمل دخل ناول میں براہ راست ہوتا ہے جس سے ناول میں نگار زمانے کی حقیقی زندگی اور فرد کے افعال و اعمال نیز ذہنی و نفسیاتی کیفیات کی عکاس کرتا ہے اسی طرح ناول کا کیوں بھی زندگی کے نشیب و فراز کی طرح وسیع ہو جاتا ہے۔ ناول کے پاس اظہار آزادی کا عنصر تو ہوتا ہے لیکن اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کفایت پسندی کے تحت تفصیلات سے دامن نہ پی ہو اور وضعی جزئیات کو تحریری اسلوب دے اگر ایسا ہے تو ناول نگار کے لیے بصیرت اور باریک بینی کا باہر بھی ہونا چاہیے ناول میں استعاراتی تہوار زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ بھائی میں نے تو ابھی تک 26 بہاریں بھی نہیں دیکھی ہیں۔ جس میں 15 سالوں سے ادب کی خدمت کرتا آ رہا ہوں مگر اب تک ادب کو قریب سے نہیں دیکھائے افق کے سارے رائٹر حضرات میرے استاد محترم ہیں انکل محمد سلیم اختر کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر یہ مقام حاصل کیا تمام ڈائجسٹوں میں لکھنے کا شرف حاصل ہوا تو سلیم اختر کی وجہ سے۔ باقی تحریروں پر تو میں تبصرہ نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے ابھی تک پڑھی ہی نہیں ہیں امید ہے کہ وہ بھی نئے افق کے معیار پر ہوں گی۔ مقبول جاوید صدیقی اور کاشف بھائی آپ دونوں کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے نئے افق کو روئی بخشی اور مزید لکھنے کی پختگی دی۔ آخر میں اتنا ضرور لکھوں گا کہ میری لکھائی بہت کمزور ہے جس کی وجہ سے تعلیم (پرائمری) پاس اور کاغذ بھی بہت پرانا استعمال کرتا ہوں جس کی وجہ سے (غربت)۔ پلیز خدا را مانتہ مت کرنا۔ میں نے افق کے معیار پر لکھ سکتا ہوں اگر میری تحریروں میں وزن ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ضرور بتانا آئندہ کے لیے نہیں لکھوں گا۔ میری طرف سے تمام دوست اور نئے افق کی پوری ٹیم کو سلام۔

**یمنی نور..... گجرات۔** السلام علیکم اگر میوں کے گرم موسم میں امید ہے خوشحال زندگی گزار رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی حفظ و امان میں رکھے! آمین! بہر بل سلامتی کی دعائیں ورنہ یہاں تو ایسا لگتا ہے گھر کی چار دیواری میں بھی محفوظ نہیں رہے۔ انسان ہی انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر رہے ہیں۔ موت صرف ایک گولی کی سافٹ پر ہے۔ ایک اشارے کی محتاج ہے۔ آنکھ پھٹکی اور انسان زندگی سے محروم۔ کیا ہمارے آباؤ اجداد نے ایسا بھی سوچا تھا کہ ہماری نسل بے مول موت کے حوالے ہو جائے گی۔ جس ملک کو قربانیاں دے کر حاصل کیا گیا تھا آج وہی وطن قربان گاہ بنا ہوا ہے۔ امراء کو جوڑ توڑ سے فرصت نہیں ہے اور غریب عوام، گرمی، مہنگائی اور دہشت گردی سے مر رہے ہیں اور پانی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ کہیں پانی کا خط ہے تو کہیں پانی کا ضیاع ہو رہا ہے۔ میرٹ



والے سرکوں کی خاک چھان رہے ہیں اور سفارشی اعلیٰ عہدوں پر بیٹھے غریب کے گلے کاٹ رہے ہیں انصاف کہاں ہے؟ اب کوئی انصاف کے لیے کورٹ پجھری کی طرف رُخ کرتا نہیں ہے۔ خود ہی مجرم اور خود ہی منصف بنے ہوئے ہیں میرے اللہ کرم فرما۔ ماہ اکتوبر کا نئے افق سرورق میں خوبصورتی نہیں تھی۔ سرورق پر کشش نہیں تھا۔ اس طرف خصوصی توجہ ہونی چاہیے۔ قارئین، لکھاریوں، اسٹاف، کوڈلی دعائیں مہنگائی نے ہماری خوشیوں کو جھٹکڑیاں لگا رکھی ہیں۔ میڈیسن نے زندگی دینے کے بہانے ہمیں موت کی نیند سنانے کی قسم اٹھا رکھی ہے اور یہی سب کسر ہمارے حکمرانوں نے پوری کر رکھی ہے۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب کی باتیں دل کو چھو گئیں، گفتگو میں سبھی کے خط خوب صورت تھے۔ گفتگو کی محفل خوبصورت تبصروں سے جچی تھی۔ اقراء میں طاہر انکس اللہ تعالیٰ کے صفائی ناموں کا ذکر کر رہے تھے۔ ان ناموں میں بڑی برکت ہے اگر اس کا ورد رکھا جائے تو کیا پلٹ جائے گی۔ لوگ تعلیم کی کمی، جہالت کی وجہ سے اپنا وقت اور پیسہ برباد کر رہے ہیں۔ فن پارے کی خریدیں پسند آتی اور خوشبوئے سخن، ذوق آگہی بھی زبردست رہے۔ اسی کے ساتھ ہی اگلے ماہ تک کے لیے اجازت، اللہ تعالیٰ

**حسینین..... کراچی۔** تمام مدیران حضرات، تمام اسٹاف اور میرے تمام دوستوں کو سلام مسنون۔ اُمید کامل ہے مزاج بخیر وعافیت ہو گئے۔ بندہ ناچیز بھی خدا بزرگ و برتر کی رحمتوں، برکتوں، عنایتوں کی بدولت خیریت سے ہے اور اپنے خدا بزرگ و برتر کا نہایت عاجزانہ سپاس گزار ہے۔ درود یاور وادی سکوت میں خواب خرگوش کی نیند کے مزے لے رہے تھے۔ سکوت اس قدر کدول کی دھڑکن اور سانسوں کی رفتار با آسانی سماعتوں سے نکرانی ہوں۔ میں اپنے مخصوص تخلیقی حجرے میں بیٹھا کچھ لکھنے میں محو تھا۔ اچانک سے موبائل کی لائٹ روشن ہوئی اور ساتھ میں ہی بیل بجنے لگی۔ اسکرین پر رونما ہونے والا نمبر میرے پیارے دوست کا تھا۔ حال احوال کے بعد معلوم پڑا کہ محترم خواجہ صاحب نے ہمیں گمشدہ قرار دے دیا ہے۔ لیوں یہ ایک مسکراہٹ نے رخص کرنا شروع کر دیا۔ ارے مٹھو بھائی میں نہیں گم نہیں ہوا۔ کچھ مصروفیت کی بنا پر محفل سے غیر حاضر رہا۔ برائے کرم بندہ ناچیز کی اس گستاخی کو درگزر فرمایا جائے۔ انشاء اللہ اب حاضری کی پابندی ہوگی۔ خواجہ صاحب یاد آوری کا بے حد شکر ہے۔ اللہ پاک آپ کو خوش رکھے۔ مصروفیت سے ہٹ کر ایک اور وجہ بھی تھی جس کی وجہ سے میں احوال نہیں لکھ پا رہا تھا۔ گذشتہ چند ماہ سے احوال کی محفل میں کچھ گرم جوشی کا اک موسم طاری تھا۔ ارے بھائی جون کی گرمی تو چھوڑیے۔ اللہ پاک نے یہ جو ایک آتش دان ہمارے سینوں میں پابند سلاسل کر رکھا ہے۔ اس کی آتش تو شاید دوزخ کی آگ سے بھی زیادہ پیش کی مالک ہے۔ یہ دنیاوی گرمی تو کچھ بھی نہیں۔ خورشید کی پیش اس کے آگے ساگر میں بارش کی ایک بوند برابر ٹھہری۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ جب ہمارا دین ایمان ہے کہ عزت اور ذلت رب کریم کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے۔ عزت سے نوازتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت سے نواز دیتا ہے۔ یہ سب مالک کے کام ہیں۔ تو کیوں ہمارے دلوں میں جلن بغض، منافقت حسد نے آکر ذریعہ جمالیایا ہے۔ نفرت کے پتھر حسد کے خاروں نے سلطنت قلب کو تباہ کر دیا ہے۔ ہم شکل و صورت سے تو بے حد خوبصورت ہیں۔ ہمارے چہرے جھپکتے آفتاب کی مانند ہیں۔ ہماری کشادہ جبین پر مخراب سجے ہوئے ہیں۔ مگر ہم اندر سے اتنے کالے کیوں ہیں۔ ہمارے اندر کی سیاہی کو ہم کیوں منہ نہیں سکتے۔ کیوں کسی کی کامیابی پر اسے دعائیں نہیں دیتے۔ رب کریم کا ارشاد ہے۔ ”تو اوروں کی خوشی مانگ میں تیری جھولی خوشیوں سے بھردوں گا“ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ ٹھہرا۔ بہر کیف بات کہاں نکل گئی۔ میرے بھائیو سبھی سوچا ہے کہ ایک دن میں 24 گھنٹے ہیں۔ ایک گھنٹہ بھی اپنی ذات کے لیے نکالا ہے کبھی؟ کبھی سوچا کہ آج کا دن گزرا آج میں نے کتنے حقوق اللہ کی ادائیگی کی کتنے حقوق العباد کی ادائیگی کی ہے؟ ارے ہم تو جو اپنے ساتھ ہی مخلص نہیں کسی اور کے ساتھ کیا خاک مخلص ہو گئے؟ نماز کا فائدہ ہمیں ہوگا مگر پڑھتے نہیں ہیں۔ نیکی کا ثواب ہمارے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔ مگر ہم کیوں کریم؟ کہیں دوسرے کا بھلا نہ ہو جائے کہیں وہ ہمیں سچے دل سے دعا نہ دے۔



کہیں ہماری آخرت نہ سنور جائے۔ میرے پیار و حسد کی آگ انسان کو راکھ راکھ کر دیتی ہے۔ بہر کیف معاملہ کچھ بڑھ نکلا۔ کوئی بات بری لگی تو معذرت چاہتا ہوں۔ ان شاء اللہ اب میں حاضری کو یقینی بناؤں گا۔ اب اجازت دیں۔ زندگی نے وفا کی تو دوبارہ حاضر ہوں گا۔ تب تک کے لیے اللہ حافظ۔

**مجید منان..... کوہ فنگس، گراچی۔** مزاج گرامی! امید واثق ہے خیر بانٹتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کی آسانیاں پیدا فرمائے صحت کی بادشاہی، ایمان کی سلامتی کے ساتھ سلامت رکھے آمین ثم آمین۔ تمام لکھاریوں، اسٹاف، اور قارئین کو تہ دل دعائیں۔ ہر طرف دہشت ہی دہشت ہے، مہنگائی کا طوفان اپنی پیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ امیری غریبی کا تضاد ہر سو ہے۔ غریب بھوک سے مر رہے ہیں تو امیر بیماری کے ڈر سے کھانا چھوڑے ہوئے ہیں۔ حسد کینہ پروری عروج پر ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد، کس کو فرصت ہے، اس طرف توجہ دے۔ جب انسان خود کے لیے جینے لگے تو انسانیت مرجاتی ہے۔ اللہ کرم کرے اور وطن عزیز کو امن کا گہوارہ بنائے آمین۔ ماہ اکتوبر کا نئے افق تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ٹھوڑا لیٹ ملا۔ پہلے پندرہ تاریخ کو مل جاتا تھا اب کی تاریخ کو ہماری دسترس میں آیا۔ سرور قی دیدہ زیب تھا۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کی تحریر نے دل کو چھو لیا۔ طاہر قریشی صاحب صفائی ناموں کے ساتھ حاضر تھے۔ بانی مکمل پرچے پر تبصرے اگلے ماہ کروں گا، جب تک کے لیے اللہ حافظ۔

**یامین ارشد..... بورے والا۔** محترم جناب اقبال بھٹی، طاہر احمد قریشی، مشتاق احمد قریشی، تمام بزرگ، لکھاریوں اور تمام اسٹاف کو نہایت عقیدت سے السلام علیکم! امید ہے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خوش و خرم زندگی گزار رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ خوشیوں کے ساتھ سلامت رکھے۔ شریک عنان صبر کے شر سے اپنی حفظ و ایمان میں رکھے اور صحت و تندرستی کی نعمت ہمیشہ رہے۔ آمین ثم آمین! جہاں رہیں خوشیاں تقسیم کریں کیونکہ یہی زندگی ہے۔ دنیا اور آخرت میں کامیابی اسی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں سے نوازے اور ایسے قہر سے محفوظ فرمائے آمین۔ میں نئے افق کے لئے نیاز ضرور ہوں مگر خاموش قاری کئی سالوں سے ہوں۔ جب بھی وقت ملتا ہے نئے افق کا مطالعہ کرتا ہوں۔ نئے افق سے خاصا لگاؤ بھی ہے۔ سب سے پہلے سرور قی کی بات کرتے ہیں۔ ماشاء اللہ! بہت خوبصورت ہے۔ نظریں تک سی جاتی ہیں۔ بہت خوب۔ زبردست سرور قی دیا گیا ہے۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کی تحریر اچھی لگی۔ کہانیوں کی بات کی جائے تو اپنی اپنی جگہ بہترین تھیں۔ ذوق آہی اور خوشبوئے سخن بہترین رہے۔ فن پارے اور گوشہ ابن کے تو کیا ہی کہنے۔ اللہ تعالیٰ نئے افق کو مزید ترقی سے ہمکنار فرمائے آمین ثم آمین والسلام!

**حسن رضوی..... ساہیوال۔** السلام علیکم! اس دعا کے ساتھ اپنے خط کا آغاز کرتا ہوں جہاں کہیں بھی ہوں گے خوشیاں بانٹنے میں مصروف ہوں گے۔ جدید دور میں کسی کے چہرے پہ خوشی کے آثار پیدا کرنا بھی تو نیکی ہے۔ ہر طرف اُداسی، مایوسی کے سخت پہرے ہیں، خوف پھیلا ہوا ہے۔ ماہ اکتوبر کا نئے افق ملا، سرور قی زبردست ہے۔ نئے افق کی گفتگو میں اقبال بھٹی صاحب کی باتیں دل کو چھو گئیں۔ دستک پڑھی جہاں مشتاق احمد قریشی کی باتیں دل کو چھوئی محسوس ہوئیں۔ گفتگو میں بھٹی صاحب کی باتیں بہت پیاری تھیں اے کاش ہم ان پر عمل کر سکتے۔ عبد الحمید، مجید احمد جانی، صائمہ نور، ریحانہ سعیدہ، ممتاز احمد، عرفان قریشی، عبد الباقی، شجاعت حسین، شجاع بخاری، ریاض حسین قمر، حسین جاوید، ایم حسن نظامی سمیت دیگر نئے افق کے پرانے ساتھی کہاں کہیں ہو گئے ہیں تمام غیر حاضر ساتھیوں سے گزارش ہے کہ فی الفور اپنی حاضری یقینی بنا کر محفل گفتگو کو رونق بخشیں۔ اقراء میں طاہر احمد قریشی نے اللہ تعالیٰ کے ناموں پہ لکھ کر دل کی کھڑکیاں کھولنے پہ مجبور کر دیا۔ اکتوبر کے شہارے میں لکھنے والی تمام کہانیاں بے مثال تھیں فن پارے بھی کمال کے تھے ذوق آہی اور خوش بوئے سخن بھی لا جواب تھے۔

**دیاب شکیل..... ملتان۔** آداب! دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ امن کی زندگی بسر کرنے کی توفیق دے اور ان خوشگوار محسوسات کی سرقتوں میں قید بھی ہوں کہ آپ حقیقی خوشیوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ پاک سرزمین کو امن کا گہوارہ بنائے اور دشمنوں کو نیست و نابود کرے۔ یہ جو فضائیں دھواں دھواں سی ہیں، یہی جہنمی خوشبوؤں سے معطر ہوں۔ یہ جو سڑکیں خون سے سُرخ ہو رہی ہیں، اللہ کرے یہ سڑکیں زرمبادلہ کمانے میں کام آئیں اور خونی بادل چھٹ جائیں۔ یہی وطن کی فلاح و بہبود کے لیے متحد ہو جانا چاہیے اور اپنا شن من دھن وطن پر قربان کرنے کے لیے میدان میں آنا چاہیے۔ اب وعدوں کا وقت نہیں کچھ کرنے کا وقت ہے۔ دشمنوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر واصل جہنم کرنا ہوگا، تب ہی امن قائم ہوگا اور خوف و ہراس کی فضا ختم ہوں گی۔ ماہ اکتوبر کا نئے افق ملا، سرورق بہت پیارا اور کشش بھرا تھا۔ دستک میں انکل مشاق احمد قریشی نے خوب لکھا۔ گفتگو میں اقبال بھٹی صاحب نے عمدہ باتیں کیں۔ اب سوچنے کا وقت نہیں ہے، عمل کا وقت ہے، ہمیں ایک دوسرے کے گریبانوں کو چھوڑ کر دشمن کے گریبان پکڑنے ہوں گے اور ان کو سزا دلوانی ہوگی ورنہ دشمن اسے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا اور ہم غلامی در غلامی کی زنجیریں اپنے گلے میں ڈال لیں گے۔ کہانیوں میں سب کی تحریریں اپنی اپنی جگہ منفرد تھیں۔ اگر نئے افق میں سفر نامے شامل کئے جائیں تو سونے پہ سہاگہ ہو جائے گا۔ ذوق آگہی، خوش بوئے سخن بھی زبردست تھے۔



### سانحہ ارتحال

ہمارے دیرینہ ساتھی اور ماہنامہ نئے افق کے مدیر جناب اقبال حسین بھٹی کی اہلیہ علالت کے باعث خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔ تمام قارئین افق سے درخواست ہے کہ ایک بار سورۃ الفاتحہ اور تین بار سورۃ اخلاص پڑھ کر مرحومہ کے لیے ایصال ثواب کر دیں۔ نئے افق گروپ آف پبلی کیشن اور ادارے کے تمام ساتھی اقبال حسین بھٹی کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت اس عظیم صدمے پر امتحانہ کو صبر جمیل اور صبر جمیل پر اجر عظیم عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین

### مصنفین سے گزارش

- ☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
- ☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیرہ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
- ☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں، صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔
- ☆ خوشبوؤں کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
- ☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
- ☆ نوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور نوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
- ☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
- ☆ ”گفتگو“ کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہیے۔
- ☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتہ پر جسٹر ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔

نوٹ 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقت ہوتا ہے لہذا اس دوران دفتر ملی فون کرنے سے گریز کریں



# اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

## الحلیم

(نہایت بردبار)

حلیم: اس کا مادہ حلیم ہے اس کے معنی بردبار، تحمل والا برداشت، نہایت درجہ نرم، باوقار، حلیم جس کے معنی جوش غضب سے نفی اور طبیعت کو روکنا یعنی بردباری اور تحمل کے ہیں۔ یہ صفت الہی ہے کیونکہ اصل حلیم اللہ تبارک و تعالیٰ کو ہی ہے۔ حلیم اسے کہتے ہیں جو صاحب قوت و عظمت ہو، متین و سنجیدہ، بھاری بھر کم ہو، ذرا سی بات پر بھڑک نہ اٹھے۔

ترجمہ: ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو اور اللہ تعالیٰ بے نیاز اور بردبار ہے۔ (البقرہ - ۲۶۳)

قرآن کریم میں بار بار جگہ جگہ صفات الہی کا ذکر آیا ہے تاکہ اہل ایمان حتی الوسع کوشش کر کے اپنے اندر وہ صفات پیدا کریں، اسلامی نظام حیات، اسلامی زندگی، ایک تہذیب کا نام ہے، زندگی کا طریقہ عمل اور آداب زندگی ہے، ایک مسلمان اپنے اندر صفات باری تعالیٰ پیدا کرنے کی کوشش کرے اور راجہ حق کے مراحل طے کرتا چلا جائے، اور ان صفات الہی سے اپنا حصہ سیکھتا ہے۔ اسلام ایک مہذب دین ہے جو معاشرے کی پوری طرح تہذیب کرتا ہے یہی بات آیت کریمہ میں سکھائی جا رہی ہے کہ جب کوئی مسائل، کوئی ضرورت مند جب کسی اہل ایمان مسلمان سے رجوع کرے تو وہ اس سے نرمی کا سلوک کرنے، شفقت سے پیش آئے، آیت کریمہ میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ جس صدقے کے بعد مسائل کو اذیت دی جاتی ہو ایسے صدقے کی کوئی ضرورت نہیں، اس سے تو بہتر ہے کہ ایک میٹھا بول، ایک نرم بات کہہ دی جائے یا دعائیہ کلمات ادا کر دیے جائیں۔ ”اللہ تجھے بھی اور ہمیں بھی اپنے فضل و کرم سے نوازے۔“ یہ قول معروف ہے اور ”مغفرہ“ کا مطلب مسائل کی پردہ پوشی ہے، مسائل کی حاجت کو اس کے سوال کو لوگوں کے سامنے نہ لانا ہی، اسلامی تعلیم ہے اور اگر مسائل کچھ تازہ یا کلمات بھی ادا کر دے تب بھی اس سے صرف و نظر چشم پوشی کا حکم ہے تاکہ اس کا پردہ رہے، یعنی مسائل سے نرمی، شفقت اور چشم پوشی اس کی پردہ پوشی اس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد اس کو لوگوں میں ذلیل و رسوا کر کے اسے تکلیف پہنچائی جائے۔ اس لئے حدیث میں آیا ہے (پاکیزہ کلمہ بھی صدقہ ہے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”تم کسی بھی

معروف (نیکی) کو حقیر مت سمجھو اگر چاہنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا ہی ہو۔ (مسلم)

ترجمہ:- انہیں اللہ تعالیٰ ایسی جگہ پہنچائے گا کہ وہ اس سے راضی ہو جائیں گے بے شک اللہ تعالیٰ علم اور بردباری والا ہے۔ (الحج-۵۹)

آیت کریمہ میں ایسے لوگوں کے لئے خوشخبری سنائی جا رہی ہے جو اللہ کی راہ میں اپنی جان اپنے مال کو خرچ کرتے ہیں انہیں کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسی جگہ داخل کرے گا جہاں پہنچ کر وہ راضی ہو جائیں گے کیونکہ جنت کی نعمتیں ایسی ہیں جنہیں آج تک کسی آنکھ نے نہیں دیکھا نہ کسی کان نے سنا دیکھنا سنانا تو کیا انسان کے دل و دماغ میں ان کے وہم و گمان میں بھی ان کا گزر نہیں جن نعمتوں سے اللہ تعالیٰ جنت کی صورت میں نوازے گا۔

اللہ بڑا علم والا ہے بڑا ہی حلیم ہے وہ نیک اعمال کرنے والوں کے درجات اور ان کے مراتب اور استحقاق کو خوب جانتا ہے۔ جو مظالم انسان کرتا ہے وہ ان کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں اسے بھی جانتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ حلیم ہے وہ سب کو مہلت دیتا ہے اپنے غضب کو روکے رکھتا ہے وہ روزِ محشر ظالم اور مظلوم دونوں کو پوری پوری جزا دے گا۔

ترجمہ:- اگر تم اللہ کو اچھا قرض دو گے (یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے) تو وہ اسے تمہارے لئے بڑھاتا جائے گا اور تمہارے گناہ بھی معاف فرما دے گا۔ اللہ بڑا ہی قدر دان اور بڑا ہی بردبار ہے۔ (التغابن-۱۷)

اللہ تعالیٰ اپنی صفاتِ عالی سے آگاہ فرما رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت ہی برکت والا اور عظیم تر ہے وہ کتنا عظیم کتنا کریم ہے کہ اُس خالق و مالک نے اپنے کرم خاص سے انسان کو پیدا فرمایا انسان جو اس کا بندہ اس کا غلام ہے وہ ذاتِ مہربان انسان کی پرورش و نگہداشت بھی کرتی ہے حیرت کی بات ہے کہ وہ مالک و قاضی ہر طرح سے مختار ہے وہ اپنے بندوں سے قرضِ حسہ مانگ رہا ہے۔ پھر وہ اس قرض کو ہی نہیں لوٹاتا بلکہ اسے کئی گنا بڑھا کر لوٹاتا ہے ساتھ ساتھ اپنے غلام اپنے بندے کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے اس کے ساتھ نہایت حلیمی سے معاملہ فرماتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جو قادرِ مطلق ہے جو احکم الحاکمین ہے یعنی بادشاہوں کا بادشاہ ہے وہ اپنے بندے سے لیا ہوا قرض نہ صرف کئی گنا بڑھا کر واپس کرتا ہے بلکہ اس کے سارے قصور بھی انعام میں معاف فرما دیتا ہے۔ جو یقیناً انسان کے لئے کسی عظیم ترین انعام الہی سے کم نہیں۔ (یہ بات ذہن نشین کر لی جائے کہ قرض کا بڑھا کر واپس کرنا ”سود“ کا جواز نہیں بن سکتا یہ خالص انعام الہی ہے اللہ تو بخیر رکھتا ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔)

اگر انسان اپنی حدود و طاقت کے مطابق اپنے تمام فرائض و کمزوریوں پر قابو پاتے ہوئے اللہ کے احکام و تعلیمات پر عمل کرے اور اللہ کی اطاعت و بندگی اختیار کرے اور اپنی جان و مال کو اللہ کی راہ میں خلوص نیت سے نہ صرف اللہ کی رضامندی کے لئے خرچ کرے اور ہر ظلم و زیادتی سے بچ کر چلے صبر و برداشت کو اپنا لے صفیۃ الہی کی تقلید کرے تو بھی انسان حق بندگی ادا نہیں کر سکتا۔ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی روح میں سے پھونکا ہے۔ اس روح کا تقاضہ ہے کہ انسان صفاتِ الہی کو اپنائے اپنی طاقت کے مطابق اس کا حق ادا کرے تاکہ اللہ اس سے راضی رہے۔





# خون ریز

امجد جاوید

حصہ اول

انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ طاقت کا حصول چاہتا ہے۔ انسانی تہذیب کے عروج و زوال کی داستانوں میں طاقت کا حصول ہی سب سے بڑی خواہش رہی ہے۔ طاقت اس وقت قوت بنتی چلی جاتی ہے، جب اس میں انسانیت کی فلاح مقصد ہو لیکن جو نہیں طاقت حاکمیت میں بدلتی ہے تو ظلم پڑھنے لگتا ہے۔ انصاف کی جگہ جبر لے لیتا ہے۔ خون ارزاں ہو جاتا ہے اور زندگی سکھنے لگتی ہے۔

خون ریز کہانی ہے اس نوجوان کی جو طاقت کے خونی کھیل میں دھکیل دیا گیا تھا۔ موت اس کا تعاقب کرنے لگی تو زندگی نے اسے نرم و نازک نسوانی جذبوں سے لے کر آتش و آہن سے کھینا سکھا دیا۔

ریشمی محبتوں، معاشرتی جبر، انسانی رویوں، دیدہ نادیدہ خطروں اور سازشوں کی خوں ریز داستان





صبح کی نیلگوں روشنی میں ہلکی ہلکی کھر پھیلی ہوئی تھی۔ میں اپنی حویلی سے باہر کار پڑور میں آیا تو سامنے کا منظر کافی جھنڈا لگتا تھا۔ باہر والے گیٹ کے پار کھیت بھی صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے جیکٹ کے ٹاپ سے سر کو نکالا اور جامنگ کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ حویلی کا گیٹ پار کرتے ہی سامنے ایک کچا راستہ تھا جو در کھیتوں تک جاتا تھا۔ میں اسی کچے راستے پر چل نکلا۔ لاہور میں بھی میرا بڑا وہ دو برس سے یہی معمول تھا۔ اب جبکہ میں گاؤں واپس آ گیا تھا، یہاں بھی میری یہ عادت ختم نہیں ہوئی تھی۔ صبح کی جامنگ مجھے سارا دن تروتازہ رکھتی تھی۔

اس وقت میں کافی فاصلہ طے کر گیا تھا۔ چاروں طرف کھیت تھیں۔ کہیں پر چارہ اگا ہوا تھا، کسی طرف کپاس کھلی ہوئی تھی، کسی جانب سبز اور پیلے رنگوں سمیت سرسوں کی فصل لگا کر کھلی لگ رہی تھی۔ میں موسم اور ماحول سے لطف اندوز ہوتا ہوا بھاگتا جا رہا تھا۔ اچانک ایک تیز بلبلاتی ہوئی انسانی چیخ سنائی دی۔ میں بھاگتے ہوئے لاشعوری طور پر ساکت ہو گیا۔ جب تک میں رکا، وہ چیخ، اس طرح کی ہڈیاں آوازوں میں بدل گئی جیسے کوئی موت کے منہ میں جا رہا ہو۔ بلاشبہ کوئی انسان ایسی ہی کسی مصیبت میں مبتلا تھا۔ وہ بلبلاتا میرے دائیں جانب سے آ رہی تھی۔ میں نے کھر میں اس جانب دیکھا، مجھے کچھ واضح دکھائی نہیں دیا۔ میرے سامنے کا منظر دھندلا تھا۔ میں نے لمحہ سے بھی کم وقت میں فیصلہ کیا اور آواز کے سہارے اس جانب بھاگنے لگا۔ چند کھیت پار کرنے کے بعد میرے سامنے جو منظر واضح ہوا، وہ بڑا بھیانک تھا۔

ہمارے ہی گاؤں کا رہنے والا ایک ادھیڑ عمر زون مسلی کھیت کے کنارے خون میں لت پت تڑپ رہا تھا۔ اس کا سر کھیت کی منڈ جبر پر اور باقی جسم کھال میں تھا۔ غور سے دیکھا تو یہی سمجھ میں آیا، کسی نے خنجر سے وار کر کے اسے مارنے کی کوشش کی تھی۔ پٹھنی ہوئی قمیص سے اُدھڑا ہوا پیٹ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایک خنجر اس کی پسلیوں کے درمیان پیوست تھا۔ وہ ہوش و حواس سے بے گانہ تھا۔ لیکن اس کی سسکاریاں ابھی تک منہ سے نکل رہی تھیں۔ اس کے منہ سے خون پسلیوں کی صورت نکل رہا تھا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ یہ ابھی زندہ ہے۔ اسے بچایا جانا چاہئے

میں نے اس پیوست خنجر کے ابھرے ہوئے دسے کو پکڑا اور پوری وقت سے باہر نکال دیا۔ وہاں سے خون اٹل پڑا لیکن اس کے ساتھ ہی روشن کی چیخ بلند ہوئی۔ روشن کے سر والا پڑنا زمین پر پڑا تھا۔ میں نے وہ اٹھایا اور اس کا سینہ باندھ کر خون روکنے کی کوشش کی۔ میں نے انتہائی تیزی سے اس جگہ کو باندھ دیا تھا۔ روشن مسلی شاید بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی آوازیں بند ہوئی تھیں۔ میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا کیونکہ اس کا پٹنا ہوا پیٹ میرے لئے مسئلہ تھا۔ میں نے اس کی قمیص پھاڑی اور پیٹ باندھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے خون سے میری جیکٹ بھر چکی تھی۔ میں نے کوئی پروا نہیں اور اس کا پیٹ باندھنے لگا۔ میں اسی کوشش میں تھا کہ میرے سامنے ایک نوجوان فیروز نمودار ہوا۔ اس وقت ہم اسی کے کھیتوں میں تھے۔ یہ واقعہ اسی کے کھیتوں میں ہوا تھا۔

”یہ کیا ہوا؟“ اس نے دیکھتے ہوئے انتہائی خوفزدہ لہجے میں پوچھا

”مجھے خود نہیں پتہ، چیخ سن کر یہاں آیا تو یہ اس حالت میں تھا، آؤ میری مدد کرو، یہ ابھی زندہ ہے۔“ میں نے تیزی سے باندھتے ہوئے کہا

”یہ زندہ نہیں بچے گا۔“ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا

”خنجر ہمیں کوشش تو کرنی چاہئے، اسے اٹھاؤ، میں جیب منگواتا ہوں۔“ میں نے اس کا پیٹ باندھا اور اٹھ کر اپنی جیب سے سیل فون نکالا۔ میں اپنے ملازم کا نمبر پیش کر چکا تھا۔ ایسے میں کھر سے دو چار مزید بندے نمودار ہوئے۔ وہ سب قریبی کھیتوں میں کام کرنے والے تھے

ان میں ایک روشن مسلی کا رشتے دار بھٹو مسلی بھی تھا۔ وہ چیخنے چلانے لگا تھا۔ میرا ڈرائیور نجانے کہاں کیا کر رہا تھا، میرا فون ہی نہیں اٹھا رہا تھا۔ میں نے دوسری بار کال کی تو وہ اس نے کال رسیڈ کر کے ہڑبڑا ہٹ میں کہا

”جی..... جی، مجھے وہ.....“

”میری بات غور سے سن، حویلی سے بالکل سیدھے راستے پر فیروز کے کھیت میں فوری جیب لے کر پہنچ، روشن مسلی شدید زخمی ہے، اسے ہسپتال لے کر جانا ہے، جلدی کرنا۔“

”جی بالکل۔“ ڈرائیور نے کہا تو میں نے کال بند کر دی۔ وہ سبھی اسے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک شخص



اس کے منہ میں پانی ڈال رہا تھا۔ سبھی وہاں موجود ایک بندے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا  
 ”اب کسی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں، یہ مر چکا ہے۔“  
 ”کیا، تم یہ.....“ میں نے تیزی سے کہا تو اس نے روشن مسکائی کی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا  
 ”ہاں، یہ اب اس جہان میں نہیں رہا۔“

”اُوہ، لیکن پھر بھی ہم اسے ہسپتال لے جائیں، پولیس کو اطلاع دیں۔“ میں نے اپنے حواس قابو میں کرتے ہوئے کہا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب کوئی انسان میرے سامنے یوں دم توڑ گیا ہو۔ میرے ہاتھوں پر خون کی چچا پھٹ، سامنے بڑی لاش اور بے دردی سے کئے گئے قتل پر طبیعت مکدر ہوئی تھی۔ مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔ میں نے کوئی اظہار نہیں کیا۔ بس مسکائی نے ایک شخص کی مدد سے اسے سیدھا کیا۔ تب تک فیروز کا بھائی ایک چار پائی لے آ یا۔ اس سے پہلے کہ میری جیب آئی وہ اسے اٹھا کر چل دیئے۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ میری مدد نہیں لینا چاہتے تو میں زبردستی نہیں کر سکتا تھا۔ میں وہیں کھڑا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ مجھ سے دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ ایسے میں ڈرائیور جیب لے کر آ گیا۔ میں اس کے ساتھ واپس چلی آ گیا۔ میرا من بہت بوجھل ہو چکا تھا۔ کسی انسان کو یوں کیسے قتل کیا جاسکتا تھا۔ میں جلدی سے فریش ہو جانا چاہتا تھا۔ میں لاؤنج میں گیا ہی تھا کہ اماں کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ حواس باختہ ہوتے ہوئے بے ساختہ پولیس

”یہ کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو.....“

”اُوہ کچھ نہیں ہوا، میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے بچھے دل سے کہا اور پھر ساری روداد سنادی۔

”اچھا جاؤ، جلدی سے نہا کر کپڑے بدل لو۔“ اماں نے دکھ سے کہا تو میں اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

☆.....☆.....☆

میں دوپہر کے کھانے کے بعد لاؤنج میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ میرے ذہن میں صبح ہونے والے واقعہ کا بہت اثر تھا جو بہر حال کافی حد تک ختم ہو گیا تھا۔ باہر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ حسب معمول لان میں میرے بابا چوہدری بشیر احمد بیٹھے ہوئے تھے۔ دوپہر ہو جانے کے بعد گاؤں کے باغ علاقے

سے لوگ آتے جاتے۔ گپ شپ ہوتی، مسئلے مسائل چنٹائے جاتے، علاقے کی سیاست اور حالات پر باتیں چلتی رہتی تھیں۔ میرے بابا نے بھی انکشن نہیں لڑا تھا لیکن کسی بھی امیدوار کو جتوانے کے لئے ان کا ساتھ ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ان کا علاقے میں اثر رسوخ تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی دیانت داری، شرافت اور ایمانداری سے گزاری تھی۔ ان کے فیصلے بھی انہی اصولوں پر ہوتے تھے۔ میرے بابا نے تو کوئی جاگیر دار تھے اور یہی کوئی زمیندار۔ ہماری اس گاؤں میں تقریباً سو ایکڑ زمین تھی۔ زمین اچھی تھی سو فصل بھی اچھی ہوتی۔ چونکہ بابا نے ساری زندگی شرافت سے گزاری تھی، اس لئے ان میں وہ ایسا کچھ نہیں تھا کہ وہ اپنی کمائی کوئی دولت کسی ناجائز راستے پر ضائع کرتے۔ بلکہ گاؤں اور علاقے میں بہت سارے لوگ ایسے تھے جن کی وہ خاموشی کے ساتھ مستقل مدد کرتے تھے۔

اس وقت بھی بابا کے پاس کافی سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ جو ذہنی طور پر دوپہر کے ساتھ بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ لوگ میری آمد کا انتظار کر رہے ہوں گے تاکہ مجھ سے اس واقعہ کی تفصیل سن سکیں۔ مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ گاؤں ہی میں نہیں پورے علاقے میں یہ خبر پھیل گئی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے جب بات پھیلی ہے تو لوگ اس میں اپنی طرف سے بھی بہت کچھ ڈال کر بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس طرح ہی سے بات کا بنگلہ بن جاتا ہے۔ بلاشبہ میرے بابا کے احباب پوری تفصیل مجھ سے ضرور سننا چاہتے ہوں گے تاکہ درست صورت حال جان سکیں۔ میں نے چائے ختم کی اور باہر چلا گیا۔

میرے وہاں بیٹھے ہی سب میری جانب متوجہ ہو گئے۔ میں نے تمام تر تفصیل سے انہیں آگاہ کیا۔ میں سب کہہ چکا تو وہ سب اپنے اپنے طور پر تبصرہ کرنے لگے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ واقعہ کیوں ہو گیا۔ روشن مسکائی چھوٹی مولی چوری چکاری تو کر لیتا تھا لیکن یوں کوئی اس کے قتل کے درپے ہو جائے، یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ یہ تبصرے ابھی جاری تھے۔ اسی دوران کھلے ہوئے گیٹ سے ایک پولیس جیب اندر داخل ہوئی۔ میں کھلے ہوئے گیٹ سے دیکھ رہا تھا کہ اس کے علاوہ بھی پولیس دین وہاں رکی ہیں۔ جیب تھوڑے فاصلے پر رکی۔ اس کے



تھانے جانا ہوگا۔ یہ عدالت میں ثابت ہونا ہے کہ علی نے قتل کیا ہے یا یہ کوئی سازش ہے۔“ راؤ ظفر نے دھمے لہجے میں بات کرتے ہوئے آخر میں ایسا اشارہ کر دیا، جس نے مجھے ہی نہیں میرے بابا کو بھی چونکا دیا تھا۔ کیا وہ جانتا تھا کہ یہ سازش تھی یا یونہی اپنی رُوش میں کہہ گیا تھا؟ کیا وہ سمجھ گیا تھا کہ اس واقعے کے پیچھے کیا محرکات تھے؟

”یہ کیا مذاق ہے۔ اس طرح تم کیسے لے جاسکتے ہو علی کو؟“ بابا کے پاس بیٹھے گاؤں کے ایک سرکردہ بزرگ نے غصے میں کہا

”دیکھیں جی میں ایک معمولی سا ملازم ہوں، مجھے اوپر سے حکم ملا کہ علی کو فوراً گرفتار کر کے پیش کیا جائے۔ ذرا سی بھی مزاحمت ہو تو سختی سے پیش آیا جائے۔ اب آپ ہی بتائیں جی میں کیا کروں؟“ راؤ ظفر نے انتہائی مسکین سے انداز میں کہا

”بتاؤ کون ہے وہ آفسر، میں کرتا ہوں اس سے بات۔“ اسی بزرگ نے کہا تو راؤ ظفر بولا

”جناب کیوں معطل کروانا چاہتے ہیں مجھے۔ میں تو سرکاری حکم کی تعمیل کرنے آیا ہوں۔“ راؤ ظفر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، پھر اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائل کھولی۔ اس میں سے ایک کاغذ نکال کر میرے بابا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا، ”یہ ایف آئی آر کی فوٹو کاپی ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں۔“

بابا نے وہ کاپی پکڑی اور پڑھنے لگے۔ جوں جوں وہ پڑھتے جا رہے تھے، ان کا چہرہ غصے میں سرخ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ پڑھ چکے تو چند لمبے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے راؤ ظفر سے کہا

”ٹھیک ہے تم علی کو لے جاؤ۔ میں اس کی ضمانت کا بندوبست کرتا ہوں۔ لیکن اپنا وعدہ یاد رکھنا، اسے کچھ ہونا نہیں چاہئے۔“ بابا نے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر جانے کا اشارہ کیا۔ میں کوئی بات کہنے بٹا اٹھا اور ان کے ساتھ چل دیا۔ ایک پولیس والا جھک کر بڑھا تو راؤ ظفر نے اسے روکتے ہوئے کہا

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔“

میں اس کے ساتھ چپ میں بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے حویلی میری نگاہوں سے دور ہوئی چلی گئی۔

تھانے ہی علاقے کا انسپکٹر راؤ ظفر اُترا۔ اس کے ساتھ دو دوسرے پولیس والے تھے۔ وہ علیک سلیک کے بعد میرے بابا کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد بابا نے اس سے پوچھا

”راؤ صاحب کس طرح آتا ہوا؟“

”دیکھیں ہمیں بھی ڈیوٹی کرنی ہے۔ صبح جو واقعہ ہوا، وہیں پر آپ کا بیٹا بھی تھا۔ وہاں دوسرے چشم دید بھی تھے۔ انہوں نے آپ کے بیٹے علی احسن پر قتل کا الزام لگایا ہے۔ ہم اسے گرفتار کرنے آئے ہیں۔“

اس کے یوں سیدھے سیدھے کہہ دینے پر ایک دم سے ہانا چھا گیا۔ میرے بابا نے اس کی بات بڑے عمل سے سنی تھی۔ پھر چند لمبے سوچنے رہنے بعد گویا ہوئے

”کس نے لگایا ہے یہ الزام؟“

”پھتوسکلی نے۔ وہ چشم دید گواہ ہے۔ اس نے ایف آئی آر میں لکھوایا ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے رُوش سلی پر علی احسن کو تختہ سے دار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔“ راؤ ظفر نے سکون سے کہا

”مطلب ایف آئی آر بھی درج ہو چکی ہے۔“ بابا نے یوں حیرت سے پوچھا جیسے انہونی ہو گئی ہو۔

”جی ہاں، درج ہو چکی ہے، جی تو میں آیا ہوں۔“ وہ ہنسنے لگا

”اوہ.....“ میرے بابا کے منہ سے بے ساختہ نکلا، پھر چند لمبے خاموش رہنے کے بعد بولے، ”دیکھو، میرا بیٹا علی بے گناہ ہے۔ اس نے تو صرف اس کی مدد کرنے.....“

”گستاخی معاف چوہدری صاحب، آلہ قتل برآمد ہو چکا ہے، چشم دید گواہ اپنے بیان دے چکے ہیں، مدعی ایف آئی آر درج کروا چکے ہیں۔ قانونی طور پر اب علی کو گرفتار کرنا میری مجبوری ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ علی کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”لیکن جب اس نے یہ قتل کیا ہی نہیں تو.....“ پاس بیٹھے ہوئے ایک بزرگ نے کافی سخت لہجے میں کہنا چاہا تو راؤ ظفر جلدی سے بولا

”دیکھیں جی، جس طرح آپ موقع پر موجود نہیں تھے، اس طرح میں بھی نہیں تھا۔ اب ایف آئی آر میں جو لکھوایا گیا ہے اور مدعی اس پر اصرار کر رہے ہیں تو علی کو ایک بار



ہمارے گاؤں سے شہر کا فاصلہ کوئی چھ کلومیٹر تھا۔ ہم جیسے ہی شہر کے قریب پہنچے تو راؤ ظفر نے بڑے رसान سے کہا ”علی یار یہ ہتھکڑی پہن لو، تھانے میں یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم تمہیں فیورے رہے ہیں۔“

اس سے پہلے کہ میں کوئی ہاں یا ناں میں جواب دیتا، اس کے ماتحت نے فوراً ہتھکڑی میرے سامنے کر دی۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ جب میں تم سے تعاون کر رہا ہوں تو پھر اس ہتھکڑی کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ہم شہر کے صدر تھانے میں آ گئے۔ جیسے ہی میں گاڑی سے لکھا، میری نگاہ سامنے کھڑے لوگوں پر پڑی۔ میں انہیں پہچان گیا تھا۔ وہ مقامی میڈیا کے لوگ تھے۔ کوئی میری تصویریں بنانے لگا اور کوئی ویڈیو۔ ایک لڑکی آگے بڑھی اور اس نے بڑے سنجیدگی سے سوال کیا

”کیا تم زمیندار لوگ، غریب کی کمین کو انسانی نہیں سمجھتے ہو، آخر تم نے اس غریب روشن مسلمی کو کیوں قتل کیا؟ ایسا کیا جرم کیا تھا اس نے؟“

میں اس کی بات کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ کوئی سوال بننا ہی نہیں تھا، دراصل اس وقت مجھے قصداً اس بات پر آ رہا تھا کہ میں کس طرح کی سازش کا شکار ہو رہا ہوں۔ وہ کون لوگ ہیں، جو میرے گرد سازش کا یہ جال بن رہے ہیں؟ اس قدر میڈیا کو لانے کا اہتمام راؤ ظفر نے کیا ہے یا کسی اور نے؟ اس لڑکی کے سوال کی بازگشت ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک مرد نے آگے بڑھ کر اسی طرح سچ لہجے میں پوچھا

”روشن مسلمی نے ایسا کیا کیا تھا کہ تم نے اسے قتل کر دیا؟“ میں وہاں زکنا نہیں چاہتا تھا لیکن راؤ ظفر میڈیا کے سامنے سینہ پھیلانے ہوئے تصویریں بنوا رہا تھا۔ میڈیا والوں نے مجھے گھیر لیا تھا۔ ہر کوئی یہی پوچھنا چاہتا تھا کہ میں نے روشن مسلمی قتل کیوں کیا؟ میں اس کے جواب میں خاموش تھا۔ راؤ ظفر تاڑ گیا کہ میں میڈیا سے کوئی سوال جواب نہیں کرنا چاہتا۔ اُس کا فوٹو سیشن والا مقصد بھی پورا ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ مجھے لیکر اندر کی طرف چل دیا۔ تھانے کے اندر ایک طرف حوالات تھی۔ وہ مجھے سیدھا اس طرف لے گیا۔ ایک ماتحت تیزی سے دروازہ کھول چکا تھا

۔ اس نے کوئی بات کئے بنا مجھے اندر دھکیل دیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ مقفل کر دیا گیا۔ راؤ ظفر نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تھا۔ اس کی نیت میرے سامنے کھل گئی تھی۔ وہ مجھے تھانے تک لے آیا تھا۔ آگے کیا ہوتا تھا، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

میں حوالات کی دیوار کے ساتھ فیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ حوالات میں موجود کچھ لوگوں نے میری طرف دیکھا، میں ان کے لئے الجھتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک مجھے دیکھتے رہے پھر مجھ سے کوئی بات کئے بنا اپنی دنیا میں گمن ہو گئے تھے۔ میں اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ یہ سازش ہوئی ہے۔ لیکن ایسا کون کر رہا ہوگا؟ روشن مسلمی کو کس نے مارا؟ مجھ پر ہی یہ ”مدعا“ کیوں ڈالا جا رہا ہے؟ مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میرے دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ میں خود کو پرسکون رکھتے ہوئے محل سے سوچنے لگا۔

میں دو ہفتے قبل یونیورسٹی سے فائنل امتحان دے کر واپس اپنے گاؤں آ گیا تھا۔ میں ہر ماہ چند دن کے لئے گاؤں آتا اور پھر واپس لاہور چلا جاتا تھا۔ مجھے گاؤں یا علاقے کے حالات بارے اتنی خبر نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ایک برس کے لگ بھگ اپنے قریبی شہر کے کالج میں پڑھا، پھر جموں ذکر پچھلے چھ برس سے لاہور میں رہ رہا تھا۔ چار برس کالج میں تعلیم پائی اور پھر اگلے دو برس یونیورسٹی میں گزر گئے تھے۔ اس لئے اپنے علاقے کے بارے میں اتنا نہیں جانتا تھا۔

میں نے بہت غور کیا، کالج اور یونیورسٹی میں میری کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی۔ بلکہ چند دوستوں کا حلقہ تھا، جن کے ساتھ بہت مزے کا وقت گزرا تھا۔ کالج کے دوست بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کے ساتھ میں کسی بھی منفی قسم کی سرگرمی میں بھی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ پھر یونیورسٹی میں آ گیا۔ یہاں نئی دوستیاں بن گئیں۔ لاہور میں میرا یہی معمول تھا کہ میں صبح جلدی اٹھتا اور جامنگ کے لئے نکل جاتا۔ سحر خیزی کی عادت مجھے بچپن ہی سے تھی۔ اس عادت کا تختہ مجھے میرے دادا جی نے دیا تھا۔ صبح صبح نہر کنارے جامنگ کا جو لطف ہوتا تھا، وہ صرف میں ہی جانتا تھا۔ موسم جیسا بھی ہوتا میرے معمول میں فرق نہیں آیا تھا۔ بھرپور



جامنگ کے بعد واپس آکر کلاس لینے کے لئے تیاری کرتا اور ڈیپارٹمنٹ چلا جاتا۔ وہیں سارے دوست جمع ہو جاتے۔ کھانا پینا ہلاکلا چلتا رہتا تھا۔ چونکہ میں سیاسیات کا طالب علم تھا، اس لئے بڑی زوروں کا بحث و مباحثہ چلتا رہتا۔ کبھی اپنے اساتذہ کے ساتھ اور کبھی ساتھیوں کے ساتھ۔ دوپہر کے بعد میں تھوڑا آرام کرتا اور پھر کلب نکل جاتا۔ جہاں میری دلچسپیاں تھیں جم، شوٹنگ اور فاسٹ۔ میں نے انہی تین دلچسپیوں کو پوری طرح اپنانے رکھا تھا۔ میں نے جم میں اپنا بدن بنانے کی طرف بھرپور توجہ دی تھی۔ دراصل میرے اس شوق کے پیچھے بھی میرے دادا جی کی خواہش تھی۔ وہ بچپن میں مجھے پہلوان بنانا چاہتے تھے۔ وہ مجھے بدنی طور پر بہت مضبوط بنانا چاہتے تھے۔ لیکن میرے بابا ان کے اس شوق کے آڑے آ گئے۔ وہ مجھے ذہنی طور پر مضبوط دیکھنا چاہتے تھے۔ تاکہ میں پڑھ لکھ کر کوئی سی ایس پی آفیسر بنوں۔ میں دادا کی محبت اور بابا کی نگرانی میں پروان چڑھتا گیا۔ میں شروع ہی سے کھانے پینے کا شوقین تھا۔ میرا تھکا تھکا اچھا لگتا تھا۔ میں سونا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ یہاں لاہور میں جم کی سہولت میری آئی تو میں نے فوراً جم جوائین کر لیا۔ وہاں میں خوب محنت کرتا۔ جیسے جیسے میرا جسم بنتا گیا میں زیادہ شوق سے محنت کرنے لگا۔ دوسرا شوٹنگ کلب میں بہت محنت کے بعد میں اچھا نشانے باز بن گیا تھا۔ وہاں ہر طرح کا ہتھیار چلانے کی تربیت دی گئی، ہتھم میں پھل کے معاملے میں کافی مہارت لے چکا تھا۔ اس پر میں نے کئی انعام بھی جیتے تھے۔ تیسرا میں نے لڑنے اور اپنا دفاع کرنے کی تربیت بھی لیتا رہا تھا۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود میرا کبھی کسی کے ساتھ جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ہمیشہ مجھے ایک اچھا سا بھائی ہی تصور کیا جاتا تھا۔ میری ان سرگرمیوں کے پیچھے میرے دادا جی کی خواہش تھی، جس سے میں بھی لطف اندوز ہوتا تھا۔ میری یہ دلچسپیاں یونیورسٹی دوستوں سے ہٹ کر تھیں۔ کلاس فیلوز سے چھوٹی موٹی ناراضگیاں، ہلکے پھلکے جھگڑے یا تھوڑا بہت غصہ تو چلتا ہی رہتا تھا۔ میرا نہیں خیال کہ یونیورسٹی کے ان دو برسوں میں کسی بھی شخص سے میرا کوئی معاملہ اس حد تک بڑھ گیا ہو کہ وہ دشمنی تک جا پہنچا ہو۔ بلکہ وہ میرا بہت خوبصورت دور رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ دشمنی کے لئے تین بنیادیں ہوتی ہیں، زر، زن اور زمین۔ زر کی مجھے کوئی ہوس نہیں تھی۔ میں اپنے والدین کا اکھوتا بیٹا تھا۔ میرے اخراجات سے زیادہ زر میرے اکاؤنٹ میں ہر وقت رہتا تھا۔ کوئی زن ابھی تک میری زندگی میں نہیں آئی تھی جو دو تازہ عذقی نہ یونیورسٹی جانے سے پہلے اور نہ یونیورسٹی میں۔ ہاں زمین کا معاملہ ایسا تھا جس پر سوچا جاسکتا تھا۔

میرے بابا دو بھائی تھے۔ ان کا ایک چھوٹا بھائی چوہدری نذیر احمد تھا۔ جب تک وہ زندہ رہے، انہوں نے اپنے بڑے بھائی کی تابعداری کی۔ جو فیصلہ بھی بابا کر دیتے وہ اس پر عمل کرتے تھے۔ دونوں میں بڑی محبت تھی۔ ایک دوسرے کا مان رکھتے تھے۔ دادا نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جائداد بڑے احسن انداز میں انہیں بانٹ دی تھی۔ جس پر دونوں ہی خوش تھے۔ ایک برس قبل ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بہت پہلے ہی بابا نے انہیں گاؤں ہی میں ایک الگ حویلی بنا کر دے دی تھی۔ وہ وہیں رہتے تھے۔ جس طرح دو خاندانوں میں تعلق ہوتا ہے ویسا ہی چلتا رہا تھا۔ چاچا نذیر احمد کے انتقال کے بعد نجانے کیوں وہ پہلے والی بات نہیں رہی تھی۔ مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا کہ میرا چاچا زادا کبر علی، میرے بابا سے ناراض اور تالاں رہتا ہے۔ چونکہ کسی نے مجھ سے بھی بات نہیں کی تھی اس لئے میں نے بھی کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ہماری چاچا زاد بیہن حلیمہ سب سے بڑی تھیں، وہ اپنی سسرال میں خوش تھی۔ اکبر اور امفر کی بھی شادیاں چاچا نذیر کی زندگی ہی میں ہو چکی تھیں۔ ہمارے دونوں خاندانوں میں زمین کا بھی کوئی تنازعہ نہیں تھا۔ اس لئے وہ میرے خلاف سازش کیوں کریں گے۔

سوال یہ تھا کہ اگر یہ دونوں آپشن نہیں تھے تو پھر تیسرا کون تھا جو مجھے چھپانے کے لئے اس حد تک چلا گیا تھا کہ مجھ پر کٹ ڈال کر مجھے قاتل ثابت کر دے؟ میں چکر کر رہ گیا تھا۔ مجھے حوالات میں بیٹھے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت ہو گیا تھا۔ میں یہی سوچتے ہوئے پریشان ہو گیا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ بھی میرے سامنے ایک ادھیڑ عمر بندے نے مجھ سے پوچھا

”اوپا، کس جرم میں آیا ہے؟“



”میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کسی نے الزام لگا دیا ہے۔“  
 ”میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا  
 ”تو پھر پریشان کیوں ہو رہا ہے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا

”میں تو پریشان نہیں ہوں۔“ میں نے تیزی سے کہا  
 ”تیرے چہرے پر بارہ کیا، چندرہ سولہ بج رہے ہیں۔ تم حواس باختہ لگ رہے ہو۔ اتنا سوہنا ٹھنڈا صبح اور یوں چڑی جتنا دل، میں تو یہی دیکھ رہا ہوں۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا تو میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ وہ بدقوق سا ادھیڑ عمر تھا۔ اس کی شیوہ بڑی ہوئی تھی۔ پہلی ہی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں اور مونے لیوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ جب مجھے بھی احساس ہوا کہ شاید میں ایسا ہی ہو رہا ہوں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا

”یاریہ جو اچانک افتاد پڑی ہے میں اس پر سوچ.....“  
 ”افتاد اچانک ہی پڑی ہے میرا سوہنا۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا پھر بولا، ”اس کے بعد دو راستے ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ ظلم سہہ جاؤ، برداشت کرو یا پھر کسی بھی طرح اس کا مقابلہ کرو۔ اب مجھے نہیں پتہ تم کیا کرو گے۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنا فلسفہ جھاڑا جو مجھے ذرا بھی پسند نہیں آیا تھا۔ تاہم اس کی پہلی بات ٹھیک تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کہتا، ایک پولیس والا حوالات کا دروازہ کھولنے لگا۔ وہ کھول چکا تو اس نے مجھے باہر آنے کو کہا۔ میں اٹھ کر باہر چل دیا۔ باہر چند پولیس والے کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے زرخے میں لیا اور تھانے کے اندر ہی ایک جانب چل پڑے۔

وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ جو کافی حد تک نیم تاریک تھا۔ وہ پولیس والے میرے پیچھے کھڑے تھے۔ جس سے روشنی مزید کم ہوگئی۔ کمرے کے بالکل درمیان میں ایک میز کے پیچھے کرسی پڑی ہوئی تھی، جس پر ایک موٹا سا اے ایس آئی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر اپنی مولیٰ سی بھدی آواز میں پوچھا  
 ”کیوں کیا تم نے روشن مسئلہ کا قتل؟“

”میں کیوں کروں گا اس کا قتل، میں نے تو اسے بچانے.....“ میں نے کہا چاہا کہ اچانک مجھے اپنے گردن پر زوردار دھماکہ محسوس ہوا، اس کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے

تارے ناچنے لگے۔ اگر میں نے تربیت نہ لی ہوتی تو شاید میں اس ضرب سے بے ہوش ہو چکا ہوتا۔ مجھے سنبھلنے کے لئے چند لمحوں کے تھے۔ میں نے انتہائی غصے میں محسوس کر دیکھا چاہا۔ اسی لمحے کئی سارے تھپڑوں کی بارش ہوگئی۔ میرے حواس ٹھل ہو گئے۔ مجھے کچھ بھی سدھ بدھ نہیں رہی۔ اسی دوران اس مونے اے ایس آئی نے پوچھا  
 ”اب بولو کہ تم نے قتل کیوں کیا۔“

”یہ کیا بے غیرتی کر رہے ہو تم لوگ، مجھے بات.....“ میں نے شدید غصے میں کہا چاہتا تھا کہ پھر سے پھنڑوں اور گھونٹوں کی بارش شروع ہوگئی۔ میں اسی لمحے سمجھ گیا کہ وہ تفتیش کم اور مجھے ذلیل زیادہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے جج کر کہا، ”ہاؤ آ جاؤ تم سب۔“

”قتل کی وجہ بتا دو، کچھ نہیں کہیں گے۔“ مونے اے ایس آئی نے طنزیہ لہجے میں کہا تو میں نے کہا  
 ”راؤ ظفر کہاں ہے، اسے بلاؤ۔“

”وہ اب نہیں آنے والا، اس کا کام ختم ہو گیا ہے۔“ وہ سکون سے بولا

”کیا مطلب.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا تو بجائے جواب دینے کے پھر سے وہی تھپڑ اور گھونٹنے پڑنے لگے۔ میرے دماغ کی لیس پھٹنے لگی تھیں۔ مجھے دکھ ہونے کے ساتھ اپنی بے بسی کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ میرا سر، گردن اور چہرہ تکلیف، درد اور جلن سے جلنے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ رک گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا چاہ رہے ہیں۔ ”دیکھو اگر قتل کا اقرار نہیں کرو گے تو ہمارے پاس تشدد کے بڑے طریقے ہیں، ابھی تمہیں ”غنی“ لگا سکتے ہیں، رول بھی پھیر سکتے ہیں، اسی لئے بہتری اسی میں ہے کہ مان جاؤ۔“ وہ موٹا اے ایس آئی مان ہی نہیں رہا تھا۔ اس کے سننے پر اس کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی، جس پر اس کا نام اسلم لکھا ہوا تھا۔ میں نے اسی لمحے کوئی بھی جواب نہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ چند لمحوں کے بعد دھماکے سے ہونے بولا، ”لگتا ہے تم یوں نہیں مانو گے۔“

”سر جی پھر لگا دیں جی؟“ ایک ماتحت نے پوچھا  
 ”اس کے ساتھ یہ سارا کچھ ہی کرنا پڑے گا۔ بس مجھے ریٹائرڈ لے آنے دے اس کا۔“ مونے اسلم نے حقارت سے کہا پھر لمحہ بھر سوچ کر بولا، ”لے جاؤ اسے اور ڈال دو



حوالات میں، ریمائنڈ کے بعد تو یہ طوطے کی طرح بولے گا۔“

جیسے ہی اس نے کہا، دو ہاتھوں نے انتہائی حقارت سے مجھے دھکے دینے شروع کر دیئے۔ میں گرتے گرتے بچا تھا۔ اس دوران ایک نے میری گدی پر ہاتھ مارا۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ یہ دو ہجمات تھے جب میرا دل چاہا کہ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا، پہلے انہیں تو سبق سکھا دوں۔ لیکن اگلے ہی لمحے مجھے میرے تپے ہوئے دماغ میں یہ بات آگئی کہ وہ تو چاہتے ہی یہی ہیں۔ میں بھڑک کر ان کے گلے پر ڈون تو بات کا بٹکڑ بنادیں۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ میرا دماغ بہت تپ گیا تھا۔ اگر وہ تھوڑی دیر مزید یوگی چٹک آمیز رویہ رکھتے تو شاید میں خود پر قابو نہ رکھ سکتا۔ مجھے کمرے سے باہر لا کر دوبارہ حوالات میں ڈال دیا گیا۔ میں وہاں دیوار کے ساتھ جا کر بیٹھا ہی تھا کہ اسی ادھیڑ عمر شخص نے بہت غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا

”گلتا ہے وہ تجھے ذلیل کرنا چاہتا ہے۔“

اس کی اس بات نے اگرچہ جلتی پر نکل ڈالا تھا، ایک دم سے میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ شدید غصے کی لہر سے میں اپنے اعصاب پر قابو چھوڑ دیتا لیکن میں یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ اس کا جو اندازہ تھا، اس کی داد دینا چاہیے تھی۔ اس لئے میں نے پوچھا

”یہ تمہیں کیسے پتہ چلا؟“

”تجربہ..... یہ میرا تجربہ ہے جو ان۔ یہ پولیس، حوالات، عدالتیں، کچھریاں، جیل یہ سب دیکھی بھالی ہیں۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے، یہ سب پتہ ہے۔ یہ جو قانون کا فکڑ ڈالا جاتا ہے نا، یہ بڑا ظالم ہوتا ہے۔“

”مطلب اب تم خود کو مظلوم ثابت کرو گے؟“ میں نے طنز یہ پوچھا

”نہیں، میں مظلوم نہیں ہوں مگر ظالم بھی نہیں، حالات مجھے یہاں تک لے آئیں ہیں۔ مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ خیر تم ایک بات یاد رکھنا، خود پر قابو رکھنا۔ یہ جو قانون کا فکڑ ہے نا، اسے توڑنا بہت مشکل ہے۔“ اس نے یوں کہا جیسے خود کلامی کر رہا ہوں۔ میں اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس بنیاد پر یہ سب کہہ رہا

تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ دوسرے لوگ ہماری باتوں سے بے نیاز لینے ہوئے تھے۔ جیسے انہیں ہم سے کوئی غرض نہ ہو۔ وہ ادھیڑ عمر بھاپ گیا تھا کہ میں اب اس سے بات نہیں کرنا چاہتا، سو وہ بھی منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ مجھے حوالات میں آئے چار پانچ گھنٹے ہوئے گئے تھے۔ لیکن ابھی تک باپا یا ان کی طرف سے کوئی ہندہ نہ تھی۔ آیا تھا۔ مجھے اس پر تھوڑی تشویش بھی ہونے لگی تھی۔ معاملہ اگر سمجھ میں آ جاتا تو اس کا حل نکالا جاسکتا تھا لیکن ایک بات ہی سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی، اس کے بارے میں کیا کہا جاسکتا تھا۔ میری ابھن مزید بڑھنے لگی تھی۔

شام ہونے کے بعد حوالات کی سلاخوں کے پار مجھے اپنے گھر کی ملازم اللہ بخش کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں نفن اور مکمل پکڑا ہوا تھا۔ میں اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ اس نے سلام کرتے ہی کہا

”میاں صاحب بڑے پریشان ہیں۔ انہوں نے آپ کے لئے یہی پیغام دیا ہے کہ بہت صبر اور تحمل سے یہ وقت گزارنا ہے۔ دشمنوں نے بڑا کاری وکاری ہے۔“

”وہ دشمن کون ہے؟“ میں نے دانت پیستے ہوئے تیزی سے پوچھا تو وہ بے چارہ دبے ہوئے لہجہ میں بولا

”ابھی سارے اندازے ہیں۔ میاں صاحب کے پاس حویلی میں بہت سارے لوگ پہنچ گئے ہیں۔ کبھی کوش کر رہے ہیں۔ بہت سارے لوگوں سے رابطہ بھی ہو گیا ہے۔ کبھی کا خیال ہے کہ یہ سیاسی دشمنی ہے۔“

”سیاسی دشمنی، تو ظاہر ہے یہ.....“ میں نے کہا تو اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا

”معاملہ اس سے بھی آگے کا ہے۔ وکیل سے بات ہو گئی ہے۔ وہ سب مل کر کوشش کر رہے ہیں۔ آپ یہ کھانا کھالیں اور میاں صاحب کی بات کو اچھی سمجھ لیں۔“

”میں سمجھ گیا۔ بابا سے کہنا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دی تو وہ سر ہلانے لگا۔ اتنے میں ایک پولیس والے نے حوالات کا دروازہ کھولا اور نفن مجھے دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پانی کی دو بوتلیں بھی دے دیں۔ اس نے ساتھ لایا ہوا مکمل بھی دے دیا۔ ظاہر ہے اب مجھے یہ رات یہاں گزارنی تھی۔ اللہ بخش واپس چلا گیا تو میں نے نفن کھولا، میرے



اور اٹھ کر حوالات سے باہر آ گیا۔

میں پھر سے اسی کمرے میں تھا۔ اسی طرح کئی پولیس والے وہاں موجود تھے۔ سامنے کرسی پر وہی موٹا اسلم اے ایس آئی موجود تھا۔ اس بار اگر تھوڑی جلد ہی کسی تو صرف یہ کہ ایک کرسی مزید رکھی ہوئی تھی۔ مجھے اس پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک میلا سا پیالہ میرے سامنے رکھ دیا۔

”یہ دودھ جلیسیاں تیرے لئے ہیں، سردی زیادہ ہے نا، پی لو۔“ اسلم اے ایس آئی نے طنز پر لہجے میں کہا  
”مجھے نہیں پتا۔“ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا  
”پی لو یار، ابھی تجھے کافی ٹھنڈ میں رہنا ہے، تمہارا جسم گرم رہے گا۔“ اس نے کہا اور تھوڑے لگا کر فیس دیا۔ ابھی میں نے سنجیدگی سے کہا  
”دیکھو اسلم، میں نہیں جانتا کہ تم یہ سب کیوں کر رہے ہو، لیکن جو بھی کر رہے ہو، بہت غلط کر رہے ہو۔“

”تم بھی سنو، تمہیں ذلیل کرنے کے، تم پر ہر طرح کا تشدد کرنے کے مجھے نوٹ ملے ہیں۔ کافی سارے نوٹ۔ جتنی میری ایک برس کی خواہ بھی نہیں ہوگی۔ اسی لئے مجھے اس قتل کیس کا تفتیشی بھی لگایا گیا ہے۔ میں نے کل اس کیس کی سی مل کیس صاحب کو پیش کرنی ہے کہ سو فیصد قاتل تم ہی ہو۔“

”کس نے دی ہے تمہیں یہ رشوت؟“ میں نے سختی سے پوچھا

”انہوں نے جن کا تم نے قتل کیا ہے۔“ اس نے حقارت سے کہا پھر لحد بھر ٹھہر کر بولا، ”تمہارا باپ یوں تو بڑا امیر بنتا ہے، لیکن اپنے بیٹے کے لئے ایک دھیلا بھی نہیں خرچ نہیں کر رہا۔ اوپر تک لوگوں سے رابطے کر رہا ہے۔ کیا اسے نہیں پتا پانی انہی پولوں کے نیچے سے گزرتا ہے۔ وہ ایم پی اے، جسے تیرے باپ نے اس بار جتوایا، اس نے کیا کیا ہے، تمہانے کارخ نہیں کیا اس نے۔ تیرا باپ کروالے سفارش جتنی کروانی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کیا کر لیتا ہے وہ سالار۔“ اس نے اپنی رو میں میرے باپ کو گالی دے دی تھی

مجھے سے برداشت نہیں ہو سکا۔ میں نے سامنے دھرا پیالہ اٹھایا اور اس کے منہ پر مار دیا۔ شاید وہ میرے اس رد عمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنا منہ صاف کر کے پیچھے ہٹا اور

سامنے وہ ادھیڑ عمر لیٹا ہوا تھا میں نے اسے کھانے کی دعوت دی۔ وہ بنا ہاتھ دھوئے میرے سامنے آ بیٹھا۔ میں نے پہلا لقمہ منہ میں ڈالا تو دل بھر آیا۔ میں اپنی ماں کے ہاتھ کا ڈالنے کیسے بھول سکتا تھا۔ یہ نہیں ان کا کیا حال ہوگا۔

”اوائے کھا کھانا، اتنا نہیں سوچتے۔ رزق سامنے ہو تو اس کی قدر کرتے ہیں بعد میں سوچ لیتا۔“ اس ادھیڑ عمر نے کہا تو میں کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا

رات کا اندھیرا ہر جانب پھیل چکا تھا مگر کوئی دکیل ابھی تک مجھے ملنے نہیں آیا تھا۔ اس کے علاوہ نہ کوئی شہر سے مجھے ملنے آیا تھا اور نہ کوئی گاؤں سے۔ لیکن مجھے اب تشویش نہیں تھی۔ مجھ تک بابا کا پیغام پہنچ گیا تھا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں۔ ان کا ہر لمحہ اسی کوشش میں ہوگا کہ میں جلد از جلد اس مشکل سے نکل آؤں۔ پریشانی والی بات یہ تھی کہ ایسا ہو کیوں رہا تھا اور اب تک یہ معاملہ حل کیوں نہیں ہو پا رہا تھا۔

میں مبل لے کر دیوار کے ساتھ لیٹ گیا تھا۔ آدھا کبل میں نے نیچے بچھا یا اور آدھا اوپر لے لیا۔ مجھے نیند تو نہیں آ رہی تھی۔ یہ دکھ تو بہت پیچھے رہ گیا تھا کہ مجھ پر قتل کیوں ڈالا جا رہا ہے، مجھے اپنی بے عزتی اور جھک پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ انھوں اور ان سب کو چیر بھاڑ کر رکھ دوں۔ لیکن میں صرف سوچ ہی سکا تھا، عملی طور پر کچھ نہیں کر سکا۔ میں سونے کی کوشش میں تھا مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرا دماغ جھک کے احساس سے شل ہو چکا تھا۔ اسی کیفیت میں نجانے کتنا وقت گزرا تھا۔ ایسے میں حوالات کا گیٹ چرچایا، اس کے ساتھ ہی کسی نے پکا

را  
”اُعلیٰ احسن اٹھ۔“

میں نے مبل منہ سے ہٹایا تو حوالات کے باہر ایک پولیس والا کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا

”ہاں کیا بات ہے؟“

”اٹھ کر باہر آ، صاحب بلا رہے ہیں۔“ اس نے حقارت آمیز لہجے میں کہا تو مجھے لگا یہ بلاوا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ بہر حال مجھے جانا تھا۔ میں نے مبل ایک طرف ہٹایا



ہستے ہوئے بولا

”یہ ہوئی ناپات۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے ماتحتوں سے کہا، ”لو بھئی میں کپڑے تبدیل کر آؤں، تم ذرا اسے باہر ٹھنڈ میں کھڑا کر کے گرم کرو۔“

یہ کہتے ہی وہ باہر نکل گیا۔ تبھی وہ سارے مجھ پر پل پڑے۔ مجھے یہ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ کون میرے پھپھر مار رہا ہے، کون کے رسید کر رہا ہے، کون دھکے دے رہا ہے۔ ٹھوڑی دیر بعد میں بے بس ہو گیا۔ انہوں نے مجھے ٹھنڈے فرش پر لٹا لیا۔ پہلے میری جرسی اتاری، پھر میری قمیص اتارنے لگے، آخر میں میری پتلون بھی اتار دی۔ میرے بدن پر ایک انڈر ویئر اور بنیان رہ گئی۔ میرے پیروں سے جرابوں سمیت جوتے بھی اتار لئے تھے۔ انہوں نے مجھے فرش سے اٹھا کر باہر کی جانب دھکیلا اور باہر کھلے میں لے گئے۔

”ہیمن کھڑا رہ۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔ اتنی دیر میں ایک پولیس والے نے پانی کا بھرا ہوا جگ مجھ پر انڈیل دیا۔ سردی کی لہریوں میں میرے بدن میں پھسکی جیسے کوئی مجھے جھری سے کاٹ رہا ہو۔ میں کپکپا کر رہ گیا۔ چند منٹ بعد ہی میرے اعصاب اٹھنا شروع ہو گئے۔ میں خود پر جتنا قابو پاتا، میرا بدن اتنا ہی بے قابو ہو رہا تھا، مجھے لگا جیسے میں چند منٹ مزید یونہی رہا تو میں اپنے حواس کھو بیٹھوں گا۔ میں باہر کھلے میں کھڑا تھا۔ وہ پولیس والے اندر کمرے میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ہنر دھرا ہوا تھا۔ ان سب کی نگاہیں مجھ پر تھیں اور میں دھیرے دھیرے توانائی کھور ہا تھا۔ میں اپنے آپ سے لڑ رہا تھا لیکن وہ پولیس والے جو میرے بارے میں غلیظ زبان استعمال کر رہے تھے وہ میری برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ گالی تو جیسے معمولی بات تھی، وہ نجانے کیسی کسی باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ میں دوہری اذیت سے دو چار تھا۔ میں اندر سے تپ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ بعد میں جو مرضی ہو جائے، ان سب کو تو ٹھکانے لگا دوں۔ میں سوچ رہا تھا، کڑھ رہا تھا اور خود پر قابو پار ہا تھا۔ مگر میں کچھ نہیں پار ہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں ایسے ہی کھڑا رہا تھا۔ بھی ایک پولیس والا اٹھا اور اس نے مجھ پر مزید پانی پھینک دیا۔ یہ ٹھوڑا سا پانی مجھے یوں لگا جیسے کسی نے برف کی سل سے مجھے مارا ہو۔ اس قدر اذیت

ہوئی کہ میرا بدن سن ہو گیا۔ مجھے احساس ہونے ہوا جیسے میری سوچے سمجھنے کی صلاحیت بھی ختم ہو رہی ہے۔ شاید میرے اندر برداشت بھی جو ابھی تک یوں کھڑا تھا۔ ورنہ میرا بدن برف ہو رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ مجھے دیکھتے رہے۔ میں نے کچھ ماتحتوں کی آنکھوں میں حیرت بھی دیکھی تھی۔ شاید انہیں یقین نہیں تھا کہ میں اتنا سخت جاں بھی ہو سکتا ہوں۔ ٹھوڑی دیر مزید گزری تھی کہ ایک اٹھا اور اس نے پھر سے پانی سے بھرا ہوا جگ مجھ پر انڈیل دیا۔ میری قوت مدافعت جواب دینے لگی۔ میں خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش لیکن کچھ ہی دیر بعد میں اپنے حواس کھو بیٹھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیر چھا گیا۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا میں کب فرش پر گر گیا۔

میرا آنکھ کھلی تو میں حوالات میں پڑا ہوا تھا۔ میرے اوپر کبل تھا۔ میرا بدن اسی طرح اکڑا ہوا کانپ رہا تھا۔ میری حالت بری ہو رہی تھی۔ میں نے پہلو ہلانا چاہا تو مجھے آواز سنائی دی۔

”شکر ہے تم ہوش میں آئے۔“

میں آواز پہچان گیا تھا۔ یہ وہی مدقوق ادھیڑ عمر تھا۔ اس نے میرے منہ سے کبل ہٹایا تو اس کا چہرہ مجھے دکھائی دیا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے کہا تو میری آواز لرز رہی تھی۔

”اللہ کرے تم ٹھیک رہو۔ تمہاری کا نپتی ہوئی آواز مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔ خیر اس وقت میں کچھ اور تو نہیں کر سکتا، ایک گولی دے سکتا ہوں۔ یہ لو۔“ اس نے جیب سے پین ٹکر گولیاں نکال کر کہا۔ میں نے اس کی پتلی پر سے وہ ٹیبلٹ لیں اور پانی کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ میرا بدن اکڑ گیا ہے۔ درد کی شدید لہر اٹھی تھی۔ بہت مشکل سے میں نے پانی لیا اور دو گولیاں پھانک گیا۔ میں پھر سے لیٹ گیا تو میری آنکھ لگ گئی۔

دوبارہ جب آنکھ کھلی تو مجھ معمولی سا پسینہ آیا ہوا تھا۔ شاید یہ ان پین ٹکر کا نتیجہ تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس ادھیڑ عمر کا شکر یہ ادا کیا۔ مگر میرے اندر ویسی دھبی آگ سلگنے لگی تھی۔ اسلم اے ایس آئی نے اچھا نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس سے کچھ اچھا کی توقع تھی۔ اس کا خیال آتے ہی میرا دماغ سلگنے لگا تھا۔ مجھے اپنی جسمانی اذیت کا اتنا دکھ نہیں تھا



، جتنا ذہنی اذیت مجھے پاگل کر رہی تھی۔ یہ ایسی اذیت تھی جس نے میری سوچوں کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔

”لو بھئی جوان، یہ چائے پیو۔“ ادھیڑ عمر نے چائے کا ایک گگ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ عام حالات میں ایسا کپ میں دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا، لیکن اس وقت چائے کی شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ میں نے وہ کپ پکڑتے ہوئے پوچھا

”اتنی صبح یہ چائے کہاں سے آگئی؟“

”باہر ہوئی سے ایک چھوٹا آتا ہے، وہ دے جاتا ہے۔“ اس نے سکون سے کہتے ہوئے زور سے چسکی لی۔ میں نے بھی سب لیا تو مجھے یوں لگا جیسے جو شانہ خلق میں اتار لیا ہو۔ اس وقت وہ جو شانہ بھی غیبت تھا۔ میں نے چند گھنٹ میں کپ ختم کر لیا۔ میں کبل میں لپٹا رہتا جتنا تھا۔ سخت سردی کی اذیت نے میرا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ میرا ناک بند ہو رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا جیسے بخار ہو جائے گا۔ شاید میرے اندر کی قوت مدافعت مجھے بچائے ہوئے تھی۔ میں یہی سوچوں میں تھا کہ حوالا تے کے دروازے پر فہیم اکل عموادہ ہوئے۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی، جو ان کی شخصیت کا ایک حصہ تھی۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی دکھائی دیتے تھے۔ میں نے اٹھنا چاہا تو درد کی لہریں بدن میں پھیل گئیں۔ میں بڑی مشکل سے اٹھا اور ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ طلیک سلیک کے بعد انہوں نے کہا

”طلی بیٹا، ایک گھنٹہ پہلے تک ہم نے بھر پور کوشش کی لیکن معاملہ حل ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ بہت مستحکم اور اس کے گھر والے ہی غائب ہیں، اس کے ساتھ فیروز کا بھی پتہ نہیں۔ انہوں نے الف آئی آر درج کروائی ہے۔ اب بات کس سے کریں۔ کوئی بات کرنے والا ہی نہیں ہے۔“

”یہ پولیس والے بھی اس بات کو نہیں سمجھ رہے؟“ میں نے پوچھا تو وہ چند لمحے سوچتے رہے پھر افسردہ سے لہجے میں بولے

”دیکھو طلی بیٹا، تمہیں بڑے طریقے سے، بہت سوچ سمجھ کر اور بڑے پلان کے ساتھ پھنسا گیا ہے۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں رات سے جو جلی ہی میں تھا

، ابھی یہاں پہنچا ہوں۔ بہت سارے رابطے ہوئے ہیں۔ اوپر تک بہت سارے لوگوں سے بات ہوئی ہے۔ اس سے معاملہ تو حل نہیں ہوا لیکن یہ بات بہر حال سامنے آگئی ہے کہ کوئی ایسی طاقت ہے جو ہمیں ان حالات میں لے آئی ہے۔ یہ نیکفرم ہے کہ سازش ہوئی لیکن کن لوگوں نے کی، کون لوگ اس میں شامل ہیں، اس کا پتہ لگنا ہے۔“

”انکل اگر یہ سیاسی معاملہ ہے تو.....“ میں کہتے کہتے رک گیا

”بالکل ایسا ممکن ہے۔ سیاسی مخالفین بھی ایسا کر سکتے ہیں لیکن اس قدر منظم انداز میں سازش کرنے والا عقل سوچ تو رکھتا ہے نا۔“ انہوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا پھر سانس لے کر بولے، ”یہ بھی ضروری نہیں کہ کوئی سیاسی مخالف ہو، تم کون سیاست میں ہو۔“

”وہ انیم لی اے چوہدری سردار وہ بھی کوئی مدد نہیں کر رہا؟“ میں نے کسی خیال کے تحت انکل فہیم سے پوچھا ”تمہیں تو پتہ ہے وہ اس بار اپوزیشن میں ہے، تھانے میں کیا اس کی کہیں بھی نہیں چلتی۔ اس کی مدد لی تو ممکن ہے یہ معاملہ سیاسی ہو جائے۔ اسی لئے یہاں مقامی طور پر کسی کو کہا نہیں۔ کہیں یہ معاملہ سیاسی مخالفین کے ہتھے نہ چڑھ جائے اور معاملہ کچھ کا کچھ ہو جائے۔“ انہوں نے بے بسی سے کہا

”تو پھر یہ معاملہ کیسے حل ہوگا؟“ میں نے پوچھا ”ظاہر ہے جب تک مدعی پارٹی سامنے نہیں آجاتی، ان سے بات نہیں ہوتی، پولیس بھی قانونی طور پر کچھ نہیں کر سکتی۔“ انہوں نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا

”اب کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا ”دیکھو، یہ رات تم نے یہاں حوالا تے میں گزار لی۔ انہوں نے تمہاری گرفتاری ڈال دی ہے۔ اب وہ تمہیں جج صاحب کے سامنے پیش کر کے ریمانڈ لینے کی کوشش کریں گے، اگر صورت حال یہی رہی تو وہ ریمانڈ لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“ یہی کہتے ہوئے وہ پھر سے افسردہ ہو گئے۔

”یہ ایسی بے بسی کیوں ہے؟“ میں نے اکتاتے ہوئے پوچھا

”اصل میں یہ ایک قانونی پر اس ہے۔ مدعی مل

جائیں تو یہاں بیٹھ کر کچھ بھی ملے ہو جائے۔ اب تمہیں جج صاحب کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ وہیں پرانے بڈی لوگوں سے ملاقات ہوگی۔ اب تو ریماڈ ہی ہوگا۔“ انہیں نے افسردگی سے کہا

”اس طرح تو میری ضمانت.....“ میں نے پوچھنا چاہا ”ریماڈ ختم ہونے کے بعد ہوگی ضمانت۔ کیونکہ جج نے تو وہی دیکھا ہے نا جو پولیس نے پیش کیا ہوگا۔“ انکل فہیم نے سمجھاتے ہوئے کہا

”سرکار میں ایک بات کہوں اگر اجازت ہو تو؟“ میرے ساتھ وہی اڈیٹر عمر حوالاتی نے اونچی آواز میں کہا تو انکل فہیم نے اس کی طرف دیکھا، پھر اشارے سے اسے پاس بلایا۔ وہ اٹھ کر سلاخوں کے پاس آگیا۔

”بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟“ انہوں نے پوچھا ”آپ وکیل ہیں، ریماڈ کی دوسروں میں ہی ہیں، جسامنی ریماڈ اور جوڈیشل ریماڈ، ایسا ہی ہے نا۔“ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا تو انکل فہیم نے سوچتے ہوئے کہا ”ہاں ایسا ہی ہے۔ لیکن میرا نہیں خیال کہ اب وہ جسامنی ریماڈ لے سکیں گے کیونکہ جو صورت حال ہے اس میں جوڈیشل ہی ہوگا۔“

”میرے خیال میں وہ اس نوجوان کو ہر حال میں ریماڈ لینے کے بعد جیل بھیجنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔“ اس اڈیٹر عمر نے کہا تو انکل فہیم اس کی طرف غور سے دیکھنے لگے پھر سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا

”مطلب تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ ”آپ یہ کیوں نہیں سوچ رہے ہو کہ وہ اس نوجوان کو جیل ہی بھجوانا چاہتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ جیل میں ہی کیوں بھیجنا چاہتے ہیں؟“

”ہاں یہ بات سوچنے کی ہے۔“ انکل نے سر ہلاتے ہوئے کہا وہ اس اڈیٹر عمر کی بات کو پوری طرح سمجھ گئے تھے ”جس طرح شکار کو گھیر کر اپنے پسند کے میدان میں لایا جاتا ہے نا، وہ اسے بھی اپنے پسند کے میدان میں لے جانا چاہتے ہیں۔“ اڈیٹر عمر نے بتایا تو انکل فہیم نے تشویش سے پوچھا

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”کیونکہ جو رات گزر گئی ہے اور کل شام اس کے ساتھ جو ہوا اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو اس کے ساتھ ہوگا، وہ.....“ وہ کہہ رہا تھا کہ انکل فہیم ایک دم سے بے قرار ہو گئے۔ انہوں نے انتہائی تشویش سے پوچھا

”کیا انہوں نے تشدد کیا ہے تم پر؟“ ”میں اسے جسمانی تشدد کم اور ذہنی تشدد زیادہ کہوں گا۔“ میں نے انتہائی غصے میں ان کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو ان کا رنگ بدل گیا۔ وہ ایک لمحہ کو ساکت ہو گئے۔ پھر دھیمے سے بولے

”وہ تو کہہ رہے ہیں کہ ہم نے کچھ بھی نہیں کہا بلکہ..... خیر تم فکر مت کرو، میں کرتا ہوں کچھ۔“ وہ غصے میں آگئے تھے۔ وہ چند لمحے وہاں کھڑے رہے پھر مزید کوئی بات کہنے بنا وہاں سے ہٹ گئے۔ میں نے انہیں ایک دم سے بہت ہی پریشان ہوتے دیکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس وقت دوپہر ہو رہی تھی، جب مجھے پولیس وین سے اتار کر عدالت کی طرف لے جایا گیا تھا۔ عدالت کے باہر ہی بابا کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ گاؤں کے لوگ بھی تھے۔ بالکل سامنے انکل فہیم کھڑے تھے۔ انہوں نے ہی میری وکالت کرنا تھی۔ میں نے بابا کے چہرے پر دیکھا، وہ بہت زیادہ افسردہ دکھائی دے رہے تھے۔ شاید ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو یوں ہتھکڑیوں میں دیکھیں گے۔ میرے ساتھ اسلم اے ایس آئی تھا۔ میں بابا کے پاس جا کر رک گیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر رزاتی ہوئی آواز میں بولے

”علی، میں نے رات بہت کوشش کی تھی کہ.....“ ”بابا، کوئی بات نہیں یہ بھی ایک تجربہ سہی، مجھے پتہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ ابھی انکل ضمانت کروالیں گے۔“ میں نے انہیں تسلی دی جس پر ان کے چہرے پر ذرا سی بھی بشارت نہیں آئی۔ وہ دھیمی آواز میں بولے

”تمہیں بیٹا ذہنی طور پر تیار ہو، اندر فیصلہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ ”میں سمجھتا ہوں بابا۔“ یہ کہہ کر میں نے بابا کی آنکھوں میں دیکھا، پھر بڑی نرمی سے بولا، ”ایک بات کہوں بابا؟“ ”ہاں بولو۔“ وہ افسردگی سے بولے



”آپ میرا حوصلہ ہو۔ آپ مجھے یہ یقین دلا دیں کہ آپ کو کچھ نہیں ہوگا، باقی میں سب دیکھ لوں گا۔“ میں نے بھرپور لہجے میں کہا تو ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس بار وہ تھوڑا سا مسکرائے، پھر بولے

”مجھے خوشی ہوئی بیٹا، مجھے ایسا ہی باہمت بیٹا چاہئے۔ اب مجھے کچھ نہیں ہونے والا۔“

”اپنا خیال رکھئے گا یا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور عدالت کی طرف چل دیا۔ میں نے دیکھا عدالت کے اندر ایک طرف بھستو مسلئی اور فیروز کھڑے تھے۔ بھستو مسلئی مدعی تھا اور فیروز اس کا چشم دید گواہ۔ عدالتی کارروائی میں پولیس کو میرے بارے میں چودہ دن کا جوڈیشل ریمانڈ مل گیا۔ یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہوا تھا، ورنہ چودہ دن کا جسمانی ریمانڈ اگر دے دیا جاتا تو میرے ساتھ کیا ہوتا؟ وہ تشدد کر کے میرا جسم ادھیڑ دیتے۔

مجھے اپنے شہر سے سو کلومیٹر دور بہاول پور کی جیل جانا تھا۔ عدالت سے باہر آ کر میں بابا سے ملا، انہیں حوصلہ دیا۔ جب تک مجھے پولیس گاڑی میں بٹھایا گیا، اس وقت تک مجھے کچھ میڈیسن لا کر دے دی گئی۔ شام ہونے سے کچھ دیر پہلے میں جیل پہنچ گیا۔ ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد جب مجھے بیرک میں لے جایا گیا تو شام ہو چکی تھی۔ اس وقت مجھے ہلکا ہلکا بخار ہو رہا تھا۔ میں نے راستے میں ایک بار میڈیسن لے لیں تھیں۔ اب سکون سے کہیں بیٹھ کر مزید میڈیسن لینا بھی تاکہ ٹوٹنے ہوئے بدن کو سکون پہنچے۔

مجھے بیرک میں دھکیل کر سلاخوں والا گیٹ بند کر کے مقفل کر دیا گیا۔ میں نے لاشعوری طور پر بیرک میں موجود ہر بندے کو دیکھا۔ وہاں میں سے بچپن سے بندے ضرور تھے۔ کبھی میری طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی دوسری دنیا سے آیا ہوں۔ مجھے وہاں کھڑے ابھی چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ ایک طرف سے اونچی آواز میں کہا گیا ”یار بڑا سوہنا منڈا اے بھئی۔“

”اُوئے یہ تو اس جیسا ہے جسے ہم قیدیوں کی انٹر لیمنٹ کہتے تھے۔“ دوسرے کونے سے چمک آمیز آواز آئی۔

”اُوئے آ، میرے کھڑے پر آ، جی خوش کر دے میرا۔“ تیسرے کونے سے آواز آئی تو ایک دم سے تھمہ بلند ہو

گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ ان کی انہی باتوں سے انداز ہو رہا تھا کہ وہ کس قماش کے لوگ تھے۔ میں نے ہر طرف دیکھا، کہیں خالی جگہ مل جائے اور وہاں جا کر بیٹھ جاؤں۔ ایک طرف تھوڑی خالی جگہ تھی۔ میں اس جانب بڑھا ہی تھا کہ ایک بندے نے اپنا پاؤں آگے کر دیا۔ میں گرتے گرتے بچا۔ میں نے اس طرف توجہ نہیں دی، بلکہ اس کونے کی طرف چلا گیا۔ جیسے ہی میں بیٹھنے لگا تو ایک بندے نے زوردار آواز میں کہا

”اُوئے ادھر نہیں بیٹھنا۔“

”یار جگہ خالی ہے۔ بیٹھ جانے.....“ میں نے کہنا چاہا تھا کہ وہ بولا

”ہر کھڑے کی قیمت ہوتی ہے جانی، نوٹ لگا اور بیٹھ جا۔“

”اس وقت تو میرے پاس نہیں ہیں، دو چار دن میں بندوبست ہو جائے گا تو دے دوں گا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ ہنسنے ہوئے بولا

”تو دو چار دن بعد بیٹھ جانا۔ تب تک یونہی کھڑا رہ۔“

”اُوئے ادھر آ مجھے نچے دے، میرے پاس آ کر بیٹھ جا۔“ ایک طرف سے حریصانہ آواز ابھری تو ہر جانب قہقہہ لگ گیا۔ میرا دماغ بھنکا کر رہ گیا۔ یہ اس نے کس قسم کی واہیات بات کی تھی؟ میں نے خود پر قابو رکھا اور اس کونے کی جانب بڑھ گیا جو اس وقت خالی تھا۔ جیسے ہی میں بیٹھنے لگا، وہ بندہ اسپرنگ کی مانند اچھلا اور مجھے ایک جانب دھکا دے دیا۔ پھر ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے بولا

”تجھے میری بات سمجھ میں نہیں آئی۔“

”کہانا دے دوں گا پیسے۔“ میں نے کہا اور پھر وہیں بیٹھنے لگا تو اس نے ایک ٹھنڈے مار دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے لڑنا چاہتا ہے۔ نجانے میرے اندر کہاں سے اتنی قوت آگئی تھی۔ شاید جو مجھے حالات میں ذلیل کیا گیا تھا، اب تک جو میری ہنک ہو چکی تھی، اس کا سارا غصہ ایک دم اکٹھا ہو گیا تھا۔ میرے اندر ایک طوفان اٹھا۔ میں نے اس کا ادھار نہیں رکھا۔ اگلے ہی لمحے اس کی تھوڑی سی نیچے نیچے مارا، اس کے ساتھ ہی ایک کلک اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان مار دی۔ وہ چیخا ہوا پیچھے ہٹا تو دو تین بندے فوراً ہی اٹھ کر مجھ پر پل پڑے۔ اس کا مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے



بہت ماریں گے۔ لیکن مجھے اپنے دفاع میں کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ میں نے دو پر اپنا فوکس ختم کر دیا اور سامنے سے وار کرنے والے پر تو جہ مرکز کر دی۔ وہ مجھے مکہ مارنے کے لئے اپنا ہاتھ بلند کر چکا تھا، اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ نیچے آتا، میں نے اس کی نعل میں اپنی گردن دیتے ہوئے اسے اوپر اٹھایا، کوشش کر کے اس کی ایک ٹانگ اپنے ہاتھ میں لی۔ جیسے ہی اس کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آئی، میں نے پوری قوت لگا کر اسے اوپر اٹھالیا، پھر ذرا سا کھما کر اسے سلاخوں میں دے مارا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور میرے سامنے تھا۔ وہ دونوں ہاتھ بڑھا کر میری جانب لپکا تھا، شاید وہ مجھے اپنے حصار میں لے کر گرانا چاہتا تھا۔ میں سرعت سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اپنی جوتک میں مجھ پر آگرا، میں نے اسے اٹھایا، سر کے اوپر گھمایا اور اسے بھی سلاخوں میں دے مارا۔ اب میرے سامنے تیسرا تھا۔ وہ پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کوئی نرم و نازک لڑاکا نہیں، لڑنا بھڑنا جانتا ہوں۔ وہ میرے گھونہ مارنے کے لئے آگے بڑھا تھا۔ میں اسے جھکائی دے گیا۔ وہ ذرا سا سنبھلا تھا کہ میں ایک دم سے فرش پر بیٹھ گیا۔ اسے یہ امید نہیں تھی جبکہ میں اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر اسے گرا چکا تھا۔ اس نے بہت مزاحمت کی لیکن تب تک میں اسے کھما دیا تھا، دو تین چکر دینے کے بعد جیسے ہی وہ فرش سے ذرا بلند ہوا، میں نے اسے سلاخوں میں دے مارا۔ تب تک پہلے والا ہوش میں آ چکا تھا۔ میں اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا، وہیں ببرک سے چند بندے اٹھے اور مجھ پر حملہ آور ہو گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کتنے بندے تھے۔ لیکن میں ان کے حملے سے سمجھ گیا کہ اب مجھے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ ایک بندے نے کوشش کی کہ وہ بھی مجھے اسی طرح سلاخوں میں مار سکے۔ لیکن ایسا نہ کر سکا۔ وہ سب مجھ پر تباہ توڑ حملے کر رہے تھے۔ مجھے یہ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ کہاں کہاں ضرب لگ رہی ہے۔ میں اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں تھا۔ میں تقریباً دو منٹ اپنا آپ بچانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں ان کے قابو میں نہیں آ رہا ہوں تو اسی کشمکش میں چند لوگوں نے مجھے ایک دم سے قابو کر لیا۔ انہوں نے مجھے اٹھایا اور دیوار پر دے مارا۔ میرے سر میں

☆.....☆.....☆

مجھے ہوش آیا تو کچھ دیر تک سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ کچھ دیر بعد میرا شعور مجھے سمجھانے لگ گیا کہ میں ایک ہیڈ پر ہوں۔ وہ جگہ ہسپتال ہے۔ مجھے ڈرپ لگی ہوئی ہے۔ وہ ہسپتال کا وارڈ تھا۔ وہاں دوسرے مریض بھی پڑے ہوئے تھے۔ میرے ارد گرد کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے ہلنا چاہا تو سر میں شدید درد اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آ گیا کہ ببرک میں ہونے والی لڑائی کے نتیجے میں یہاں بڑا ہوں۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور درد کو سہنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر گزری تھی کہ مجھے کسی کالمس محسوس ہوا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرے سامنے ایک ادھیڑ عمر پولیس والا سنتری کھڑا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ بولا

”ہوش آ گیا ہے تمہیں۔“ اس کے کہنے پر میں نے ذرا سا سر ہلادیا تو اس نے کہا، ”اچھا میں ڈاکٹر کو بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا، دوا کھانے کی رسی سی تاکید کی اور واپس چل دیا۔

مجھے بہر حال یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں پولیس کی حراست میں ہوں۔ یہاں اگر کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ کرنا تھا تو اس کے لئے مجھے نوٹوں کی ضرورت تھی۔ یہی نوٹ اس وقت میرے پاس نہیں تھے۔ ظاہر ہے مجھے بابا تک یہ پیغام پہنچنا تھا۔ یہاں چودہ دن سہولت سے گزارنے کا مطلب تھا کہ مجھے اس کی ادائیگی کرنا تھی۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے پاس بیٹھے سنتری سے پوچھا ”یار مجھے یہ بتا، مگر تک پیغام کیسے پہنچ سکتا ہے؟“

”مجھے گھر کا فون نمبر دو، میں پیغام بھجو دیتا ہوں، لیکن ابھی نہیں جب میری ڈیوٹی ختم ہوئی تب باہر جاؤں گا اور پیغام دے دوں گا۔“ اس نے ایک ہی بار ساری تفصیل بتا

بہت ماریں گے۔ لیکن مجھے اپنے دفاع میں کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ میں نے دو پر اپنا فوکس ختم کر دیا اور سامنے سے وار کرنے والے پر تو جہ مرکز کر دی۔ وہ مجھے مکہ مارنے کے لئے اپنا ہاتھ بلند کر چکا تھا، اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ نیچے آتا، میں نے اس کی نعل میں اپنی گردن دیتے ہوئے اسے اوپر اٹھایا، کوشش کر کے اس کی ایک ٹانگ اپنے ہاتھ میں لی۔ جیسے ہی اس کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آئی، میں نے پوری قوت لگا کر اسے اوپر اٹھالیا، پھر ذرا سا کھما کر اسے سلاخوں میں دے مارا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور میرے سامنے تھا۔ وہ دونوں ہاتھ بڑھا کر میری جانب لپکا تھا، شاید وہ مجھے اپنے حصار میں لے کر گرانا چاہتا تھا۔ میں سرعت سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اپنی جوتک میں مجھ پر آگرا، میں نے اسے اٹھایا، سر کے اوپر گھمایا اور اسے بھی سلاخوں میں دے مارا۔ اب میرے سامنے تیسرا تھا۔ وہ پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کوئی نرم و نازک لڑاکا نہیں، لڑنا بھڑنا جانتا ہوں۔ وہ میرے گھونہ مارنے کے لئے آگے بڑھا تھا۔ میں اسے جھکائی دے گیا۔ وہ ذرا سا سنبھلا تھا کہ میں ایک دم سے فرش پر بیٹھ گیا۔ اسے یہ امید نہیں تھی جبکہ میں اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر اسے گرا چکا تھا۔ اس نے بہت مزاحمت کی لیکن تب تک میں اسے کھما دیا تھا، دو تین چکر دینے کے بعد جیسے ہی وہ فرش سے ذرا بلند ہوا، میں نے اسے سلاخوں میں دے مارا۔ تب تک پہلے والا ہوش میں آ چکا تھا۔ میں اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا، وہیں ببرک سے چند بندے اٹھے اور مجھ پر حملہ آور ہو گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کتنے بندے تھے۔ لیکن میں ان کے حملے سے سمجھ گیا کہ اب مجھے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ ایک بندے نے کوشش کی کہ وہ بھی مجھے اسی طرح سلاخوں میں مار سکے۔ لیکن ایسا نہ کر سکا۔ وہ سب مجھ پر تباہ توڑ حملے کر رہے تھے۔ مجھے یہ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ کہاں کہاں ضرب لگ رہی ہے۔ میں اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں تھا۔ میں تقریباً دو منٹ اپنا آپ بچانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں ان کے قابو میں نہیں آ رہا ہوں تو اسی کشمکش میں چند لوگوں نے مجھے ایک دم سے قابو کر لیا۔ انہوں نے مجھے اٹھایا اور دیوار پر دے مارا۔ میرے سر میں



دی۔

”بچے کون ہے۔“ میں نے تیزی سے پرتھس لہجے میں پوچھا  
”انہیں پتہ نہیں چل سکتا۔“ ارم نے تیزی سے کہا

”کیوں، مطلب؟“ میں نے پوچھنا چاہا

”جب بندہ تلوار کا مقابلہ لاشی سے کرتا ہے تو ایسا ہی  
ہوتا ہے۔ تمہارے بابا میرے لئے بڑے محترم ہیں لیکن  
جب انہیں چند باتوں کی سمجھ آئے گی تو سارے معاملات  
سامنے آ جائیں گے۔“ ارم نے تیزی سے چڑھاتے ہوئے  
قدرے کی سے کہا تو مجھے ارم پر غصہ آ گیا، وہ میرے بابا  
کے بارے کی بات کر رہی تھی۔ اس سے پہلے میں کچھ  
کہتا بابا بولے

”بہن! تم ٹھیک کہہ رہی ہو، لیکن یہ تو.....“ وہ کہتے ہوئے  
رک گئے

”انکل، آپ دیکھ نہیں رہے کہ دشمنوں نے کیسی  
پلاننگ کی ہے۔ قانون کا ناجائز استعمال کر کے علی کو پھنسا  
گیا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رُک گئی، پھر میرے  
چہرے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولی، ”علی، مجھے  
صرف ایک لفظ میں جواب دینا، صرف ایک لفظ میں۔ وہ  
ہوگا ہاں یا ناں.....“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے رک کر میرے  
چہرے پر دیکھتی رہی، پھر دھیمے سے بولی، ”تباہی تم نے مکمل کیا  
؟“

”نہیں۔“ میں نے فوراً جواب دیا تو اس نے طویل  
سانس لیا، پھر بڑے پراعتماد لہجے میں بولی  
”پھر یہ سمجھ لو کہ تمہیں کچھ نہیں ہوتا۔“

”تم یہ.....“ میں نے پوچھنا چاہا تو اس نے میرے  
چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا

”جواب تک ہونا تھا وہ ہو گیا۔ انہوں نے تمہیں اور  
انکل کی صاف کوئی، شرافت اور ایمانداری کو سامنے رکھ کر  
ہی پلان کیا ہے۔ جو کوئی بھی ہے وہ آپ کے ارد گرد ہی ہے  
۔ وہ منافق دشمن ہے۔ یہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔“

”مجھے بھی اب یہی احساس ہو رہا ہے۔“ بابا نے دھیمے  
سے لہجے میں کہا

”ارم، تم یہاں تک کیسے پہنچی ہو.....؟“ یہ سوال ابھی  
تک میرے دماغ میں اٹکا ہوا تھا۔ بھی وہ ہلکا سا مسکرا دی  
پھر سکون سے بولی

”میں نے کل کا اخبار دیکھا بھی تھا، لیکن مجھے پتہ نہیں

”اچھا جب جاؤ گے تو مجھے بتانا۔“ میں نے کہا اور آ  
کھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ میں ان سارے حالات کے  
بارے میں سوچنا چاہتا تھا لیکن درد کرتا ہوا دماغ کچھ بھی  
سوچنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ  
میں سو جاؤں۔ شاید کسی میڈیسن میں کوئی نیند کی گولی دوں تو  
میں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے کسی نے پکارا  
”علی، آنکھیں کھولو۔“

جانی پہچانی آواز تھی۔ مجھے لگا میں خواب دیکھ رہا ہوں  
اور کوئی خواب ہی میں مجھے پکار رہا ہے۔ فطری طور  
پر میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے سامنے ارم کھڑی تھی  
۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں خود پر شک کرنے لگا۔  
مجھے پھر یونہی لگا جیسے میں کوئی خواب ہی دیکھ رہا ہوں۔ اس  
کا یہاں ہونا ناممکن تھا۔ وہ یہاں جیل کے ہسپتال میں کیسے  
آ سکتی تھی؟ میں اسے ہولنوں کی مانند دیکھ رہا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو، تم ٹھیک تو ہونا علی؟“ اس بار وہ  
تشویش زدہ لہجے میں بولی تھی

”تم یہاں کیسے؟“ میں نے سرسراتے ہوئے بے یقینی  
سے پوچھا

”یہ ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا اور نہ تمہارے بابا  
کے۔ اس پر دماغ مت کھاؤ۔“ میں بعد میں تمہیں تفصیل  
کے ساتھ بتا دوں گی۔ پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کیسے ہو؟“ اس  
نے تیزی سے شہوہ بھرے لہجے میں کہا

”میں ٹھیک ہوں، مگر.....“ میں نے کہنا چاہا تو اس کی  
اوٹ میں میرے بابا بھی کھڑے تھے۔ وہ انتہائی پریشانی  
میں مجھے دیکھ رہے تھے۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ بابا کے  
سامنے مجھے حوصلہ دکھانا ہے۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر  
زبردستی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا

”بابا آپ ٹھیک ہیں؟“  
”میں تو ٹھیک ہوں بنا تمہاری یہ حالت..... ٹھیک  
کہتے تھے کہ وہ تمہیں جیل کیوں سمجھنا چاہتے ہیں۔ انہوں  
نے.....“ وہ کہتے کہتے یوں رُک گئے جیسے وہ خود پر قابو  
پارہے ہوں۔ میں جانتا تھا کہ انہیں بہت دکھ ہو رہا تھا لیکن  
وہ خود کو میرے سامنے مضبوط رکھنا چاہ رہے تھے۔

”بابا، کیا پتہ چل گیا ہے کہ اس سارے معاملے کے  
Digitized by



باتیں کرتے رہے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ وہ میرے پاس رہے، اس کے بعد وہ واپس چل دیے۔ جاتے ہوئے بابا نے نوٹوں کی ایک گڈی میرے سر ہانے کے نیچے رکھ دی۔

ارم یہاں پر کیوں آئی؟ اس کی مجھے سمجھ تو نہیں آئی لیکن یونیورسٹی میں گزرنے ان دو برسوں اور اسی دوران کلب میں گزرنے ہوئے ڈیڑھ برس میں ارم کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں، اس کی باتوں اور رویوں پر لاشعوری طور پر سوچتا چلا گیا۔

ارم لاہور میں میری کلاس فیلو تھی۔ اس کی شخصیت بڑی رعب دار تھی۔ وہ انتہائی خوبصورت تھی۔ لیکن کوئی بھی اس کے قریب جھکنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ وہ کسی کو ایسا موقعہ ہی نہیں دیتی تھی۔ اس کا انداز شاہانہ تھا اور وہ شہزادوں کی طرح رہتی تھی۔ اس کا حلقہ چند لڑکیوں تک محدود تھا۔ ہمارے گروپ کا اس کے ساتھ ایسا دوستانہ تعلق تھا کہ وہ ہماری ساتھ ہر طرح کی سرگرمی میں شامل نہیں ہوتی تھی، بس کبھی کبھار جب سارے مل بیٹھتے تھے تو اس سے بات چیت ہو جاتا کرتی تھی۔ اگر گہرا دوستانہ نہیں تھا تو کوئی اجنبیت بھی نہیں تھی۔ کچھ عرصہ بعد جب میں نے کلب جوائن کیا تو وہ مجھے وہاں ملا کرتی تھی۔ وہاں ایک اچھا تعلق ہمارے درمیان بڑھا۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ کافی حد تک بے تکلف بھی ہو گئے تھے لیکن ہمارے درمیان ایک احترام تھا۔ یہ تعلق بہت بھلا لگتا تھا۔

میں ارم کے خاندانی پس منظر کے بارے میں بالکل بھی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت پڑی تھی۔ لیکن اس کے شاہانہ انداز سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کسی امیر ترین فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ مہنگی گاڑی میں یونیورسٹی آئی، اس کا لباس مہنگا ہوتا۔ وہ اپنے ارد گرد کی لڑکیوں پر بہت سا پیسہ خرچ کر دیتی تھی۔ میں نے جب پہلی بار اسے دیکھا تو میرے دماغ میں ایک ہی لفظ گونجتا تھا "شہزادی"۔ لمبا سا اٹھتا ہوا قد، گورا سرخی مائل رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، جن پر نیکی چتون تھی۔ اس کا ناک اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا، پتلے پتلے لب، گول سا چہرہ، لانی گردن، شولڈر کٹ پال، بھاری بھاری گداز بدن میں پہلی سر دور سے ہی دکھائی دے جاتی۔ اس کی لانی گردن کے نیچے ابھری ہوئی ہڈیاں اور بھاری سینہ فوری متوجہ کر لیتا تھا۔

چلا۔ مول نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا کہ تم نے کوئی قتل کر دیا ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تم کوئی قتل بھی کر سکتے ہو۔ میں نے تمہیں فون کیا تو آغوشی سے بات ہو گئی، ان سے ساری تفصیلات کا پتہ چلا۔

"یہاں تک کیسے؟" میں نے پوچھا  
"میں تمہارے گاؤں گئی تھی، وہاں سے انکل کو لیا، یہ بہت پریشان تھے۔ انہیں یہ اطلاع مل چکی تھی کہ تم یہاں زنجی حالت میں پڑے ہو۔ بس میں ان کے ساتھ یہاں آ گئی۔" اس نے پھر اسی سکون سے گول مول جواب دیتے ہوئے کہا

"اصل بات تم گول کر رہی ہو؟ یہاں تو کسی کو....." میں نے کہنا چاہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی  
"میں کوئی غیر قانونی طور پر تو نہیں آئی۔ ہاں لیکن بہت کم لوگوں کو یہ قانونی اجازت ملتی ہے۔ بڑے جگاڑ لگتے ہیں، اگر کوئی جگاڑ لگانے والا ہو تو، ویسے میں وزیر جیل خانہ جات کی خصوصی اجازت سے یہاں آئی ہوں۔"  
"ارم تمہارا شکریہ کہ تم نے بابا کو....." میں نے پھر کہنا چاہا تو اس نے ٹوکتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا

"اُبس اپنی فارمیٹی اپنے پاس رکھو۔ ابھی اس وقت کے بعد تمہاری یہاں پر خصوصی دیکھ بھال ہوگی۔ مجبوری یہ ہے کہ اب یہ چودہ دن ہمیں یہاں لگانے ہیں۔ یہ قانون ہے اس کا خیال تو کرنا ہوگا۔ کیونکہ ایک ایف آئی آر یہ بھی درج ہو گئی ہے کہ قیدیوں نے تمہیں زنجی کیا۔"

"بیٹا، میں اب بہت کچھ سمجھ رہا ہوں۔ تم بہر حال اپنا خیال رکھنا اور جلدی ٹھیک ہونے کی کوشش کرنا۔" بابا نے کا فی حد تک مضبوط لہجے میں کہا تو میں نے ارم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"بابا کا خیال رکھنا۔"  
"تم بالکل بھی فکر نہ کرو۔ میں ادھر گاؤں ہی میں ہوں۔ ابھی واپس لاہور نہیں جا رہی۔ مجھے پتہ ہے کہ انکل اور آغوشی کو بہت ضرورت ہوگی۔ میں تمہارا بھی پتہ کرتی رہوں گی، لیکن ممکن ہے میں دوبارہ یہاں نہ آ سکوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ تھوڑا پیچھے ہٹ گئی تاکہ بابا میرے پاس آ جائیں۔ انہوں نے مجھ سے کیا بات کرنا تھی۔ میری حالت ان کے سامنے تھی۔ کوئی معاملہ واضح نہیں تھا۔ بس کچھ دیر یونہی



رہی ہے۔“

”آں، ہاں.....“ اس نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا، پھر بولی، ”درازد، گول سا بھرا بھرا چہرہ، یہ موتی موتی آنکھیں، یہ لباناک، یہ درمیانے سے بھرے بھرے ہونٹ، یہ ٹھوڑی میں ذرا ساقم، چوڑا سینہ بالوں سے بھرا ہوا، مضبوط کمری بدن، اور خاص طور پر یہ اوپری ہونٹ پر مونچھیں اور اس میں ہر وقت شرارتی سی مسکراہٹ، یہی مرداگئی ہے، بہت اچھے لگتے ہو۔“

”واللہ، پہلی بار کسی لڑکی نے اتنی تعریف کی ہے مجھے اپنا آپ اچھا لگنے لگا ہے، جی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں جانتا تھا کہ میں، میں ہی ہوں لیکن میں نے اب بھی اس کی بات کو مذاق ہی میں لیا تھا۔ وہ بھی اس طرح کھلی ہی نہیں تھی میرے ساتھ۔

”تم نے میری آنکھ سے کبھی اپنے آپ کو نہیں دیکھا، یقین جانو بالکل شہزادے لگتے ہو۔“ اس نے کہا تو میں ایک دم سے چونک گیا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ میرے چہرے پر یوں حیرت دیکھ کر اس نے پریشان ہو تے ہوئے پوچھا ”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟“

”تم نے مجھے شہزادہ کہا؟“ میں نے پوچھا  
”ہاں کہا، تم ہو شہزادے۔“ اس نے اپنی بات کا مزہ لیتے ہوئے کہا

”کیا تم یقین کرو گی، میں نے جب بھی تمہیں دیکھا، تمہارے لئے میرے ذہن میں ایک ہی تصور ہے اور وہی میرے ذہن میں آتا ہے، وہ ہے شہزادی۔“ میں نے پوری سنجیدگی سے کہا تو میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی، پھر ایک دم سے تھک لگا کر ہنس دی۔ کچھ لمحے بعد بولی

”لیکن یار اتنے خیالات ملنے کے باوجود تم ایک دوسرے سے بے تکلف ہی نہیں ہوئے، ہے نا حیرت کی بات۔“

”تم نے کبھی لفٹ ہی نہیں کرائی، سو ہم نے بھی لفٹ مانگنا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔“ میں نے کاندھے اچکاتے ہوئے مذاق میں کہا تو وہ پھر سے تھک لگا کر ہنس دی۔

”میں سمجھی تم مجھے بھی لفٹ نہیں کراؤ گے جیسے دوسری لڑکیوں کو نہیں کراتے۔“ اس نے کہا پھر اچانک میری

بلاشبہ قدرت نے جو اسے حسن نوازا تھا، وہ ایک عطیہ تھا لیکن اس نے بھی خود کو سنوارنے میں بڑی محنت کی تھی۔ میں کلب میں اسے تقریباً روزانہ ہی دیکھتا تھا۔ وہ اکثر ٹریک سوٹ میں ہوتی۔ بالوں کو پونی سے باندھ لیتی تھی اور بہت محنت کرتی تھی۔ ہمارے درمیان تھوڑی بہت بات ہو جایا کرتی تھی لیکن اس کے ساتھ بے تکلفی نہیں تھی۔ ایسے ہی ایک دن جب وہ پسینے میں بھیگی ہوئی کلب کے لان میں آئی تو سیدھی میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”کیا پوچھ گی؟“ میں نے مروت میں پوچھا  
”ہیکو جوس۔ وہ بھی دو گلاس۔“ اس نے بے تکلفی سے کہا تو مجھے اچھا لگا۔ میں نے آرڈر کیا اور اس کے ہیکے ہوئے بدن کو دیکھ کر پوچھا

”اتنی محنت کیوں کرتی ہو؟ تربت نے ویسے ہی تمہیں بڑا خوبصورت بدن دیا ہے۔ باڈی بلڈر بننا چاہتی ہو یا کوئی ماڈل بننے کا ارادہ ہے؟“

”باڈی بلڈر تو نہیں ہاں مگر ماڈل تو مجھے بننا ہے، اگر کسی فلم میں جاس مل گیا تو وہ بھی نہیں چھوڑ دوں گی۔“ اس نے پر مزاح لہجے میں کہا اور تھک لگا کر ہنس دی تھی  
”اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارا بدن کسی ماڈل سے کم نہیں۔“ میں نے اس کی تعریف کی تو وہ چپکتے ہوئے بولی

”کیا میری شکل اس قابل نہیں ہے؟“

اس کے یوں کہنے پر میں گڑبڑا گیا، پھر تیزی سے بولا  
”نہیں نہیں، تم بہت خوبصورت ہو، میں نے سوچا اگر ایسے کہا تو کہیں تم مائنڈ ہی نا کر جاؤ۔“

”شکر ہے میں تمہیں خوبصورت لگتی ہوں، ویسے اس میں مائنڈ کرنے والی کوئی بات نہیں، میں خوبصورت ہوں تو ہوں۔ آخر اسی بل بوتے پر ماڈل بننا ہے نا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ہلکا سا ہنس دی تھی۔ پھر ایک دم سے بولی، ”ویسے تم بھی تو کسی ماڈل سے کم نہیں ہو۔“

”مطلب.....؟“ میں نے اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے

کہا  
”مطلب تم ایک ہیڈم ہو جو ہر مرداگئی جھلکتی ہے تم سے؟“ اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اس کے مزاح کا مزہ لیتے ہوئے کہا  
”اچھا یہ بتاؤ، تمہیں یہ مرداگئی کہاں سے دکھائی دے



طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی، ”فرینڈز۔“  
میں نے اس کا گلابی بڑھا ہوا ہاتھ دیکھا اور اسے تھام کر کہا  
”فرینڈز۔“

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تو وہ بولی  
”ایک بات کہوں علی۔ کلاس میں ہمارا یہ تعلق سامنے نہیں آنا چاہئے۔ سو باتیں نہیں کی۔ ایسے خواہ مخواہ کے قصے۔“  
”تم بالکل ٹھیک کہتی ہو، ہم یہاں ملتے ہیں، بس ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو ویر ہمارا آرڈر لے آیا۔  
ہماری یہ دوستی یونیورسٹی سے ہٹ کر گئی۔ وہ زیادہ تر مجھے جم میں لیتی۔ ہم اکٹھے ایکسرسائز کرتے۔ مجھے خود اس کا سڈول بدن بہت اچھا لگتا تھا۔ جب وہ بہت موڈ میں ہوتی تو ٹائٹس کے ساتھ سیلیورس ہینٹی، وہ بھی سیاہ رنگ کا۔ اس دن وہ غضب ڈھاتی تھی۔ ایکسائز کرتے ہوئے جب وہ پسینہ پسینہ ہو جاتی، اس لمحے وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ شوٹنگ میں وہ میرے ساتھ مقابلے لگاتی۔ اس کا نشانہ بھی بہت اچھا تھا۔ میں نے بھی اسے فائٹ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی میں نے اس بارے اس سے پوچھا تھا۔

کلب کی ان ملاقاتوں میں ہمارا اچھا تعلق پروان چڑھا تھا۔ جو وقت کے ساتھ اچھا ہوتا گیا۔ جسے دوستی کا نام دیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ کلب کے علاوہ ہم کبھی کسی جگہ نہیں ملے تھے۔ یہاں تک کہ کسی ریسٹوران میں بھی نہیں۔

کبھی پر جہاں بہت سارے لوگ ہوں جیسے ہماری یونیورسٹی کی کلاس۔ سب کے ساتھ ایک جیسا تعلق نہیں ہو سکتا۔ لیکن چند لوگ ہوتے ہیں جن کی آپس میں دوستی ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی ہم پانچ لوگوں کا گروپ تھا۔ ہم نے الوداعی کھانا فائو شار میں رکھا تھا، اس رات ارم بھی میرے کہنے پر ہمارے ساتھ شامل تھی۔ پھر اس رات کے بعد ہم نہیں ملے۔ دو ہفتے اتنا طویل دورانیہ تو نہیں ہو سکتا لیکن اس وقت سب سے اہم یہ بات تھی کہ ارم یہاں میرے لیے کیوں آئی ہے؟ ویسے یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ وہ مجھے اگر دوست سمجھتی تھی تو اس کا آنا اتنا بھی پر ہنس نہیں تھا۔ تاہم حیرت والی بات یہ تھی کہ وہ میرے بابا اور اماں کے ساتھ گاؤں میں ٹھہر گئی تھی۔

نے ٹھیک کہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد، میرا بہت زیادہ خیال رکھا جانے لگا تھا۔ اس نے ایسا کیا کیا تھا؟ اس کی اتنی رسائی تھی؟ وہ اتنا بڑا جگاڑ لگا سکتی تھی؟ جو کچھ بھی اس نے کیا تھا یہ وہی بنا سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہی میرے شہر کی عدالت تھی جہاں سے چودہ دن پہلے مجھے ریماڈ پر جیل بھیج دیا گیا تھا۔ مجھے پولیس گاڑی سے نکالا گیا تو میرے ہاتھ میں پھنکڑی لگی ہوئی تھی۔ عدالت میں ویسے ہی بہت سارے لوگ تھے جیسے معمول کی گمبھا بھی ہوتی ہے۔ میں نے کھلی فضا میں ایک طویل سانس لیا۔ میرا زخم ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا لیکن میں خود کو بالکل ٹھیک محسوس کرتا تھا۔ میں نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی جو کل مجھ تک پہنچ گئی تھی۔ جج صاحب کی عدالت کے سامنے کافی رش تھا۔ میں نے دیکھا، بابا سمیت کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ ہمیں وہاں کھڑے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ بلاوی نے آواز دے دی۔ ہم عدالت کے اندر چلے گئے۔ وہاں پر ایک جانب بابا، انکل نعیم اور دوسرے گاؤں کے بزرگ تھے۔ ان کے ساتھ ذرا قافلے پر اسلم اے ایس آئی کھڑا تھا۔ آج اس کے چہرے پر خفاست نہیں تھی۔

جج صاحب کے آتے ہی خاموشی چھا گئی۔ کاروائی کا آغاز ہوا۔ انکل نعیم میری وکالت کر رہے تھے۔ انہوں نے پہلا کٹریہ دیا کہ فرانزک رپورٹ کے مطابق، آلہ قتل پر دو لوگوں کے فنگر پرنٹ تھے۔ فنگر نکالنے والا قاتل نہیں ہو سکتا۔ اس پر بحث مزید بڑھتی کہ پھنکڑی مسللی اپنے بیان سے بدل گیا۔ اس نے شک ہی نہیں یقین سے کہا کہ علی وہاں پر اس وقت پہنچا جب روشن مسللی مر چکا تھا۔ اسی طرح فیروز نے بھی اپنے بیان میں تبدیلی کر لی جس سے مجھے شک کا فائدہ مل رہا تھا۔ گفتیش میں مزید کئی ایسے نکات تھے جو مجھے بے گناہ ثابت کر رہے تھے، لہذا جج صاحب نے مجھے باعزت بری کر دیا۔ میری پھنکڑی کھول دی گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انکل نعیم ایک قابل وکیل تھے۔ انہوں نے بڑے زور دار نکات پیش کئے تھے۔ لیکن میرے لئے یہ حیرت کی بات نہیں رہی تھی۔ مجھے یہ گمان ہو نے لگا تھا کہ ضرور اس میں ارم کا بھی کمال رہا ہوگا۔ اس کی رسائی جیل کے اندر ہو سکتی ہے تو یہاں بھی اس نے کوئی نہ



بولی

”مجھے آنٹی نے سارے واقعے کی تفصیل بتادی تھی۔ اس کے مطابق یہ جو تمہاری ایف آئی آر درج ہوئی تھی نا، اسی میں سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ فیروز اور پھتو مسلی نامی دونوں بندے ٹھیک نہیں تھے۔ انکل بھی یہی بات سمجھ رہے تھے۔ ریما نے ہونے تک وہ بھی غائب تھے۔ وہ کیوں غائب ہوئے؟ ظاہر ہے ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی تو دشمن ہے؟ اب یہی بندے بتا سکتے تھے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ دوسرا نقیشتی اسلم، اس نے جو مسل حج صاحب کے سامنے رکھی تھی۔ اس میں وہ جانب دار نظر آیا۔ ظاہر ہے وہ بھی ان سے ملا ہوا تھا۔ ان تینوں پر مختلف طرح سے دباؤ ڈالا گیا۔ وہ اس پر تو راضی ہو گئے کہ وہ درست حقائق سامنے لے آئیں گے لیکن یہ کس کے ایما پر ہوا اس پر انہوں نے ایک لفظ نہیں کہا۔“

”مطلب، ان تینوں کو معلوم ہے کہ میرا دشمن کون ہے؟“ میں نے بات سمجھتے ہوئے کہا

”کیا تم نے اب تک سوچا، یہ سب کیوں ہوا؟ بلکہ وہ روشن مسلی ہی کون کیوں ہوا تھا؟“ اس نے پوچھا تو میں تیزی سے کہا

”بہت سوچا، جیل میں سوچنے کے علاوہ میرے پاس تھا کیا؟“

”کسی نتیجے پر پہنچے ہو؟“ اس نے پوچھا

”نہیں، شاید میں اسے اتفاق ہی سمجھتا، اگر پہلے دن سے لیکر اب تک کچھ باتیں سامنے نہ آ جاتی، ہے تو یہ سازش ہی، اور یہ سازش صرف مجھے ذلیل کرنے کے لئے کی گئی۔ میں سوچتا ہوں اگر میرا جسمانی ریما نہ ہو جاتا تو میں ذہنی طور پر مغلوب ہو کر رہ جاتا۔“ میں نے کہا تو وہ بولی

”اس کی کسر انہوں نے پیرک میں نکالنا چاہی۔ خیر اب تم بہت محتاط ہو کر رہنا۔ دشمن کسی دوسری طرح بھی تجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یہ واقعہ تمہارا معمول دیکھ کر ہی ہوا ہے، تم کب جا ملنگ کے لئے نکلتے ہو، کدھر جاتے اور سارا دن کیا کرتے ہو۔“

”اب یہی پتہ کرنا ہے کہ کون ہے میرا دشمن؟“ میں نے کسی حد تک معاملہ سمجھتے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی

کوئی جگا ضرور لگا لیا ہوگا۔ اس نے ایسا کیا کیا تھا، اس کی تفصیل میں اسی وقت پوچھ سکتا تھا، جب میں اس سے اکیلے میں بیٹھ کر بات کرتا۔ بہر حال مجھے ارم کی وجہ سے بہت مدد ملی تھی۔ ممکن ہے بابا کو اس نے ایسے مشورے دیئے ہوں، جس سے پھتو مسلی جیسوں کا اپنا بیان بدلنا بڑا۔ عدالت میں مجھے ارم دکھائی نہیں دی تھی۔ میں نے گھاؤں جانے کے لئے کار میں بیٹھتے ہوئے بابا سے پوچھا

”بابا، وہ ارم نہیں آئی یہاں؟“

”وہ کل شام واپس لا اور چلی گئی تھی۔“ انہوں نے سر سری سا بتایا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے ملے بنا ہی کیوں چلی گئی مگر بابا اس کا کیا جواب دیتے، سو میں خاموش ہو گیا۔

حویلی میں میری اماں میری منتظر تھی۔ وہ ماں تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ اتنے دنوں سے سوئی بھی نہیں ہوگی۔ انہوں نے بڑے سارے کھانے بنوائے ہوئے تھے جیسے انہیں یقین تھا کہ میں آج واپس گھر آ جاؤں گا۔

کھانے پر بابا، اماں اور میں ہی تھے۔ ایسا ممکن نہیں تھا کہ اسی قتل کے حوالے سے باتیں نہ چلتیں۔ لیکن کھانا شروع کرتے ہی اماں نے کہہ دیا کہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔ سوا دھر اُدھر کی باتوں میں کھانا کھا لیا تو میں لاؤنج میں آ گیا۔ گاؤں کے بہت سارے لوگ مجھے ملنے آئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی چلے گئے۔ میں اس وقت حویلی کے اندرونی کارپڈور میں بیٹھا ہوا تھا جب مجھے ارم کا خیال آ۔ میں نے اپنا فون منگوا یا اور اسے کال کر دی۔

”تم فوراً چلی گئی، ایک دن مزید ٹھہر جانی۔“ میں نے پوچھا

”ارے یار، بارہ دن رہی ہوں میں تمہارے باپ، مجھے واپس لا اور بھی تو آتا تھا۔ اب وہیں تو میں رہ سکتی تھی۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا

”میں تم سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا، یہ سب.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات قطع کرتے ہوئے بولی

”کیا تمہیں یہ احساس نہیں ہو گیا کہ تمہارے ساتھ سازش ہوئی ہے؟“

”ارم، میں تو سازش کا شکار ہو گیا، لیکن اس سازش کا جال تو نا کیسے؟“ میں نے تیزی سے پوچھا تو وہ سکون سے

”مجھے معلوم ہوتا تھا تو ابھی تمہیں بتا دیتی۔ مگر مجھے اتنا اندازہ ہے، وہ جو کوئی بھی ہے، تیرے ارد گرد ہے۔ اسے تلاش کرنا اب تمہارا کام ہے۔ کہنا ایسا منافق دشمن بہت خطرناک ہوتا ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا  
 ”دیکھو، وہ وجہ تلاش کرو، جس کی بنا پر کوئی تیرا دشمن ہوا ہے۔“ اس نے کہا تو میں بولا  
 ”یاریک دن مزید رہتی تھوڑا اکپ شپ ہی کر لیتے“

”آ جانا لاہور، کر لیں گے کپ شپ۔“ اس نے ہنستے ہوئے آفر کی

”ٹھیک ہے میں ایک دو دن میں آتا ہوں، اپنا چیک اپ بھی کروالوں گا اچھی طرح سے۔“ میں نے کہا تو اس نے میری ہاں میں ہاں ملائی، باقی دوستوں کے بارے میں تھوڑی دیر باتیں کرتے رہنے کے بعد ہمارے درمیان فون کا رابطہ منقطع ہو گیا۔

ارم نے یہ تو کہہ دیا تھا کہ پھنسا سکتی، فیروز اور اسلم تفتیشی پر دباؤ ڈالا، لیکن کس طرح یہ دباؤ ڈالا، کن کے ذریعے یہ دباؤ ڈالا، انہوں نے میرا دشمن بتایا بھی نہیں اور سارا معاملہ سیدھا ہو گیا؟ یہ سوال میرے ذہن میں گونج رہا تھا۔ جب اس نے یہ بات بتائی تو میں نے اسے اتنا سنجیدہ نہیں لیا تھا لیکن کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد یہ سوال مجھے بے چہن کرنے لگا۔ ایک تو ابھی تک دشمن نامعلوم تھا، دوسرا دباؤ والی بات ابھی تک سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بابا نے بھی اس پر بات نہیں کی تھی۔ وہ اس واقعہ کو دہراتے ہی نہیں تھے جیسے وہ اس کا ذکر بھی پسند نہ کرتے ہو۔ آخر یہ معہ تھا کیا؟

یہ معہ اپنی جگہ تھا لیکن ان گزرے دنوں میں جس اذیت سے میں گزارا تھا وہ میں ہی جانتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ اپنی بے عزتی کا احساس تھا، کس قدر غلیظ انداز میں مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں یہ لیحات چاہتے ہوئے بھی نہیں بھول سکتا تھا۔ میرے اندر لمحہ بہ لمحہ آگ بھڑکنے لگی تھی۔ میرا جی چاہتا کہ میرا دشمن میرے سامنے ہو تو میں اسے چیر پھاڑ دوں۔ جس طرح مجھے ذلیل کیا گیا تھا میں اس سے کئی گنا اسے ذلیل کر کے ہی سکون کا سانس

لے سکتا تھا۔ میں نے کسی کو تنگ نہیں کیا تھا، نہ کسی پر ظلم تھا، لیکن مجھے نشانے پر کیوں رکھا گیا۔ اگر کسی کو مجھ سے دشمنی کرنا ہی تھی تو سامنے آکر لڑنا۔ چھپ کر وار کر والا جو بھی تھا، اب اسے تلاش تو میں نے کرنا ہی تھا۔ چودہ دن جو میں نے جیل کے ہسپتال میں گزارے تھے اسی سوچ میں ہی گزر رہے تھے۔ میں نے کیا کرنا تھا، میں نے انہی دنوں میں سوچ کر فیصلہ کر لیا تھا۔ میرے انا کی آگ نے مجھے بدل کر رکھ دیا تھا۔ پندرہ دن پہلے والا احسن نہیں رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اسی رات میں اپنے کمرے میں تھا اور اپنے حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ملازمہ نہ تھی کے آنے کے بارے میں بتایا۔ میں نے ملازمہ کو چائے بھجوانے کا کہا اور مہمان خانے کی جانب چل دیا۔ تھی میرے بچپن کا دوست تھا۔ نام تو اس کا تو یہ تھا۔ لیکن وہ تھی کے یک نیم سے مشہور تھا۔ وہ ہمارے گاؤں کا ہی رہنے والا تھا۔ اس کا والد جسر قدر شریف النفس انسان تھے، تھی اتنا ہی تیز، شرارتی اور لا پرواہ ذہن کا مالک لگتا تھا۔ اس کے دونوں چھوٹے بھائی پڑھ لکھ کر اسکول ٹیچر بھرتی ہو گئے تھے لیکن تھی بہ مشکل میٹرک ہی کر سکا تھا۔ وہ عجیب داغ کا تھا۔ اس کی مجھے کچھ نہیں آتی تھی۔ اس کی اپنے گھر والوں سے بنی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر والوں پر بوجھ نہیں بنا بلکہ ایسے ہی چھوٹا موم بیوپار کرنا شروع کر دیا۔ اب بھی وہ اپنے گزارے لائق کہ لیتا تھا۔ اس کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں تھا۔ صرف ایک فون تھا، جس پر اس سے رابطہ ہو جاتا تھا۔ وہ ایک بار لاہور آیا تھا، میرے پاس ٹھہرا تھا۔ میرے جیل جانے سے پہلے ایک دو بار اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی جب میں نے اپنے پرانے سگی ساتھیوں کو اپنے ذریعے پر بلایا تھا۔ لاہور کی رونق چھوڑ کر یہاں آیا تو کافی تھکائی محسوس کی تھی۔ سوچ میں یہی تھا کہ پرانے سگی ساتھیوں کے ساتھ محفلیں جمانا کروں گا۔ اس طرح دل بہلا رہے گا۔ انہی دنوں تھی کے بارے میں پتہ چلا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔

کچھ دیر بعد جب میں مہمان خانے میں پہنچا تو وہ اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ سردی کی وجہ سے اس نے کافی تفتیشی چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ اس کے سر پر کوبانی ٹوپی لی ہوئی تھی اور



کے لئے کام کر رہا ہے۔ یہ جو چند دن پہلے غائب ہو گیا تھا اور اب بھی چھپا ہوا ہے، میری اطلاع کے مطابق، وہ چوہدری سلطان کے پاس ہے۔“ اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا

”یہ چوہدری سلطان وہی ہے نا، چوہدری لطیف کا بیٹا، جو باپ کے مرجانے کے بعد اپنے پر پرزے نکال رہا ہے؟“ میں نے کریدتے ہوئے پوچھا

”پر پرزے نکال نہیں رہا، اب تک تو کافی نکال چکا ہے۔ وہ علاقے میں پوری پوری بد معاشی کرنے کے چکر میں ہے۔ وہ کسی کو اپنے سامنے کچھ بھی نہیں سمجھتا۔“ حتیٰ نے نے جوش بھرے لہجے میں بتایا

”تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ اس کا ہمارے معاملے سے کوئی نہ کوئی تعلق ہے؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا

”مجھے لگتا ہے۔ کیونکہ بھٹوسلمتی ہی نہیں فیروز بھی اسی کے پاس جاتا ہے۔ سمجھو اسی کے کیپ کا بندہ ہے۔ ان دونوں بندوں کی پشت پر وہی چوہدری سلطان ہے۔ اب وہ دونوں ہی غائب ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا

”میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ لیکن مجھ سے سلطان کی کیا دشمنی، میرا خیال ہے ہمارا آنا سامنا ہوئے کوئی چار پانچ برس تو ہو ہی گئے ہوں گے۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا

”یہ مجھے نہیں معلوم، لیکن تمہارے معاملے کے سارے ”کھرے“ اس کی طرف ہی جاتے ہیں۔ ان حالات میں تو چوہدری سلطان کو چاہئے تھا کہ وہ بھٹوسلمتی اور فیروز کو قریب نہ چھٹکے دیتا مگر اس نے ان دونوں کو ڈیرے پر رکھا ہوا ہے۔“ حتیٰ نے پھر مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا تو میں چند لمحے سوچتا رہا پھر بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا

”دیکھتی، میں کچی بنیاد پر یونہی کسی پرچہ دوڑنا نہیں چاہتا، نہ ہی خواہ مخواہ کی مخالفت مول لینا چاہتا ہوں۔ ہاں اگر مجھے بے جوتوں کے ساتھ یہ پتہ چل گیا کہ یہ ساری بے غیرتی چوہدری سلطان کی ہے تو پھر اس کا حشر دیکھنا، میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔“

”میں جانتا تھا کہ تم یہی کہو گے۔ میں اسی لئے

یروں میں جا کر رہنے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر میرے ساتھ مصافحہ کیا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تو میں نے بے تکلفانہ لہجے میں پوچھا

”خیر ہے اس وقت آئے ہو؟“

”مجھے کچھ دیر پہلے پتہ چلا کہ تم جیل سے واپس آ گئے ہو، بس اس لئے ملنے آ گیا۔“ اس نے دھیمی سی آواز میں شروع لہجے میں کہا۔ وہ اچھا خاصا دراز قد، مضبوط جسم کا جوان تھا۔ اس کے نین نقش تھیکے تھے۔ آنکھیں میں ایک خاص چمک ہر وقت رہتی تھی جو اس کی اندر کی بے چینی کو ظاہر کرتی رہتی تھیں۔ اس کا ماتھا چوڑا تھا جس پر سیاہ بالوں کی لٹ آ جاتی تھی۔ لمبی یں ناک کے نیچے بھاری مونچھ تھیں۔ اس کی ہلکی ہلکی داڑھی تھی، جسے وہ بہت سنوار کر رکھتا تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا لیکن حالات نے اسے جلا کر رکھ دیا ہوا تھا۔ اس میں جو ایک تھیکا پن تھا، جو اس کی شخصیت کا لازمی جز تھا، وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اس لئے میں نے

سے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا

”تمہیں خیر ہے، تم اس قدر مر جھائے ہوئے ہو؟“

”یار میں سارے حالات جانتے ہوئے بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکا۔ یہاں تک کہ تجھے ملنے بھی نہیں آیا۔ میں تم سے شرمندہ ہوں یار۔“ اس نے اسی شرمندگی بھرے لہجے میں کہا

”اچھا تم ایسا کر بھی لیتے تو کیا کرتے، مجھے خود ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ اس کے حالات پیچھے کون ہے؟“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا

”حالات کو سمجھنے ہی سے وہ چھپا ہوا دشمن سامنے آئے گا نا، اب دیکھو روشن مسلمتی تو ادھیڑ عمر تھا، چھوٹی موٹی چوری چکاری کرتا تھا، معاشرے کا کوئی اچھا فرد تو نہیں تھا لیکن وہ انسان تو تھا۔ اسے کیوں مارا گیا؟ پہلا سوال یہ بنتا ہے نا؟ سوچو، بنتا ہے نا؟“ اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا

”چلو یونہی سہی، تم بات کرو۔“ میں نے اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا

”لیکن یہ بھٹوسلمتی کون سا اچھا بندہ ہے۔ یہ روشن مسلمتی کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا، لیکن روشن نے اسے اپنی بیٹی نہیں دی۔ چلو یہ ایک الگ معاملہ ہے مگر پچھلے ایک برس سے وہ چوہدری سلطان کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔“

تمہارے پاس اس وقت اکیلا آیا ہوں۔ چند دن صبر کرو، میں سارے ثبوت تمہارے سامنے رکھ دوں گا۔ شاید میں اسی طرح اپنے یار کی مدد کر سکوں۔“ اس نے جوش بھرے عزم سے کہا تو میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے ڈن ہو گیا، تم یہ کام کرو، میں بھی کوشش کرتا ہوں۔ میرا ڈن میرے سامنے آ جائے تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔“

”یہ کام اب تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ اس نے دھمکے سے لہجے میں یوں کہا جیسے اسے کوئی من پسند کام مل گیا ہو۔ اتنی دیر میں چائے آگئی۔ اس دوران تفتی سے علاقے کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ میری کوشش تھی کہ میں علاقے میں موجود لوگوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات لے لوں۔ یہ میرے لئے بہت ضروری تھا۔ جس طرح چوہدری سلطان بارے مجھے اب پتہ چلا تھا کہ وہ علاقے میں بد معاشی پر اثر آ یا، اس طرح نجانے کتنے چھپے ہوئے لوگ تھے۔ میں اب واپس گاؤں آ گیا تھا اور اب مجھے یہیں رہ کر زمیندارہ کرنا تھا۔ اس لئے مجھے علاقے کی خبر ہونی چاہئے تھی۔ شاید میں اس بابت جاننے کی اتنی جلدی نہ کرتا لیکن میرے ساتھ جو حالات بن گئے تھے۔ ان حالات کا تقاضا تھا کہ میں اپنے ارد گرد سے باخبر رہوں۔ وہ تقریباً دو گھنٹے میرے پاس رہنے کے بعد چلا گیا۔ میں تفتی پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس نے بھی میرے ساتھ کوئی فضول مذاق نہیں کیا تھا لیکن اس کی بات پر آنکھیں بند کر کے اعتماد بھی تو نہیں جا سکتا تھا۔ بچپن کی دوستی اپنی جگہ لیکن اب مجھے کسی پر بھی بھروسہ نہیں رہا تھا۔ میں بچپن سے اب نکل آیا تھا، مجھے پورے ہوش سے رہنا تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن میں ناشتہ کر چکا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ وہ کوئی اجنبی نمبر تھے۔ میں کچھ دیر سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر میں نے کال ریسیور کر لی۔ دوسری جانب کوئی بھاری آواز میں بات کر رہا تھا۔ اس نے میرا نام لے کر تعہد بنی کی ”ہاں بولو، میں ہی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا تو دوسری طرف سے طنز یہ لہجہ میں کہا گیا

”اور میں اُن لوگوں میں سے ایک ہوں جنہوں نے

”تمہیں بیرک میں بری طرح مارا تھا۔“

”اُدھ اچھا، کیا تم باہر آ گئے ہو؟“ میں نے بے صبر سے پوچھا کیونکہ اس کے بارے میں جانتے ہی میرے دماغ میں ایک دم سے آگ بجڑک اٹھی تھی۔

”اسی لئے تمہیں فون کر رہا ہوں سوہنے منڈے۔ سنو۔ میری بات۔“ اس نے تیزی سے کہا اور لہجہ بھر کے رُک گیا، پھر بولا، ”تمہیں زخمی کرنے کی وجہ سے ہم پر جالیف آئی آدرج ہوئی ہے۔ اب اس کی پٹشی ہے۔ اگر تم اپنی جان چھڑوانا چاہتے ہو۔ بلکہ سکون سے جینا چاہتے ہو تو جیسا ہم کہیں ویسے بیان دینا۔“

”ورنہ کیا ہوگا؟“ میں نے سکتے ہوئے پوچھا

”ورنہ، یہ تو ہم بھی نہیں جانتے کہ تیرے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ بس ہوگا یوں کہ تم مرنا چاہو گے لیکن مر نہیں سکتے گے۔“ اس نے انتہائی تحارت سے کہا

”اور میں تم لوگوں کا خطرہ ہوں کہ میرے سامنے آ جاؤ۔ مجھے یہ تو پتہ چل ہی گیا ہے کہ تم کون کون ہو۔ یہ سن لو کہ میں اسی انتظار میں ہوں کہ تم لوگ جیل سے باہر آتے ہو اور میں تمہیں تمہاری بد معاشی کا سبق سکھاؤں۔ تم سن لو اور اپنے ساتھیوں کو بھی بتا دینا، اس کے بعد تم بد معاشی نہیں کر سکو گے۔“ میں نے اپنے غصے پر قابو رکھتے ہوئے کہا تو وہ دوسری طرف سے وہ تہقق لگا کر ہنس دیا پھر سرد سے لہجے میں بولا

”اُوئے چڑی بیچ، ہماری بے غیرتی سے تو بڑے بڑے پناہ مانگتے ہیں، تم کیا شے ہو۔ اچھا ہے، تم ہمارے بارے میں جان لو، کیونکہ جیسے ہی تمہیں ہمارے بارے میں پتہ چلے گا، تمہیں ہارٹ ایکٹ ہو جائے گا۔“

”میں جانتا ہوں کہ تمہاری حیثیت کتنوں سے زیادہ نہیں، جو مجھ پر کسی نے چھوڑے تھے۔ مجھے دھمکیاں مت دو۔ بلکہ میرے سامنے آنے کی ہمت ابھی سے پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ مجھے کتوں کا علاج کرنا آتا ہے۔“ میں نے غصے میں کہا

”مطلب تم چاہتے ہو کہ ہمارا اور تمہارا سامنا ہو۔“ اس نے حتمی لہجے میں پوچھا تو میں بولا

”اُوئے میں تو تم لوگوں کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”چل ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور فون کال بند کر دی



اور شرمندہ سے لہجہ میں بولی  
”ہم لوگ آپ سے شرمندہ ہیں لیکن کوئی دوسرا دروازہ  
ایسا نہیں جہاں سے ہمیں مدد مل سکے۔ ہمارے ساتھ بہت  
بڑا دھوکا ہو گیا ہے۔“

”کیسی مدد اور کیسا دھوکا؟“ میں نے پوچھا  
”دیکھیں، میں آپ کو بتاتی ہوں۔“ اس عورت نے کہا  
پھر طویل سانس لے کر کہتی چلی گئی، ”بھٹو ہمارا رشتے دار  
ہے مگر وہ کوئی اچھا بندہ نہیں ہے۔ بہت عرصے سے اس کی  
میری بیٹی پر نگاہ تھی۔ میں نے اسے بہت دفعہ منع بھی کیا  
لیکن وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے رشتہ بھیجتا رہا۔ اس کی سب  
سے زیادہ مخالفت میرا شوہر روشن ہی کرتا تھا۔ روشن کے قتل  
کے بعد ہمیں تو اپنی ہی بڑائی۔ لیکن آج صبح سے میری بیٹی  
غائب ہے۔ ہمیں پکا یقین ہے کہ اسے بھٹو نے ہی اغوا کیا  
ہے۔ خدا کے لئے ہمیں ہماری بیٹی واپس دلادیں۔ ہم یہی  
عرض کرنے بڑے میاں صاحب کے پاس آئی ہیں۔“  
”دیکھو بی بی، یہ گھر ہے کوئی تھا نہ نہیں۔ تم جاؤ تھانے  
وہاں جا کر رپٹ درج کراؤ۔ پھر اس کے بعد دیکھتے ہیں  
۔“ میں نے انہیں یہ کہہ کر لانے کی کوشش کی۔ مجھے لگا کہ وہ  
ہمیں پھانسنے کے لئے کوئی چال چل رہے ہیں۔

”وہاں ہماری کون سنتا ہے جی، کوئی ہمارے ساتھ  
.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے کہا

”تمہارے گھر والے ہیں، رشتے دار ہیں انہیں ساتھ  
لو چلی جاؤ شہر تھانے۔ وہ اگر بات نہیں سنیں گے تو آکر  
بتانا۔“ میں نے پھر ٹال دیا۔ وہ مایوس ہو چکی تھیں۔ انہی  
لمحوں میں سٹی موٹر سائیکل پر گیسٹ پارکر سے اندر آ گیا۔ اس  
نے موٹر سائیکل کھڑی کی، پھر ان عورتوں کی طرف دیکھتا  
ہوا میرے پاس آ گیا۔ اس نے کسی علیک سلیک کے بغیر  
پوچھا

”یہ روشن کی بیوی اپنی بیٹی کے سلسلے میں آئی تھی نا؟“  
”ہاں، کہہ رہی ہے کہ ان کی مدد کی جائے اور تھانے  
جایا جائے۔“ میں نے اسے بتایا تو وہ بولا

”ہاں، مدد تو ان کی بنتی ہے۔ لیکن یہ مدد مانگنے غلط جگہ  
پر آگئی ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے روشن کی بیوی سے کہا، ”اماں  
مجھیں یہ خیال نہیں آیا کہ کل تو تم لوگ ان پر قتل کا الزام  
لگا رہے تھے اور آج ان سے مدد مانگ رہے ہو؟“

میں نے وہ نمبر محفوظ کر لیا۔ نجانے کیوں مجھے یہ احساس  
نے لگا تھا کہ اب مجھے یہ لڑائی لڑنا ہی پڑے گی۔ بابا اپنے  
مرے میں تھے اور اماں اندر کہیں مصروف تھی۔ میں انہیں  
فون کال کے بارے میں بتا کر انہیں پریشان نہیں کرنا  
چاہتا تھا۔ اس لئے وہاں سے اٹھ گیا۔

میں حویلی سے باہر نکلا تو اچھی خاصی دھوپ نکلی ہوئی  
تھی۔ میں لان میں ٹھوڑی دیر بیٹھ کر اسی فون کال کے  
بارے میں سوچتا چاہتا تھا جو ابھی ٹھوڑی دیر پہلے کسی نے  
میرے کی تھی۔ مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اس کال کے بارے  
میں انکل خیم کو بتانا چاہئے یا نہیں؟ میں ابھی اسی فیصلے میں  
تھا ہوا تھا کہ بڑے گیٹ پر چند عورتیں نمودار ہوئیں۔ وہ  
تف عمر کی تھیں۔ وہ گیٹ پر کھڑی اندر کی جانب دیکھ رہی  
تھیں۔ میں نے ان کی طرف دیکھا اور کچھ دور کام کرتے  
سے ملازم سے کہا کہ ان سے پوچھیں کہ کیا بات ہے۔  
مزم نے انہیں دیکھا اور چونکتے ہوئے تیر کی مانند میری  
طرف آیا۔

”یہ تو روشن مسئلے کی بیوی اور اس کی بیٹی ہے، ان کے  
اتھان کی رشتے دار عورتیں ہیں۔“ ملازم نے تیز جیز انداز  
سے بتایا

”یہ یہاں کیا کرنے آئی ہیں؟“ میں نے بے ساختہ  
پوچھا

”جی مجھے کیا پتہ۔“ اس نے بے چارگی سے کہا  
”تو جاؤ جا کر پتہ کرو۔“ میں نے تیزی سے کہا تو ملازم  
گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ وہ ان سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا  
مرواپس پلٹ کر مجھے بتایا

”وہ بڑے میاں صاحب سے بات کرنا چاہتی ہیں۔“  
”کس معاملے میں؟“ میں نے پوچھا

”یہ تو میں نے نہیں پوچھا۔“ اس نے کان کھجاتے  
ہوئے کہا تو میں نے بھناتے ہوئے اس کی طرف دیکھا  
اور پھر گیٹ میں کھڑی عورتوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ  
چمکتے ہوئے اندر آ گئیں۔ وہ ساری میرے سامنے کھڑی  
ہو گئیں۔ سبھی میں نے پوچھا

”لی بی کیا بات ہے؟ کیوں بڑے میاں صاحب سے  
سنا چاہتی ہو؟“

میرے کہنے پر ایک اوجیز عمر عورت ذرا صاف آگے بڑھی

”پھر پتر کیا کروں میں، کوئی بھی میرے ساتھ چلنے کو تیار نہیں۔“ اس نے ایک دم سے روتے ہوئے کہا  
”تمہارے رشتے داروں میں کوئی بھی تیرا ساتھ دینے کو تیار نہیں؟“ اس نے پوچھا تو وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی

”کوئی نہیں جا رہا ہے، سبھی بھٹو سے ڈرتے ہیں۔“  
”وہ اتنا بڑا بد معاش بن گیا ہے۔“ میں نے سرسراتے ہوئے پوچھا

”ہاں، وہی چوہدری سلطان کی پشت پناہی کی وجہ سے۔“ سنی نے دھم سے کہا، پھر چند لمحے سوچ کر بولا،  
”چل میں چلا ہوں تیرے ساتھ، لیکن بعد میں اگر تم لوگ کمر گئے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

”بس میری بیٹی مل جائے، مجھے اور کیا چاہئے۔“ اس نے روتے ہوئے کہا

”چل شاپ پر جا، وہاں سے دسکین میں بیٹھ کر شہر چل، میں آتا ہوں موٹر سائیکل پر۔“ سنی نے کہا تو وہ چند لمحے کھڑی رہیں پھر ساری پلٹ گئیں۔

”تم کیوں یہ سرد روی لے رہے ہو؟“ میں نے تجسس سے پوچھا

”یہ سرد روی لینی پڑے گی، ورنہ دشمن انہیں استعمال کر جائیں گے۔“ سنی نے کہا تو مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا مگر میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا

”میرا کون سا دشمن، ابھی مجھے اپنے دشمن کا پتہ ہی نہیں اور تم خواہ مخواہ میرا دشمن میرے سامنے کھڑا کر رہے ہو۔“  
”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ اس نے مر جھائے ہوئے لہجے میں کہا تو میں اس پر برس پڑا

”دیکھ تیرا اگر کوئی چوہدری سلطان سے بھدا ہے تو اسے خود ہی نیٹ، اس طرح بہانے سے میرا اس کا آئنا سامنا مت کرو۔ ہاں اگر اس نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہے کوئی ظلم کیا ہے تو بتا، پھر کر لیتے ہیں بات۔“  
”میں تم سے بحث نہیں کروں گا، بس ایک بات کہوں گا

جس دن تمہیں یہ پتہ چل گیا کہ وہی تمہارا دشمن ہے، میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھا اور موٹر سائیکل کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے اسے آواز دینا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ وہ موٹر سائیکل انٹارکٹ کر کے وہاں سے

لھکتا چلا گیا۔ مجھے اس پر بہت غصہ آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد میں خود پر قابو پا کر معمول پر آ چکا تھا۔ بھٹو مستی اور فیروز دونوں ہی غائب تھے۔ لیکن اسلم اے ایس آئی تو یہیں تھا۔ مجھے اس تک رسائی حاصل کر کے اسے پکڑنا چاہئے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ انکار کرے گا لیکن مجھے اس سے بدلہ بھی تو لینا تھا۔ اس کے لئے نفرت میرے دل میں بڑھ رہی تھی۔ اسی لمحے میرے اندر یہ ضد بڑھتی چلی گئی کہ اگر کوئی نہیں ملتا تو اسلم اے ایس آئی کو پکڑ لوں، اسی سے مجھے اپنے دشمن کا پتہ چلے گا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی میں اپنے آپ کو روک ہی نہیں سکا۔ میں اٹھا اور اپنی جیب کی جانب بڑھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہی میں نے ڈیش بورڈ میں پڑا پل دیکھا، فالتو میگزین چیک کئے اور پھر ڈیش بورڈ بند کر دیا۔ ملازم سے شہر جانے کا کہہ کر میں جیب لے کر کھولی سے نکل گیا۔

تھانے کے اندر جانے سے پہلے میں نے پل اٹھائی دائیں جانب نیچے میں اڑس لیا۔ میں نے جیب پارک کی اور تھانے کے اندر چلا گیا۔ تھانے کے صحن میں مجھے روشن کی بیوی اور اس کے ساتھ وہی عورتیں دکھائی دیں۔ ان کی نگاہ بھی مجھ پر پڑ چکی تھی۔ ان کی طرف جانے کی بجائے میں حوالات کی جانب گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہی ادھیڑ عمر ابھی وہی پر ہے یا چلا گیا ہے۔ وہ وہاں پر نہیں تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور راؤ ظفر کے کمرے کی جانب چل دیا۔

راؤ ظفر اپنے آفس ہی میں تھا۔ مجھے یوں تھانے میں دیکھ کر چونک گیا۔ پھر بڑی خوش اخلاقی سے اٹھ کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا  
”کہئے کہئے آتا ہوں؟“

”ایک نمبر لکھیں۔“ میں نے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے کہا، ”اس سے مجھے دھمکیاں ملی ہیں کہ میں ہیرک میں ہونے والی لڑائی بھول جاؤں۔“

”اوہ، مجھے پتہ چلا تھا کہ آپ کی وہاں لڑائی ہو گئی تھی۔“ اس نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا تو میں نے صراحت کر دی۔

”لڑائی نہیں، مجھ پر حملہ ہوا تھا، قاتلانہ حملہ۔۔۔۔۔ اور اب یہ دھمکی دی ہے مجھے۔“



اے ایس آئی کے حوالے کر دی گئی تو میں تھانے سے گاؤں جانے کے لئے اُٹھ گیا۔

واپسی پر باد با ساغصہ میرے دماغ میں پھیلا ہوا تھا۔ دشمن ضرب لگا کر چھپ گیا تھا۔ بلاشبہ میری بے بسی کا تماشا کر رہا تھا۔ میں یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا جو راؤ ظفر نے کہی تھی۔ دشمن مجھے اپنے ٹریک پر ڈال رہا تھا۔ میں یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ میں آہستہ آہستہ اس ٹریک پر چل پڑا تھا۔ اگر میں سکون سے گھر بیٹھ جاتا، گھبرا کر، ڈرا کے، خوف زدہ ہو جاتا تو شاید وہ بھی مجھے بھلا دیتے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ واقعی ہی بھلا دیتے؟ جس مقصد کے لئے انہوں نے مجھ پر وار کیا تھا کیا اس طرح اس کا مقصد حل ہو جاتا؟ کیا ان کا یہی مقصد ہے کہ میں خوف زدہ ہو جاؤں؟ آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟ نہ دشمن کا پتہ نہ دشمن کے مقصد کا پتہ؟ اس سے بڑی بے بسی اور کیا ہو سکتی تھی۔

میرا دماغ کئی حصوں میں بٹ چکا تھا۔ میں ایسے بٹے ہوئے دماغ کے ساتھ ڈرائیونگ کرتا ہوا گاؤں واپس جا رہا تھا۔ میرے دونوں طرف کھیت تھیں۔ درمیان میں ایک پتلی سی تار کول کی سڑک تھی۔ آگے تھوڑے سے فاصلے پر ریتلا علاقہ تھا۔ تقریباً آدھا کلومیٹر وہ ریتلا ٹکڑا ہے آب گیا تھا۔ پھر اس کے بعد ایک نہر آتی تھی اور آگے میرے گاؤں تک سارا علاقہ زرخیز تھا۔ میں اس ریتلے علاقے کے پاس آ گیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف ریت تھی اور چھوٹے چھوٹے ٹیلے بنے ہوئے تھے۔ ہوا سے اُڑ کر ریت سڑک پر بھی آ جاتی تھی۔ انہی لمحات میں مجھے اپنے پیچھے ایک جیپ آتی دکھائی دی۔

بلاشبہ اس کی رفتار مجھ سے زیادہ تھی۔ میں سائیڈ مرر میں دیکھ رہا تھا۔ وہ جیپ لمحہ بہ لمحہ میرے نزدیک آتی چلی جا رہی تھی۔ انہیں اصولی طور پر راستہ لینے کے لئے ہارن دینا چاہئے تھا۔ لیکن سر پر پتھر کچھی انہوں نے ہارن نہیں دیا تھا۔ میں انہیں راستہ دینے کے لئے تیار تھا۔ نہانے کیوں مجھے خطرہ سا محسوس ہوا۔ ان جیپ والوں کا انداز مشکوک تھا۔ وہ جیسے ہی میرے برابر پر آئے، میں نے لاشعوری طور پر ان کی طرف دیکھا، میری سائیڈ مرر پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے پستل سپدھا کیا ہوا تھا اور نشانہ لگانے کی تاک میں تھا۔ مجھے کچھ نہیں سوچا تو میں نے اپنی جیپ کو ذرا سا سائیڈ میں

”نمبر نکھوائیں۔“ اس نے مزید بات کرنے کی بجائے پینسل لے کر لکھنے کو تیار ہو گیا تو میں نے اسے نمبر نکھوایا۔ وہ نمبر لکھ چکا تو میں فوراً ہی اپنے اس مقصد پر آ گیا جس کے لئے میں یہاں آیا تھا۔

”وہ اسلم اے ایس آئی کا گھر ہے، اسے تو ذرا بلوائیں، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“ میں نے سکون سے کہا۔ ”وہ کل ہی سے دوبارہ کی چھٹی پر چلا گیا ہے۔“ راؤ ظفر نے دھیمے سے کہا تو میں ہنس دیا پھر بولا

”اس کا مطلب ہے اسے بھی..... خیر، کب تک۔“ ”علی، ایک بات سنو، آب کا جو بھی دشمن ہے ایک نہ ایک دن سامنے تو آ ہی جائے گا لیکن وہ تمہیں جس ٹریک پر ڈالنا چاہتا ہے، وہ بہت ہی خطرناک ہے۔ اس سے بچ جاؤ۔“ اس نے ہمدردی سے کہا

”میں سمجھتا ہوں۔ اس ٹریک کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی بھی مجھے ذیل ٹرک کے صاف بچ جائے گا۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ ہو گیا تھا

”دیکھو، اوپر سے سارے معاملات ہونے، اس تھانے میں.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے پی سے کہا ”ٹھیک ہے، میں کوئی تفتیش تو نہیں کر رہا، بس یونیو اسلم اے ایس آئی کے بارے میں پوچھا تھا، آخر ایک دن وہ ملے گا تو ضرور۔“

میں نے اٹھا کہا ہی تھا کہ وہ عورتیں دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئیں۔ دروازے پر کھڑا سنتری انہیں وہاں سے جانے کا کہنے لگا تھا۔ ان کے ساتھ تھی بھی تھا۔ میں نے ایک نگاہ انہیں دیکھا پھر راؤ ظفر سے کہا

”ان عورتوں کی رپورٹ کیوں نہیں لکھتے؟ یہ بھی اپر سے آرڈر آئیں گے تو لکھیں گے؟“ میرے لہجے میں غمی ابھی تک موجود تھی۔ جس پر راؤ ظفر نے میری طرف دیکھا۔ شاید اس نے خون کے ٹھونٹ پیئے تھے۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر ان عورتوں کو اندر بلا لیا۔ ان سے مسئلہ پوچھتا رہا، یہ وہی تھا وہ جو پہلے مجھے بتا چکی تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے انہیں تھانے کے کھٹی کے حوالے کیا تو میں اٹھ گیا۔ تھی میری طرف دیکھتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کس قسم کے جذبات نمودار نہیں ہوئے تھے۔ رپورٹ لکھ کر ایک

تین باب سے یہ کہیں  
امید اور ناامیدی کے درمیان پرورش پاتی حسین داستانیں

# حجاب کرچی

شع ہو گیا ہے

محبت نرتن میراں سے مین، قاتل قاتل باپوں

میرے خواب زندہ ہیں

شب آرزو تیری چاہ میں

عشق دی بازی

اس کے علاوہ دنیا ادب کے نئے  
ستارے ہر ماہ اس میں شامل ہیں

Infoohijab@gmail.com

021-35620771/2

0300-8264242

کر کے ایک دم سے رفتار کم کر دی۔ وہ اپنی جو تک میں آگے نکل گئے۔ اسی اثناء میں وہ فائر کر چکے تھے۔ فائر میری جیب کے بونٹ پر لگا تھا۔ میرے اچانک رکنے سے وہ کئی گز دور آگے نکل چکے تھے۔ ہمارا درمیانی فاصلہ کوئی سو قدم کارہا ہوگا۔ جب تک میں بھی سرعت سے اپنا پہل نکال چکا تھا۔ میں نے شیفتی کچھ ہٹایا اور سامنے فائرنگ کرنے لگا۔ میرا پہلا نشانہ ان کے ٹائر پر تھا، جیسے ہی فائر ٹائر میں لگا ایک دھماکا ہوا۔ ابھی سامنے سے کئی فائر ہوئے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کتنے لوگ تھے۔ لیکن فائرنگ ایک دم سے ہوئی تھی۔ مجھے بہت محتاط ہو کر ان کی فائرنگ کا جواب دینا تھا۔ میں جیسے ہی سر اٹھا تا، سامنے سے ایک دم فائرنگ ہو جاتی۔ وہ میری تاک میں تھے۔

اس وقت میں اکیلا تھا۔ اس لئے مجھے مشکل ہو رہی تھی۔ میں گھبرا جا چکا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھے انہیں خبر تھی کہ میں شہر سے گاؤں جا رہا ہوں۔ مگر یہ وقت ان سوچوں کا نہیں تھا۔ مجھے ایک ایک گولی، درست طرح سے استعمال کرنا تھی۔ شدید فائرنگ سے میری جیب کا سامنے والا حصہ بے کار ہو چکا تھا لیکن انجین ابھی تک سٹارٹ تھا۔ میں نے محتاط انداز میں سر نکالا اور سامنے ایک شخص کو دیکھ کر تاک کے نشانہ لیا۔ فائر کے ساتھ ہی ایک چیخ بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی سامنے سے زوردار فائرنگ ہونے لگی۔

اچانک مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے دائیں جانب سے بھی فائرنگ ہونے لگی ہے۔ میں نے تھوڑا غور کیا تو ایک ٹیلے کی اوٹ میں کوئی شخص سامنے کھڑی جیب کا نشانہ لے کر فائرنگ کر رہا تھا۔ وہ کون تھا؟ میں اس پر فوری طور پر دماغ نہیں کھپایا بلکہ اس کا فائدہ اٹھالیا۔ وہ جیسے ہی فائر کرتا، سامنے سے لحد بھوکو فائر ترک جاتا، ابھی میں فائر کر دیتا۔ دو میگزین خالی ہو چکے تھے اور میں تیسرا لوڈ کر رہا تھا۔ ابھی مجھے احساس ہوا کہ یہ کمیل اب ختم ہونا چاہئے، وہ جو سائیڈ میں سے فائرنگ کر رہا ہے اگر اس کے پاس گولی نہ رہی تو وہ کیا کرے گا؟ مجھے اس کا فائدہ چند لمحوں میں اٹھانا تھا۔

اس نے جیسے ہی فائر کیا، میں نے تاک کر نشانہ لیا، دوسری چیخ بلند ہوئی تو اس کے ساتھ ہی سامنے والی جیب میں حرکت ہوئی، وہ پھٹے ہوئے ٹائر کے ساتھ ہی پھل پڑے تھے۔ میں ٹیلے کی اوٹ، میں موجود اپنے جھنکے کھٹا چاہتا



مشکوک ہو چکا تھا۔ وہ شام ڈھلنے تک نہیں آیا۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے نہ آنے سے میری سوچوں کو تقویت ملنے لگی تھی۔ میں بابا کو اس فائرنگ کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا لیکن میں فوری طور پر جیپ کو نہیں چھپا سکتا تھا۔ انہیں پتہ چل گیا تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد بولے

”کیا پولیس کو اطلاع دی تم نے؟“

”نہیں، لیکن ابھی بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور تھا نے فون کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد راؤ ظفر سے میرا رابطہ ہو گیا۔ میں نے اسے سارے واقعہ کے بارے میں مطلع کیا۔ اس نے رپورٹ بنانے کے لئے بندے بھیجنے کا کہہ دیا۔ میں نے زیادہ بات نہیں کی اور فون بند کر دیا۔ بابا کافی حد تک مطمئن ہو گئے تھے۔

”بیٹا، تم ایسا کرو، کچھ دن کے لئے لاہور چلے جاؤ، وہاں چند دن رہو، پھر فریش ہو کر واپس آنا۔“

”بابا، میں جانتا ہوں آپ یہ مجھے کیوں کہہ رہے ہیں، میں نے جانا تھا لاہور اپنا مکمل چیک اپ کرانے لیکن اب نہیں، اب میں گیا تو میرا دشمن یہی سمجھے گا کہ میں ڈر گیا۔“ میں نے بڑے ادب سے انہیں اپنا موقف بتا دیا

”نہیں بیٹا، دشمن کا مقابلہ طاقت سے زیادہ عقل سے کیا جاتا ہے۔ بھرپور وار کے لئے تھوڑا پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔“ بابا نے سمجھاتے ہوئے کہا

”لیکن دشمن سامنے ہو اور میں اس پر وار کر رہا ہوں تب نا، ابھی تو میں نے اسے تلاش کرنا ہے۔“ میں نے اپنا لہجہ مودب رکھا

”پھر بھی چند دن کے لئے ہی سہی تم ابھی چلے جاؤ۔“ انہوں نے پھر سے کہا تو میں انکار نہیں کر سکا تھا۔ اس لئے کہا

”ٹھیک ہے بابا، میں چلا جاؤں گا ایک دو دن میں۔“

”نہیں، تم آج ہی جاؤ گے۔“ بابا نے کافی سختی سے کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا

”بابا اگر یہی حیلے مجھ پر لاہور میں بھی ہونے لگے تو پھر کیا کروں گا؟“

تھا۔ جیسے ہی وہ جب دور ہوئی، نیلے میں سے وہ شخص سامنے آ گیا مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حسرت ہوئی کہ وہ سچی تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، سڑک کے بالکل بیچ اس کا بایک اوندھا بڑا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی بایک کی جانب بڑھا اور اس پر سوار ہو گیا۔ میں اپنی جیب سے نیچے اتر آیا۔ میں اس کی راہ روکنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے تیزی سے کہا

”ابھی خطرہ ہے، وہ نہر پر ہو سکتے ہیں۔“ یہ کہتے ہی وہ چل پڑا۔ میں تیزی سے جیب میں بیٹھا اور چل دیا۔ میں نہر کے پل پر جا کر رک گیا۔ وہاں نہر کے پل کے آپ پاس چند دوکانیں تھیں۔ ایک درخت کے نیچے حمام بیٹھا ہوا تھا۔ سچی اس کے پاس کھڑا سے پوچھا رہا تھا

”اُویار پیچھے بڑی فائرنگ ہوئی ہے، تم لوگوں نے سنی؟“

”ہاں آواز تو ہم نے بھی سنی، پر یقین اس وقت ہوا جب ایک پھٹے ہوئے ٹائر والی جیب ادھر گئی ہے۔“ اس نے نہر کے ساتھ ساتھ جانے والے راستے کی جانب اشارہ کیا۔ بلاشبہ وہ سڑک سے ہٹ گئے تھے۔ انہیں ٹائر بدلنا تھا۔ ان میں کوئی نہ کوئی زخمی ہو گیا تھا، انہیں پچھانا ان کی مجبوری تھی۔ وہ نہر کے ساتھ ساتھ جا کر اگلے پل سے دوسری سڑک پر چڑھ سکتے تھے۔ یہ فاصلہ کوئی تین کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ میرا اس طرح ان کا پیچھا کرنا بہت خطرناک تھا۔ سچی نے میری جانب دیکھا اور آنکھ کے ہلکے سے اشارے سے جانے کو کہا۔ میں کوئی بات کہنے بنا چل دیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ بلاشبہ وہاں پل پر موجود لوگوں نے میری جیب کی حالت بھی دیکھی ہوگی۔ کسی نے مجھ سے پوچھا نہیں تھا لیکن وہ سمجھ گئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ وہ میرے پیچھے حویلی میں آئے گا لیکن سچی نے ایسا نہیں کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ اتنی جلدی میرے پیچھے کیسے آ گیا؟ کیا اسے علم تھا کہ مجھ پر فائرنگ ہونے والی ہے؟ کیا وہ ہر وقت اپنے ساتھ مسل رکھتا ہے یا اسی موقعہ کے لئے اس نے مسل اپنے ساتھ لیا تھا؟ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ کیا میرا اعتماد جیتنا چاہتا ہے؟ ایک دم ہی سے کئی سوالوں نے مجھے گھیر لیا۔ سچی کا کردار میرے لئے

میری طرف دیکھ کر بولے

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ وہاں تم کیا کرو گے۔ ٹھیک ہے تم وہاں سے زیادہ یہاں محفوظ ہو۔ بس باہر نہ نکلا کرو۔“ انہوں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا تو میں نے بابا کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ پھر ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا

”بابا میں جانتا ہوں کہ میں اکلوتا ہوں۔ مجھے اس دنیا کے ساتھ چلنا ہی نہیں اس کا مقابلہ بھی کرنا ہے۔ میں نے یہاں رہنے کے نہ صرف بہت سوچا ہے بلکہ اس کی تیاری بھی کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ میرا ایس مت، میں دیکھ لوں گا جو کوئی بھی ہے۔“

”یار بھی کبھی مجھے گمان ہوتا ہے، کہیں یہ سب اکبر تو نہیں کروا رہا، جائیداد کا اسے ہی فائدہ مل سکتا ہے۔“ بابا نے اپنا شک ظاہر کیا تو میں نے انہیں یقین دلواتے ہوئے کہا

”بابا، اس میں اتنی جرات نہیں کہ وہ اتنا بڑا اکیلے بھیل سکے۔ میں جانتا ہوں وہ کس بات پر ناراض ہے۔ میں لحوں میں اس کی ناراضگی دور کر سکتا ہوں۔ اکبر دل میں کینہ رکھ سکتا ہے، مجھ سے یا آپ سے حسد کر سکتا ہے، کہیں بھی ہماری مخالفت کر سکتا ہے لیکن ایسا نہیں کر سکتا جو ہو رہا ہے۔“

”ہاں ایسا تو ہے، لیکن یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟“ بابا نے کہا

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میری اتنی بڑی دشمنی کسی کے ساتھ نہیں تھی اور نہ حالیہ دنوں میں ہوئی ہے۔ نہ آپ کا ایسا کوئی وکیلہ رہا ہے۔ خیر دیکھتے ہیں کون ہے۔ سنبھال لیں گے اسے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے ادب سے کہا اور پھر انہیں صوفے پر بٹھا دیا۔ سچی وہ پھر کچھ نہیں بولے۔ میں انہیں زیادہ ڈسٹرپ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا تا کہ ان کی توجہ بٹ جائے۔

☆.....☆.....☆

شام ہونے لگی تھی۔ ہم رات کا کھانا کھا چکے تھے۔ میرا دماغ اسی ادھیڑ میں تھا کہ اگر اسلم اے ایس آئی غائب ہو گیا ہے تو اس کے بارے میں پتہ کروایا جا سکتا ہے۔ گاؤں میں ایسے لوگ تھے جو بھٹو مسکی یا فیروز کے بارے

میں اطلاع دے سکتے تھے۔ میں اس معاملے میں مدد لینے کے بارے میں سوچ رہا کہ وہ کون بندہ ہو جو یہ میرے لئے انتہائی خاموشی یہ کام کر دے۔ اسلم ای ایس آئی کے لئے مجھے شہر سے کوئی بندہ تلاش کرنا تھا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شہر سے چند پولیس والے آگئے۔ وہ رپورٹ لکھنے آئے تھے۔ انہوں نے حالات کے بارے میں تفصیلی لکھا، مجھے سے کچھ دیر سوال جواب کرتے رہے پھر مہمان خانے میں کھانا کھا کر واپس چلے گئے۔ انہیں کتنے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا کہ چوہدری سردار ایم پی اے کی کار آڑگی۔ اسے مہمان خانے میں موجود خاص کمرے میں بٹھایا گیا۔

”میں تو آج آیا ہوں لاہور سے پورے بیس دن بعد، مجھے بتایا تو تھا میرے ایک آدمی نے لیکن اتنا بڑا مسئلہ بن جائے گا، یہ تو گمان میں بھی نہیں تھا، ویسے بات کیا ہوئی ہے؟“ اس نے پوچھا تو بابا اسے بتانے لگے۔ میں غور سے بات سن رہا تھا۔ میں اس وقت چونک گیا جب بابا نے ارم کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ جیل کے اندر تک رسائی کے بارے میں بابا نے یہی بتایا کہ ان کے ایک دوست کی وجہ سے یہ ممکن ہوا۔ مجھے تھوڑا تعجب تو ہوا لیکن میں خاموش رہا تا کہ ان سے بعد میں اس بارے پوچھوں گا، بابا ساری بات کہہ کر بولے

”اب جو کوئی بھی دشمن ہے، پتہ نہیں اسے علی سے کیا میرے۔“

”دیکھیں، میں جیسا بھی ایم پی اے ہوں، مانتا ہوں کہ اپوزیشن میں ہونے کی وجہ سے آج کل میری شنوائی کہیں نہیں ہے۔ تھانے والے بھی میری بات نہیں مانتے لیکن پھر بھی اتنا گیا گزرا تو نہیں ہوں کہ آپ کی کوئی مدد ہی نہ کر سکوں۔ کچھ تعلق تو اب بھی ہیں نامیرے۔“ اس نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا

”ہماری کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے تو ہم کیا کہیں اس معاملے میں چوہدری صاحب۔“ بابا نے سکون سے کہا ”علی نوجوان ہے اور یہ لڑکے بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ کسی وقت بھی، کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا

”آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے، لیکن میرا نہیں خیال علی جذباتی ہے، اور کبھی بھی اس کے کسی جذباتی پن کی وجہ



اس نے مجھے تھانے میں ذلیل کیوں کروایا؟ مجھے تنہی کی باتیں ٹھک ٹھک لگتی تھیں۔ اس نے اگر چہ ہدیری سلطان کی طرف انگلی اٹھائی تو ٹھیک اٹھائی تھی۔

میں بے چین ہو گیا۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ میں ابھی اٹھوں اور سیدھا جا کر چوہدیری سلطان کو کروں سے دیوبند لوں۔ اس پر سوچا جتنا آسان تھا، اس پر عمل کرنا اتنا ہی مشکل تھا۔ اور پھر یہ نری بے وقوفی تھی کہ بنا سوچے سمجھے کسی پرچہ دھوڑا جائے۔ بابا اور چوہدیری سردار آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان کی باتوں میں ہنگامہ بھی نہیں دیا تھا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ میرے اندر کھد بد ہو رہی تھی کہ میں پتہ کرواؤ کہ واقعی وہ جیب چوہدیری سلطان کے ڈیرے پر کھڑی ہے؟

میں حویلی کے کارپڈروں میں آ گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کا تھپڑ اڑا تو احساس ہوا کہ باہر کافی ٹھنڈی۔ مگر میرے اندر کی آگ نے اس ٹھنڈ کو محسوس نہیں کیا۔ میں اپنے کسی بھروسہ والے دوست کو فون کر کے پتہ کروانا چاہ رہا تھا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ دوسری جانب تنہی تھا۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری اطلاع کا بھی یقین نہیں آیا ہو گا لیکن میں نے اپنی کبھی ہوئی بات پوری کر دی ہے۔ میں اس وقت تک تمہیں ثبوت دیتا رہوں گا جب تک تم مانو گے نہیں۔“

”تمہاری اطلاع کچی ہے؟“ میں ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم ایسا کرو، اپنے فون کا نیٹ آن کرو، میں تمہیں اس کی تصویریں بھیج دیتا ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا تو میں حیران ہوا۔ حتیٰ اس قدر شہید ہو چکا ہے۔ کیا مجھے اس پر یقین کر لینا چاہئے یا وہ مجھے ٹھکر کر اس کے ڈیرے پر لے جانا چاہتا ہے؟ میں مذہب کا شکار ہو گیا۔ میں نے بادل نحوستہ فون نیٹ آن کیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تصویریں مجھے موصول ہوئیں۔ فائرنگ زدہ جیب ڈیرے کے کنارے میں کھڑی تھی۔ اسے چھپایا نہیں گیا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ جیسے یہ مجھے دعوت دی جا رہی ہو کہ یہ لوہم یہاں ہیں، ہمارا جو کرنا ہے کر لو۔ غصہ میرے دماغ میں شوکر میں مارنے لگا تھا۔ وہ تصویریں جیج جیج کر مجھے میری اوقات یاد دلانے لگی

سے کسی کو نقصان ہوا ہو۔ اب اگر اپنی جان پر بن جائے، کوئی جان کے ہی درپے ہو جائے تو پھر اپنا دفاع تو کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً جیسے آج ہی کی فائرنگ کی بات لے لیں، اگر اس کے پاس پہل نہ ہوتا تو کیا صورت حال بنتی۔“ بابا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”یہ علی اپنے ساتھ پہل رکھتا ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا

”نہیں، یہ تو اب حالات کی وجہ سے رکھا، اس کا اپنا آئی لائسنس والا پہل ہے۔“ بابا نے وضاحت کر دی۔

”بہر حال جو بھی ہے وہ اچھا نہیں کر رہا۔ ویسے میں آپ کو ایک مشورہ دوں، آپ اسے یورپ بھیج دیں پڑھنے کے لئے۔ نہ یہاں ہو گا نہ کوئی دشمنی بنے گی اس کی کسی کے ساتھ۔“ ایم پی اے نے کہا

”میں چوہدیری صاحب بھیج دوں لیکن کسی دشمنی کا پتہ تو چلے۔ ہم سے کوئی زیادتی ہوئی ہو، کوئی تصور ہو گیا ہو، ہم سے، کسی پر ظلم کیا ہو۔ اب کوئی خواہ مخواہ ہمیں یہاں سے دھکیلنا چاہے تو مرضی ہے۔“ اس بار بابا تھوڑا غصے میں آ گئے تھے۔ ان کے درمیان ایسی ہی بے سرو پا گفتگو جاری تھی کہ میرے سیل فون پر ایک میسج آ گیا۔ صرف دو سطریں تھیں۔

”جس جیب سے تم پر فائرنگ ہوئی تھی، وہ جیب چوہدیری سلطان کے ڈیرے پر کھڑی ہے۔ یقین نہ آئے تو پتہ کروالو۔“

وہ میسج تنہی کی طرف سے تھا جسے پڑھتے ہی مجھے اچھانہ لگا۔ میرے دماغ میں ایک دم سے غبار چڑھ گیا۔ یہ تنہی مجھے سلطان کے مقابلے پر لا کر ہی کھڑا کرے گا۔ لیکن اگلے چند منٹ بعد میرے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا۔ یارا کروہ جیب وہاں کھڑی ہے تو اس کا مطلب ہے وہ چوہدیری سلطان کی ایماء پر ہی کھڑی ہے؟ کیا اسے نہیں معلوم کہ جیب والوں نے مجھ پر فائرنگ کی تھی؟ اس کا مطلب ہے چوہدیری سلطان ہی میرا دشمن ہے جو یہ ساری چال بازیوں کر رہا ہے۔ کیا وہ اس قدر رسائی رکھتا ہے کہ ہیرک میں موجود غنڈے بھی اس کی بات مانتے ہیں؟ کیا وہ اتنا مضبوط بد معاش بن گیا ہے کہ علاقے کے لوگوں پر ہاتھ ڈال سکے۔ میں جوں جوں سوچتا چلا جا رہا تھا، میرے اندر آگ بھڑکنے لگی تھی۔ میں نے تو اس کا کوئی نقصان نہیں کیا تھا مگر



تھیں۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی وار کرنے کے بعد سامنے کھڑا مسکرا رہا ہو۔ غصے سے میرا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔

جاؤں، نہیں میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لوں گا۔“

”سیدھا کہو، تم میں دشمن کا سامنا کرنے کی جرات ہی نہیں ہے۔ بس میں نے سمجھ لیا، تم کچھ نہیں کر سکتے ہو۔ لیکن ایک بات سن لو اور سمجھ لو، یہ لوگ اس وقت تک تمہیں چین سے بیٹھے نہیں دیں گے۔ جب تک ان کا مقصد حل نہیں ہو گیا۔ تم مجھے جب بھی آواز دو گے، میں تمہارے لئے حاضر ہوں۔“ وہ کھوکھو بھرے لہجے میں کہتے ہوئے فون بند کر گیا۔ میں سیل فون کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ اس نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ مگر میں اس پر یقین بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سرد ہوا کے جھوکے سے میرے بدن میں ایک لہر سرائت کر گئی۔ میرے بدن پر ایک گرم شال بھی جوڑھلک گئی تھی۔ میں نے چادر کو سمیٹا اور اندر کی جانب چلا گیا۔ چوہدری سردار ابھی تک بابا کے ساتھ مہمان خانے میں موجود تھا۔ میں اندر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

میں سگ رہا تھا اور مجھے کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنی الماری کھولی، اس میں دھری ہوئی کن کو دیکھا، اسے نکال کر چیک کیا، پھر واپس رکھ دی۔ پسل اٹھایا، اسے دیکھا اور پھر رکھ دیا۔ مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ میں نے چادر ایک جانب رکھی اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ مگر مجھے نیند بالکل بھی نہیں آ رہی تھی۔ میرے اندر بیٹھا ہوا انسان مجھے غیرت دلا رہا تھا۔ جلتی پرتیل کا کام تپتی کے لفظ تھے۔ میرے ساتھ ہونے والا ذلت آمیز سلوک مجھے مرنے مارنے پر آمادہ کر چکا تھا۔ میں بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔ میرے کمرے میں اندھیرا تھا۔ باہر کی روشنی چمن کرا اندر آ رہی تھی۔ انہی لمحات میں چوہدری سردار کی گاڑی پورچ سے نکلی اور گیٹ پارک کر گئی۔ چوکیدار نے گیٹ بند کر دیا تھا۔ بابا حویلی کی طرف آرہے تھے۔ انہوں نے اپنے کمرے میں چلے جانا تھا۔ میں وہاں کھڑا سب دیکھتا رہا۔

رات کا دوسرا پہر تھا۔ ہر جانب سناٹا تھا۔ میرے اندر وہ کیفیت فخم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ میں پاگل ہونے والا ہو گیا تھا۔ بھی میں نے ایک لمحہ کے لئے سوچا اور اٹھ گیا۔ میں نے الماری سے چین کے ساتھ جیکٹ نکالی، اسے پہنا۔ اس میں پسل کے ساتھ سائیکس اور میگزین

اب میرے پاس دو ہی راستے تھے، چپ چاپ خاموشی سے اپنے گھر میں دبک کر بیٹھ جاؤں۔ تپتی کے بتانے کے باوجود یوں بن جاؤں کہ جیسے مجھے پتہ ہی نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہو کہ میں سیدھا ڈیرے پر جاؤں اور جا کر انہیں ایسا سبق سکھاؤں کہ دوبارہ میری طرف دیکھنے کی جرات نہ کریں۔ میرا دل بھی لمبی چاہ رہا تھا لیکن انہیں لمحات میں ارم کی کمی ہوئی بات میرے دماغ میں گونج گئی۔ تلوار کے مقابلے میں لاشیں نہیں اٹھانی چاہئے۔ اس کے ڈیرے پر پتہ نہیں کیا تھا، کتنے لوگ تھے اور میں اکیلا تھا۔ میں نے تو اس کا ڈیرہ بھی نہیں دیکھا ہوا تھا۔ اس وقت میری بے بسی کی انتہا تھی۔ میں خود کو روکنے میں ناکام ہو رہا تھا لیکن میں خودکشی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اچانک فون بیل ہوئی تو میں چونک گیا۔ وہ فون تپتی کا تھا۔ میں نے بادل خواستہ کال ریسو کر لی۔ میرے ہیلو کے جواب میں وہ بولا

”ان کے دو بندے زخمی ہوئے ہیں۔ ایک کے کاندھے پر گولی لگی ہے اور دوسرے کی ران پر فائر لگا تھا۔ وہ دونوں ہسپتال میں ہیں اس وقت۔ تین بندے وہیں ہسپتال میں ہیں۔ ڈیرے پر صرف دو بندے ہیں۔ کہو تو میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔“

”دیکھ تپتی، میں اپنی جنگ خود لڑوں گا۔ تم نے معلومات دے دیں، تمہارا شکر یہ، میں قانون کے دائرے میں.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ بھٹکا کر بولا

”قانون، تجھے پتہ ہے قانون نے تیرے ساتھ کیا کیا ہے۔ نہیں علی، میں جو سمجھتا تھا کہ تم میں دل گردہ ہی نہیں ہے، میں غلط سمجھ رہا تھا کہ تم میں تھوڑی بہت بھی غیرت ہے۔ لڑکیوں میں رہ رہ کر تم بھی لڑکی بن گئے ہو۔ مان لو تم بزدل ہو۔ تم اپنی جنگ لڑ بھی نہیں سکتے ہو۔ جاؤ سو جاؤ جا کر۔ میں پاگل تھا جو تمہیں.....“ اس نے انتہائی غصے میں کہا تو میں اس بات کاٹتے ہوئے تیزی سے فیصلہ کن لہجے میں بولا

”تمہارا کیا خیال ہے میں بھی غنڈہ اور بد معاش بن



”بہت ہے تیل۔“ اس نے کہا پھر دوبارہ گن کی جانب دیکھ کر بولا، ”علی پتر، تمہارے ارادے ٹھیک نہیں ہیں؟“

”ہاں، لیکن تم فکر مت کرو، چپ چاپ خاموشی سے ادھر بڑے رہو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”نہیں علی، میں تمہاری جگہ ہوتا تو یہی کچھ کرتا، اب تک میں نے بندے پھر کا دیئے ہوتے۔ مجھے ساتھ لے چلو، میں تمہارے بہت کام آسکتا ہوں۔“ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو میں نے غصے میں پوچھا

”تجھے پتہ ہے چاچا، میں کہاں جا رہا ہوں؟“

”ہاں، مجھے اندازہ ہے، تم چوہدری سلطان کے ڈیرے پر جا رہے ہو۔“ اس نے تیزی سے کہا تو میں نے لمحہ بھر فیصلے کے بعد کہا

”چل پھر نکال موٹر سائیکل اور چلو میرے ساتھ۔“ میں نے کہا ہی تھا کہ اس نے انتہائی تیزی سے چادر لیٹی، دوسرے کمرے سے موٹر سائیکل نکالا اور کنگ مارکر شارٹ کرتے ہوئے بولا

”آپتر، دیکھتا ہوں اس بد معاش کو۔“

میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اس نے بھی گن لے لی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے یوں باہر دیرانے میں رہنا تھا تو تھک یا راس رکھنا پڑتا تھا۔ اس نے ہیڈ لائٹ روشن کئے بغیر جی سڑک پر موٹر سائیکل ڈالا اور احتیاط سے چلا چلا گیا۔ یہ دیہاتی لوگ، جو باہر کیتوں میں اپنی زندگی گزارتے ہیں، جن کے چاروں طرف زیادہ تر راتوں کا اندھیرا ہوتا ہے، اس کے وہ عادی ہو چکے ہوتے ہیں، رستے ان کے دیکھے بھالے ہوتے ہیں۔ انہیں ارد گرد کی بڑی خبر ہوئی ہے۔ اگر کوئی چور نہیں بھی ہوتا تو چوروں سے نپٹنے کے سارے گر جانتے ہیں۔ چاچا فیضو تو خود کسی زمانے میں بڑا اکھڑ تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے سفر کے بعد اس نے موٹر سائیکل روک کر بند کر دی۔ کچھ دیر تک وہ خاموشی سے ارد گرد کی سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا پھر دھیسے بولا

”یہاں سے کوئی دو سو قدم بالکل سامنے چوہدری سلطان کا ڈیرہ ہے۔ ہم موٹر سائیکل یہیں چھوڑتے ہیں۔ یہاں سے پیدل جاتے ہیں۔“

رکھے۔ گن اٹھائی اور انتہائی خاموشی سے باہر آ گیا۔ میں سامنے کی طرف سے نہیں گیا۔ چوکیدار اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا تھا۔ میں نے سائیز والی دیوار پارکی اور حویلی سے باہر آ گیا۔ میں نے چوہدری سلطان کا ڈیرہ دیکھا ہوا نہیں تھا لیکن مجھے اندازہ تو تھا کہ وہ کہاں ہو سکتا ہے۔ وہ ڈیرہ زیادہ سے زیادہ تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میں اس طرف نہیں گیا بلکہ سیدھا اپنے ڈیرے پر چلا گیا۔ وہاں پہنچنے میں مجھے آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ وقت لگ گیا۔

ڈیرے پر ہمارا مزارع چاچا فیضو تھا۔ کوئی وقت تھا، اس کا پورے علاقے میں طوطی بولتا تھا۔ وہ ایک پہلوان ہی نہیں، اچھا خاصا جتھ چھٹ بھی تھا۔ نو جوانی کے دنوں میں وہ ناک پر کھسی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ تھوڑا فربہ بال، کھلی فضا میں رہنے والا صحت مند دیہاتی تھا۔ پھر وقت کے ساتھ اس نے یہ سب چھوڑ دیا۔ اولاد جوان ہو گئی۔ اس کا سارا خاندان گاؤں میں رہتا تھا۔ اس کی بیوی بچے اور ایک بہو ہماری زمینوں پر کام کرتے تھے۔ بابا نے دوسرے مزارعوں کی دیکھ بھال بھی اسی کے ذمے لگا دی۔ اب ڈیرے پر وہی ہوتا تھا۔ رات گئے تک اس کے پرانے سنگی سامی وہاں بیٹھے رہتے۔ وہ اب اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ بابا نے اسے موٹر سائیکل لے کر دی ہوئی تھی۔ وہ موٹر سائیکل ڈیرے پر ہی ہوتا تھا۔ وہ کہتے ہیں ناچور، چوری سے جائے پر ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ اسی طرح اس نے بد معاشی تو چھوڑ دی تھی لیکن شوق اس کے اب بھی وہی تھے۔ میں ڈیرے میں داخل ہوا تو ہمارے پالتو کتے سیدھے میرے پاس آ گئے۔ میں ان کے پاس رک گیا۔ چاچا فیضو خبردار قسم کا بندہ تھا۔ وہ فوراً دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس نے مجھے یوں پیدل اتنی رات گئے دیکھا تو تشویش زدہ لہجے میں بولا

”علی پتر، سب خیر تو ہے نا؟“

”چاچا خیر! موٹر سائیکل کہاں ہے؟“

”وہ ادھر دوسرے کمرے میں کھڑا ہے۔“ اس نے گن کی جانب دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بتایا

”باہر نکالو اسے، تیل ہے نا اس میں؟“ میں نے دھیسے سے پوچھا

## صحبت نیکان

مسلمانو! اپنے سے بڑوں کے پاس بیٹھا کر عالموں سے سواں کیا کرو اور آتش مندوں سے ملا کرو۔ (طبرانی)

ہر انسان اپنے دوست کے مشرب پر ہوتا ہے۔ پیس پہلے ہی سے دیکھ لیتا چاہئے کہ وہ کس کو دوست بناتا ہے۔

(مشکوٰۃ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک شخص نے عرض کیا۔ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کسی نیک آدمی سے اس کے نیک اعمال کے باعث محبت کرتا ہے مگر وہ خود نیک اعمال اتنے نہیں کرتا جیسے اس نیک آدمی کے اعمال ہیں۔“ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”کچھ مضائقہ نہیں۔ آدمی قیامت میں اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ (یعنی) اس نیک کی صحبت کا اسے صلہ ملے گا۔

(بخاری)

## عہد شکنی کا وبال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس قوم میں عہد شکنی کی عادت پھیل جاتی ہے اس میں خوں ریزی بڑھ جاتی ہے۔ اور جس قوم میں بدکاری پھیل جاتی ہے اس میں موتوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔

(ابوداؤد۔ حاکم نسائی)

یہ کہہ کر اس نے مونڈ سائیکل ایک درخت کے ساتھ لگا دیا۔ گن ہاتھ میں لے کر چادر کو اچھی طرح خود سے لپیٹا اور میرے آگے آگے چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا چلا گیا۔ ڈیرے کے بالکل قریب پہنچ کر اس نے مجھے روک دیا۔ میں رک گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ڈیرے کی دیوار کے سب سے قریب درخت پر چڑھ گیا۔ وہ اس قدر خاموشی سے درخت پر چڑھا تھا کہ میں بالکل قریب تھا، مجھے اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ واپس اتر آیا۔ نیچے اترتے ہی بولا

”میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ چھت پر تو کوئی پہرا نہیں دے رہا۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔ نہ کوئی سخن میں ہے اور نہ کوئی اس وقت برآمدے میں موجود ہے۔ اگر کوئی ہوا تو وہ اندر کر دے ہی میں ہوگا۔“

”کتنے کمرے ہیں؟“ میں نے پوچھا

”چھ کمرے ہیں اور ایک بڑا ہال نما کمرہ ہے جو بھینسوں کا باڑہ ہے۔“ اس نے مجھے بتایا تو میں نے گن اپنے کاندھے پر لٹکانی اور خود درخت پر چڑھنے لگا۔ لڑکپن میں کھیلے ہوئے کھیل اس وقت کام آ رہے تھے۔ میں نے کافی اونچائی پر جا کر دیکھا۔ چاچا فیضو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ برآمدے میں جہاں ہوا ایک مدقوق بلب وہاں کی صورت حال بتا رہا تھا۔ وہاں موجود کتے کھلے ہوئے تھے۔ وہ سخن میں بے چینی سے پھر رہے تھے۔ شاید انہیں ہمارا احساس ہو گیا تھا۔ یہ وہ کتے تھے جو بھونکتے کم اور لوگوں کو چر بھاڑ دینے میں وقت نہیں لگاتے تھے۔ میں نے پھل نکالا، اس پر سائیکسٹکس کر کے خود کو ایک شاخ کے ساتھ مضبوط کیا۔ میری جانب رخ کئے ہلکی ہلکی ننگ ننگ کرنے والا کتا میرے نشانے پر تھا۔ اسی کتے کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ وہ ایک دم سے پھر پھری لے کر تڑپا، پھر سخن میں لوٹ پوٹ ہونے لگا، اس سے پہلے کہ دوسرا بھونک کر اندر بڑے لوگوں کا الٹ کرتا، میں نے اس کا بھی نشانہ لیا، وہ بھی سخن میں گر کر تڑپنے لگا۔ میں تیزی سے نیچے اتر آیا۔ میرے سامنے کوئی دس فٹ کی دیوار تھی۔ جو بھی توپکی اینٹوں کی لیکن گارے سے بنائی ہوئی تھی۔ اس میں درزیں بنی ہوئی تھیں۔ چاچا فیضو آگے بڑھا، اس نے اپنا کاندھا لگا یا اور میں دیوار پر چڑھ گیا۔ دیوار کے ساتھ اندھیرا تھا۔ چاچا



”مجھے پہچان گئے ہو میں کون ہوں؟“ میں نے نفرت سے پوچھا تو اس نے ہان میں گردن ہلاتے ہوئے کہا  
 ”ہاں..... وہ.....“

”کس نے مجھ پر فائر کرنے کے لئے کہا تھا؟“ میں نے پوچھا تو وہ بے چارگی سے بولا  
 ”چوہدری سلطان نے۔“

اس نے یہ لفظ کہے ہی تھے کہ میں نے اس پر فائر کر دیا۔ کوئی اس کے سننے پر لگی تھی۔ وہ وہیں پردہرا ہوتا چلا گیا۔ اب وہاں پر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے ان کے دو بندے مار کر ان کی دھنکی کا جواب دے دیا تھا۔ جب وہ دونوں ساکت ہو گئے تو میں واپس پلٹا اور حین میں آ گیا۔ جہاں سامنے وہی جیب کھڑی تھی، جس پر فائر لگے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر اچانک میرے دماغ میں آیا کہ انہیں کوئی نشانی تو دے کر جاؤں کہ ان بندوق کو کون مار گیا ہے؟ میں نے اس جیب کی تنکی میں فائر مارا، تیل گرنے لگا۔ میں نے باہر جا کر پھر سے فائر کیا تو تیل سے آگ لگ گئی۔ میں تیزی سے باہر بھاگا۔ چاچا فیضو پہلے ہی موٹر سائیکل شارٹ کر چکا تھا۔ ہم نے ارد گرد نہیں دیکھا، بس وہاں سے نکلے چلے گئے۔

چاچا فیضو مجھے حویلی کے قریب اتار کر چلا گیا۔ میں نے اپنی حویلی کی دیوار پھلانگی اور اندر چلا گیا۔ یہاں تک کہ میں کاریڈور میں آ گیا۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح جو کیدار تبدیل کر دیتا ہے۔ میں اپنے کمرے کی جانب بڑھا تو مجھ پر نشہ طاری تھا۔ احساسِ رخِ مندی کا نشہ، میرے اندر کے انسان کو بڑی تسکین مل رہی تھی۔ میں نے سوچا، ابھی تو میں نے ان لوگوں کو مارا ہے جنہوں نے مجھ پر فائرنگ کی تھی، جب میں اپنے اصل دشمن کو ماروں گا تو کیا ہوگا؟ اسی خیال سے ہی میرا انداز تیز ہونے لگا تھا۔

☆☆☆☆

فون کی تیز آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا، ابھی دھوپ نہیں نکلی تھی، بلکی، بلکی کبر دکھائی دے رہی تھی۔ میں پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔ میں نے سائڈ ٹیبل سے فون اٹھایا تو وہ جی کی کال تھی۔ میں نے کال رسیو کی تو وہ دوسری طرف خوش بھرے لہجے میں بولا  
 ”میں خوش ہوں تم پر، کمال کر دیا تم نے، کاش تم مجھے

سو اشارہ کرنے لگا کہ اسے بھی اوپر کھینچ لوں۔ میں نے بے کجھے بغیر اسے بھی اوپر اٹھایا۔ اس نے دوسری طرف نے میں مجھے مدد دی۔ پھر آہستہ سے کہا  
 ”میں بڑا گیٹ کھول کر آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی کیٹ کھولنے چل دیا۔ میں برآمدے میں گیا اور جاتے دوہاں کا بلب بجھا دیا۔ وہاں اندھیرا ہو گیا۔ میں نے گن کی اور ایک کمرے کی جانب بڑھا۔ میں نے اس کی مڑکی سے اندر دیکھا، اندر اندھیر تھا۔ مجھے یوں لگا سے یہاں پر کوئی بھی نہیں ہے۔ میں نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اگلے کمرے میں بھی اسی طرح دیکھا، وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ تیسرے کمرے کی کھڑکی تک میں ابھی گیا ہی تھا کہ اندر سے کسی نے کھانسنے کی آواز آئی۔ میں وہیں ساکت ہو گیا۔ چند یوں بعد میں نے کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن وہ دھیمی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس کمرے میں کوئی تو ہے۔ میں نے بند دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ یوں نے کمرے کی کھڑکی نہیں لگائی تھی۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھولا تو اندر زیر و بلب کی مدہم ٹیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے ایک نگاہ دیکھا، دو لوگ لحاف اوڑھے لینے آئے تھے۔ میں نے انہیں ویسے ہی لینے رہنے دیا اور بنائی تیزی سے باقی کمرے دیکھے۔ ان کمروں میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ جو بھی تھے ایک ہی کمرے میں پڑے آئے تھے۔ میں انتہائی سرعت سے واپس اسی کمرے کی جانب پلٹا۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھولا اور اندر داخل کیا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی ایک بندے نے لحاف پرے ہٹا کر میری جانب دیکھا، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے فائر کر دیا۔ اس سے کوئی بات تو نہ ہوئی لیکن اس کی نہیں بلند ہو گئیں۔

اس کے ساتھ بڑا ہوادوسرا شخص بے تابانہ اٹھا مگر اپنے منے کن تانے دیکھ کر وہیں بہم گیا۔

”کچھ بولو گے یا بولے بنا ہی مر جانا پسند کرو گے؟“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ چند لمحوں کے لیے ہی ساکت رہا تو میں نے گن اس کی جانب سیدھی کر دی وہ جلدی سے ہڈیانی انداز میں بولا  
 ”کک..... کیا..... بات ہے؟“



اپنے ساتھ لے جاتے، مجھے حسرت نہ رہتی۔“  
 ”کیا بات کر رہے ہو، کس بات سے خوشی ہو گئی ہے تمہیں؟“ میں نے بالکل انجان بنتے ہوئے کہا تو چپکے ہوئے بولا

”تم نے کمال کر دیا، میں آ رہا ہوں کچھ دیر بعد تیرے پاس۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ فون اس وقت ایک خطرناک آلہ بھی بن جاتا ہے، جب یہ آپ کے خلاف استعمال ہوتا ہے۔ پھر مجھے اس کے سامنے اقرار کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ایسا سوچتے ہی میرا دھیان رات کی جانب چلا گیا۔ وہی نشہ میرے اندر سرسرا نے لگا۔ اب چوہدری سلطان کا کیا حال ہوگا؟ وہ میرا سامنا کرنے کے لئے کس طرح تڑپ رہا ہوگا؟ ایک ذہنی سانپ کس طرح مل کھاتا ہے، اس کا مجھے اندازہ تھا۔ وہ احساسِ ذلت جو میرا حوصلہ توڑ رہا تھا اب نہیں رہا تھا۔ ایک اعتماد میرے اندر در آیا تھا۔ میں جاگنگ پر جانے کے لئے اٹھ گیا۔

ناشتے کی میز پر بابا نے مجھے بتایا کہ رات چوہدری سلطان کے ڈیرے پر موجود دو مشکوک لوگ قتل ہو گئے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے مجھے غور سے دیکھا تھا۔ میں نے بڑے اعتماد سے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”بابا، انہیں بندے کہنا ہی غلط ہے، درندے ہیں وہ سارے۔“

”خیر بیٹا، تم بہت محتاط رہنا، دشمن کے وار کا پتہ نہیں ہوتا۔“ انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا  
 ”جی بالکل، میں محتاط ہوں گا۔“ میں نے ادب سے کہا اور ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں چائے کا گپ پکڑ کر ریڈور میں آ بیٹھا۔ شمال سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بادل بھی چھامکے ہوئے تھے۔ مجھے حتیٰ کا انتظار تھا۔ بلاشبہ وہ علاقے کی خبر دینے والا تھا۔ میں چائے کے سبب لیتا ہوا اسی کے انتظار میں تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وہ موٹر سائیکل پر گیٹ پار کرتا ہوا آ گیا۔ اس نے موٹر سائیکل تیزی سے اسٹینڈ پر لگا یا اور میری جانب بڑھ آیا۔ میرے چہرے پر جدوجہدِ سنجیدگی دیکھ کر وہ ٹھوڑا ٹھنکا اور پھر اپنی ساری گرم جوشی سمیٹ کر بولا

”رات چوہدری.....“

”وہ تمہا تکے ہوا؟“ میں نے سر سے لہجے میں کہا  
 ”یار میں تو سمجھتا ہوں وہ تم نے کیا ہے تو کمال کیا ہے؟“ اس نے دبے دبے جوش سے کہا تو میں نے منہ بناتے ہوئے کہا

”میں نے انہیں نہیں مارا، مارتا تو ضرور بتاتا، بلکہ ڈکے کی چوٹ پر کہتا، میں کوئی غنڈہ یا بد معاش نہیں ہوں۔“

”یاد تم نے تو میری امید ہی ختم کر کے رکھ دی.....“  
 ہے گاؤں میں کتنی خوشی ہے۔ پہلی بار چوہدری سلطان کو کسی نے نقصان پہنچایا ہے۔ وہ کسی باگل کتے کی طرح رات سے بھونک رہا ہے۔ اس نے کتنا ظلم کیا ہوا ہے اس علاقے پر تم جانے نہیں ہو۔“ اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا  
 ”جب میرا اس کا آ منسا سامنا ہوا تو دیکھ لوں گا۔“ میں

نے سرسری سے لہجے میں کہا اور اس کی سننے لگا۔ وہ بے حد جذباتی ہونے لگا تھا۔ وہ مجھے باور کرانے کے لئے کئی واقعات بتانے لگا کہ لوگ کس قدر اس سے تنگ ہیں۔ میں سنتا رہا۔ کچھ دیر تک وہ بیٹھا رہا۔ اندر سے چائے آگئی وہ اس نے پی اور پھر اٹھتے ہوئے بولا، ”بہر حال علی، یہ جس نے بھی کیا ہے اسے شاباش اور کاش تم مجھ پر اعتماد کر سکو۔“ یہ کہہ کر اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا بلکہ وہاں سے لٹکتا چلا گیا۔ میں اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

میں اٹھ کر اندر گیا تو میرے حزرارغ کی کال آگئی۔ وہ وہیں ڈیرے پر جا پہنچا تھا، جس طرح ارد گرد کے لوگ وہاں جا پہنچے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ پولیس کی بھاری نفری وہاں پر آئی ہوئی تھی۔ وہ دو لوگ تھے۔ پولیس سب کچھ دیکھ کر چلی گئی تھی۔ چوہدری سلطان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ قاتل کو پکڑ کر ان کا بدلہ لے۔ یہ اس کی بہت زیادہ بے عزتی تھی۔ پہلی بار کسی نے اس کے ڈیرے میں گھس کر اس کے بندے پھڑکا دیئے تھے۔ یہ وہی تھے جنہوں نے مجھ پر فائرنگ کی تھی۔ علاقے میں جو اس کی دھاک بیٹھنی ہوئی تھی، وہ سب کی سب ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے ہی نہیں لوگوں کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ اب چوہدری سلطان کو نیچا دکھانے والا آ گیا ہے۔ مجھے کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں تھی، ابھی لوگ آنا شروع ہوں گے تو وہ سب بتانے لگ جائیں گے۔ مجھے اگر انتظار تھا تو اپنے دشمنوں کی



ف سے، وہ کیا رد عمل دکھاتے ہیں یا اگر چوہدری سلطان  
تھا تو پھر سارا منظر ہی واضح ہو جانے والا تھا۔

دو پہر تک ہر طرح کی اطلاع ل چکی تھی۔ ان مرنے  
وں میں دونوں اشتہاری تھے جو چوہدری سلطان کے  
ساتھ لائے ہوئے تھے۔ میڈیا ان تک پہنچ چکا تھا۔ خبریں  
ف جیسٹل بر چل چکی تھیں۔ لیکن کسی بھی بندے نے مجھ  
راہٹ نہیں کیا تھا۔ مجھے اب پولیس کا خوف نہیں تھا بلکہ  
مر تھا کہ کوئی مجھ تک آئے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ شام  
میں انتظار ہی کرتا رہا۔

شام ڈھل رہی تھی۔ مغربی آفت پر سرخی پھیل چکی تھی۔  
ی چوکتا تھا۔ میں نے اپنے چند قریبی لوگوں کو اپنے ہاں  
لیا تھا کہ ممکن ہے چوہدری سلطان باؤلا ہو کر حویلی پر  
حالی کرے۔ یہ میرا پناہ ذاتی خیال تھا۔ وہ سب مہمان  
نے میں تھے۔ یہ معمول کی بات تھی۔ لوگ بیٹھے رہتے  
تھے۔ ایسے میں ایک سیاہ ہنڈائی پورچ میں آن رکی۔ میں  
ن میں بیٹھا اُسے دیکھ رہا تھا۔ کار کتنے ہی اس میں سے  
م باہر نکلی۔ اس نے سیاہ پتلون پر سیاہ جیکٹ پہنی ہوئی تھی  
میک اپ سے بے نیاز چہرہ، کٹے ہوئے بال اور تھکی تھکی  
نگ رہی تھی۔ میں اس کی اس طرح اچانک آمد حیران رہ  
یا۔ اس نے مجھے فون بھی نہیں کیا تھا۔ میں اٹھ کر اس کے  
س چلا گیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتی تھی۔ اس نے  
ناگاہی ہاتھ بڑھایا تو میں نے تمام لیا۔

”یوں اچانک.....“ میں نے پوچھا  
”نہیں آسکتی کیا؟“ اس نے ایک ادا سے کہا  
”اُو جناب جم جم آؤ، آؤ اندر تشریف لے آؤ۔“ میں  
نے اندر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میرے ساتھ  
ندر چل پڑی۔ ہم لاؤنج میں جا بیٹھے۔ کچھ ہی دیر میں اماں  
نوبھی اس کی آمد کا پتہ چل گیا وہ بھی وہیں آ گئیں۔ انہوں  
نے بھی آتے ہی ارم سے یہی سوال کیا تو وہ ہنس دی  
”میں اس لئے آئی ہوں کہ صبح اس کی بہاول پور میں  
شی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا،  
”یہ ہے کہ نہیں؟“

”ہے تو سہی۔“ میں نے کہا  
”بس تو پھر، مجھے آنا ہی تھا۔“ اس نے دلی دلی  
سکراہٹ سے کہا اور اماں سے باتیں کرنے لگیں۔ کچھ دیر

بعد اماں نے کہا

”چل جلدی سے فریش ہو جا، میں کھانا لگواتی ہوں  
“ یہ کہہ کر وہ دونوں اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

حویلی کے پچھلے لان میں مدہم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی  
میں اور ارم کافی کا گک پکڑے وہاں جا بیٹھے تھے۔ موسم  
کافی سرد ہو رہا تھا۔ کھلی فضا میں بیٹھ کر گرم گرم کافی کا اپنا ہی  
مزہ ہوتا ہے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اچانک  
ارم نے گہری سنجیدگی سے پوچھا

”علی، میں جو تم سے پوچھنے جا رہی ہوں، وہ بالکل سچ بتانا۔“  
”پوچھو، کیا پوچھنا ہے۔“ میں نے عام سے لہجہ میں کہا  
”یہ جو چوہدری سلطان کے ڈیرے پر ہوا، اس میں  
تمہارا کتنا ہاتھ ہے، مطلب یہ سب کچھ کروانے میں  
.....؟“ اس نے بڑے محتاط انداز میں پوچھا

”وہ سب میں نے خود کیا ہے۔“ میں نے اسے  
بتا دیا تو اس کے چہرے پر لمحہ بھر کے خوشگوار حیرت در آئی،  
پھر وہ خوش ہوتے ہوئے بولی

”میرا اندازہ درست نکلا علی، تمہارے منہ سے یہ بات  
سن کر مجھے لگا کہ تم ایک غیرت مند نوجوان ہو، تم میں بدلہ  
لینے کا حوصلہ ہے۔“

”تم نے کیوں یہ انداز لگائے؟“ میں نے پوچھا  
”یہ تم نہیں سمجھو گے، لیکن اتنا دراز قد، وجہ اور طاقت  
رکھنے والے کا دل اگر چھوٹا سا ہوتا تو شاید تم میری توجہ نہ  
بننے، تم نے میرا دل جیت لیا ہے۔ یہ جو زمین پر بوجھ لوگ  
ہیں نا، انہیں کوئی دوسرا نہیں، دل والا ہی صاف کرتا ہے  
میں نے جو تمہارے بارے میں شروع سے انداز لگایا تھا،  
وہ درست نکلا۔ تم نہ صرف اپنا دفاع کر سکتے ہو بلکہ ان بے  
غیرتوں کو ٹھکانے بھی لگا سکتے ہو۔“ اس نے بے حد جذباتی  
انداز میں یوں کہا جیسے وہ بھی ایسا ہی چاہتی ہو۔ میں کچھ مل  
اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا جہاں نفرت پھیلی ہوئی  
تھی۔ پھر اس نے جیسے خود پر قابو پالیا اور مسکراتے ہوئے  
بولی، ”میں اسی لئے آئی تھی یہاں، وہ تمہاری پیشی والے  
دن تم پر حملہ ضرور کریں گے۔ میں نے ان کے بارے میں  
ساری تفصیل لے لی ہوئی ہے۔ ہیرک میں تم سے لڑنے  
والے کوئی معمولی بد معاش نہیں ہیں۔“

”کیا وہ سارے لوہے کے بنے ہوئے ہیں؟“

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ ایک دم سے کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر بولی

”دیکھو، یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ طاقت کی طرف جھکتا ہے۔ یہ غنڈے، بدمعاش اور جرائم پیشہ لوگ بنیادی طور پر بزدل ہوتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی ان کے ساتھ طاقت جڑتی ہے یا وہ کسی طاقت کے ساتھ لگ جاتے ہیں تو اپنی خواہش دکھاتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہی ہے کہ اس وقت ان کی پشت پر کون سی طاقت ہوئی ہے۔“ اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا

”یہی سیاسی لوگ، انہیں قدم قدم پر ان جیسے لوگوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اپنے علاقے میں جب تک خوف و ہراس پھیلا کر نہ رکھیں، اس وقت تک یہ اپنا تسلط نہیں جما سکتے۔“ میں نے اپنی رائے دی۔

”سیاست تو اصل میں خدمت کا نام ہے، لیکن یہاں عجیب صورت حال ہے، یہاں غلام بنانے اور تسلط جمانے کے لئے یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اسے کاروبار تصور کر لیا گیا ہے، جرم چھپانے کے لئے آزمایا گیا ہے۔ کیا کیا چال بازی نہیں ہو رہی یہاں پر۔“ اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا

”تمہیں پتہ چلا کہ وہ ہیرک والے بدمعاش کون ہیں؟“ میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لئے پوچھا

”وہ کوئی بھی ہوں، انہیں تو بس استعمال کیا گیا ہے۔ ان کی طرف سے اس وقت تک کوئی خطرہ نہیں جب تک تمہارے یہاں سے اصل دشمن سامنے نہیں آ جاتا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے خود کھامی کے سے انداز میں کہا، ”بہت جلد، وہ لوگ بہت جلد سامنے آ جائیں گے۔“

”اچھا یا ایک بات بتا، اگر تم ناراض نہ ہو تو پوچھوں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کر بولی

”چل پوچھ، کیا پوچھتا ہے۔“

”یہ تم مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہو، مطلب دوسرے بھی تو ہیں، انہوں نے تو ایک فون کال نہیں کی اور تم.....“ میں کہتے کہتے رک گیا تو اس نے میرے چہرے پر دیکھا، پھر اپنے نچلے ہونٹ کو ذرا سادباتے ہوئے بڑے ہی جذباتی لہجے میں بولی

”علی، بڑی عجیب بات ہے کہ تمہیں اب میرے مہربان ہونے کا پتہ چلا، میں تو تم پر ڈیڑھ برس ہوئے مہربان ہوں

کبھی اکیلے میں بیٹھ کر سوچنا میرے بارے میں۔“

”ہماری بے تکلفی کلب میں ہوئی تھی۔ وہ تو مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ہم بہت اچھے دوست ہیں لیکن وہ بھی کلب کی حد تک اور.....“ میں نے کہا چاہا تو اس نے سکاری لیتے ہوئے کہا

”بات اس سے بھی آگے کی ہے علی، چھوڑ ان باتوں کو، آداب چلیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ ابھی اس نے کافی قسم نہیں کی تھی یوں اس کا اٹھ جانا یونہی نہیں تھا۔ وہ مزید بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تیزی سے اندر کی جانب چل گئی۔ میں بھی اٹھا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے اس کا رویہ تو بڑا عجیب لگا تھا۔ شاید وہ ایسا کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی، جسے کہنے کے لئے وہ بیتاب ہو گئی تھی۔

میں اپنے کمرے آ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں سونے کی کوشش میں تھا لیکن نایادہ اور کسی متوقع خطرے کے سبب مجھے نیند بالکل بھی نہیں آ رہی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے یونہی بے چینی میں پہلو بدلتے ہوئے گزر گئے۔ آخر کار میں اٹھ گیا۔ میں نے سائیڈ ٹیبل سے اپنا بسٹل اٹھایا اور باہر کی جانب چل دیا۔ میں باہر کا ایک چکر لگا کر آنا چاہتا تھا تا کہ کچھ تو ذہنی سکون ہو۔ میں پہلے ایک طرف گیا۔ وہاں مہمان خانے میں لوگ جاگ رہے تھے۔ چوکیدار بھی گیٹ کے ساتھ بنے کمرے کے دروازے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں دوبارہ اندر گیا اور حویلی کی بجھلی جانب گیا۔ میں جیسے ہی کارڈر میں پہنچا، مجھے ایک ہولا ایک دم سے اندر میرے میں غائب ہوتے ہوئے دکھائی دیا۔ وہ میرا وہم نہیں تھا، حقیقت تھی۔ میں انتہائی سرعت سے اس جانب بڑھا، اس دوران میں نے بسٹل کا سیلفی کچھ مٹالیا تھا۔ میں دم سادھے اسی ہیو لے کے انتظار میں تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)





# انتقام

خلیل جبار

کچھ لوگ فطرتاً پرہیزگار ہوتے ہیں ان کے ساتھ کتنی ہی بھلائی کیوں نہ کی جائے وہ ضرور پہنچانے سے باز نہیں آتے، ایسے شخص کا فسانہ عبرت جسے انتقام نے اندھا کر دیا تھا

نئے افق کے قارئین کے لیے بطور خاص

بری عادتوں کی جانب راغب کرتا ہے۔ انسان کے پاس پیسے دیکھ کر بری محبت میں مبتلا لوگ اس کے بہت نزدیک آ جاتے ہیں اور وہ انسان بھی ان کی طرح گمراہ ہو جاتا ہے جس انسان کے پاس پیسے کم ہوتے ہیں اس کے نزدیک بری محبت میں مبتلا لوگ چھلکتے بھی نہیں ہیں۔ اسی بنا پر نعمت علی اس سے پوری تنخواہ چھین لیتے تھے اور ٹائم کے پیسے چھوڑ دیتے تھے تاکہ وہ اپنا گزارا اچھی طرح کر لے ان سے تنخواہ میں سے خرچے کو پیسے نہ مانگے۔

الیاس اپنے دوستوں کو خرچا کرنا دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا تھا۔ ایک دن شدید غصہ آنے پر اس نے ابا سے احتجاج کیا۔

”ابا! میرا اور ٹائم کے پیسوں میں گزارا نہیں ہوتا۔“  
”اچھا میرے بیٹے کا گزارا نہیں ہوتا“ تین وقت کا کھانا تھیں گھر سے ملتا ہے، پہننے کو سال میں دو مرتبہ دو نئے جوڑے مل جاتے ہیں۔ بیوی بچے تمہارے نہیں ہیں پھر بھی اور ٹائم میں تمہارا گزارا نہیں ہوتا۔“

”میرے دوست خوب کھلا خرچ کرتے ہیں۔“  
”کیا تمہارے دوست نواب ہیں۔“  
”نواب نہیں لیکن خرچا نوابوں کی طرح کرتے ہیں۔“  
”تم نے میرے دوستوں نصیر، چمن اور تصور کو دیکھا ہے۔“

”ہاں دیکھا ہے اور ان کے بچوں کو بھی جانتا ہوں۔“  
الیاس نے کہا۔

الیاس کی جیبے ہی فیس بک چلاتے ہوئے ایک خوبصورت لڑکی پر نظر پڑی وہ ایک لمحے کو چونکا اور پھر اس کے لمبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس تصویر میں کوئی خاص بات ہے جس نے الیاس کو بڑی خوشی دی تھی۔ الیاس نے نیٹ سے ایک خوبصورت نوجوان کی تصویر لی اور ایک نئے نام سے آئی ڈی بنا کر اسے فریڈ کی درخواست بھیج دی۔ وہ آن لائن تھی اس لیے صبا معراج نے اس کی درخواست کو کنفرم کر دیا۔

درخواست کنفرم ہو جانے پر الیاس بچوں کی طرح خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہ لڑکی اس کے سابقہ فیس انچارج معراج نور کی بیٹی تھی۔ اس نے اکثر صبا کو بازار میں شاپنگ کرتے دیکھا تھا۔ اس لیے فیس بک چلاتے ہوئے صبا کی تصویر دیکھ کر فوراً سے پہچان گیا تھا۔

الیاس پچیس سال کا تھا۔ اس کے گھریلو حالات ایسے تھے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے اس لیے میٹرک کرتے ہی فیکٹری میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ الیاس کے پاس کوئی خاص ہنر نہ تھا جو اسے اچھی تنخواہ ملتی۔ اس کی تنخواہ وہی مقرر ہوئی جو دوسرے ملازمین کی تھی۔ تنخواہ گھر پر دینے پر اسے اور ٹائم سے ملنے والے پیسوں میں پورا مہینہ گزارنا پڑتا تھا۔

اس کے والد نعمت علی سخت مزاج کے انسان تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ نوجوان لڑکے کو خرچ کے لیے زیادہ رقم نہیں ملنی چاہیے ورنہ وہ بگڑ جاتے ہیں۔ جیب میں زیادہ پیسہ اسے



”ان کے فرمانبردار بچے تنخواہ اور ادور ٹائم اپنے باپ کی ہتھیلی پر رکھ دیتے ہیں۔“

”ان کے ماں باپ انتہائی کنجوس ہیں۔“

”میں اسی لیے تمہارے ادور ٹائم کے پیسے نہیں لیتا کہ لوگ مجھے انتہائی کنجوس کہیں۔“ الیاس نے کہا۔

”بیٹے انسان کو چار روکھ کر پاؤں پھیلانے چاہیں۔“

”چادر ہی نہ ہو تو پھر انسان کیا کرے۔“ الیاس نے غصے سے کہا۔

”پھر انسان صبر کرے۔ صبر کرنے پر بھی انسان کو ثواب ملتا ہے۔“

الیاس سمجھ گیا کہ باپ نہیں گے اس لیے اس نے امی جان سے شکایت کر دی، اس کی توقع کے برعکس امی جان نے بھی ابا کی حمایت کی۔

”الیاس بیٹے! گھر کا خرچ چلانا بہت مشکل ہو گیا ہے۔“

”گھر کا خرچ پہلے بھی چل رہا تھا۔“

”پہلے کی اور بات تھی اور بات ہے۔“

”اب کیا بات ہے؟“

”تمہارے ابارٹائزڈ ہو گئے ہیں۔ پینشن میں گزرا نہیں ہوتا۔“

”انور بھائی بھی کام کر رہے ہیں اور میں بھی کام کر رہا ہوں پھر بھی گزرا نہیں ہوتا۔“

”مہنگائی بہت ہو گئی ہے تم دونوں کی تنخواہ کے بعد بھی

گزارا کرنا مشکل ہے۔“ امی جان نے کہا۔

الیاس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ بات بننے والی نہیں اس لیے خاموش ہو گیا۔

فیکٹری میں جو لڑکے کام کرتے تھے وہ اپنے اپنے گھروں میں آدگی تنخواہ دیتے تھے۔ ادور ٹائم کے پیسے بھی اپنے پاس ہی رکھتے تھے، بقول ان کے ان پیسوں میں وہ کھل کر عیاشی کرتے ہیں۔ ان کی باتیں سن کر الیاس کے دل میں بھی خواہش ابھرتی کہ کاش وہ بھی ان کی طرح کھل عیاشی کرتا۔ مگر وہ جب گھر کو دیکھتا تو اپنی خواہشات کا گلا کھونٹ دیتا تھا۔

الیاس نے فیکٹری میں کام کرتے ہوئے تین سال کا عرصہ گزار دیا تھا۔ ان تین سالوں میں جو بات اس نے سیکھی تھی وہ یہ تھی کہ جو لوگ خوشامد کرنے کا فن جانتے ہیں وہ بڑے مزے میں ہیں۔ وہ اپنے انچارج کی خوشامد کر کے مالی اور دیگر فائدے حاصل کر لیتے ہیں۔ جو اس فن سے نا آشنا ہیں وہ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے..... اس کا شمار بھی ایسے لوگوں میں ہی ہوتا تھا۔

اس نے یہ فن اپنے ساتھیوں سے سیکھنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ اسے بھی اس فن میں مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ الیاس آفس میں آنے والے صاحبان کا منج سب سے پہلے استقبال کرتا..... ان کے لباس ٹائی اور پالوں کی تعریف کرتا..... وہ تعریف اتنی مہارت سے کرتا کہ جس کی تعریف کر رہا ہوتا وہ خوش ہو جاتا..... اس کے تعریف کرنے



ہوئے کہا۔

”سر آپ کو مذاق سوچ رہا ہے ادھر میرا سوچ‘ سوچ کر برا حال ہو رہا ہے۔“

”اچھا! کیا سوچ رہے ہو۔ مجھے بھی بتاؤ۔“

”سر یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ میرے لیے سوچیں کہ

میں اب کیا کروں۔“

”تم نوکری کرو گے اور کیا کرو گے۔“

”میری نوکری ختم ہو چکی ہے۔“ الیاس نے کہا۔

”میری جان کیا ضروری ہے کہ ایک ہی فیکٹری میں کام

کرتے کرتے زندگی گزار دو اوشی فیکٹریاں ہیں کہیں بھی

نوکری کی جاسکتی ہے۔ بولو کہاں اور کس فیکٹری میں کام

کرو گے۔“ منیجر نے کہا۔

الیاس نے حیرت سے منیجر کو دیکھا۔ اسے اپنی ساعت

پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس نے اسے نوکری سے درخواست

کیا وہی اسے کام کی آفر کر رہا ہے۔

”تم مجھے حیرت سے مت دیکھو تم نے ہمارے ساتھ

ایک عرصہ کام کیا ہے ہم تمہارے لیے نہیں سوچیں گے تو پھر

کون تمہارے لیے سوچے گا؟ تم اتنا ڈی پن کا ثبوت نہ دیتے

تو ہم تمہیں بچا لیتے۔ ہم کون سے پارسا ہیں، ہم بھی پیسوں

میں ہیر پھیر کرتے ہیں لیکن اپنے آپ کو بچا کر کرتے ہیں

کچرے میں اچھا مال ڈال کر فیکٹری سے نکال دینا معمولی

کام ہے مگر تم یہ دیکھو ہم کتنی صفائی سے یہ کام کرتے ہیں! میں

نے تمہاری نوکری کے نکالے جانے کا ایئر تیار ہونے سے

پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ تمہیں کہاں نوکری پر بھیجتا ہے۔ اس

لیے میں نے تمہاری نوکری کا پہلے بندوبست کیا ہے اور پھر

تمہارا ایئر نکالا ہے۔“ منیجر نے کہا۔

”کیا واقعی؟“ الیاس چونکا۔

”آج کی تاریخ میں میں نے تمہاری نوکری سے

نکالنے کا ایئر نکالا اور آج ہی تاریخ میں تمہاری جی جگہ نوکری

کا ایئر بھی نکلا دیا ہے۔ یہ ایئر اور جا کر آج ہی سے جو ان

کر نو دہاں پر یہاں سے زیادہ تنخواہ ملے گی۔“ منیجر نے کہا۔

الیاس منیجر صاحب کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے

چل دیا۔ وہ حیران تھا کہ منیجر راشد نے اس پر بڑی مہربانی

کی ہے ورنہ اس دور میں کون ہے جو کسی کے ساتھ اتنی بھلائی

کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ آفس والوں کے نزدیک ہو گیا۔ وہ

الیاس کو چائے بنانے کے بہانے آفس میں بلا لیتے۔ اس

کا کام دوسرے مزدور کرتے اور وہ آفس والوں کو لپیٹے اور

ادھر ادھر کی باتیں سناتا رہتا۔ اس کی باتوں سے متاثر ہو

کر اسے مزدوروں کی صف سے نکال کر کلرک بنا دیا گیا

کلرک بن کر اس کے مزے آ گئے۔ وہ اب پیسوں میں

ہیر پھیر کر کے مینے میں معقول رقم جمع کر لیتا تھا۔ آفس

والوں کا چھینٹا ہونے کے سبب اسے کچھ نہیں کہا جاتا تھا اور

کہتا کون وہ بھی ان کے رازوں سے واقف ہو چکا تھا! ان

کے مقابلے میں وہ بہت معمولی ہیر پھیر کرتا تھا۔ فیکٹری میں

کام کرنے والی خوبصورت لڑکیوں سے ان کی دوستی بروہ کسی

قسم کے خیالات کا اظہار نہیں کرتا تھا اور نہ ان کی گفتگو میں

دلچسپی لیتا تھا۔ یہ بات ان لوگوں کو بہت اچھی لگتی تھی۔

حساب کتاب میں معمولی ہیر پھیر نے اس کی زندگی

میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ وہ بھی اب اپنے دوستوں کی

عرح عیاشیوں میں بڑ گیا تھا۔ دن بدن اس کے خرچوں

میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ اس نے ایک دن بڑا ہاتھ دکھایا

تو پکڑ میں آ گیا اور اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ اس نے

کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو جائے گا! حالانکہ اس کے

ساتھ کام کرنے والے اس سے بڑے بڑے ہاتھ

دکھا جاتے تھے..... نوکری سے نکالے جانے بروہ بہت

افردہ تھا! وہ سوچ رہا تھا کہ گھر جا کر کیا بتائے گا! لوگ طرح

طرح کی اس کے بارے میں باتیں بنائیں گے۔ الیاس

ان ہی سوچوں میں غرق تھا کہ اسے اپنے پیچھے کسی کی

موجودگی کا احساس ہوا..... مڑ کر جو دیکھا اس کے پیچھے منیجر

راشد کھڑے تھے اسے افردہ دیکھ کر بولے۔

”الیاس! مجھے تمہاری دلی کیفیت کا اندازہ ہے کہ تم

پر اس وقت کیا بیت رہی ہے۔ بات اور تک پہنچ گئی تھی اس

لیے ہمیں اپنے بچاؤ کے لیے تمہیں نوکری سے فارغ کرنا

پڑا۔“

”میں کس منہ سے گھر جاؤں گا اور گھر کیا بتاؤں گا؟“

”تمہارے کیا دس میں منہ ہیں جو تمہیں گھر جانے

کے لیے اس قدر سوچنا پڑ رہا ہے اور رہی بات نوکری کے

جانے کی یہ بات گھر پر کیوں بتاتے ہو۔“ منیجر نے مسکراتے



کرتا ہے۔

فیجری نے الیاس کے جانے پر خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ معاملہ بیکر و خوبی انجام پا گیا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ معاملہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ الیاس کی نوکری چلی جائے۔ فیجری نے خود الیاس کو خود برو کے معاملے میں پھنسا کر نوکری سے نکلوا دیا تھا۔ حقیقت یہ یہی تھی کہ وہ ان کے تمام رازوں سے واقف ہو چکا تھا اور وہ اپنے خوشامدی رویے کی بدولت مل مالکان کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا یہ بات ان کے لیے خطرے کی علامت تھی۔

مالکان کسی کے نہیں ہوتے، وہ اپنے مفادات کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کسی بھی اپنا شفقت بھرا ہوا تھا الیاس کے کندھوں پر رکھ کر ان کے راز اگلو لیتے۔ الیاس اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا کہ مالکان اس کی عزت افزائی کر رہے ہیں۔ الیاس کے راز اگلنے پر ان کا جو حال ہوتا وہ سب دیکھتے۔ فیجری موقع شاس تھا، وہ ہوا کا رخ دیکھ کر چلنے والا تھا..... اس سے قبل بھی وہ الیاس جیسے کئی لوگوں کو مالکان کے نزدیک ہونے پر فیجری سے نکلوا چکا تھا، الیاس کو نکلوانا اس کے لیے معمولی بات تھی۔

الیاس کو فیجری نے اپنے تعلقات استعمال کر کے اچھی نوکری دلادی تھی۔ اس لیے وہ بہت خوش تھا اور اپنے گھر والوں کے سامنے فیجری صاحب کی تعریف کرتے نہ ٹھٹھکتا تھا، اسے جو نوکری ملی تھی یہاں بھی پیسوں میں ہیر پھیر کرنے کے بہت ذرائع تھے مگر وہ ابھی سنبھل کر چل رہا تھا۔ اپنے ماتحت اور مالکان کا اعتماد بحال ہونے پر الیاس نے ہاتھ کی صفائی دکھانا شروع کر دی۔

اس فیجری میں کام کرتے ہوئے اسے کئی سال گزر گئے اس دوران الیاس کی شادی ہو گئی، وہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا باب بن گیا۔ مگر فیجری پر زوال آیا اور فیجری بند ہو گئی۔ الیاس وقتی طور پر پریشان ضرور ہو گیا تھا مگر اس نے فیجری سے اتنا مال بنالیا تھا کہ وہ ایک سال بیٹھ کر کھا سکتا تھا۔ وہ کام کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ ایک فیجری میں اسے ملازمت مل گئی۔ اس فیجری میں نیا تھا اس لیے کھل کر اپنے جوہر نہیں دکھا سکتا تھا اس لیے صبر کرتے ہوئے وہاں کا جائزہ لینے لگا۔

فیجری کا فیجری معراج نور سخت قسم کا آدمی تھا۔ وہ نمازی پر ہمیزی آدمی غلط کاموں سے دور رہتا تھا اور نہ ہی یہ برداشت کر سکتا تھا کہ کوئی بے ایمانی کا کام کرے۔ الیاس کو وہاں اپنی وال گھٹی نظر نہیں آ رہی تھی اور پھر ان دنوں فیجریوں میں لوگوں کو بھرتی کرنے کے بجائے نکالا جا رہا تھا، فیجری مالکان کی کوشش یہی تھی کہ کم سے کم خرچ کیا جائے۔ فیجری بند کرنے کے بجائے دو آدمیوں کا کام ایک شخص سے لیا جائے۔ اس لیے الیاس نے بہتر یہی سمجھا کہ خاموشی سے کام کرتا رہے۔ جب فیجریوں کے حالات بہتر ہوں تو اس وقت کسی دوسری فیجری میں کام کر لیا جائے۔

اس فیجری میں اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ بس اسے فیجری کے فیجری معراج کا ایک ایک چیز پر نظر رکھنا پسند نہ تھا۔ وہ بازار سے آنے والی چیزوں کے بل بھی بہت باریک بینی سے چیک کرتا تھا۔ فیجری سے باہر جانے والے مال پر بھی فیجری صاحب کی بھر پور نظر تھی۔ فیجری میں ملازمت کرنے والے ملازم کی لائی کوئی چیز نہ کھاتے، ان کے نزدیک یہ رشوت تھی۔ الیاس کی فیجری معراج کے معمولات پر کڑی نظر تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ فیجری صاحب یہ سب دکھاوے کے لیے کرتے ہیں۔ ایسے لوگ چھوٹی موٹی کرپشن کرنے کی بجائے بڑی کرپشن کرتے ہیں۔ چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ وہ فیجری معراج کی کسی کرپشن کا کھوج لگانے میں ناکام رہا..... وہ ان کے بارے میں جتنا کھوج لگاتا تھا ان کی ایمانداری اور کھل کر سامنے آ رہی تھی۔

الیاس نے کئی بار بازار میں فیجری معراج کو خریداری کرتے دیکھا تھا، کبھی وہ اپنی بیگم کے ساتھ اور کبھی اپنی بیٹی صبا کے ساتھ مگر وہ معمولی سامان گھر لے کر جا رہے ہوتے تھے۔ ان کی جگہ کوئی اور فیجری ہوتا تو اس کی شان نزاع ہوتی۔ بہترین گاڑی اور انتہائی قیمتی سامان کی خریداری کرتے نظر آتے۔ اس کے برعکس وہ پرانی موٹر سائیکل پر گھوم رہے ہوتے تھے۔ انہیں دیکھ کر الیاس کو فیجری معراج کی حالت پر ترس آنے لگا تھا کہ اس کی ایمانداری نے فیجری صاحب کو کیسی بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا ہوا ہے۔ فیجری جگہ اگر وہ ہوتا تو اس کے ٹھانڈ دیکھنے سے تعلق رکھتے۔



ہے اس کا مقصد محض اسے ٹھونسا ہے۔ وہ نادان بچہ نہ تھا جو اپنا راز خود بخود اگل دیتا۔ راز ظاہر ہونے پر میجر مالکان کو تباہ کر پھندا دیتا یا بلیک میل کر کے رقم بنورتا رہتا۔

اس بات کو مشکل سے ایک ماہ گزرا تھا کہ نیجر نے الیاس کو اپنے کمرے میں بلایا اور نرمی سے بولا۔

”الیاس! میں نے بہت کوشش کی ہے کہ تم اپنی حرکت سے باز آ جاؤ مگر تم اپنی حرکت سے باز نہیں آ رہے ہو۔“  
”میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟“ الیاس نے غصے سے کہا۔

”میں سب باتوں سے باخبر ہوں..... الیاس ایمانداری سے روزی کمانے سے انسان خوش بھی رہتا ہے اور کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوتا ہے اس کے برعکس اپنی حلال روزی کو حرام کر لینے سے اللہ تعالیٰ بھی بندے سے ناراض ہوتا ہے اور انسان کو بھی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ وہ حرام طریقے سے کتنا ہی کمالے اس کی ہوس پوری نہیں ہوتی۔“

”آپ مجھ پر ناحق الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس پر مجھے کسی قسم کی شرمندگی ہو۔“ الیاس نے کہا۔

”الیاس غصے میں نہ آؤ۔ میں کتنے ٹھنڈے لہجے میں تم سے بات کر رہا ہوں۔“

”جب کوئی غلط بات کرے تو غصہ آنا فطری بات ہے۔“

”میں نے کوئی غلط بات نہیں کی میں تمہارے بھلے کی بات کر رہا ہوں بات ابھی مجھ تک ہی ہے تم نے جو بھی ناجائز طریقے سے رقم کمائی ہے مجھے دے دو۔“

”اور کتنے لوگوں سے یہ بات کر کے رقم لی ہے۔ یہ اچھا طریقہ ہے صاحب لوگوں کے سامنے ایمان دار بنے رہو اور ملازمین کو بلیک میل کر کے زبردستی رقم اکٹھے رہو۔“  
الیاس نے حقارت سے نیجر کو دیکھا۔

”میں نے کسی ملازم سے بھی بلیک میل کر کے رقم نہیں لی۔ میں بے ایمانی کر کے بڑی شاہانہ زندگی گزار سکتا ہوں مگر میں نے کبھی بے ایمانی سے کچھ نہیں کمایا۔“  
”تمہاری بات سے مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ کتنے

الیاس کھلے ہاتھ کا انسان تھا۔ اس لیے تنخواہ میں اس کا گزارہ نہیں ہو رہا تھا جو جمع پونجی تھی اس میں سے بھی ٹھیک ٹھاک رقم وہ خرچ کر چکا تھا۔ الیاس بھی انسان تھا وہ کب تک تنخواہ پر گزارا کرتا..... اس نے پرانا کام بڑی ہوشیاری سے کرنا شروع کر دیا۔ دو تین ماہ تک نیجر کو کچھ خبر نہ ہوئی۔

ایک دن نیجر نے الیاس کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ جب کمرے میں گیا نیجر صاحب کے ہاتھ میں پرانے اور نئے بل اور دیگر رجسٹر تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کی خرد برد نیجر کے علم میں آ گئی ہے۔ نیجر معراج نے اسے بہلا پھسلا کر اس سے یہ اقرار کرانے کی کوشش کی کہ وہ یہ بات بتا دے کہ اس نے خرد برد کی ہے مگر الیاس بھی اپنی بات پر ڈٹ گیا۔  
”یہ مجھ پر جھوٹا الزام لگایا جا رہا ہے۔“

”میں تمہارے بھلے کو کہہ رہا ہوں اگر تم نے خرد برد کی بھی ہے تو بتا دو اور وہ رقم فیکٹری کے اکاؤنٹ میں جمع کرادو ورنہ بات میرے اختیار سے نکل جائے گی۔ یہ بات مالکان تک پہنچنے کا مطلب سمجھتے ہو جنہیں جیل بھی ہو سکتی ہے۔“  
نیجر نے کہا۔

”میں کہہ چکا ہوں میں نے کوئی خرد برد نہیں کی پھر کیوں مجھے ہراساں کیا جا رہا ہے۔“ الیاس نے غصے سے کہا۔

نیجر معراج نے غصے سے الیاس کو گھورا اور خاموشی اختیار کر لی۔ الیاس نے سمجھا کہ نیجر اس کے خلاف مالکان کو ثبوت پیش کرنے میں ناکام رہا ہے اس لیے خاموش ہے۔ اس نے نیجر کی خاموشی کو دیکھ کر اپنا کام جاری رکھا دو ماہ مزید گزر جانے پر ایک بار پھر نیجر صاحب نے اسے ٹوکا کہ وہ غلط کام کر رہا ہے۔ اپنے کام سے باز آ جائے مگر الیاس نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور ڈھٹائی سے بولا۔

”میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔“

”میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“

”میں نے اگر کوئی جرم کیا ہے تو ثبوت دیں۔ ورنہ خاموش رہیں۔“

اس بار بھی نیجر معراج نے خاموشی اختیار کر لی۔  
الیاس سمجھ گیا کہ نیجر صاحب کے پاس کوئی ثبوت نہیں

جیسے موجود ہیں کوئی ملازم بھی ہمیں نہیں لوٹ سکتا۔“ جاوید سبحانی نے کہا۔

”الیاس تم نے اپنی روزی بھی حرام کی اور پکڑے بھی گئے۔ کیا فائدہ ہوا مالکان کی نظر میں جو تمہاری عزت تھی وہ خاک میں مل گئی۔“ منیجر نے کہا۔

”منیجر صاحب پولیس کوفون کریں اسے ابھی اور اسی وقت پولیس کے حوالے کرنا ہے۔“ جاوید سبحانی نے کہا۔

”ایسا نہ کریں سر اگر اسے پولیس کے حوالے کیا تو اس نے جو رقم نمین کی ہے وہ ہمیں نہیں ملے گی۔“ منیجر نے کہا۔

”پھر ہم کیا کریں؟“ جاوید سبحانی نے پوچھا۔

”یہ فیکٹری میں اس وقت تک کام کرے گا جب تک اس نے جو نمین کیا ہے وہ رقم اتر نہیں جاتی۔“

”اگر یہ بھاگ گیا تو.....“ جاوید سبحانی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”بیوی بچوں والا آدمی ہے بھاگ کر کہاں جائے گا۔ اس وقت مزدوروں کے لیے روزگار ملنا مشکل ہو رہا ہے جو جہاں کام کر رہا ہے وہیں چپک کر رہ گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے تمہاری ضمانت پر اسے پولیس کے حوالے نہیں کر رہا ورنہ میرا آج یہ پروگرام تھا کہ اسے لازمی پولیس کے حوالے کر دوں۔“

الیاس نے اپنے بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا منیجر نے جو بات کی تھی وہ حقیقت تھی الیاس اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ نوکری چھوڑ کر چلا جائے منیجر معراج نور نے ایک طرح سے اس پر احسان کیا تھا کہ پولیس کے حوالے کیے جانے سے بچا لیا تھا۔ ورنہ وہ بڑی پریشانی میں آ جاتا۔ الیاس نے اچھی نوکری کی تلاش جاری رکھی یہاں اس کے لیے کام کرنا اب بے کار تھا۔ اوپر کی آمدنی کے بغیر اس کا گزارا نہیں تھا۔

الیاس کو ایک سال کی کوشش کے بعد ایک دوسری فیکٹری میں نوکری مل گئی۔ اس دوران اس پر جو نمین کا الزام لگا تھا وہ رقم اور ٹائم کے پیسوں سے کٹ چکی تھی۔ نئی جگہ پر کام ملنے پر الیاس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہاں اس کی تھج جائے گی۔

یہاں معراج نور جیسا کوئی ایماندار شخص موجود نہیں تھا جو اس کے کام پر نظر رکھتا اس لیے کام چل گیا۔ اس فیکٹری میں کام کرتے ہوئے وہ منیجر معراج نور کو نہیں بھولا تھا۔ اس کے

ایماندار ہونے سے رقم مانگ کر اس کا کیا کرو گے بتاؤ؟“

”تم جو رقم دو گے وہ فیکٹری کے اکاؤنٹ میں جمع کرادوں گا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر خرچ کرنا حرام سمجھتا ہوں۔“ دیکھو میں آخری بار سمجھا رہا ہوں ابھی بات مجھ تک ہے جب بات مالکان تک پہنچے گی وہ تم سے رقم بھی وصول کر لیں گے اور جیل بھی بھیج دیں گے۔“

”جیل بھیجنے سے پہلے ثبوت پیش کرنا پڑے گا۔“ یہ کہتے ہوئے الیاس کمرے سے نکل گیا منیجر معراج صاحب نے اسے کئی آوازیں دیں۔ الیاس نے نی ان سی کر دیں۔

شام گئے جب الیاس گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا اس کا بلاوا آ گیا۔ فیکٹری کے مالک جاوید سبحانی کے کمرے میں منیجر صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ منیجر کو دیکھ کر الیاس کا ماتھا ٹھکا۔ ضرور اس نے میرے خلاف مالک سے شکایت کی ہے۔ تب ہی مجھے بلایا گیا۔ جاوید سبحانی سخت غصے میں دکھائی دے رہے تھے۔ الیاس کو دیکھ کر جاوید سبحانی نے کچھ فائلیں اس کی طرف پھینکیں۔

”یہ سب کیا ہے؟“

”جی یہ بلوں کی فائلیں ہیں۔“ الیاس نے سادگی سے کہا۔

”اس میں اصل بل دیکھو اور تم نے جو جعلی بل بنوا کر لگائے ہیں ان میں کتنا فرق ہے۔“

الیاس نے جو فائل دیکھی تو کانپ کر رہ گیا۔ منیجر صاحب نے خوب اچھی طرح چھان بین کر کے اصل دکانداروں سے مل کر اصل بل حاصل کر لیے تھے۔ الیاس نے بلوں میں رقم میں جو اضافہ کیا تھا وہ اصل بل سے ظاہر ہو گیا تھا۔ غلطی اس کی بھی تھی اس سے قبل وہ جہاں سے فیکٹری کے لیے سامان لاتا تھا وہ ملازم کا بھی حصہ رکھتا تھا اس فیکٹری میں وہ ڈرڈر کر کام کر رہا تھا بلوں میں اضافہ کم کرتا تھا اس لیے وہ ملازم کا حصہ کس طرح رکھ سکتا تھا اس بات کا منیجر نے فائدہ اٹھایا اور ان دکانوں سے اصل بل کی کاپی حاصل کر کے الیاس نے جو جعلی بل بنائے تھے ان سے ملایا اور اس کی چوری پکڑ لی۔

”تم کیا سمجھ رہے تھے اس طرح جعلی بل بنا کر ہمیں لوٹتے رہو گے۔ اس فیکٹری میں جب تک منیجر معراج نور

نہیں رہے۔“

الیاس نے جو فائل دیکھی تو کانپ کر رہ گیا۔ منیجر صاحب نے خوب اچھی طرح چھان بین کر کے اصل دکانداروں سے مل کر اصل بل حاصل کر لیے تھے۔ الیاس نے بلوں میں رقم میں جو اضافہ کیا تھا وہ اصل بل سے ظاہر ہو گیا تھا۔ غلطی اس کی بھی تھی اس سے قبل وہ جہاں سے فیکٹری کے لیے سامان لاتا تھا وہ ملازم کا بھی حصہ رکھتا تھا اس فیکٹری میں وہ ڈرڈر کر کام کر رہا تھا بلوں میں اضافہ کم کرتا تھا اس لیے وہ ملازم کا حصہ کس طرح رکھ سکتا تھا اس بات کا منیجر نے فائدہ اٹھایا اور ان دکانوں سے اصل بل کی کاپی حاصل کر کے الیاس نے جو جعلی بل بنائے تھے ان سے ملایا اور اس کی چوری پکڑ لی۔

”تم کیا سمجھ رہے تھے اس طرح جعلی بل بنا کر ہمیں لوٹتے رہو گے۔ اس فیکٹری میں جب تک منیجر معراج نور

نہیں رہے۔“

الیاس نے جو فائل دیکھی تو کانپ کر رہ گیا۔ منیجر صاحب نے خوب اچھی طرح چھان بین کر کے اصل دکانداروں سے مل کر اصل بل حاصل کر لیے تھے۔ الیاس نے بلوں میں رقم میں جو اضافہ کیا تھا وہ اصل بل سے ظاہر ہو گیا تھا۔ غلطی اس کی بھی تھی اس سے قبل وہ جہاں سے فیکٹری کے لیے سامان لاتا تھا وہ ملازم کا بھی حصہ رکھتا تھا اس فیکٹری میں وہ ڈرڈر کر کام کر رہا تھا بلوں میں اضافہ کم کرتا تھا اس لیے وہ ملازم کا حصہ کس طرح رکھ سکتا تھا اس بات کا منیجر نے فائدہ اٹھایا اور ان دکانوں سے اصل بل کی کاپی حاصل کر کے الیاس نے جو جعلی بل بنائے تھے ان سے ملایا اور اس کی چوری پکڑ لی۔

”تم کیا سمجھ رہے تھے اس طرح جعلی بل بنا کر ہمیں لوٹتے رہو گے۔ اس فیکٹری میں جب تک منیجر معراج نور

نہیں رہے۔“

الیاس نے جو فائل دیکھی تو کانپ کر رہ گیا۔ منیجر صاحب نے خوب اچھی طرح چھان بین کر کے اصل دکانداروں سے مل کر اصل بل حاصل کر لیے تھے۔ الیاس نے بلوں میں رقم میں جو اضافہ کیا تھا وہ اصل بل سے ظاہر ہو گیا تھا۔ غلطی اس کی بھی تھی اس سے قبل وہ جہاں سے فیکٹری کے لیے سامان لاتا تھا وہ ملازم کا بھی حصہ رکھتا تھا اس فیکٹری میں وہ ڈرڈر کر کام کر رہا تھا بلوں میں اضافہ کم کرتا تھا اس لیے وہ ملازم کا حصہ کس طرح رکھ سکتا تھا اس بات کا منیجر نے فائدہ اٹھایا اور ان دکانوں سے اصل بل کی کاپی حاصل کر کے الیاس نے جو جعلی بل بنائے تھے ان سے ملایا اور اس کی چوری پکڑ لی۔



”نہیں صبا! ایسی کوئی بات نہیں ہے اتفاق سے میرے والد محکمہ تعلیم میں بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ اس لیے روپے پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”کمال ہے، ہم دونوں پیسوں کے اعتبار سے کتنے لگی ہیں، میری سہیلیوں کے والد اچھے عہدوں پر فائز ہیں لیکن وہ پھر بھی پیسوں کے لیے پریشان رہتی ہیں اپنی خواہشات کا گلہ کھنٹی رہتی ہیں۔“

”اپنا اپنا نصیب ہے۔ کوئی ساری زندگی پیسوں کے لیے ترستا رہتا ہے۔ کوئی ساری زندگی پیسوں میں کھیلتے زندگی گزار کر دنیا سے چلا جاتا ہے۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو آصف! ایسا ہی ہوتا ہے۔“

الیاس کا آصف بن کر صبا سے بات چیت کرنے کا ایسا سلسلہ چل نکلا کہ وہ دونوں روزانہ رات کو لازمی ایک دوسرے سے بات کرنے لگے تھے۔ الیاس نے اپنی چھ دار باتوں میں اسے پھنسا لیا تھا۔ صبا کو الیاس کی کال کا انتظار رہتا تھا اس نے جب یہ محسوس کر لیا کہ صبا اس کے جال میں پھنس چکی ہے تو ایک دن بات کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”صبا ہم کب تک موبائل پر بات کرتے رہیں گے۔“

”ظاہر ہے دوری ہے موبائل پر یا فیس بک پر ہی بات ہو سکتی ہے۔“

”کیا ہماری ملاقات ہو سکتی ہے۔“ الیاس نے پوچھا۔

”ہاں ہو سکتی ہے اگر تم کراچی آ جاؤ۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ میرے ماموں الیاس کراچی میں رہتے ہیں۔ کیا تم میرے ماموں کے گھر آ سکتی ہو۔“

”ہاں ضرور آ سکتی ہوں اگر تمہارے ماموں اور ان کی فیملی کو اعتراض نہ ہو۔“

”میرے ماموں کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا“ میری ان سے بات ہو چکی ہے۔ میں نے تمہارا تعارف اپنی کلاس فیلو کی حیثیت سے کر دیا ہے۔“

”تمہارے ماموں نے یہ نہیں کہا کہ میں تمہاری کلاس فیلو کیسے ہوئی۔ تم سیالکوٹ میں رہتے ہو اور میں کراچی میں رہتی ہوں۔“

دل میں ابھی تک انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

فیس بک چلانے والے لوگوں کے اکاؤنٹ دیکھتے ہوئے جب اس کی نظر صبا نور پر پڑی تو اس کے ذہن میں ایک شیطانی منصوبہ آ گیا۔ اس منصوبے پر عمل کر کے وہ اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کر سکتا تھا۔ صبا معراج آن لائن تھی اس نے پہلو لکھ کر بات چیت کا آغاز کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ کراچی یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے اور ماس کمیونیکیشن میں ایم اے کر کے الیکٹرونک میڈیا پر کام کرنے کا خواہشمند ہے۔ پھر اس نے صبا سے پوچھا کہ وہ کیا کرتی ہے۔ اس پر صبا معراج نے بتایا۔

”میں ایک میڈیکل کالج میں زیر تعلیم ہوں اور میں ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔“

”تمہارے ڈاکٹر بننے کا ہمیں بھی فائدہ ہو جائے گا بغیر فیس چیک کر لو گی نا؟“

”تو یہ وقت آنے پر سوچا جائے گا کہ تم سے فیس لی جائے یا نہیں۔“

”ابھی بہت وقت ہے۔ تم اچھی طرح سوچ لو کہ مجھ سے فیس لینا ہے یا نہیں۔“ الیاس نے کہا۔

”ارے بھئی میں مذاق کر رہی تھی۔ تم سے بھی کیا پیسے لوں گی۔“

”میں بھی تم سے مذاق میں کہہ رہا ہوں مجھے پتا ہے تم ڈاکٹر بن کر مجھ سے پیسے نہیں لو گی۔ ایک بات تو بتاؤ صبا۔“

”ہاں پوچھو؟“

”ڈاکٹری کرنے پر تمہارے ٹھیک شاک پیسے خرچ ہو رہے ہوں گے کیا تمہارے والد کی اتنی آمدنی ہے کہ وہ گھر کا خرچ اٹھانے کے ساتھ ساتھ تمہاری تعلیم کا بھی خرچ اٹھا رہے ہیں۔“

”میرے والد کی ایک فیکٹری میں پائرنٹر شپ ہے اس لیے ہمیں روپے پیسے کی اتنی فکر نہیں ہوتی ڈیپنس میں ہمارا شمار درجہ ہے۔“

”اچھا“ اچھا ابھی تعلیم حاصل کر رہی ہو ورنہ اس دور میں تعلیم حاصل کرنا مشکل کام ہے۔“

”آصف! کیا تمہیں ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے حوالے سے کوئی پریشانی ہے۔“

”نہیں صبا! ایسی کوئی بات نہیں ہے اتفاق سے میرے والد محکمہ تعلیم میں بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ اس لیے روپے پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”کمال ہے، ہم دونوں پیسوں کے اعتبار سے کتنے لگی ہیں، میری سہیلیوں کے والد اچھے عہدوں پر فائز ہیں لیکن وہ پھر بھی پیسوں کے لیے پریشان رہتی ہیں اپنی خواہشات کا گلہ کھنٹی رہتی ہیں۔“

”اپنا اپنا نصیب ہے۔ کوئی ساری زندگی پیسوں کے لیے ترستا رہتا ہے۔ کوئی ساری زندگی پیسوں میں کھیلتے زندگی گزار کر دنیا سے چلا جاتا ہے۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو آصف! ایسا ہی ہوتا ہے۔“

الیاس کا آصف بن کر صبا سے بات چیت کرنے کا ایسا سلسلہ چل نکلا کہ وہ دونوں روزانہ رات کو لازمی ایک دوسرے سے بات کرنے لگے تھے۔ الیاس نے اپنی چھ دار باتوں میں اسے پھنسا لیا تھا۔ صبا کو الیاس کی کال کا انتظار رہتا تھا اس نے جب یہ محسوس کر لیا کہ صبا اس کے جال میں پھنس چکی ہے تو ایک دن بات کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”صبا ہم کب تک موبائل پر بات کرتے رہیں گے۔“

”ظاہر ہے دوری ہے موبائل پر یا فیس بک پر ہی بات ہو سکتی ہے۔“

”کیا ہماری ملاقات ہو سکتی ہے۔“ الیاس نے پوچھا۔

”ہاں ہو سکتی ہے اگر تم کراچی آ جاؤ۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ میرے ماموں الیاس کراچی میں رہتے ہیں۔ کیا تم میرے ماموں کے گھر آ سکتی ہو۔“

”ہاں ضرور آ سکتی ہوں اگر تمہارے ماموں اور ان کی فیملی کو اعتراض نہ ہو۔“

”میرے ماموں کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا“ میری ان سے بات ہو چکی ہے۔ میں نے تمہارا تعارف اپنی کلاس فیلو کی حیثیت سے کر دیا ہے۔“

”تمہارے ماموں نے یہ نہیں کہا کہ میں تمہاری کلاس فیلو کیسے ہوئی۔ تم سیالکوٹ میں رہتے ہو اور میں کراچی میں رہتی ہوں۔“

”نہیں صبا! ایسی کوئی بات نہیں ہے اتفاق سے میرے والد محکمہ تعلیم میں بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ اس لیے روپے پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”کمال ہے، ہم دونوں پیسوں کے اعتبار سے کتنے لگی ہیں، میری سہیلیوں کے والد اچھے عہدوں پر فائز ہیں لیکن وہ پھر بھی پیسوں کے لیے پریشان رہتی ہیں اپنی خواہشات کا گلہ کھنٹی رہتی ہیں۔“

”اپنا اپنا نصیب ہے۔ کوئی ساری زندگی پیسوں کے لیے ترستا رہتا ہے۔ کوئی ساری زندگی پیسوں میں کھیلتے زندگی گزار کر دنیا سے چلا جاتا ہے۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو آصف! ایسا ہی ہوتا ہے۔“

الیاس کا آصف بن کر صبا سے بات چیت کرنے کا ایسا سلسلہ چل نکلا کہ وہ دونوں روزانہ رات کو لازمی ایک دوسرے سے بات کرنے لگے تھے۔ الیاس نے اپنی چھ دار باتوں میں اسے پھنسا لیا تھا۔ صبا کو الیاس کی کال کا انتظار رہتا تھا اس نے جب یہ محسوس کر لیا کہ صبا اس کے جال میں پھنس چکی ہے تو ایک دن بات کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”صبا ہم کب تک موبائل پر بات کرتے رہیں گے۔“

ایلیاس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تم سے کل ملاقات ضرور ہوگی“ میں نے تمہارے بتائے ہوئے پتے کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا ہے۔“

”اچھا تم سو جاؤ تاکہ صبح جلدی بیدار ہو سکو اور مجھ سے ملاقات کر سکو۔“ ایلیاس نے کہا۔

”نیند کس کجنت کو آ رہی ہے، بس دل چاہ رہا ہے کہ جلدی سے صبح ہو جائے تاکہ ہماری ملاقات ہو جائے۔“ صبا نے کہا۔

”بالکل میری بھی یہی حالت ہے کہ کس طرح ٹرین کراچی سے جلدی پہنچ جائے تاکہ ہماری ملاقات ہو۔ صبا تم ایسی ہی ہونا جیسی تم تصویر میں نظر آتی ہو۔“

”کیوں تمہیں شک ہے؟“ صبا نے پوچھا۔

”بس ویسے ہی دل میں دوسو سٹاتے ہیں۔“

”کل جب ہماری ملاقات ہوگی تمہارے یہ دوسو سے بھی ختم ہو جائیں گے۔“ صبا نے کہا۔

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو کل ہر چیز صاف ہو جائے گی ہم دونوں آنے سامنے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے۔ کیا ایسا موقع مل جائے گا نا۔“ صبا نے پوچھا۔

”لانا چاہیے ورنہ ہم کو گھومنے کے بہانے کسی رستوران میں بیٹھ کر یہ ماحول پیدا کرنا پڑے گا۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے، کم از کم ہمیں تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔“ صبا نے کہا۔

”میرے ماموں اور ان کی فیملی بہت اچھی ہے۔ وہ کسی صورت میں ہمیں تنگ نہیں کریں گے۔“

”گھر گھر ہوتا ہے گھر میں تنہائی میسر آ جانے پر ہم ایک دوسرے کو بھرپور طریقے سے دیکھ لیں گے اور تمہارے شیطانی دوسو سے بھی دم توڑ جائیں گے۔ تنہائی ملنے پر تم کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا کہ ہمیں شرمندگی ہو۔“ صبا نے کہا۔

”صبا تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ ماموں کے گھر میں تمہیں اپنے گھر جیسا ماحول ملے گا۔“ ایلیاس معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

”میں تمہاری امانت ہوں جب تک ہماری شادی نہیں ہو جاتی اس امانت کو سنبا ل کر رکھنا پڑے گا۔“

”صبا تمہارے خیالات کتنے اچھے ہیں ورنہ اس

”میں نے تمہارے کراچی میں رہنے کا نہیں بتایا بلکہ یہ کہا ہے کہ تم سیالکوٹ میں میرے ساتھ رہتی ہو اور کراچی میں اپنے کسی عزیز کے یہاں ملنے آئی ہو۔“

”ٹھیک ہے، تم سے ملنے کے لیے یہ جھوٹ بھی بول دوں گی۔“ صبا نے ہنستے ہوئے کہا۔

”محبت اور جنگ میں سب چلتا ہے۔“ ایلیاس نے کہا۔

”جب سب چلتا ہے تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“ صبا نے کہا۔

موبائل پر رابطہ منقطع ہو جانے پر ایلیاس کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ آ گئی تھی اس نے جو مضروب تیار کیا تھا اس میں ابھی تک اسے کامیابی ہی مل رہی تھی۔ ایلیاس کے گھر والے چند دن کے لیے حیدر آباد ایک شادی میں جانے والے تھے۔ اور اس نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ وہ آصف کے ماموں کے روپ میں ملاقات کرے گا اور اسے بتائے گا کہ آصف کی ٹرین لیٹ ہو گئی ہے۔ وہ ایک گھنٹے میں گھر پہنچنے والا ہے جب تک اس کی فیملی حیدر آباد سے لوٹ نہیں آئی وہ صبا کو اپنی قید میں رکھے گا اور اسے جب اس کی فیملی آنے والی ہوگی اس دن استاد کمال کے ہاتھوں صبا کو فروخت کر دے گا اس طرح اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔

ایلیاس کی فیملی جس شام حیدر آباد کو روانہ ہوئی اس نے رات بھر صبا سے خوب محبت بھری باتیں کیں اور ساتھ رہنے کی قسمیں نبھائیں۔

”صبا! میں کل صبح تم سے ملنے سیالکوٹ سے کراچی پہنچ جاؤں گا تم مجھ سے ملنے آؤ گی نا۔“

”جب تم مجھ سے ملنے سیالکوٹ سے کراچی پہنچ سکتے ہو تو میں کراچی میں رہتے ہوئے تم سے ملنے کیوں نہیں آ سکتی۔“ صبا نے کہا۔

”بس دل میں شیطانی دوسو آتے رہتے ہیں نا کہیں ایریانا ہو جائے کہ میں آؤں اور تم ملنے نہ آؤ مجھے دھوکا دے جاؤ۔“ ایلیاس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں ضرور آؤں گی تم بے فکر ہو جاؤ اور شیطانی دوسو کو چھٹک دو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے شیطانی دوسو کو چھٹک دیا۔“



دور میں لڑکیاں عشق میں دیوانی ہو کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھتی ہیں۔

”پھر انہیں بچھٹانا بھی پڑتا ہے۔“ صبا نے کہا۔

”ہاں یہ بات بھی درست ہے۔ سب کچھ گنوا کر پھر بچھٹا دے ہی رہ جاتے ہیں۔“

الیاس کی ساری رات آنکھوں میں کئی۔ نیند اس سے کوسوں دور تھی اسے تصور میں صبا کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ صبا کی آمد پر ایک جشن منانا چاہتا تھا اس مقصد کے لیے دو بوتلیں شراب کی بھی حاصل کر لی تھیں حقیقت یہ تھی کہ اس نے جب پہلی بار صبا کو دیکھا تھا وہ اس کے دل کو بھائی تھی مگر وہ اس کے سابقہ منجر معراج نور کی بیٹی تھی اس لیے وہ اس کا احترام کرتا تھا مگر اب وہ انتقام لینے کی غرض سے صبا کو ہوس کا شکار بنا کر ایک گروہ کو فروخت کر دینا چاہتا تھا۔ وہ گروہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کو خرید کر بازار حسن کی زینت بنادیتا تھا۔ صبا ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے دام بھی اچھے مل جانے تھے اس طرح وہ اپنے سابقہ منجر سے اپنی بے عزتی کا پھر پورا انتقام لے سکتا تھا۔

صبح ہونے پر وہ صبا کا انتظار کرنے لگا کہ وہ کب آتی ہے۔ گیارہ بجنے پر دروازے پر دستک ہوئی، الیاس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی وہ دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھا اور دروازہ کھول کر دیکھا دروازے پر صبا کھڑی تھی۔ اسے سامنے پا کر الیاس کی دھڑکن اور تیز ہو گئی تھی۔

”کیا یہ الیاس صاحب کا گھر ہے؟“ صبا نے پوچھا۔

”جی ہاں، میں ہی الیاس ہوں تم شاید صبا ہو آصف کی دوست جو کراچی گھومنے آئی ہے۔“

”جی ہاں میں صبا ہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”تم باہر کیوں کھڑی ہو اندر آ جاؤ۔“ الیاس نے اسے اندر داخل ہونے کے لیے راستہ دیا۔

”کیا گھر میں کوئی نہیں ہے؟“ صبا نے پوچھا۔

”گھر میں کیا میں تمہیں نظر نہیں آ رہا ہوں۔“ الیاس نے کہا۔

”میرا مطلب ہے کہ باقی گھروالے نظر نہیں آ رہے ہیں۔“ صبا جھینپتے ہوئے بولی۔

”آصف کافی عرصے بعد کراچی آ رہا ہے اس لیے گھر

والے اسے لینے ریلوے اسٹیشن گئے ہیں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں گھر پر رہ گیا تھا اور آصف نے بتایا تھا کہ صبا آئے گی اس لیے گھر میں کسی ایک آدمی کا رہنا ضروری تھا اس لیے میں گھر میں ہی رہ گیا۔“

”آصف کب تک پہنچ رہا ہے؟“

”ٹرین آگئی ہوگی یا آنے والی ہوگی۔“ ٹرین آنے کے دس پندرہ منٹ بعد وہ لوگ گھر پہنچ جائیں گے۔“

”آپ آصف کے ماموں ہیں؟“ صبا نے پوچھا۔

”ہاں میں اس کا ماموں ہوں آصف نے تمہاری بہت تعریف کی تھی۔“ الیاس نے کہا۔

”وہ آپ کی بھی بہت تعریف کرتا ہے۔“

”میں اس کا ماموں ہوں اور وہ میرا بھانجا ہے لازمی بات ہے بھانجا ماموں کی تعریف لازمی کرے گا نا۔ صبا بیٹی تم کیا بیوی۔“

”میں گھر سے ناشتہ کر کے آئی ہوں۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔“ صبا نے کہا۔

”اچھا پھر کولڈ ڈرنک بہتر رہے گی۔“ الیاس یہ کہتے ہوئے فریج کی طرف بڑھ گیا۔

صبا اسے روکتی رہ گئی۔ الیاس نے دو گلاس کولڈ ڈرنک کے بنائے اور صبا کے گلاس میں بے ہوش کر دینے والی دوا ملا دی۔

”جب تک گھروالے نہیں آ جاتے یہ کولڈ ڈرنک پڑو تمہاری اور آصف کی خدمت گھروالے ہی کریں گے۔“

الیاس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

صبا کولڈ ڈرنک پینا نہیں چاہتی تھی مگر الیاس کے اصرار پر اسے پینا ہی پڑ گئی، ابھی اسے کولڈ ڈرنک پیے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اسے ایک چکر سا آیا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

الیاس نے صبا کو اٹھا کر بیڈ پر لٹا دیا اور کمرے کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کر خود دوسرے کمرے میں آ گیا۔ صبا کے گھر آنے پر وہ خوشی سے پھولے نہ سارہا تھا۔ الیاس کا پروگرام تھا کہ آج رات خوب شراب پی کر وہ صبا کے کمرے میں جائے گا اور اس کی عزت تار تار کر کے رکھ دے گا صبا کے کمرے میں جانے سے پہلے وہ بیوی کی آواز کو تیز کر دے گا تاکہ صبا کے چیخنے چلانے پر اس کی آواز

پولیس میں جا کر صبا کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا کے آتا ہوں۔“ منیجر معراج نور نے کہا۔

قریبی تھانے پر جا کر منیجر معراج نور نے صبا کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی تاکہ پولیس اس کا سراغ لگا سکے۔

رات ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا، الیاس نے شراب کی بوتل لی اور صبا کا کمرہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں داخل ہو کر دروازے کو لاک کر دیا، صحن میں لی دی کی آواز اتنی تیز تھی کہ صبا کے شور شراب کرنے پر آواز فلیٹ سے باہر سنائی دے سکے وہ صوفے پر بیٹھ کر شراب پینے لگا۔

ایک گھنٹے میں شراب کی بوتل خالی کر چکا تھا۔ الیاس پر شراب کا بھرپور نشہ چڑھ چکا تھا۔

”چل سالی اٹھ جا۔“ الیاس نے صبا کو جھنجھوڑا جب وہ بیدار نہ ہوئی اس نے پانی کا جگ اس کے منہ پر اٹھیل دیا۔

صبا بڑا برا کراٹھ بیٹھی اپنے سامنے ایک اجنبی کو پا کر وہ چونگی۔

”کک..... کک کون ہو تم؟“ وہ بولی۔

”صبح اپنے پار سے ملنے آئی تھی اور اب رات ہونے پر کہتی ہے کہ کون ہو تم؟“

صبا نے جب اپنے ذہن پر زور ڈالا تو اسے یاد آنے لگا کہ وہ آصف سے ملنے آئی تھی اور اس کے ساموں الیاس نے کوئلہ ڈرنگ پیش کی تھی جس کے پینے پر وہ ہوش ہو گئی تھی۔

”غور سے مجھے دیکھ لے کیوں کہ مجھے دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا اور اب تیری ہر رات کسی اجنبی کی آنکھوں میں گزرے گی۔“

”آصف کہاں ہے؟“

”کمال ہے، آصف تیرے سامنے موجود ہے پھر بھی پوچھتی ہے کہ آصف کہاں ہے۔“ وہ بولا۔

”تم تو آصف کے ساموں ہو۔“

”صبا! تم بھی کتنی بھولی ہو جس دور میں تم زندہ ہو اس میں جعل سازی بہت ہے۔ میں الیاس ہی ہوں جو تصویر تم فیس بک پر ڈیپٹی رہی ہو وہ بتائیں کون تھا۔ میں نے تمہیں پھانسنے کے لیے اپنی جگہ اس کی تصویر لگا دی تھی۔

”تم دھوکے باز ہو تم نے ایسا کیوں کیا؟“

فلیٹ سے باہر سنائی دے شام گئے صبا جب گھر نہ پہنچی تو اس کے گھر میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ صبا کی امی نسرین بیگم نے اس کی مختلف سہیلیوں کو ٹیلی فون کر کے پوچھا کہ صبا کیا ان کے گھر میں ہے۔ مگر ہر سہیلی نے انکار کر دیا، ٹائلڈ نے یہ بات کہہ کر ان کا دل دہلا دیا کہ صبا آج یونیورسٹی پڑھنے ہی نہیں آئی۔ منیجر معراج نور کے گھر آنے پر انہیں جب صبا کی گمشدگی کی خبر ملی تو بھی پریشان ہو گئے۔

”تم نے اس کی سہیلیوں سے پوچھا۔“

”میں نے صبا بیٹی کی ایک، ایک سہیلی سے صبا کے بارے میں پوچھا ہے۔ وہ کسی کے ہاں نہیں ہے۔ ٹائلڈ نے بتایا ہے کہ وہ آج یونیورسٹی بھی پڑھنے نہیں گئی ہے۔“

”صبا کے موبائل پر کال کی؟“

”ہاں کی تھی مگر وہ کال اٹھا نہیں رہی، صبا میں ایک عادت بہت خراب ہے وہ گھر سے نکلے ہوئے اپنا موبائل سالنٹ پر رکھ دیتی ہے اور یونیورسٹی پہنچ کر کھولتی ہے۔ وہ یونیورسٹی نہیں پہنچی اسی لیے ابھی تک اس کا موبائل سالنٹ ہے ورنہ وہ ضرور موبائل کی کال اٹینڈ کر لیتی۔“

”یہ بہت اچھا ہے کہ اس کا موبائل بند نہیں ہے۔“ منیجر معراج نور نے کہا۔

”اس سے کیا ہوگا؟“

”اس سے یہ ہوگا کہ پولیس اس مقام کا پتا چلا سکتی ہے جہاں صبا موجود ہے۔“ منیجر معراج نور نے بتایا۔

”اگر کسی نے اغوا کر کے موبائل کہیں پھینک دیا ہوگا تو پھر کیا ہوگا؟“

”پھر اغوا کرنے والے خود ہم سے رابطہ کریں گے۔“

”وہ ہم سے کیوں رابطہ کریں گے؟“

”جب کسی کو اغوا کیا جاتا ہے تو پھر اس کے گھر والوں سے تاوان کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔“

”تاوان..... ہم تاوان کہاں سے ادا کریں گے ہمارے گھر میں تو خود کھانے کے لیے لالے پڑے ہیں ہم کہاں کسی کو تاوان دیں گے تمہاری اوپر کی آمدنی بھی نہیں ہے جو اس جمع پونجی میں سے ادا کریں۔“

”بیگم تم گھبراؤ نہیں اللہ تعالیٰ ہے خبر کی دعا کرو۔ میں



”میں مجبور تھا۔“

”مجبوری کیسی مجبوری تھی تمہاری جو تم نے جعل سازی کر کے مجھے اپنا دوست بنایا۔“

”مجھے تمہارے والد معراج نور سے انتقام لینا تھا، اس نے مجھے اپنی فیکٹری میں ذیل ورسوا کر لیا تھا۔ اس دن سے میں تمہارے والد سے اس بے عزتی کا انتقام لینا چاہتا تھا، مگر مجھے موقع نہ مل سکا تھا، جب فیس بک پر تمہاری تصویر دیکھی تو میرے ذہن میں ایک منصوبہ آ گیا اور میں نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تمہیں پھاس لیا ہے آج میں تمہاری عزت کو تار تار کر کے تمہیں بازار حسن کی زینت بنا دوں گا۔“ الیاس نے قہقہہ لگایا۔

”ذیل انسان میرے والد ایک اصول پرست اور ایماندار انسان ہیں، تم نے ضرور ایسی حرکت فیکٹری میں کی ہوگی جس کی بنا پر ابو نے تمہیں فیکٹری میں ذیل ورسوا کیا ہوگا۔“ صبا زور سے چیخی۔

”اس دنیا میں کون پارسا ہے، جس کو موقع مل رہا ہے وہ موقع سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ تمہارے والد کی ایمانداری بھی ایک دن ہوا ہو جائے گی، وہ مالکان کی نظر میں اپنا اونچا مقام بنا کر کوئی بڑا فائدہ لے کر کہیں دوسرے شہر فرار ہو کر زندگی گزارے گا۔“ الیاس نے کہا۔

”تم جیسے گھٹیا سوچ کے لوگ دوسروں کے بارے میں ایسی ہی گھٹیا سوچ رکھتے ہیں۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ ورنہ ایسا مزاحمتی ہو گی کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔“ صبا بیڈ پر سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”لو میں ہٹ گیا۔“ الیاس اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

صبا تیزی سے دروازے کی طرف لپکی مگر دروازہ لاک تھا۔

”دروازہ کھولو۔“

”یہ دروازہ اب نہیں کھلے گا۔ اس کمرے میں میرا حکم چلے گا تمہیں۔“ الیاس چیخا۔

”میں کہتی ہوں دروازہ کھولو۔ میں ایک منٹ اس کمرے میں نہیں رہ سکتی۔“

”پھر چلی جاؤ، کٹری کیوں ہو۔“ الیاس نے ہنستے

ہوئے کہا۔

صبا غصے سے الیاس پر جھپٹی، الیاس اس سے زیادہ طاقتور تھا اس نے صبا کو بیڈ پر گرادیا۔

”میں تم پر قہقہے ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے صبا نے الیاس کے منہ پر قہقہہ دیا اور بیڈ سے اترنے لگی۔

انسانی صحت کے لیے اتنا غصہ کرنا اچھا نہیں ہوتا، ویسے ایک بات ہے، غصے میں تم مجھے بہت پیاری لگ رہی ہو میری جان! اپنی جان کو ہلکان نہ کرو مجھے بھی انجوائے کرنے دو اور خود بھی انجوائے کرو۔“ الیاس نے صبا کو بلاج لیا۔

صبا نے بہت زور لگایا کہ وہ خود کو الیاس سے چھڑا لے مگر نشے میں ہونے کے باوجود اس کی گرفت بہت سخت تھی۔

الیاس کے منہ سے آتی شراب کی یواس کو زہر لگ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ الیاس کو کوئی چیز دے مارے کہ اچانک دروازہ باہر سے زور زور سے چٹا جانے لگا۔ دروازہ پٹنے جانے پر الیاس چونکا، اس وقت کون آ گیا۔

الیاس ایک جھٹکے سے بیڈ سے اتر اور دروازے کا لاک کھول دیا، صبا بھی پھرتی سے بیڈ سے اٹھی اور دروازے تک پہنچ گئی، الیاس اس صورت حال کے لیے پہلے ہی تیار تھا اس نے صبا کے دروازے کے پاس آنے پر زور سے دھکا دیا، وہ دوڑ جا کر الیاس کے لیے یہ لمحہ کافی تھا، وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا اور اس نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

”دروازہ کھولو۔“ صبا نے زور سے دروازہ بجایا۔

باہر بھی زور زور سے دروازہ بجایا جا رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا کہ دروازہ فوری نہ کھولنے پر دروازہ توڑ ڈالے گا۔

”تم سے میں آ کر منتا ہوں۔“ الیاس یہ کہتے ہوئے

دروازے کی طرف لپکا۔

اس نے ابھی ہلکا سا دروازہ کھول کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ باہر کون ہے۔ باہر سے زور سے دروازے کو دھکا لگا اور الیاس دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ پولیس والے فلیٹ کے اندر داخل ہو گئے۔ ایک سپاہی کمرے کے دروازے کی کنڈی کھول دی۔ دروازہ کھلنے پر صبا کمرے سے باہر نکل آئی۔

”کیا تمہارا نام صبا ہے۔“ سپاہی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ صبا نے کہا۔

”اس نے تمہیں اغوا کیا ہے؟“

”جی۔“

”یہ جھوٹ بولتی ہے اپنی مرضی سے فلیٹ پر آئی تھی اور

پولیس کو دیکھ کر اپنا بیان بدل رہی ہے۔“ الیاس نے کہا۔

”کیا سچ ہے کیا جھوٹ، یہ تمہانے چل کر پتا چلے گا۔“

دوسرے سپاہی نے الیاس کے ہاتھوں میں جھکڑی لگاتے

ہوئے کہا۔

☆☆☆

موبائل کی گھنٹی بجنے پر منیجر صاحب نے کال ریسیو کی۔

”منیجر صاحب بات کر رہے ہیں۔“

”جی ہاں بات کر رہا ہوں۔“

”دیکھیے میں انسپکٹر جواد بات کر رہا ہوں آپ کی بیٹی صبا

کو ہم نے بازیاب کر لیا ہے آپ تمہانے آجائیں۔“ انسپکٹر

جواد نے کہا۔

”مہم..... میں ابھی..... آ..... آتا ہوں۔“ منیجر صاحب

نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”کیا ہوا؟“ بیگم انہیں دیکھ کر چوکی۔

”بیگم! صبا کو پولیس نے بازیاب کر لیا ہے میں اسے

لینے تمہانے جا رہا ہوں۔“

”کیا..... صبا مل گئی ہے؟“

”ہاں بیگم۔“

”ہماری پولیس اتنی تیز ہو گئی ہے کہ رپورٹ درج

کراتے ہی صبا کو بازیاب بھی کر لیا۔“ بیگم نے حیرت سے

کہا۔

”آج کل یہ ممکن ہو گیا ہے۔“ منیجر نور نے خوش

ہوتے ہوئے کہا۔

”میں بھی آپ کے تمہارے ساتھ تمہانے چلوں گی۔“

بیگم نے کہا۔

دو دنوں تمہانے ساتھ پہنچے تمہانے میں صبا کو دیکھ کر بیگم

نے صبا کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

”صبا آپ کو کہاں سے ملی۔“ منیجر نور نے پوچھا۔

”ہم نے صبا کے موبائل فون کی لوکیشن حاصل کر کے

ملزم الیاس کے گھر پر چھاپہ مارا اور لڑکی کو بازیاب کر لیا ہے۔“

ملزم الیاس کو ہم نے لاک اپ کر دیا۔ ملزم الیاس کا کہنا ہے کہ اس نے صبا کو تادان کے لیے نہیں بلکہ تم سے انتقام لینے کے لیے جس بے جا میں رکھا اس کا ارادہ تھا کہ وہ صبا کو کسی عصمت فروشی کا دھندہ کرنے والوں کے ہاتھوں فروخت کرنے کا تھا۔“ انسپکٹر جواد نے تفصیل بتائی۔

منیجر معراج نور لاک اپ کے پاس گیا، الیاس نے اسے

آتا دیکھ کر اپنی نظریں نیچی کر لیں۔

”اچھا یہ تم ہو ایسا کر کے تمہیں کیا حاصل ہوا؟“ معراج

نور نے پوچھا۔

”مجھے انتقام لینا تھا۔ آپ نے مجھے فیکٹری سے نکلوا

تھا۔“

”تم انسان کہلائے جانے کے قابل نہیں ہو میں تمہیں

ایک اچھا انسان بنانا چاہتا تھا اس لیے میں نے تمہیں تین بار

سدرہ نے کام موقع دیا جب تم باز نہ آئے پھر میں نے فیکٹری

مالکان سے تمہاری شکایت کی۔ فیکٹری مالکان تمہیں جیل

بھیجنا چاہتے تھے میں نے پیسے وصول کرنے کے بہانے

تمہیں جیل جانے سے بچایا مگر تمہارے مقدر میں جیل

جانا تھا اس لیے تم نے ہماری فیکٹری سے نکل کر دوسری

فیکٹری میں ملازمت اختیار کی اور اب تم نے مجھ سے انتقام

لینے کے لیے میری بیٹی کو اغوا کر کے اسے زیادتی کا نشانہ بنانا

چاہتے تھے لیکن دیکھ لو میں حق پر تھا اس لیے تم میرا کچھ بھی نہ

بگاڑ سکے اب تمہیں اپنے کیے کی سزا ملے گی ایک طویل

عرصے جیل میں رہنا پڑے گا بدنامی الگ ہوگی۔“ منیجر

نور نے کہا۔

الیاس کے پاس انہیں جواب دینے کو کچھ نہ تھا واقعی یہ

سچ تھا کہ اگر اس دن منیجر معراج نور اسے نہ بچاتے تو مالکان

اسے ضرور جیل بھیج دیتے۔ اس نے ان کا احسان مند ہونے

کی بجائے انتقام لینے کے لیے جو جال بچھایا تھا اس میں خود

پھنس کر رہ گیا تھا۔





# پگلی کا پیار

ریاض بٹ

کیس چاہے جو بھی ہو اسے انجام تک پہنچانے میں ریاض بٹ کو کمال حاصل ہے، یہ بھی ایک انوکھا کیس ہے جسے بہت خوب صورتی سے انجام تک پہنچایا ہے آپ قارئین کو ضرور پسند آئے گا۔

ریاض بٹ کے قلم سے قارئین افق کے لیے ایک تحفہ

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ہم وہاں پہنچ گئے تھے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے وہاں اسٹیشن ماسٹر حیدر علی کاٹنا بدلنے والا تین چار قلی اور اسٹیشن سے قریب ایسا دھند جھکیوں کے چھ سات کین موجود تھے۔ جن میں دو خواتین بھی تھیں۔ لاش کا معائنہ کرنے کے بعد میں نے وہاں موجود مردوزن سے لاش کی شناخت کے حوالے سے پوچھ گچھ کی لیکن سب لوگوں کے لیے خاتون اجنبی تھی۔ لاش کاٹنا بدلنے والے وسم کی دریافت تھی..... وہ صبح سات بجے پشاور سے آنے والی گاڑی کے لیے کاٹنا بدلنے آ رہا تھا۔ کہ اس کی نظر دو حصوں میں منقسم لاش پر پڑی..... لاش چونکہ لائن سے باہر پڑی تھی دوسری گاڑی آنے کا ٹائم بھی ہو گیا تھا اس لیے وسم نے پہلے جلدی سے کاٹنا بدلنا پھر تقریباً دوڑ کر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے تک گیا اور ہانپتے کاٹنے ساری صورتحال اس کے گوش گزار کر دی۔

بہر حال آگے کی کارروائی میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج کر میں اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گیا..... میرے ساتھ ایک کاشییل اور ایک سپاہی بھی تھا۔ ایک سپاہی (خوشحال خان) کو میں نے لاش کے ساتھ بھیج دیا تھا۔

ان کو میں نے باہر ہی رہنے دیا..... اس وقت اسٹیشن پر کافی رش تھا کراچی جانے والے مسافر ٹکٹ لے رہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد کراچی جانے والی گاڑی نے یہاں پہنچ جانا تھا اس لیے اس وقت اسٹیشن پر الجھن تھی۔ کاٹنا

کہتے ہیں کسی چیز کی زیادتی اکثر باعث مصیبت بنتی ہے۔ اور اگر کسی انسان کی خوبصورتی کی بات کی جائے تو یہ بھی اکثر انسان کو کسی نامی امتحان میں ضرور مبتلا کرتی ہے۔ وہ بھی ایک خوبصورت لڑکی تھی لیکن اس وقت اس کی دو حصوں میں منقسم لاش ریلوے لائن کے پاس پڑی تھی..... بڑا عبرتناک منظر تھا۔

پہٹ سے اوپر والا حصہ الگ پڑا تھا اور نیچے والا حصہ علیحدہ پڑا تھا۔ دونوں حصوں کا درمیانی فاصلہ بائیس فٹ ہوگا..... پہلا تاثر یہی بنتا تھا کہ اس نے خودکشی کی ہوگی۔ لیکن!

لاش کی حالت کوئی اور کہانی سنار ہی تھی آس پاس خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ بہر حال کاغذی کارروائی کرنے کے بعد میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ لاش کے چہرے کے دو تین ٹوکوز میں نے بنوا لیے تھے۔ اب یہ بات بتا دوں کہ ہم یہاں پہنچنے کی طرح تھے..... آج صبح میرے دفتر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

میں نے دوسری گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا۔ ”ہیلو.....“ تھانیدار صاحب میں اسٹیشن ماسٹر حیدر علی بول رہا ہوں یہاں ریلوے لائن کے باہر کسی لڑکی کی لاش پڑی ہے لگتا ہے اس نے خودکشی کی ہے۔“

”ٹھیک ہے..... حیدر صاحب..... اطلاع دینے کا شکریہ..... ہم ابھی آ رہے ہیں۔“ پھر.....!



بدلتے والے دسیم کو بھی میں نے ساتھ رکھا۔ اس کو تھوڑی دیر بعد اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتی تھی اس لیے میں نے سب سے پہلے اسی سے سوال جواب کرنے کا فیصلہ کیا۔  
”دسیم تم کتنے عرصے سے اس اسٹیشن پر ڈیوٹی انجام دے رہے ہو۔“

”میں جناب تقریباً چھ ماہ ہوئے اس اسٹیشن پر آیا ہوں..... پہلے میں جہلم ریلوے اسٹیشن پر ہوتا تھا۔“  
”یہ بات تو تم اپنے ابتدائی بیان میں بتا چکے ہو۔ کہ تم صبح کا ٹاؤن لے جا رہے تھے تو تم نے وہاں کسی خاتون کی دو حصوں میں منقسم لاش دیکھی، کیا اس کے علاوہ بھی تم نے کوئی غیر معمولی بات دیکھی تھی۔“

”نہیں جناب میں لاش دیکھ کر اتنا بدحواس ہو گیا تھا کہ ادھر ادھر دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔“  
”قارئین ایسے حالات میں ایسے ہی ہوتا ہے۔

بہر حال چند اور مضمنی سے سوال پوچھ کر میں نے اسے واپس بھیج دیا جب وہ جانے لگا تو اسٹیشن ماسٹر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”دسیم..... کینٹین والے کو کہہ جانا کہ چار اچھی سی دودھ پتی اور کیک بیس بھیج دے۔“

جب وہ چلا گیا تو اسٹیشن ماسٹر حیدر علی نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارا نذر صاحب اس واقعے یا حادثے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟“

”دیکھیں جی..... یہ تو مجھے قتل کا کیس لگتا ہے۔“

میں نے صاف بات بتانا ہی مناسب سمجھا۔  
”قتل.....؟“ اسٹیشن ماسٹر نے زیر لب دہرایا پھر بولا۔  
”اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی نے خاتون کو قتل کر کے لاش یہاں پھینک دی..... اور گاڑی کے نیچے آ کر یہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔“

”میرے خیال میں یہ بات نہیں ہے..... فرض کریں..... لاش کا آدھا دھڑ ریلوے لائن کے اندر ہوا اور آدھا باہر..... اوپر سے گاڑی کا پھیر گزرے تو آدھا دھڑ اندر رہ جائے گا“ آدھا دھڑ باہر رہ جائے گا لیکن اس صورت میں ذرا تصور میں لائیے کہ اندر والے حصے کا کیا حشر ہوگا؟ پھر یہاں خون کا ہونا بھی ضروری تھا جو نہیں ہے۔“

”بالکل..... یہ بات تو میں نے سوچی ہی نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا..... کہ کسی انٹری قاتل نے بڑے بھونڈے طریقے سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ لڑکی نے خودکشی کی ہے۔“

”اب صبح صورتحال تک آپ پہنچے ہیں۔ آپ یہ بتائیں کہ رات نو بجے سے صبح چھ بجے تک کتنی گاڑیاں یہاں آئی ہیں؟“

”صرف دو گاڑیاں ایک ایک رات ایک بجے آئی ہے..... جو کراچی سے آتی ہے اور اس کی آخری منزل پشاور ہے..... پھر صبح ساڑھے پانچ بجے گاڑی آتی ہے۔“

یہاں یہ بات بتانا مناسب ہوگا کہ وہ جون کا مہینہ تھا..... سخت گرمی پڑ رہی تھی..... صبح پانچ بجے روشنی اندھیرے کو نگل لیتی تھی۔



”سرکار..... خیر تو ہے آج ہماری جھکیوں پر دھاوا کیوں بول رہا ہے؟“

”کانشیل نواز نے فوراً پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”جی..... ماگھا.....“

”دیکھیں..... بزرگو! ہم نے کوئی دھاوا نہیں بولا.....

یہ بات تو آپ کے علم میں آچکی ہوگی کہ ادھر ریلوے لائن

کے ساتھ ایک لڑکی کی لاش ملی ہے، ہم اسی سلسلے میں آئے

ہیں۔“ میں نے فوراً نرم لہجے میں کہا۔

”سرکار آپ کا آنا سرا نکھوں پر..... ہمارے پاس

ایسی جگہ نہیں ہے جہاں آپ کو بٹھائیں۔“ اس نے شرمندہ

لہجے میں کہا۔

”میں نے صرف چند سوال کرنے ہیں..... ادھر

کھڑے کھڑے کرلوں گا۔ یہ بتائیں کہ جھکیوں میں رہنے

والوں میں کوئی مردوزن غائب تو نہیں ہے۔“

”دیکھیں..... جی اس وقت ہماری تقریباً بارہ عورتیں

اور چھ مرد کام پر گئے ہوئے ہیں۔“

”کون سا کام کرتے ہیں؟“ میں نے اس کی آنکھوں

میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”چھ مرد تو شہر میں مزدوری کرتے ہیں، جبکہ عورتیں

مختلف چیزیں بیچنے جاتی ہیں..... جن میں چوڑیاں، کپڑا

اور کاغذ کے بے ہوئے مختلف کھلونے شامل ہیں۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور مرد یا عورت.....“ دیکھو ماگھا

اگر مجھے بعد میں پتہ چلا کہ تم نے کوئی بات چھپائی ہے

یا جھوٹ بولا ہے..... تو تمہیں تھانے میں لے جاؤں

گا اور.....؟“

میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورہ چھوڑ دیا۔

”تھانے دار صاحب! اپنی معلومات کے مطابق میں

نے ہر بات ٹھیک بتائی ہے۔“

”خیر ہم پھر آئیں گے..... اگر تمہیں کوئی بات یاد

آجائے تو تمہانے آ جانا۔“

واپس پر میں نے کانشیل نواز کو جھکی لیتے ہوئے کہا۔

”نواز..... یہ مرحلہ تو طے ہو گیا۔“

”سر..... نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے ان

جھکیوں میں ہمارے لیے کوئی سراغ ہے۔ کیا سراغ ہے؟

”اس کا مطلب ہے؟ رات ایک اور تین بجے کے درمیان یہ واقع ہوا ہے۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

اتنے میں چائے آگئی..... اسٹیشن ماسٹر نے چائے

لانے والے لڑکے سے کہا۔

”کہ وہ باہر کھڑے پولیس اہلکاروں کو اندر بھیج دے۔

چائے پینے کے دوران بھی بات چیت ہوتی رہی

لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔

رخصت ہوتے وقت میں نے اسٹیشن ماسٹر سے کہا

آپ ذرا ادھر ادھر نظر رکھیے گا، جو بھی کوئی بات یا سراغ ہاتھ

آئے مجھے مطلع کیجیے گا۔

اس نے ایسا ہی کرنے کا وعدہ کیا۔

جونہی ہم اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے باہر نکلے

کانشیل نواز نے کہا۔ ”سرکیوں نہ جھکیوں کا ایک چکر

لگا لیا جائے۔“

میں نے چونک کر کانشیل کی طرف دیکھا اور پھر

مسکرا کر کہا۔

”کیوں بھئی..... کوئی خاص بات.....؟“

”سر..... بات تو کوئی خاص نہیں ہے“ اس نے سر

کھجاتے ہوئے کہا۔ ”بس ویسے ہی سر.....“ اس نے چند

لمحے توقف کیا پھر بولا۔ ”یہ آپ کا ہی قول ہے کہ کسی بات

یا امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔“

”دیری گڈ..... شکر ہے تم نے میری باتوں کو پلے

باندھ لیا ہے۔ چلو پھر۔“ میں نے سپاہی قاسم کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم گاڑی میں بیٹھو۔“

ہمارے قدم خراماں خراماں جھکیوں کی طرف اٹھ گئے۔

یہ میرا تجربہ تھا کہ جھکیوں میں رہنے والے زیادہ تر اس

پنڈ، مٹھی اور اچھے لوگ ہوتے تھے لیکن آٹے میں نمک کے

برابر ایسے لوگ ضرور ملتے تھے جن کا کام چوری چکاری

ہیرا پھیری اور چھوٹے موٹے جرائم کرنا ہوتا تھا۔ ان گندی

جھکیوں نے پورے تالاب کو گندا کیا ہوا تھا۔ ہم دونوں

کو دیکھ کر وہاں سرا سبکی پھیل گئی، کچھ تنگ دھڑنگ بچے باہر

نکل آئے..... کچھ خواتین جھکیوں کے باہر کپڑے دھو رہی

تھیں مرد زیادہ تھے..... ان میں ایک سانولے رنگ

کا بارلیش بندہ بھی تھا وہ آگے آیا..... اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

یہ ابھی واضح نہیں ہے؟“  
 ”چلو..... بھئی جب یاد آ جائے تو بتا دیتا..... ویسے  
 تمہیں کھلی چھٹی ہے کہ تم کسی کے تھرو یا خود آ کر ان جھگیوں  
 میں فیتیش کر سکتے ہو۔“ تھانے میں واپس آ کر میں نے  
 اے ایس آئی جاوید خان کو اپنے کمرے میں بلایا۔  
 ”جاوید خان تمہارے ذمے جو کام میں نے لگایا تھا  
 اس کا کیا ہوا؟“  
 ”سر بڑے خفیہ طریقے سے کام ہو رہا ہے میں نے خبر  
 چھوڑے ہوئے ہیں۔“  
 بہر حال اوپر سے بڑا ریشر ہے جاوید جتنی جلدی  
 ہو سکے کوئی سراغ لگانے کی کوشش کرو۔“ اس معاملے کا ذکر  
 آگے آئے گا۔  
 ”ٹھیک ہے سر..... میں جلد ہی خوشخبری سناؤں گا۔“  
 ”چلو..... یہ تو ہو ہی جائے گا مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے  
 ..... میں نے تمہیں ایک اور کام کے لیے بھی بلایا ہے۔“  
 میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔  
 ”جی جگ سر۔“  
 ”تم آج صبح تھانے میں نہیں تھے۔“  
 پھر میں نے اسے لڑکی کی لاش ملنے کے متعلق بتایا اور  
 ساری باتیں اس کے گوش گزار کر دیں۔  
 ابھی یہ ہم باتیں کر رہے تھے کہ مجھے دفتر کے داخلی  
 دروازے پر سپاہی خوشحال خان کی شکل نظر آئی..... پھر شکل  
 کے ساتھ اس کی آواز بھی میری سماعت سے ٹکرائی۔  
 ”سر..... میں اندر آ سکتا ہوں۔“  
 ”آ جاؤ بھئی.....“  
 اس نے ایک لفافہ مجھے دیا..... اور سلوٹ کر کے  
 چلا گیا۔  
 جیسا کہ آپ بڑھ چکے ہیں کہ میں نے جب لاش  
 پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی تھی تو سپاہی خوشحال خان کو ساتھ  
 بھیجا تھا..... لاش کے چہرے والی تصویروں کی ریل بھی  
 اس کے پاس تھی۔  
 میں نے لفافہ کھولا تو اس میں دس پرنٹ تھے۔  
 ایک تصویر میں نے اپنی دراز میں رکھ لی..... اور باقی  
 اے ایس آئی کو دے تے ہوئے کہا۔  
 ”ارد گرد کے تھانوں میں یہ تصویریں بھیج دو۔“ اس قسم

کی لاشوں کی شناخت کا یہ ہمارا طریقہ کار ہوتا ہے جسے ہم  
 شور و غوغا کہتے ہیں۔  
 بہر حال اے ایس آئی تصویریں لے کر چلا گیا۔  
 اور میں اس کیس کے متعلق سوچنے لگا۔  
 اگلے دن جب پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آئی تو اس میں  
 بڑے سنسنی خیز انکشافات تھے۔  
 رپورٹ کے مطابق مقتولہ کو پہلے جنسی تشدد کا نشانہ  
 بنایا گیا اور پھر اسے گلہ کھنٹ کر ٹکڑے کیا گیا تھا۔ جب اس  
 کا جسم ٹھنڈا ہو گیا تو اس کے مردہ جسم کو کٹڑی چیرنے والے  
 کسی آرے سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ تو درندگی  
 کی انتہا تھی۔  
 قاتل کوئی اذیت پسند تھا۔  
 لیکن.....!  
 سوال یہ تھا کہ لڑکی کون تھی؟ اس کی عمر کا اندازہ میں  
 نے اس کی صورت سے بیس بائیس سال لگایا تھا.....  
 میرا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا..... قاتل نے تو اپنی طرف  
 سے اسے خود کشی کا رنگ دے دیا تھا۔  
 مرنے کا وقت رات بارہ بجے سے ایک بجے کے  
 درمیان لکھا تھا۔  
 یہاں ایک بات اور آپ کو بتا دوں کہ خاتون کے  
 پاؤں میں چپل وغیرہ نہیں تھے..... اس کے علاوہ سونے کی  
 کوئی چیز اور پرس بھی نہیں تھا۔  
 لاش کو میں نے اٹھایا دفترا دیا تھا..... نامعلوم مقتولین  
 کے ساتھ ہمیں ایسا ہی کرنا پڑتا تھا..... اور اس لاش کی  
 حالت تو.....!  
 یہ واردات عجیب تھی..... سب سے زیادہ حیران کن  
 بات یہ تھی کہ لاش کو دو حصوں میں تقسیم کیوں کیا گیا تھا؟ اور  
 وہ بھی ٹکڑے کرنے کے بعد۔  
 دو دن بعد ایک مرد اور ایک عورت میرے پاس آئے۔  
 دونوں شکل سے حد درجہ پریشان نظر آ رہے تھے۔  
 عورت سانولے رنگ کی ایک قبول صورت خاتون  
 تھی..... جبکہ مرد گورا چٹا اور مرادانہ و جاہت کا پیکر رہا ہوگا  
 جوانی میں۔  
 عورت کی عمر کا اندازہ میں نے پچیس سال کے  
 قریب لگایا جبکہ مرد وہاں پانچ کا ہندسہ عبور کر چکا تھا۔

یہ ابھی واضح نہیں ہے؟“  
 ”چلو..... بھئی جب یاد آ جائے تو بتا دیتا..... ویسے  
 تمہیں کھلی چھٹی ہے کہ تم کسی کے تھرو یا خود آ کر ان جھگیوں  
 میں فیتیش کر سکتے ہو۔“ تھانے میں واپس آ کر میں نے  
 اے ایس آئی جاوید خان کو اپنے کمرے میں بلایا۔  
 ”جاوید خان تمہارے ذمے جو کام میں نے لگایا تھا  
 اس کا کیا ہوا؟“  
 ”سر بڑے خفیہ طریقے سے کام ہو رہا ہے میں نے خبر  
 چھوڑے ہوئے ہیں۔“  
 بہر حال اوپر سے بڑا ریشر ہے جاوید جتنی جلدی  
 ہو سکے کوئی سراغ لگانے کی کوشش کرو۔“ اس معاملے کا ذکر  
 آگے آئے گا۔  
 ”ٹھیک ہے سر..... میں جلد ہی خوشخبری سناؤں گا۔“  
 ”چلو..... یہ تو ہو ہی جائے گا مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے  
 ..... میں نے تمہیں ایک اور کام کے لیے بھی بلایا ہے۔“  
 میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔  
 ”جی جگ سر۔“  
 ”تم آج صبح تھانے میں نہیں تھے۔“  
 پھر میں نے اسے لڑکی کی لاش ملنے کے متعلق بتایا اور  
 ساری باتیں اس کے گوش گزار کر دیں۔  
 ابھی یہ ہم باتیں کر رہے تھے کہ مجھے دفتر کے داخلی  
 دروازے پر سپاہی خوشحال خان کی شکل نظر آئی..... پھر شکل  
 کے ساتھ اس کی آواز بھی میری سماعت سے ٹکرائی۔  
 ”سر..... میں اندر آ سکتا ہوں۔“  
 ”آ جاؤ بھئی.....“  
 اس نے ایک لفافہ مجھے دیا..... اور سلوٹ کر کے  
 چلا گیا۔  
 جیسا کہ آپ بڑھ چکے ہیں کہ میں نے جب لاش  
 پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی تھی تو سپاہی خوشحال خان کو ساتھ  
 بھیجا تھا..... لاش کے چہرے والی تصویروں کی ریل بھی  
 اس کے پاس تھی۔  
 میں نے لفافہ کھولا تو اس میں دس پرنٹ تھے۔  
 ایک تصویر میں نے اپنی دراز میں رکھ لی..... اور باقی  
 اے ایس آئی کو دے تے ہوئے کہا۔  
 ”ارد گرد کے تھانوں میں یہ تصویریں بھیج دو۔“ اس قسم

یہ ابھی واضح نہیں ہے؟“  
 ”چلو..... بھئی جب یاد آ جائے تو بتا دیتا..... ویسے  
 تمہیں کھلی چھٹی ہے کہ تم کسی کے تھرو یا خود آ کر ان جھگیوں  
 میں فیتیش کر سکتے ہو۔“ تھانے میں واپس آ کر میں نے  
 اے ایس آئی جاوید خان کو اپنے کمرے میں بلایا۔  
 ”جاوید خان تمہارے ذمے جو کام میں نے لگایا تھا  
 اس کا کیا ہوا؟“  
 ”سر بڑے خفیہ طریقے سے کام ہو رہا ہے میں نے خبر  
 چھوڑے ہوئے ہیں۔“  
 بہر حال اوپر سے بڑا ریشر ہے جاوید جتنی جلدی  
 ہو سکے کوئی سراغ لگانے کی کوشش کرو۔“ اس معاملے کا ذکر  
 آگے آئے گا۔  
 ”ٹھیک ہے سر..... میں جلد ہی خوشخبری سناؤں گا۔“  
 ”چلو..... یہ تو ہو ہی جائے گا مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے  
 ..... میں نے تمہیں ایک اور کام کے لیے بھی بلایا ہے۔“  
 میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔  
 ”جی جگ سر۔“  
 ”تم آج صبح تھانے میں نہیں تھے۔“  
 پھر میں نے اسے لڑکی کی لاش ملنے کے متعلق بتایا اور  
 ساری باتیں اس کے گوش گزار کر دیں۔  
 ابھی یہ ہم باتیں کر رہے تھے کہ مجھے دفتر کے داخلی  
 دروازے پر سپاہی خوشحال خان کی شکل نظر آئی..... پھر شکل  
 کے ساتھ اس کی آواز بھی میری سماعت سے ٹکرائی۔  
 ”سر..... میں اندر آ سکتا ہوں۔“  
 ”آ جاؤ بھئی.....“  
 اس نے ایک لفافہ مجھے دیا..... اور سلوٹ کر کے  
 چلا گیا۔  
 جیسا کہ آپ بڑھ چکے ہیں کہ میں نے جب لاش  
 پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی تھی تو سپاہی خوشحال خان کو ساتھ  
 بھیجا تھا..... لاش کے چہرے والی تصویروں کی ریل بھی  
 اس کے پاس تھی۔  
 میں نے لفافہ کھولا تو اس میں دس پرنٹ تھے۔  
 ایک تصویر میں نے اپنی دراز میں رکھ لی..... اور باقی  
 اے ایس آئی کو دے تے ہوئے کہا۔  
 ”ارد گرد کے تھانوں میں یہ تصویریں بھیج دو۔“ اس قسم

یہ ابھی واضح نہیں ہے؟“  
 ”چلو..... بھئی جب یاد آ جائے تو بتا دیتا..... ویسے  
 تمہیں کھلی چھٹی ہے کہ تم کسی کے تھرو یا خود آ کر ان جھگیوں  
 میں فیتیش کر سکتے ہو۔“ تھانے میں واپس آ کر میں نے  
 اے ایس آئی جاوید خان کو اپنے کمرے میں بلایا۔  
 ”جاوید خان تمہارے ذمے جو کام میں نے لگایا تھا  
 اس کا کیا ہوا؟“  
 ”سر بڑے خفیہ طریقے سے کام ہو رہا ہے میں نے خبر  
 چھوڑے ہوئے ہیں۔“  
 بہر حال اوپر سے بڑا ریشر ہے جاوید جتنی جلدی  
 ہو سکے کوئی سراغ لگانے کی کوشش کرو۔“ اس معاملے کا ذکر  
 آگے آئے گا۔  
 ”ٹھیک ہے سر..... میں جلد ہی خوشخبری سناؤں گا۔“  
 ”چلو..... یہ تو ہو ہی جائے گا مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے  
 ..... میں نے تمہیں ایک اور کام کے لیے بھی بلایا ہے۔“  
 میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔  
 ”جی جگ سر۔“  
 ”تم آج صبح تھانے میں نہیں تھے۔“  
 پھر میں نے اسے لڑکی کی لاش ملنے کے متعلق بتایا اور  
 ساری باتیں اس کے گوش گزار کر دیں۔  
 ابھی یہ ہم باتیں کر رہے تھے کہ مجھے دفتر کے داخلی  
 دروازے پر سپاہی خوشحال خان کی شکل نظر آئی..... پھر شکل  
 کے ساتھ اس کی آواز بھی میری سماعت سے ٹکرائی۔  
 ”سر..... میں اندر آ سکتا ہوں۔“  
 ”آ جاؤ بھئی.....“  
 اس نے ایک لفافہ مجھے دیا..... اور سلوٹ کر کے  
 چلا گیا۔  
 جیسا کہ آپ بڑھ چکے ہیں کہ میں نے جب لاش  
 پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی تھی تو سپاہی خوشحال خان کو ساتھ  
 بھیجا تھا..... لاش کے چہرے والی تصویروں کی ریل بھی  
 اس کے پاس تھی۔  
 میں نے لفافہ کھولا تو اس میں دس پرنٹ تھے۔  
 ایک تصویر میں نے اپنی دراز میں رکھ لی..... اور باقی  
 اے ایس آئی کو دے تے ہوئے کہا۔  
 ”ارد گرد کے تھانوں میں یہ تصویریں بھیج دو۔“ اس قسم

یہ ابھی واضح نہیں ہے؟“  
 ”چلو..... بھئی جب یاد آ جائے تو بتا دیتا..... ویسے  
 تمہیں کھلی چھٹی ہے کہ تم کسی کے تھرو یا خود آ کر ان جھگیوں  
 میں فیتیش کر سکتے ہو۔“ تھانے میں واپس آ کر میں نے  
 اے ایس آئی جاوید خان کو اپنے کمرے میں بلایا۔  
 ”جاوید خان تمہارے ذمے جو کام میں نے لگایا تھا  
 اس کا کیا ہوا؟“  
 ”سر بڑے خفیہ طریقے سے کام ہو رہا ہے میں نے خبر  
 چھوڑے ہوئے ہیں۔“  
 بہر حال اوپر سے بڑا ریشر ہے جاوید جتنی جلدی  
 ہو سکے کوئی سراغ لگانے کی کوشش کرو۔“ اس معاملے کا ذکر  
 آگے آئے گا۔  
 ”ٹھیک ہے سر..... میں جلد ہی خوشخبری سناؤں گا۔“  
 ”چلو..... یہ تو ہو ہی جائے گا مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے  
 ..... میں نے تمہیں ایک اور کام کے لیے بھی بلایا ہے۔“  
 میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔  
 ”جی جگ سر۔“  
 ”تم آج صبح تھانے میں نہیں تھے۔“  
 پھر میں نے اسے لڑکی کی لاش ملنے کے متعلق بتایا اور  
 ساری باتیں اس کے گوش گزار کر دیں۔  
 ابھی یہ ہم باتیں کر رہے تھے کہ مجھے دفتر کے داخلی  
 دروازے پر سپاہی خوشحال خان کی شکل نظر آئی..... پھر شکل  
 کے ساتھ اس کی آواز بھی میری سماعت سے ٹکرائی۔  
 ”سر..... میں اندر آ سکتا ہوں۔“  
 ”آ جاؤ بھئی.....“  
 اس نے ایک لفافہ مجھے دیا..... اور سلوٹ کر کے  
 چلا گیا۔  
 جیسا کہ آپ بڑھ چکے ہیں کہ میں نے جب لاش  
 پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی تھی تو سپاہی خوشحال خان کو ساتھ  
 بھیجا تھا..... لاش کے چہرے والی تصویروں کی ریل بھی  
 اس کے پاس تھی۔  
 میں نے لفافہ کھولا تو اس میں دس پرنٹ تھے۔  
 ایک تصویر میں نے اپنی دراز میں رکھ لی..... اور باقی  
 اے ایس آئی کو دے تے ہوئے کہا۔  
 ”ارد گرد کے تھانوں میں یہ تصویریں بھیج دو۔“ اس قسم



دونوں نے اپنا تعارف میاں بیوی کی حیثیت سے کروایا۔

”تھانیدار صاحب ہم گاؤں سجادوں سے آئے ہیں..... ہماری بیٹی شوروگم ہوگئی ہے۔“

”آپ کی بیٹی.....“ میں نے دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ کب کی بات ہے؟“

”جی یہ پانچ دن پہلے کی بات ہے میرا مطلب ہے آج پانچواں دن ہے۔“ مرد نے جواب دیا۔

قارئین یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ آج ہفتہ تھا لاش بدھ کی صبح لی تھی..... اس کا مطلب کہ وہ منگل کے دن سے غائب تھی۔

”پھر تو آپ کو رپورٹ درج کروائے بغیر واپس بھیج دینا چاہیے۔“

”کیا مطلب تھانیدار صاحب..... ہم تو بڑی امید لے کر آئے ہیں۔“ عورت جس نے اپنا نام مہتاب بتایا تھا۔ نے حیرت اور غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

”آپ نے اتنے دن ضائع کر دیے.....؟“

”دراصل بیٹی کا معاملہ تھا پہلے ہم خود اسے ڈھونڈتے رہے۔“ مرد نے جواب دیا۔

اجانک میں نے میز کی دراز سے تصویر نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔

دونوں اچھل کر اس طرح اٹھ کر کھڑے ہو گئے جیسے کرسیوں میں سپرنگ لگے ہوں۔

”یہ..... یہ..... تصویرہ بھی صرف چہرے کی..... کشور کو کیا ہوا ہے؟ وہ کہاں ہے؟“

میں نے مختصر الفاظ میں انہیں حالات سے آگاہ کر دیا۔

پھر مرد و توڑنے لگ گیا تھا اور خاتون کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

”تھانے وارنہ سب کس نے کیا؟ اور ہمارا ایسا کون سا دشمن ہے؟“ عورت نے پوچھا۔

”یہ تو خاتون آپ کو پتہ ہوگا؟“

”تھانیدار صاحب..... ہمارے خیال میں ہمارا ایسا کوئی دشمن نہیں ہے جو اتنی درندگی کا مظاہرہ کرے۔“

دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

”خاتون آپ کی شادی کب ہوئی تھی؟“

”تقریباً بارہ سال پہلے۔“

”پھر..... کشور آپ کی بیٹی کیسے ہو سکتی ہے؟“

”اوہ..... تھانیدار صاحب..... میں معذرت خواہ ہوں یہ بات مجھے آپ کو پہلے بتانی چاہیے تھی۔“ مرد جس کا نام صفدر تھا نے بتانا شروع کیا۔

”دراصل کشور میری پہلی بیوی شازیہ سے ہے۔ تقریباً تیرہ سال پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا..... اس کے ایک سال بعد میں نے مہتاب سے شادی کر لی تھی۔ اس وقت

کشر کی عمر تقریباً دس سال ہوگی۔“

”چلیں یہ تو آپ نے اچھا کیا..... کیا کشور شادی شدہ تھی؟“ میں نے اپنے ذہن میں آئے ہوئے سوال کو ان کے سامنے رکھ دیا۔

”نام کی شادی شدہ تھی۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرت سے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔

”آج سے دو سال پہلے ہم نے اس کی شادی شاکر سے کر دی تھی۔ دو ماہ بعد ہی اس کے دماغ میں باہر جانے کا سودا سا گیا..... شاکر کشور کی پسند تھا ہم نے یہ سوچ کر

کشر کی شادی کر دی تھی کہ زندگی اس نے گزار لی ہے اگر ہم اس کی راہ میں رکاوٹ بنے تو..... حالات کوئی اور رخ اختیار کر سکتے تھے..... لیکن..... تھانے دار صاحب حالات

نے ایسا رخ اختیار کیا کہ.....“ چند لمحے صفدر نے توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”کشور کسی صورت شاکر کو باہر بھیجنے کے حق میں نہیں تھی لیکن شاکر نے منت سماجت کر کے اور اپنی محبت کا واسطہ

دے کر کشور کو راضی کر لیا..... ہم نے کشور کے اکاؤنٹ میں پچاس ہزار روپے رکھوا دیے تھے کہ وہ اپنی پسند کی چیزیں

خرید لے پھر دس تو لے سونامی میں نے اسے دیا تھا یعنی دس تو لے کی چیزیں بنا کر اسے دی تھیں۔

کشور نے بلاسو پے سمجھے پیسے اور زیورات اپنے مجازی خدا کے ہاتھ میں دے دیے تھے۔

وہ ایسا گیا کہ پھر اس کی کوئی خبر نہیں آئی..... وہ کویت جانے کا کہہ کر گیا تھا سفارت خانوں کی معرفت پتہ کروایا

تو یہ عقدہ کھلا کہ شاکر نام کے آدمی نے کسی ملک کے لیے کوئی ویزہ حاصل نہیں کیا۔ تقریباً دو سال ہو گئے ہیں۔“

76

”آپ نے عدالت میں جا کر کشور کا فیصلہ لے لیا تھا.....“ میں نے کہا۔

”تھانیدار صاحب‘ کشور نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی تھی..... اس کا مطالعہ کافی وسیع تھا، وہ تو کہتی تھی کہ محبت خوشبو ہے، خوشبو کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، اسے پکلا نہیں جاسکتا، وہ کسی صورت عدالت میں جانے پر رضامند نہیں ہوئی تھی..... ایک بات اور بھی آپ کو بتا دوں کہ وہ تھوڑی ایب نارمل بھی ہوگئی تھی، کبھی وہ ویسے ہی باہر نکل جاتی تھی..... اور خود ہی واپس آ جاتی تھی۔“

”اس طرح کے کاموں میں اس طرح تو ہوتا ہے..... جس سے محبت کی جائے وہ کمی چٹائی دے کر چلا جائے تو مت تو ماری جاتی ہے..... سڑاٹھ نے کہا تھا کہ عشق دیوانگی ہے لیکن..... میں نے چند لمحے توقف کیا..... پھر بات کٹا گے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اس کی تو مت ماری گئی تھی، کیا آپ کی عقلوں پر بھی پتھر پڑ گئے تھے۔ آپ نے اس کا علاج نہیں کروایا؟“

”علاج تو جاری ہے تھانیدار صاحب، پھر وہ ایسی خطرناک بھی نہیں تھی کہ ہم اسے کسی پاگل خانے میں داخل کر دیتے یا باندھ کر رکھتے۔“ خیر اب اس معاملے پر زیادہ مفزع کھپائی کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیے میں نے اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

”آپ کے پاس شکر کی تصویر تو ہوگی۔“

”جی ہاں..... گھر میں ہے..... میں شام تک دے جاؤں گا۔“ صفدر نے جواب دیا۔

میں نے نہیں رخصت کر دیا تھا۔

قارئین ایک بات آپ کے ذہن میں کھٹک رہی ہوگی، میں اس کے متعلق آپ کو بتا دیتا ہوں۔

میں نے دونوں میاں بیوی کو کہا تھا کہ اگر آپ کو لاش چاہے تو فلاں قبرستان میں دفن ہے، اس کے ساتھ ہی میں نے انہیں قبر کھدوانے کا قانونی طریقہ بھی بتا دیا تھا۔

ایک کام میں نے یہ کیا تھا کہ ان کا اور ان کے داماد کا ایڈریس لے لیا تھا، کافی عرصے سے کشور ان کے ساتھ ہی رہ رہی تھی، دونوں میاں بیوی کا شمار امیر لوگوں میں ہوتا تھا..... جب صفدر نے یہ کہا تھا کہ مہتاب سے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی..... لیکن وہ اللہ کو پیارے ہو گئے

تھے، تو میرا شک مہتاب پر گیا تھا..... کہ کہیں اس نے کوئی کل نہ کھلا دیا ہو..... مجھے اس شک پر بھی تفتیش کرنی تھی..... ذرا انسان کو بہکا دیتا ہے۔

لیکن اس میں ایک قباحت تھی کہ اتنے عرصے بعد اس نے یہ کیوں کیا تھا، پھر اس بندے کے ساتھ اس کا کیا تعلق تھا..... جس نے ایک ایب نارمل خاتون سے یہ سب کیا تھا؟

ویسے تو انسان کی فطرت عجیب ہوتی ہے، یہ جب اشتباہ تو دلی بن جاتا ہے، لیکن جب گھبراتا ہے تو اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی..... درندوں اور شیطان کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

شام کو میں نے سپاہی قاسم کو ساتھ لیا، اور شکر کے ایڈریس پر پہنچ گیا۔

یہ ایک سات مرلے پر بنا ہوا کھلا مکان تھا..... صحن میں امرود اور آلوچے کے درخت تھے۔ صحن کچا تھا..... برآمدے اور کمروں میں فرش تھا۔

پتہ یہ جلا کہ شکر کا باپ امتیاز اور اس کی بیوی گنہت اپنی بیٹی جس کی عمر بارہ تیرہ سال ہوگی کے ساتھ اس مکان میں رہتے ہیں۔ دو بیٹیاں شادی شدہ تھیں، یہ باتیں مجھے صفدر کی زبانی معلوم ہو چکی تھیں۔

امتیاز ہمیں گھر کے اندر لے گیا، اپنی بیوی اور بیٹی کو ایک کمرے میں بھیج دیا۔

امتیاز درمیانے قد کا ایک قبول صورت بندہ تھا۔ ساٹھ کے بیٹے میں ہوگا۔

”امتیاز بھائی..... دیکھو میں تم کو کھانے میں نہیں بلوایا..... خود آ گیا ہوں..... تمہارے بیٹے نے ایسا جرم کیا ہے جو اسے سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کے لیے کافی ہے۔“

”تھانیدار صاحب..... یہ تو آپ کی فراخ دلی اور مہربانی ہے..... میں آپ کے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دوں گا۔“

”تمہارا بیٹا کہاں گیا ہے؟“

”اس نے تو ہمیں یہ بتایا تھا کہ وہ کوئٹہ جا رہا ہے۔“

”کیا آپ لوگ اسے خود جہاز میں بٹھانے ایئر پورٹ گئے تھے؟“ میں نے اہم سوال کیا۔

”نہیں جناب، ہم اسے بسوں کے اڈے تک چھوڑنے



جب اس کی شکل دوبارہ نظر آئی تو اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی جب اس نے ٹرے میز پر رکھی تو اس میں باداموں والے ٹھنڈے دودھ کے دو گلاس نظر آئے۔

”یہ تکلف تم نے کیوں کیا..... صفر؟“

”بس تمہارا صاحب..... گرمی کا موسم ہے۔“

ہم اس کے خلوص کے آگے سر جھکانے پر مجبور ہو گئے۔

”آپ ہمیں اپنے دامادی تصویر دے دیں..... تاکہ

کارروائی کو آگے بڑھا جاسکے..... میں نے دودھ پینے

کے بعد اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے کہا۔

وہ تصویر لے لیا۔

یہ ایک وجیہ جوان کی تصویر تھی..... ہلکی ہلکی مونچھیں

چہرے پر اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔

تصویر میرے ہاتھ میں دینے کے بعد صفر بولا۔

”ابھی میں تصویر لے کر آپ کے پاس آنے ہی والا تھا

کہ آپ خود ہی آ گئے۔ دراصل مجھے تھوڑی دیر ہو گئی۔“

”صفر علی جس کام نے جس طرح ہونا ہوتا ہے اسی

طرح ہوتا ہے، ہم شاکر کے گھر گئے تھے سوچا وہاں ہی رہا

کے گھر سے ہوتے چلیں۔“ میں نے صفر کا کاندھا چھکتے

ہوئے کہا۔

”میں ذرا کشور کا کمرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”سمت بسمہ اللہ جی۔“

پھر.....!

ہم نے کشور کے کمرے کا باریک بینی سے جائزہ لیا تھا

لیکن کوئی سراغ کوئی کام کی چیز ہاتھ نہ لگ سکی۔ میں

دراصل خطوط کے چکر میں تھا، لیکن مجھے ناکامی ہوئی تھی۔

یہاں یہ بات بھی بتانا چلوں کہ میں نے یہ بات زور

دے کر شاکر کے باپ سے پوچھی تھی کہ کیا بھی شاکر نے

اس دوران خطوط یا خط لکھے تھے۔

اس کا جواب نفی میں تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ جانے کے بعد وہ ایسے غائب

ہو گیا تھا جیسے گدھے کے سر سے بیگ۔

عجیب چکر تھا، جس نے مجھے بھی چکر بنا دیا تھا۔

تھانے میں جا کر میں نے شاکر کی تصویر کے آٹھ دس

پرنٹ نکالوائے، یہ کام سہائی قرن نے کیا تھا۔

اس دن میں نے ایک پرنٹ رکھ کر باقی پرنٹ مختلف

گئے تھے۔ کہتا تھا لاہور سے اس کے کچھ اور دوست بھی کوئٹہ جائیں گے۔“

”اس بات سے آپ کے دل میں کوئی کھٹک، کسی قسم کا

کوئی شک پیدا نہیں ہوا۔“ میں نے بغور اس کے چہرے کی

رف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل نہیں جناب۔“

”شاید اس نے کوئی ویزا پاسپورٹ وغیرہ آپ کو

دکھایا ہوگا۔“

”نہیں جناب.....“

”پھر تو آپ کاٹھ کے الو ہیں یا پھر اس جرم میں شریک

ہیں۔“ مجھے غصہ آ گیا۔

”جرم.....“ وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا، پھر منمناتی

ہوئی آواز میں بولا۔ ”یقین کریں ہمارے تو وہم و گمان میں

بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح غائب ہو جائے گا۔“

”دیکھیں..... اس نے ایک لڑکی کو دھوکہ دیا ہے اور وہ

دردناک موت مری ہے۔ آپ نے آنکھوں پر غفلت کی

پہنی باندھے رکھی ہے۔ ہاتھی کے کان میں سوتے رہے

ہیں۔ ویسے یہ تو بتائیں کہ وہ کام کیا کرتا تھا؟“

”کہتا تھا اس کا ایک سپورٹ لیٹرورٹ کا کام ہے.....

اس سلسلے میں وہ اکثر لاہور جاتا رہتا تھا..... بقول اس کے

دو پارٹنر اور بھی ہیں..... اور ان کا دفتر لاہور میں ہے۔“

”کس جگہ؟“ میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

”یہ تو میں نے نہیں پوچھا..... اور نہ اس نے بتایا۔“

”دل تو کرتا ہے کہ میں آپ کو تھانے لے جاؤں اور

اس وقت تک بٹھائے رکھوں جب تک شاکر کا کوئی سراغ

نہ مل جائے لیکن میں نے اپنے غصے پر صبر کی برف رکھتے

ہوئے کہا۔

”مجھے آپ کے بڑھاپے پر ترس آتا ہے..... والدین

کو اتنا غافل بھی نہیں ہونا چاہیے۔“

اس کے بعد اس کی بیوی اور بیٹی سے بھی چند سوال

کئے گئے..... لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی نکلے

تھے۔

اس کے بعد ہماری اگلی منزل صفر کا گھر تھا۔

وہ تو جیسے مری گئے تھے، بیٹی کی ضد کی سولی پر چڑھ کر

صفر ہمیں اپنے گھر کی بیٹھک میں بٹھا کر غائب ہو گیا اور

کاشیمل نواز کے جانے کے بعد اس نے میرے سامنے بڑی کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کی..... تو میں نے دبا کا رتے ہوئے کہا۔  
”کھڑی رہو..... ابھی تمہارے بیٹھے کا فیصلہ نہیں ہوا۔“

”کیا مطلب.....! تمہانیدار صاحب؟“  
”ہم مجرموں کو کھڑا رکھتے ہیں۔“  
اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتی، میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔  
”تمہارا نام کیا ہے؟“

”جی..... لاڈو..... سب یہی کہتے ہیں۔“  
آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ عورت کے متعلق میں نے اندازہ لگایا تھا کہ شوباز اور پھر ہے ہی عصمت فروش ہے۔  
”اب یہ بتاؤ کہ تم نے کس کی مدد سے کشور کو قتل کیا تھا..... اور اس کی عزت کا قاتل کون ہے؟“

”کون کشور.....؟“  
”جس کی لاش ریلوے لائن پر ملی تھی۔“  
”یقین کریں..... میں نے اسے قتل نہیں کیا..... میں تو.....“ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔  
”بولو..... جلدی سب کچھ اگلو..... ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم عورت ہو۔“ میں نے غصے سے کہا۔  
”دراصل میں صبح اس طرف نکل گئی تھی..... میں نے جب لاش کو دیکھا تو مجھے ٹھنڈے پیسے آ گئے..... جب میں ڈرا اپنے حواس میں آئی تو میری نظریں اس کے کانور پر پڑیں وہاں پڑے جیسے دیکھ کر میری نیت خراب ہو گئی..... اور میں نے جھکے اتار لیے..... اور اپنے کانور میں پہن لیے..... میں مانتی ہوں کہ پولیس کی نظریں بہت تیز ہوتی ہیں لیکن آپ کے کاشیمل کی نیت میرے اوپر خراب ہو گئی تھی۔“ کہتا تھا اگر میں اس کی بات مان لوں تو وہ یہ بات

تمہانیدار صاحب یعنی آپ تک نہیں پہنچائے گا۔“  
میں ہنس پڑا..... اور ایسی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے میری نیت بھی خراب ہو گئی ہو۔  
”دیکھو..... لاڈو تم نے ایک ایسا جرم کیا ہے جس کی سزا پانچ سال تک ہو سکتی ہے.....“ میں نے اسے ڈراتے

تھانوں میں بھجوا دیے۔ اب شاکر کا ملنا بہت ضروری تھا۔  
یہ تو بھوسے میں سے سوئی ڈھونڈنے والی بات تھی..... ویسے جو میں سوچ رہا تھا معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا تھا۔

بہر حال یہ تو شاکر کے ہاتھ آنے کے بعد ہی پتہ چل سکتا تھا..... کہ معاملہ کیا ہے.....؟  
میں اپنی میز پر موجود کاغذات کو غٹا رہا تھا کہ کاشیمل نواز کی آواز میرے کانوں سے نکل گئی۔  
”سر..... میں اندر آ سکتا ہوں۔“  
”آ جاؤ بجٹی.....“ میں نے قلم میز پر رکھتے ہوئے

کہا۔  
میں نے دیکھا اس کے چہرے سے دبا دبا جوش ظاہر ہو رہا ہے۔  
”لگتا ہے نواز تمہیں کوئی کامیابی مل گئی ہے۔“  
”سر..... میں نہ کہتا تھا کہ جھکیوں میں سے ہمیں کوئی سراغ ضرور ملے گا۔“

”اچھا..... یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ کیا سراغ ملا ہے؟“  
”سراغ تیس سال کی قریب ہے سر“ اس نے ذومعنی لہجے میں کہا۔ میں ابھی حاضر کرتا ہوں لیکن سراغ کو حاضر کرنے سے پہلے اس نے چند باتیں مجھے بتائیں چند ہی لمحوں بعد وہ میرے سامنے ایک جھکے نقوش والی تیس سالہ خاتون کو لے کر آ گیا..... عورت کا تعلق جھکیوں سے لگتا تھا۔

”تمہانیدار صاحب..... میں اکیلے میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ عورت نے کاشیمل نواز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
”اچھا.....“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔  
”ایسی کوئی راز و نیاز کی باتیں ہیں جو تم مجھ سے اکیلے میں کرنا چاہتی ہو..... دیکھو بی بی یہ تمہانہ ہے کوئی قلم اسنوڈیو یا ٹیپ نہیں ہے۔“

”تمہانیدار صاحب آپ کی بڑی مہربانی ہوگی..... دراصل چند ایسی باتیں ہیں جو میں کسی کی موجودگی میں نہیں بتا سکتی۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔  
میں نے نواز کو جانے کا اشارہ کیا۔



ساتھ وقت گزارنے کو تیار ہوں، تم جھمکوں کی بات گول کر دو۔“

”سر..... مجھے غصا گیا، میں نے اسے کہا..... سیدی طرح تھانے چلو ورنہ بھٹکری لگا کر لے جاؤں گا۔“

اس طرح یہ یہاں آ گئی۔ راستے میں اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ آپ سے کہے گی کہ.....!“

”ٹھیک ہے..... میں تمہاری ساری بات سمجھ گیا ہوں..... اس نے واقعی تم پر الزام لگایا ہے کہ تم نے اسے کہا تھا کہ اگر وہ کچھ وقت تمہیں دے دے تو.....“

”سر..... یہ بہت کامیاب عورت ہے..... میں نے سجاد کو بھی سفید کپڑوں میں انٹیشن اور جھکیوں کے آس پاس دیکھا ہے شاید وہ بھی کسی چکر میں ہے۔“

سجاد بھی ہمارا خیر تھا..... اور مجھے یقین تھا کہ اسے اے ایس آئی نے کام پر لگایا ہوا ہے۔ اب یہ بات بھی آپ کے سامنے کھول دوں کہ ان دنوں ہمارے تھانے کی حدود میں بڑے خفیہ طریقے سے منشیات فروش کا بازار گرم تھا، میں نے اے ایس آئی کو اس کام پر لگایا ہوا تھا۔

”نواز..... مجھے امید ہے کہ یہ عورت ہمیں قاتل تک پہنچائے گی..... اس سے جھمکے لاس کے کانوں سے اتار کر بیٹے کی حماقت سرزد ہو چکی ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد اسے جانے کی اجازت دے دوں گا۔ میں نے اسے شیشے میں اتار لیا ہے، تم نے خفیہ طریقے سے اس پر نظر رکھو، اب خود اس کے سامنے نہیں آنا ہے۔“

”ٹھیک ہے..... سر..... میں آپ کی بات پوری طرح سمجھ گیا ہوں۔“

”جاؤ..... اور چہرے پر مسکراہٹ سجا کر لاؤ کو یہ کہہ کر بھیج دو کہ تھانے دار صاحب بلا رہے ہیں۔“

کچھ ہی دیر بعد لاؤ میرے سامنے بھی..... اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس بات پر پھولے نہیں ساری، کہ اس نے ایک تھانیدار کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔

یہ تو مٹی جو ہے کا کھیل تھا..... بس نے کس کو قابو کیا تھا یہ تو آنے والے وقت نے بتانا تھا..... اور اللہ کے فضل سے اس وقت وقت کی لگائیں میرے ہاتھ میں تھیں۔

موتے کہا۔

قارئین مجھے اپنی عملے پر پورا بھروسہ تھا، خاص کر کانٹیل نواز سے مجھے اس قسم کی کوئی توقع نہیں تھی..... اور اس لاؤ کی فطرت سے بھی اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔

”چھوڑیں جی..... اس پر مٹی ڈالیں..... آپ کی تو بات ہی اور ہے مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ آج کل کوارٹر میں کیلے ہی رہتے ہیں۔ میں رات کو آپ کے پاس آ جاؤں گی..... اور پوری رات آپ کے پاس رہوں گی۔“

مجھے غصہ تو بہت آیا..... میرا جی چاہا کہ اپنا رولر اٹھاؤں اور اس کے جسم کو نیوٹیل کر دوں۔

لیکن.....!

میں نے اپنے غصے کو ضبط کیا، اور لوہے کو لوہے سے ٹاٹنے کا فیصلہ کر لیا..... بعض اوقات موچھ مچنی کرنے کا فائدہ ہو جاتا ہے۔ میں نے ساہی قاسم کو بلا کر کہا، آج فیس بوائے نہیں آیا، ذرا کسی کو بیچ کر چائے اور بسکٹ منگوا لو۔

وہ ایسی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی جیسے اس کے بس میں ہو تا بھی میرے پاس آ کر بیٹھ جائے۔

بہر حال چائے پلانے کے بعد میں نے اسے کانٹیل کی ہیرک میں بیچ دیا..... اور کانٹیل نواز کو بلا لیا۔

وہ آتے ہی بولا..... ”سر..... اس نے (لاؤ) کیا کہا، کہ جھمکے اس کے کانوں تک کیسے پہنچے؟“

”مجھے تم پر فخر ہے نواز..... میں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔“ وہی اصل میں پرہیز گار ہے جس کو گناہ کی ترغیب ملے اور وہ گناہ نہ کرے۔ تم یہ بتاؤ یہ سب کس طرح ہوا؟“

”سر..... آپ نے مجھے جھکیوں اور آس پاس کھل کر غیش کرنے کی اجازت دی تھی..... میں نے خیر نعت کو اس کام پر لگادیا تھا وہ جھکیوں والوں کے ساتھ محل مل گیا، اس عورت پر اس کی نظر پڑ گئی..... اس کے حلق اس نے مذاہ لگایا کہ عصمت فروش اور چوری چکاری کی ماہر ہے..... اس کے کانوں میں پڑے جھمکوں نے اسے شک میں ڈال دیا..... میں نے اس سے بات کی تو یہ پہلے تو میں بایں شائیں کرنے لگی پھر کہا۔

”دیکھو..... تم بڑے خوبصورت ہو..... میں تمہارے

”کیا مطلب.....؟“  
 ”آج رات مال آ رہا ہے.....“ اس نے انکشاف کیا۔

پھر..... اس نے ساری بات میرے گوش گزار کر دی۔  
 میں نے جی کھول کر اس کی تعریف کی۔  
 اور پھر میں نے اس کے کورٹ میں گیند پھینکتے ہوئے کہا۔

”جاوید..... مجھے تم پر پورا اعتماد اور بھروسہ ہے تم جس طرح چاہو اس معاملے کو ڈیل کرو مجھے مجرم چاہیے۔ جو موت کے سوداگروں والا کام کر رہے ہیں۔

آپ بالکل فکر نہ کریں سر آج انشاء اللہ یہ کھیل ختم ہو جائے گا..... ویسے ایک بات ہے اگر ریلوے لائن کے پاس لاش ملتی تو ہم شاید اتنی جلدی مجرموں تک نہ پہنچ سکتے۔

وہ چلا گیا..... اور میں ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔

رات کے پچھلے پہر چھ بندے ہمارے قبضے میں آ گئے۔ سب سے حیرانگی والی بات یہ تھی کہ ان میں کاٹہ بدلتے والا دیکھ بھی تھا۔

میں تھانے میں ہی تھا..... یہ رات اسی طرح گزارنی تھی۔

پانچ بندوں کو میں نے حوالات میں بند کروا دیا۔ اور دیکھ کر اسے کمرے میں بلا لیا۔

اب میں اس کو اور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔  
 ”ہاں جی..... وسیم صاحب اب سچ بولو گے یا مجھے تمہارا کاٹہ بدلانا پڑے گا..... پہلے تم بہت اداکاری کر چکے ہو۔“

”جناب..... میں تو صرف قادرے اور ظفری کی مدد کر رہا تھا یقین کریں مجھے نہیں پتہ کہ لکڑی کی پٹیوں میں کیا ہے؟“

”تم کتنے عرصے سے یہ کام کر رہے ہو؟“

”ایک ماہ سے۔“

”تم نے بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ یہ راز معلوم کرو کہ آخر ان پٹیوں میں کیا ہے؟ اور رات کے اندھیرے میں ان کو کیوں ایک ویران مڑوک ودام میں

’لاڈو..... تم یہ جھمکے اتار کر مجھے دے دو..... یہ تمہارے لیے مصیبت کا باعث بنیں گے۔“

”آپ جو حکم کریں میں کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کی باندی جو ہوں بس آپ اس بات کو گول کر دیں اور میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔“

”بھئی ایک بار کہہ جو دیا..... کہ تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا..... میں تمہیں نئے جھمکے بنوا دوں گا بس تم ایک کاغذ پر دستخط کر دو۔“

”کیسا کاغذ..... جی.....؟“ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

”کاغذ پر یہ لکھا ہوگا کہ تم نے اپنی رضا اور مرضی سے جھمکے میرے حوالے کیے ہیں۔“

”دیکھیں..... کہیں مجھے پھنسانہ دیجیے گا۔“

”تمہارے اوپر مقدمہ تو میں ویسے بھی بنا سکتا ہوں۔ چلو نہ کرو کاغذ پر دستخط..... میں نے حق کی سہارا۔“

”میں دستخط تو نہیں کر سکتی..... البتہ انگوٹھا لگا دیتی ہوں آپ کو ناراض تو نہیں کر سکتی..... ابھی آپ سے اور بھی کام کروانے ہیں۔“ اب میرے کان کھڑے کرنے کی باری تھی..... جی بھی جو کام تشدد سے نہیں ہو سکتے وہ نفسیاتی طریقے سے ہو جاتے ہیں۔

میں نے رخصت کرنے سے پہلے اس سے جھمکے لے لیے اور کاغذ پر انگوٹھا بھی لگوا لیا میں نے نفسیاتی طریقے سے اس سے ہر وہ بات منوائی تھی جو اس کی خلاف جانی تھی۔

جاتے جاتے وہ کہنے لگی ”تو میں کب کوارٹر میں آؤں؟“

میں نے کہا۔

”ابھی تم جاؤ..... میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“

میں نے اسے کوارٹر میں بھی بھی نہیں بلوایا تھا..... میں اپنے خدا کا جتنا بھی شکریہ ادا کرتا تھا کہ اس باری تعالیٰ نے مجھے ایسے نازک مواقعوں پر ہمیشہ ثابت قدم رکھا تھا۔

ابھی دو ہی دن گزرے تھے کہ شام سے تھوڑی دیر پہلے اے ایس آئی نے مجھے بتایا۔

”سر..... سجاد نے بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے۔“



ناراجا جاتا ہے؟“ میں نے اے ایس آئی سے حاصل ہونے  
لی معلومات کی روشنی میں کہا۔

”مجھے یہ خیال بسھی نہیں آیا۔“

اسی وقت کا کسٹبل نواز بھی میرے کمرے میں تھا.....  
نے اسے کہا۔

”جی سر.....“ اس نے وسیم کو گھورتے ہوئے کہا۔

کاشییل نواز ملزموں کو اسی طرح گھورتا تھا کہ ان  
دعا خون خشک ہو جاتا تھا۔

”اس کو لے جاؤ اور اس کے دماغ کا ایسا کٹا بند لو کہ  
 کے دماغ کی گاڑی سچ کے اسٹیشن پہنچ جائے۔“

”چلو..... لکڑی کے باندر.....“ وہ اسے کھیلتا ہوا لے

یہ کوئی بہت منظم گروہ تھا..... کیونکہ تلاشی کے دوران  
کی جیب سے زہریلا کپسول برآمد ہوا تھا۔

وہ یعنی وسیم بڑا سخت جان ثابت ہوا تھا..... اور اپنے  
بیان پر ہی ڈنار ہا تھا۔

لیکن میرا تجربہ کچھ اور کہتا تھا..... اس لیے میں نے اگلی عدالت سے اس کا چھ روزہ رہیمانڈ لے لیا۔

باقی پانچ بندوں میں تین ملی تھے، جن کو صرف اپنی وری سے غرض تھی۔ ان کو میں نے مقدمے میں رکھنا تھا

نکدہ گواہ بھی تھے اور ان کو سزا بھی ہو سکتی تھی۔  
باقی دو کا تعلق جھکیوں سے تھا۔ وہ بہت بودے ثابت

یہ تھے۔ انہوں نے صرف تھوڑی سی مار کھا کر یہ  
یا تھا کہ ان کا کام مال لوڈ کرنا ہے اور سپلائی کرنا بھی

..... انہوں نے چار ایسے بندوں کی نشاندہی کی تھی جو ہر شہر کے کاجوں تک بھی پہنچا رہے تھے..... ہم نے ان

میں گرفتار کر لیا تھا..... اور آپ کو یہ بات بھی بتا دوں کہ دھندے میں لاڈو بھی ملوث تھی..... اور یہاں ان

مرغہ وسم تھا۔ وسم کے خلاف اتنے ثبوت تھے جو اسے  
ثبات فروش ثابت کرتے تھے۔

لیکن مجھے اس پر ایک شک اور بھی تھا.....  
اس کار میمانڈ لینے کے بعد میں نے اسے اے ایس آئی

فاروق کی عمرانی میں دے دیا..... ملک فاروق اس نے میں نیا آیتھا اور اس قسم کے کاموں میں ماہر تھا۔ پانچ

گھنٹوں بعد..... وسم کا انگ انگ بولنے کے قابل ہو گیا۔

”ہاں جی..... وسیم..... اب کیا حال چاں ہیں؟“ میں نے اسے طنزیہ لہجے میں گھورتے ہوئے کہا۔

”تھانے دار صاحب..... میں سب کچھ بتا دوں گا.....  
لیکن..... اس کے بعد آپ مجھے خودکشی کی اجازت دے دیں“

”اوائے..... عقل سے پیدل..... اوپر تو وہ باری تعالیٰ نہیں تو اوپر والے مجھے جیل میں بھی نہیں چھوڑیں گے۔“

ہے..... جو سب کا خالق اور مالک ہے۔“

”جناب میں اپنے بڑوں کی بات کر رہا ہوں۔“

”زیادہ..... ادھر ادھر کی باتیں نہ کرو شروع ہو جاؤ“  
 ”ورنہ ایک اور پتھر الگوا دوں گا..... ڈرائنگ روم کا.....“

سپاہی بولا۔  
”جناب میں پہلے ہی مر رہا ہوں.....“ اس نے اپنے

جسم کو دباتے ہوئے اور ہائے کا ورد کرتے ہوئے  
کہا۔

قارئین اس کے اقرار جرم کی کہانی میں اپنے الفاظ میں  
آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں۔

وسیم کا اصل نام بشیر تھا..... وہ اس دھندے میں عرصہ پانچ سال سے ملوث تھا..... وہ ریلوے کی نوکری بھی

کر رہا تھا..... اور ساتھ ساتھ یہ دھندہ بھی کر رہا تھا.....  
پیشیوں میں ولایتی شراب اور نیچے خفیہ خانوں میں ہیر و دکن

اور چرس ہوئی تھی..... متروک گودام کے متعلق انہوں نے مشہور کروا رکھا تھا کہ وہ آسیب زدہ ہے..... اس لیے وہاں

کوئی نہیں جانتا تھا..... یہ پٹیپاں یہاں اسٹین کے پاس  
واقع ایک بڑے مکان میں بنتی تھیں..... وہاں آراستہ

بھی تھی..... اور ایک پٹھان ہمت خان وہاں ہوتا تھا..... وہ  
 بھی ہمارے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ مکان سے ایک جوڑا سینڈل

کا بھی برآمد ہو کیا تھا، انہوں نے بلکہ لاڈو نے یہ سوچا تھا کہ جب بات ٹھنڈی ہو جائے گی تو یہ جوڑا وہ خود استعمال

کر لے لی..... جی ہاں کشوری عزت کا مجرم اور قاتل بشیر  
 ہی تھا..... شام کو اسٹیشن پر کشور کو اس نے دیکھ لیا..... اتنی

”آپ نے کہاں جانا ہے؟“

”بھائی میں نے جانا کہاں ہے میں تو اپنے محبوب کو ڈھونڈ رہی ہوں۔“ شاید اس وقت اس کی ذہنی رو بہک چکی ہوئی تھی۔

”محبوب کو.....؟“ بشیر نے زیر لب دہرایا۔ پھر پوچھا۔

”وہ کہاں ہے؟“

”وہ مجھے دھوکہ دے کر غائب ہو گیا ہے..... شاکر نام ہے اس کا۔“

”ذرا اس کا حلیہ تو بتاؤ۔“

اس وقت تک شاید کشور کی ذہنی حالت پھر نارمل ہو گئی تھی۔ اس نے جب شاکر کا حلیہ بتایا..... تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

شاکر تو ان کی گینگ میں شامل تھا..... اس نے شادی کے بعد باس سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اب اس دھندے کو خیر باد کہہ دینا چاہتا ہے، بشیر نے مجھے کہا تھا کہ تھانیدار صاحب جو بندہ ایک بار اس دھندے میں شامل ہو جائے اس کا لکھنا موت ہوتا ہے۔ باس نے شاکر کو کہا کہ وہ یہ خیال دل سے نکال دے۔ شاکر چپ ہو گیا.....

پھر ایک دن پتہ چلا کہ وہ غائب ہو گیا ہے..... یقیناً اسے مار دیا گیا تھا..... کچھ باتیں بشیر کے بیان سے ہٹ کر میں نے سوچی تھیں..... جو قریب قیاس تھیں شاید اس نے پیسے اور زیور اس لیے لیا تھا کہ چپ چاپ باہر چلا جائے اور

بعد میں اپنی بیوی کو بھی بلا لے..... اور یہ باہر جانا غیر قانونی طور پر ہی ہو سکتا تھا..... نفسیات کا دھندہ کرنے والے کبھی کبھی گولیاں نہیں کھیتے..... ان کو کسی طرح پتہ چل گیا ہوگا اور انہوں نے اسے ٹھکانے لگا دیا ہوگا، میں اس تھانے میں اس کے بعد ایک سال رہا..... لیکن مجھے اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا..... بہر حال بات ہو رہی تھی کشور کی..... بشیر نے اسے کہا کہ وہ اس وقت اس کے کوارٹر میں چلی جائے، کیونکہ جلد ہی رات ہو جائے گی۔

وہ بچی اس کے ساتھ چلی گئی..... رات کو شیطان نے اپنا کام کر دیا..... وہ کافی عرصے سے اپنے شوہر سے دور تھی..... اس لیے بشیر کو قوی طور پر آسانی ہوئی لیکن جلد ہی اس کی آسانی ہوا ہو گئی جب وہ جذبات کے غلبے سے باہر

آئی تو اس نے رونا شروع کر دیا..... اور بشیر کے سینے پر دو ہنتر مارتے ہوئے کہا کہ وہ تو اپنے شاکر کی امانت تھی..... بشیر نے اس کے ساتھ یہ کیا کر دیا؟

بشیر اس افتادے سے گھبرا گیا، اور اس پر پاگل پن کا وہ لحوہ سوار ہو گیا..... جب انسان اپنی یا کسی کی جان لے لیتا ہے اس نے کشور کا گلہ کھوٹ کر اس کو ہلاک کر دیا..... یہ سب ایک بجے تک ہو گیا تھا۔

اب اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ لاش کو ٹھکانے لگانے کے متعلق سوچنے لگا۔

اس نے کشور کے کانوں سے جھپکے اتار لیے..... جو بعد میں اس نے لاڈو کو دے دیے۔ وہ بھی اکثر اس کی راتیں آباد کرنے کے لیے اس کے کوارٹر میں آتی رہتی تھی..... لاڈو نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ اس نے ریلوے لائن کے پاس بڑی لاش کے کانوں سے جھپکے اتارے تھے..... میں نے اسے اس وقت جان بوجھ کر ڈھیل دی تھی میرا شک یہ تھا کہ وہ واردات میں ملوث ہے۔

اب بات رہ جاتی ہے لاش کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تو بشیر نے بتایا تھا کہ ویسے ہی اس نے اس قتل کو کسی جنونی قاتل کے کھاتے میں ڈالنے کے لیے یہ سب آرا مشین پر کیا تھا۔

مجھے یہ سن کر بہت غصہ آیا تھا..... میں نے سپاہی سے کہا تھا۔

”اسے لے جاؤ..... اور اس کو الٹا لٹکا دو..... اور نیچے مرجھوں کی دھونی دو..... اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس کے جسم کے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دیتا، وسم نے ریزہ ریزہ کر کے لاش کو ٹھکانے لگا یا تھا اس وقت ہر طرف ہوا کا عالم تھا..... میں نے کیس تیار کر کے حوالہ عدالت کر دیا تھا..... باقیوں کو جو سزا ہوئی تھی وہ تو ہوئی ہی تھی جج صاحب نے بشیر کو پھانسی کی سزا دی تھی۔ کشور کے والدین نے چشم پوشی کا ثبوت دیا تھا، میں تو انہیں کوئی سزا نہیں دلواسکا تھا لیکن چند ہی ہفتوں بعد دونوں پر قانع کا حملہ ہوا تھا، اور وہ چار پائی کے ہو کر رہ گئے تھے..... اسے کہتے ہیں مکافات عمل۔“

نفس افق



# وہ تیس دن

عمارہ خان

قسط نمبر 06

یہ کہانی خود غرضی اور لالچ پر مبنی ہے کہ کیسے کچھ انسان اپنی غرض پوری کرنے کے لیے دوسروں کا احساس کیے بنا ہی کچھ ایسے شرمناک کام انجام دے جاتے ہیں جو رہتی دنیا کے لیے باعث شرم بن جاتے ہیں اپنے حال پر مطمئن رہنا بھی ایک شکرگزاری ہی ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اس کہانی کے کچھ کرداروں کا فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ وہ غلط تھے یا درست، حالات کے بے رحم سمندر میں بہتے ہوئے کمزور انسان اپنے آپ کو بچانے کی خاطر اکثر فطرت اور ضمیر کے خلاف بھی چلے جاتے ہیں جس کا خمیازہ اس کے ساتھ اولاد کو بھی بھگتنا ہوتا ہے مجھے یعنی صاحب تحریر عمارہ خان کو جیسے بتایا گیا تھا اسے جوں کا توں لکھ دیا ہے ہو سکتا ہے اس کو پڑھ کر آپ اپنے گھر کی بنیاد کے بارے میں بھی مشکوک ہو جائیں کیونکہ یہ کہانی ایک ایسے خونی گھر کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو کسی نے بہت پیار سے اپنی بیوی کے لیے بنوایا تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ اس گھر کی بنیاد میں کالے جادو کے کچھ اثرات ہیں جن سے بچھا جھڑانا بے حد مشکل ہے یہ بھی ممکن ہے کہانی پڑھنے کے دوران آپ کو کچھ سوال ابھرن میں ڈال دیں لیکن جیسے جیسے کہانی اپنے انجام کی سمت جائے گی آپ کو سوالوں کے جوابات بھی ملتے جائیں گے اور پھر شاید فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ حقیقتاً قصور وار کون تھا؟ کون تھا جس نے اپنی خواہشات کے منہ زور گھوڑے کو لوگام نہیں ڈالی اور کتنے ہی گھروں کو اپنے ساتھ تکلیف میں ڈال دیا قصہ مختصر کرتے ہیں اور اس آسپ زدہ خونی گھر کی کہانی کا حصہ بنتے ہیں



بچ گیا ہے۔“ لشہ نے جہاں لیتے ہوئے شہیر کو مزید تفصیل بتائی۔

”آخری سال ہے نا، اسی لیے اسکول والے نت نئی جگہوں پر لے جا رہے ہیں پھر یہ وقت دوبارہ نہیں آئے گا۔“

شہیر کی سوئی چاند کی چودہ پہانک گئی تھی۔ وقت تو واقعی کبھی واپس نہیں آتا دل ہی دل میں شہیر نے بیٹی کے الفاظ دہرائے۔

”ٹھیک ہے پایا۔ مجھے نہیں اٹھائیے گا صبح۔“ لشہ نے ایک بار اور یاد دہانی کرائی اور کمرے سے باہر نکل گئی اس کے جاتے ہی شہیر نے فوراً ہی موبائل پر وقت دیکھا اور سامنے لگے ہوئے کلینڈر پر تاریخ دیکھی، جہاں آج کے دن کی تاریخ کو ہائی لائٹ کیا ہوا تھا۔

”اوہ۔“ شہیر کا دل ہی اچاٹ ہو گیا، فائلز ایک طرف کر کے وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”پھر آگئی وہ رات..... خونی رات۔“

شہیر کا سارا دھیان آسیب زدہ مکان کی سمت ہو گیا تھا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ اپنی کرسی چھوڑی اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ ٹھنڈی ہوائ نے اس کا استقبال کیا لیکن ذہن پر چھائی ہوئی سوچ نے اسے کچھ بھی انجوائے نہیں کرنے دیا۔

”چہ نہیں خونی چکر کس کو اپنے ساتھ لے جائے گا اس بار۔ فیصل نے بھی کس تھنجال میں پھنسا دیا ہے مجھے۔“ شہیر نے سچائی سے منہ موڑتے ہوئے سارے کھاتے فیصل کی سمت کر دیے۔

☆ ☆ ☆

سونیا نے کچن کا ایک چکر لگایا اور اب پھر سے اپنے سوچے ہوئے پاؤں کو لے کر بیٹھ گئی۔

”اوہ چند برتن دھو کر یہ حال ہو گیا ہے لگتا ہے ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑے گا۔“ سونیا نے بڑبڑاتے ہوئے ٹیس دیتے پاؤں کو ہلکا مساج دیتا شروع کیا، سامنے رکھے موبائل کی اسکرین نے روشن ہو کر سونیا کی توجہ اپنی طرف کھینچی۔

”الماس کا لنگ۔“ سونیا نے غصے سے فون اٹھایا اور دوسری طرف کی بات سننے سے پہلے ہی اسے ڈانٹا شروع

سونیا نے اپنا پاؤں گرم پانی سے نکال کر ٹاول سے صاف کیا اور پاؤں کی کم ہوئی سوجن دیکھ کر سکون کی سانس بھری۔

”افف ذرا سی چوٹ نے چلنے پھرنے سے محتاج ہی کر دیا تھا۔“

سونیا نے پاؤں کی انگلیوں کو ہلاتے ہوئے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور دھیرے دھیرے اس پر وزن دے کر کھڑے ہونے کی کوشش کی ایک ہلکی سی ٹیس نے اسے بتایا کہ ابھی مکمل طور پر اس پر وزن نہیں دے پائے گی لیکن اب کم از کم صبح والی صورت حال نہیں تھی جو ایک ہی جگہ محدود ہونے پر مجبور ہو گئی تھی۔ کچن کی سمت جاتی ہوئی سونیا نے ایک بار پھر وقاص کو فون کرنا چاہا لیکن گنگنل ناپلے کے سبب بھنجلا کر رہ گئی۔

”یہ تو مسئلہ والی بات ہے، اگر کبھی کوئی ایمر جنسی ہو گئی تو دھر گنگنل ہی ڈھونڈنا جائے بندہ۔ چلو صبح ہی کروتی ہوں۔“ بڑبڑاتے ہوئے سونیا نے بیچ ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔

☆ ☆ ☆

”پاپا میں صبح اسکول نہیں جاؤں گی۔“ لشہ نے بیگ بند کرتے ہوئے نیند سے بھری ہوئی آنکھوں سے شہیر کو دیکھا جو اخبار اور کچھ فائلیں آس پاس بکھرائے پوری طرح گنگن تھا۔

”سانا پاپا۔“

”ہاں ہاں سن لیا تم کچھ زیادہ ہی اسکول سے چھٹیاں کرنے لگی ہوئے۔“ شہیر نے نظریں اٹھائے بغیر اپنی بیٹی سے سوال پوچھا۔ ”بیمپر زقریب ہیں اور اس پر یہ آئے دن کی چھٹیاں۔“

”اوہو پاپا۔ آج اسکول ویسے ہی ہاف ڈے تھا نا۔“ وہ کیوں بھلا۔“ شہیر نے فائل پر کچھ لکھتے لکھتے لشہ کی طرف دھیان دیا۔

”کیونکہ آج چاند کی چودہ ہے اور اسکول والے ہمیں بیچ کیسٹنگ کرانے لے گئے تھے۔“

”چاند کی چودہ۔“ شہیر کی رگ رگ میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

”میرا موڈ نہیں ہوا اسی لیے میں نہیں گئی ورنہ میرا پورا



ہو گئی۔

”اب تم بھی وقاص کے نقش قدم پر چلنے لگی ہو وقت دیکھو ذرا کیا ہو رہا ہے۔“

”سو سواری باجی شام سے ہی میں ریحام کے ساتھ ہوں۔“

”تو مجھے بتانا پسند نہیں کر سکتی تھیں تم۔ میں اتنا پریشان ہو رہی ہوں ادھر تا تم آئی ہو ابھی تک نا وقاص آئے ہیں حد ہوتی ہے بے پروائی کی۔“ سونیا نے ایک دم ہی بلند آواز میں الماس کے لئے لیے۔

”سواری باجی بس ایسے ہی اچانک پروگرام بن گیا تو میں اس کے گھر آ گئی آپ کو معلوم ہے تا وہ سائٹ میں رہتی ہے۔“

”سائٹ پر رہنے کا یہ مطلب ہو گیا کیا جب دل چاہے گا بنا بتائے تم کسی کے بھی گھر چلی جاؤ گی ایسی تو تربیت نہیں ہے ہماری الماس۔“ سونیا نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے ڈانٹا۔

”وہ باجی، اس نے گھر آنے ہی نہیں دیا مجھے ابھی بھی سامنے بیٹھی مسکرا رہی ہے مجھے ڈانٹ بڑا دیکھ کر۔“ الماس نے فوراً ہی ڈھکے چھپکے الفاظ میں سونیا کو احساس دلایا اس کی دوست سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔

”اب یہ بتاؤ گھر آتا ہے یا نہیں۔“ سونیا نے الماس کی پوزیشن سمجھتے ہوئے مزید ڈانٹنے سے پرہیز کیا۔

”آتا ہے آتا ہے، گھر کیوں نہیں آتا باربس ذرا لیت ہو جاؤں گی۔“ الماس نے جھجکتے ہوئے بات مکمل کی۔

”اس سے زیادہ کیا لیت ہو گی تم۔ الماس وقت دیکھو اور خود کو دیکھو اب کیا مناسب ہے اس وقت تمہارا کسی اور کے گھر میں رہنا۔“ سونیا نے کھڑکی سے شام کے دھندلکے کو دیکھ کر سونیا کو احساس دلانا چاہا۔

”اوہ کم آن باجی نو مور پچر پلیز۔“ الماس نے تنک کے فوراً ہی سونیا کو ٹوک دیا۔

”تم آؤ گھر کرتی ہوں تمہارا کوئی بندہ دست اب۔“ سونیا نے تنک سے موبائل رکھتے ہوئے بڑبڑانا جاری رکھا۔

”سب کرو اپنی مین مانیوں۔ ایک میں ہی فارغ ہوں جو ہر ایک کا انتظار کرتی رہتی رہوں نا۔ شام سے رات ہونے والی ہے اور دونوں کو دیکھو صبح گھر سے نکلے تھے اور اب بھی

آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ سونیا نے جھنجھلاتے ہوئے بیڈ سے اٹھ کر کچن کی سمت چلتا شروع کیا۔ ”بے کار ان لوگوں کے لیے کھانا نہیں کھایا تھا اچھا ہوتا گرم گرم ہی کھا لیتی۔“ سونیا نے اپنے لیے کھانا نکالا اور کچن کاؤنٹر پر بیٹھ کے بے زاری سے نوالے کھانے لگی۔

”اکیلے کھانا بھی نہیں کھایا جاتا۔“ سونیا نے منہ بتاتے ہوئے ایک جھٹکے سے ٹرے پرے کی۔

”اب پورے گھر میں باگلوں کی طرح ننگڑاتی پھروں۔ سڑھیاں بھی نہیں چڑھ سکتی ورنہ بچوں کے پاس ہی چلی جاتی ایک تو اس پاؤں نے بھی اسی وقت.....!“ سونیا نے سیز میوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے یاسیت سے اپنے پاؤں کو دیکھا اور سر جھٹک کے لاؤنچ میں ہی بیٹھ گئی۔

کمرے سے کچن اور کچن سے لاؤنچ تک آنے جانے میں سونیا کے پیچھے مسلسل کالی لمبی گئی ہوئی گئی جیسے وہ اس کی نگرانی پر مامور ہو۔

کچھ وقت بڑھانے کے بعد سونیا نے وقت دیکھا اور ایک بار پھر وقاص کو فون کرنے لگی بند فون کی ریکارڈنگ سن کر سونیا کا موڈ مزید خراب ہو گیا۔

”بندہ اپنی جان سے چلا جائے لیکن ان کو کوئی پرواہی نہیں ہے۔ فون بند کیسے بیٹھے ہیں۔“ اس نے جھنجھلا کر فون صوفے پر ہی پھینک دیا اور خود چائے بنانے کا سوچنے لگی لیکن پاؤں میں اٹھنے والی مین اس کے ارادے کے آڑے آ رہی تھی۔

کھڑکیوں سے سرسراتی ہوئی ہوا اکرانے کی آواز سن کر خیالوں میں ڈوبی ہوئی سونیا نے چونک کر سر اٹھایا اور اسے احساس ہوا کافی وقت گزر گیا ہے، ایک بار پھر وقاص کو فون ملایا اور ریکارڈنگ سن کر منہ بنالیا، اپنی ہمت بندھائی ہوئی سونیا نے دھیرے دھیرے اٹھنا شروع کیا۔ اتنی دیر سے ایک ہی جگہ جم کر بیٹھ جانے سے پاؤں پر فرق پڑا تھا شاید جو تکلیف دینے لگا تھا

اب اٹھ ہی گئی ہوں تو چائے بنا لیتی ہوں، اسی کے ساتھ کچھ کھالوں گی ورنہ رات کو بھوک تنگ کرے گی۔ سونیا نے کمرے میں جاتے ہوئے سرسری سا کچن کی سمت دیکھا اور چند برتن دیکھ کر انہیں بھی دھونے کا فیصلہ کیا۔

دیکھا جہاں چاند اپنی دلفریب روشنی کے ہمراہ آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔

”مجھے معاف کر دو مثنیٰ اگر میں تمہاری بات سن لیتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ سب میری وجہ سے ہوا تم اور وہ.....!“

اچانک فیصل روتے ہوئے مثنیٰ کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کا ڈرپ لگا ہاتھ اٹھا کر اپنی بہتی آنکھوں سے لگایا۔

بسا بسا گھر میری ایک بے پرواہی سے ختم ہو گیا۔ مثنیٰ کے سر ہانے لگی مثنیٰ کی جلتی جلتی روشنیوں نے ایک بار پھر تیزی پکڑی۔

”میں کیسے گزرا ہوا وقت واپس لاؤں مثنیٰ مجھے بتاؤ۔“  
سکتے ہوئے فیصل کو علم نہیں ہوا کہ مثنیٰ کا سانس تیزی سے چلنے لگا تھا اور وہ بے چین ہو رہی تھی۔ ”صرف ایک بار صرف ایک بار وہ ناظم مجھے مل جائے تو میں سب کفارہ کر دوں گا۔“

”اوہ مائی گاؤ۔“ نرس کی گھبرائی ہوئی لیکن تیز جیج سن کے فیصل چونک گیا۔

”پچھتے نہیں یہ کیا کر دیا آپ نے۔“  
فیصل نے ناہنجی سے نرس کو دیکھا جو حیران پریشان کھڑی ہوئی مثنیٰ کو دیکھ رہی تھی۔ فیصل نے اس کی نظروں کا پیچھا کیا اور دھک سے رہ گیا جس ہاتھ کو وہ تھاما ہوا تھا وہ خود اس کے لٹ پٹ تھا۔

☆ ☆ ☆

”اف بہت لیٹ ہو گیا ہوں، سونا یقیناً غصے میں ہوگی۔“ وقاص نے ہر ممکن کوشش کی تیز رفتاری سے گاڑی چلانے کی لیکن رات کے اس پہر جب نیو کراچی سے ہائی وے کی طرف والی روڈ سنان اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہو تو کوئی بھی ہوش مند انسان ایک حد سے زیادہ گاڑی نہیں بھاگ سکتا تھا۔

”اوہ شٹ۔“ وقاص کی نظر فیول میٹر پر پڑی اور وہ مزید جھنجھلا گیا۔  
”اس کو تھی اسی وقت ختم ہونا تھا۔ اب پینرول پمپ پر گاڑیوں کی لائن میں لگو میاں وقاص اور مزید لیٹ ہو جاؤ۔“

☆ ☆ ☆

”مجھے سخت گھبراہٹ ہو رہی ہے شاہ جی۔“ رخ تاج نے کمرے میں پھیلی ہوئی خاموشی سے گھبراتے ہوئے شاہ کو مخاطب کیا جو خاموش بیٹھے ہوئے کسی غیر مرئی نکتے پر محکمی بندھے بیٹھے تھے۔

”صبر کرو رخ صبر۔ ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔“  
رخ تاج نے بے اختیار ہی کھڑکی کھول دی اور جم کے ایسے کھڑکی ہو گئی جیسے آسیب کو کچھ کرنے سے پہلے روک دیا گیا۔

”مت تھکاؤ خود کو رخ۔“

”کیا کروں شاہ جی دل قابو میں نہیں آ رہا وہ..... اس کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔“ رخ تاج نے چہرے جاند کو ایک نظر دیکھ کر سامنے خونی گھر کی سمت دیکھا۔ ”پتہ نہیں کس بد نصیب کی باری آئے گی آج۔“  
”اسی جلدی تیس دن گزر جاتے ہیں معلوم بھی نہیں ہوتا۔“ شاہ جی نے خود کلامی کی۔

”پتہ نہیں کتنے تیس دن دیکھنے ہیں ہم نے ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا کس کا کیا بگاڑا تھا ہم نے۔“ رخ تاج نے سکتے ہوئے شاہ جی کی سمت چہرہ کیا اور عین اسی وقت ایک ہیولے نے خونی گھر کی چھت پر اپنے قدم جمائے۔

”دعا کرو دعا۔“

”اتنے سالوں سے وہی تو کر رہے ہیں شاہ جی۔“  
”ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی تو نہیں رخ۔“ شاہ نے مایوسی سے سر جھکاتے ہوئے مکمل ہار مانی۔  
اسی کے ساتھ خونی گھر کی چھت پر نمودار ہوتے ہوئے ہیولے نے اپنی جسامت بڑھانی شروع کر دی تھی۔

☆ ☆ ☆

خنک کمرے کی خاموشی میں فیصل ایک تک سامنے لیٹی ہوئی بے خبر مثنیٰ کو دیکھتا رہ گیا۔

”مجھے معلوم ہے مثنیٰ تم ہوش میں نا رہتے ہوئے بھی معمولی طور پر محسوس کر سکتی ہو اور آج..... ہاں آج وہ تیس دن پورے ہو گئے ہیں۔“

فیصل نے نظریں اٹھا کر کمرے سے شلڈ۔ چوبیسی کھڑکی کھول کر سامنے دور تک پھیلے روشن آسمان کی سمت



”اوہو، مجھے پہلے کیوں خیال نہیں رہا اس بات کا وہ تو ویسے ہی اتالیق جاتے ہیں با آسانی مجھے لے سکتے تھے۔“  
”تو اب ٹرائی کر لو نا۔“ ریحام نے جھجکتے ہوئے اپنی دوست کو مشورہ دیا۔

”اب وہ کیسے بتاتی اس کا بھائی کافی باتیں سنا چکا ہے اس وقت ہائی وے کا ٹوٹی جانے پر۔“  
”ہوں فون کرتی ہوں۔“ الماس نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا موبائل اٹھایا اور وقاص کا نمبر سرچ کیا۔  
”شکر ہے تیل جا رہی ہے۔“

”ہیلو..... ہیلو..... بھائی جان کہاں ہیں آپ۔“  
الماس نے فوراً ہی پر جوش ہوتے ہوئے سوال پوچھا۔  
”فیول کی لمبی لائن میں خوار ہو رہا ہوں یار۔ بیزار آواز اسپیکر سے ہوتی ہوئی الماس کی سماعت سے گھرائی۔  
”اوہ شکر۔“ الماس نے فوراً ہی شکر کا کلمہ ادا کیا۔  
”یعنی ابھی آپ گھر نہیں گئے نا۔“

”قسمت میں ہی نہیں لکھا یار۔ اتنی دیر ہو گئی ہے اور موبائل بھی بند تھا ابھی کار چار جڑ خرید کر آن کیا ہے اسے اور فوراً ہی تمہارا فون آ گیا۔ اپنی بہن کو تسلی دے دو، اس کا میاں راستے میں ہے آ رہا ہے۔“

”وہ بھائی بات سنیں۔“  
”خدا کے لیے، اس وقت کوئی فرمائش نہیں داغ دینا۔“ وقاص نے فوراً سے جیستر الماس کے فرمائش پر وگرام پر بند باندھا۔  
”میری ہمت نہیں اس وقت جو کوئی چیز لینے اتر سکوں۔“

”نہیں نہیں کچھ منگوانا نہیں ہے۔“  
”اوہ شکر ہے۔ پھر بولو۔“ وقاص نے کچھوے کی اسپینڈ سے گاڑی آگے کرتے ہوئے پرسکون انداز میں سیٹ سے ٹیک لگائی۔  
”وہ بھائی میں تاریخام کے گھر ہوں۔“

”کیا۔“ وقاص نے پھرتی کے ساتھ سیدھے ہوتے ہوئے تیز لچے میں کفر کیا۔  
”تم اس وقت گھر نہیں ہو اور سونیا اکیلی ہے اسی لیے وہ اتنا غصہ کر رہی تھی۔“ لففف الماس۔ یہ کونسا وقت ہے کسی کے گھر ہونے کا۔“

گاڑی کا رخ مین ہائی وے کی سمت موڑتے ہوئے اس نے اپنا موبائل اٹھا کر سونیا کو فون کرنا چاہا وہ بھی بند ہی تھا اسی کی کسر رہ گئی تھی۔ کراہتے ہوئے وقاص نے گاڑی کی اسپینڈ تیز کی اور دل ہی دل میں سونیا کا تصور کر کے پریشان ہوئے گا۔

”پتہ نہیں کیوں ذہن سے نکل گیا فیل کا۔ اوہ واؤ۔“  
سامنے نظر پڑتے ہی وقاص ساری باتیں بھول گیا۔ کس قدر حسین نظارہ ہے

جہاں ایک طرف اندھیرے میں ڈوبی ہوئی دور تک سڑک تھی تو دوسری طرف سامنے ہی پورا چاند الگ ہی منظر پیش کر رہا تھا، اس کی چاندنی سے آس پاس کی جگہ بھی جگمگا رہی تھی اور پورے چاند کے گرد ہالہ اس کو نظر لگ جانے کی حد تک دلنشین بنا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆  
”ریحام پلیز مجھے ڈراپ کر دو ورنہ باجی قتل کر دیں گی مجھے۔“ الماس نے پریشانی سے اپنی دوست کی منت کی اور ایک نظر باہر ہوتے ہوئے اندھیرے پر ڈالی بہت لیٹ ہو گیا ہے اور باجی پتہ نہیں کیوں فون پک نہیں کر رہی مستقبل فون کرتے کرتے الماس عاجز آ گئی تھی۔

”بھائی نے کہا ہے بس ایک میل دور ہوں۔“ ریحام نے شرمندہ ہوتے ہوئے الماس کو تسلی دی۔

”باتوں باتوں میں وقت کا بالکل اندازہ نہیں ہوتا۔“  
”ہاں لیکن باجی پہلے ہی ناراض تھی اور اب اتنی دیر سے گھر جانے پر پتہ نہیں کیا کیا سن رہی تھی۔“

”اوہ۔“ ریحام کو اندازہ نہیں تھا وہ دوست کو کس مشکل میں ڈال رہی ہے اپنے گھر ملا کر۔

”ان کے پاؤں پر چوٹ بھی لگ گئی تھی آج صبح اسی لیے وہ چڑچڑی ہو رہی تھیں۔“ نادانستی میں الماس نے اپنی بہن کا دفاع کیا۔ ”ورنہ ایسی بھی کوئی بات نہیں وہ اتنی کمزور ویڈیو نہیں ہیں کہ تمہارے گھر آنے پر یوں۔“  
”تم رہتی بھی تو اتنی دور ہو کہ حد نہیں۔“

”تمہارے گھر سے تو میں منٹ کا راستہ ہے یار اگر مجھے اندازہ ہوتا کہ اتنی دیر ہو جائے گی تو بھائی جان سے کہہ دیتی وہ مجھے آفس سے اٹھتے ہوئے پک کر لیتے۔“ الماس نے آنسوؤں کرتے ہوئے سر جھکا۔

ایک بیچ کھینے لگی۔

”اب صبح ہی آتا میں گیٹ نہیں کھولوں گی۔“

موبائل پر ٹائپ کرتے کرتے وہ بے خیالی میں کچن کے اس گیٹ تک چلی گئی جو سیدہ حالان میں کھلتا تھا گہری سانس لے کر اس نے کھینچی ہوئی فضاء اپنے اندر اتاری اور ایک ٹپک باہر کا لے سیاہ آسمان میں جگمگاتے ہوئے چاند پر ڈالی۔ لنگڑا تے ہوئے سونیا نے لان میں جانے کا فیصلہ کیا دو چار قدم چل کر اس کے پاؤں میں تیس اٹھنے لگی۔

”چلو کل سہی اب تو اسی گھر میں رہنا ہے۔“ سونیا نے مسکراتے ہوئے چاند کو دیکھا اور ایک نظر اپنے لان پر ڈالی جہاں چاند کی روشنی چاندنی میں بے حد حسین نظر آ رہا تھا۔

”ارے۔“ ابنتی ہوئی جانے کی مہک نے سونیا کو متوجہ کیا پھر تھی سے کچن میں آکر اس نے چو لہے کی لوگم کی اور موبائل رکھ کر دودھ کا پیک لینے کے لیے فرنیج کی سمت رخ موڑا۔

ہر سمت چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی تو ہوا بھی سرسراتی ہوئی چل رہی تھی باہر کے فسوں خیز موسم سے ہٹ کر گھر کے اندر سونیا کے پیچھے چلتی ہوئی کالی بلی ایک کونے میں دبکی اسے دیکھ رہی تھی جیسے سونیا کے انجام سے باخبر ہو۔

اچانک سرسراہی ہوا قدرے تیز ہوئی گھر کی چلتی ہوئی لائٹس کی روشنی کم زیادہ ہونے لگی۔ سونیا نے چونک کر کچن کی لائٹ کو دیکھا اور کچھ نا سمجھے ہوئے کھڑکی سے دور بول کی لائٹ کو دیکھا لیکن وہ بالکل ٹھیک تھی جبکہ گھر کی روشنی کم زیادہ ہو رہی تھی۔

”اوہ یہ کیا ہو رہا ہے کہیں وولج کا مسئلہ تو نہیں اس جگہ۔“ سونیا کو اپنی الیکٹرکس کے سامان کی فکر لاحق ہوئی۔

کچن میں کھڑی ہوئی فکر مند سونیا کو نظروں میں رکھتی ہوئی کالی بلی لائٹس کے کم زیادہ ہوتے ہی ایک دم سہم گئی اور فوراً ہی ایک کونے میں جا بیٹھی جیسے کسی کی آمد کو محسوس کر کے ڈر گئی ہو۔

”جد کر دی اس بار تو وقاص نے اب رات کے اس سے وولج کا چکر چیک کروں یا اپنا پاؤں دیکھوں آنے دو آج صاف بات کرنی ہوں بس بہت ہو گیا اس پر جیکٹ کا چکر۔“ سونیا نے سر جھٹک کر بالا خر کھلے ہوئے فرنیج کو

”سوری بھائی میں نے باجی کو بتا دیا تھا لیٹ ہو جاؤں گی لیکن اتنی دیر ہو جائے گی مجھے بالکل آئیڈیا نہیں تھا۔“ شرمندہ ہوئی ہوئی الماس نے فوراً ہی معذرت کی۔

”اوکے۔۔۔۔۔ اوکے۔۔۔۔۔ لیکن بی کیئر فل بیجے ایسے کسی کے گھبرات پر رہنا مناسب نہیں اب تم چھوٹی نہیں ہو جو ایسی باتیں سمجھانی پڑیں۔“ وقاص کی فصیح سن کر الماس کی آنکھوں میں نمی سی آگئی۔ سکے بھائیوں سے بھی بڑھ کر وقاص تھا۔

”سوری بھائی آگے سے ایسا نہیں ہوگا۔“ ”چلو خیر ہے اب کام بھی بتا دو۔“ وقاص نے بھی موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے پک کر سکتے ہیں۔“ الماس نے ایک ہی سانس میں کہہ کر بات ختم کر دی اور وقاص کی گہری سانس لینے کی آواز سن کر وہ مزید شرمندہ ہو گئی اسے اندازہ تھا پورا دن آفس میں کام کرنے کے بعد ایک بار پھر نیو کراچی آنا اور پھر ہائی وے تک واپس جانا مشکل کام تھا۔

”اوکے، ایڈریس ایس ایم ایس کر دو۔“ ”شکریہ بھائی جان اینڈ آئی ایم سوری۔“ الماس نے سکون کی سانس بھری اور چہرہ اوجھا کر کے خدا کا شکر ادا کیا،

اسی کے ساتھ الماس نے اندھیرے میں جگمگاتے پورے چاند کی خوبصورتی پہلی بار محسوس کی جو اپنے حسین ہالے کے ساتھ ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”کس قدر حسین چاند ہے آج۔ اس سے پہلے اس کی خوبصورتی محسوس ہی نہیں ہوئی۔“ سونیا نے کچن سے کھلنے والی کھڑکی سے ایک نظر باہر دیکھا اور چاند پر نظر جما کر کھو ہی گئی۔

”شہر میں تو یہ اونچی بلڈنگوں تلے ہی چھپ جاتا تھا آج نظر آ رہا ہے کہ چودھویں کا چاند کیوں اتنا مشہور ہے اپنی خوبصورتی کی وجہ سے۔“

کچھ ہی دیر بعد سونیا چاند کو دیکھ کر تھک گئی اور اس کی ذہنی روایک بار پھر وقاص اور سونیا کی سمت ہو گئی۔ ”دیکھو ذرا اتنی دیر ہو گئی لیکن کسی نے ایک بیچ تک نہیں کیا۔ چوکیدار بنا رکھا ہے دونوں بہن بھائی نے۔“ سونیا نے موبائل پر نظر ڈالی اور بیچ نہ پا کر خود ہی دونوں کو



ہے آپ چائے کا منع کر دیں ایسا ممکن نہیں۔“ اب کی بار سونیا نے اس کے کپڑوں کی طرف دھیان دیا۔

”ارے یہ کپڑے تو آپ پہن کر نہیں گئے تھے آج آفس۔“

سونیا کے حیرت سے بھرے ہوئے سوال کو نظر انداز کیے ہوئے وقاص ایک بار پھر چاند کی سمت نگاہیں کر چکا تھا۔

”اوہ اچھا پھر کوئی ایمر جنسی مینگ آگئی ہوگی جو آفس میں ہی ڈریس بدلنا پڑ گیا ہوگا تا آپ چلیں میں لاتی ہوں چائے۔“ وقاص کی جانب سے مسلسل خاموشی کو ٹھکنے کا سوچ کر خود کی تسلی کرائی ہوئی سونیا اس وقت سوچ بھی نہیں سکتی تھی آج سے اس کی زندگی بدلنے والی ہے۔

”باہر لے آنا میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ وقاص نے دھیمے لہجے میں سونیا کو تاکید کی اور خود متوازن چال چلتے ہوئے کچن سے فسلک دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ سونیا نے الجھ کر اسے دیکھا اور کندھے اچکا کر دوسری پینلی نکالنے لگی کیونکہ پہلی والی تو خراب ہو چکی تھی۔

”انف کام بڑھ گیا۔ اب اس کو مانجھنا پڑے گا لیکن یہ کیوں اس وقت لان میں چلے گئے اتنی دیر سے آئے ہیں، آرام کرنے کی جگہ مستیاں سو جھ رہی ہیں۔ حد ہے۔“ سونیا نے بڑبڑاتے ہوئے کپ نکالے اور ٹرے میں رکھ کر چائے ایلنے کا انتظار کرنے لگی۔

”اوہو کیا بات ہے، آج تو آپ بڑی فرصت سے نظر آ رہے ہیں۔“

وقاص لان میں رکھی ہوئی پیچ پر بیٹھا سر اوجھا کیے چاند کو دیکھ رہا تھا، اس کے عین قدموں میں ایک کالی بلی سر نواڑے بڑی سی جیسے جبدے میں ہو۔

”کتنا خوبصورت ہے نا۔“ سونیا نے مسکرا کر وقاص کو اپنی سمت متوجہ کیا۔ ادھر علاقے میں آکر اس کی خوبصورتی کا احساس ہوتا ہے۔ ورنہ شہر میں تو بلڈنگوں نے اسے چھپا ہی دیا تھا۔ سونیا نے بھی چاند کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی مداح سرائی کی۔

وقاص خاموشی سے چاند کو تنک رہا تھا جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے کوئی بات کر رہا ہو۔

”خیریت تو ہے، کیا زبان آفس ہی رکھ آئے ہیں

بند کیا اور جیسے سامنے دیکھا تو وہاں وقاص کھڑا ہوا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”ارے آپ.....!“

سونیا نے حیران ہوتے ہوئے گھر کے اندرونی دروازے کو دیکھا جس کا لاک اندر سے کھلتا تھا اور اپنے تئیں وہ لاک کر کے بیٹھی تھی۔

”کیسے..... آئی میں..... آپ کیسے اندر آئے مجھے معلوم ہی نہیں ہوا۔“ حیران ہوتی ہوئی سونیا نے غور ہی نہیں کیا وقاص صبح کسی اور رنگ کے کپڑے پہن کر گیا تھا جبکہ اس وقت سامنے کھڑا ہوا وقاص کالے رنگ کی شلوار میچس میں ملبوس تھا اور ساتھ ہی کالی چادر کی بگل مارے ہوئے تھا۔

”لیکن چلو فاسٹی آپ آئے تو سہی وقت دیکھیں ذرا حیرت کی زیادتی سے سونیا اپنی ناراضگی بھول چکی تھی۔

وقاص کچھ لمحے کھڑے ہوئے اسے بے تاثر انداز میں دیکھتا رہا اور کھڑکڑائی ہوئی آواز میں اسے جواب دیا۔

”ہاں آگیا میں..... آج تو آنا ہی تھا مجھے۔“

سونیا نے الجھی ہوئی نگاہوں سے وقاص کا انداز دیکھا۔

”الماس کا فون آگیا تھا وہ اپنی دوست کی طرف ہے وہ بھی اتنی دیر لگا چکی ہے کہ اب مجھے لگ رہا ہے اس نے پہلے ہی اسے کا سوڈ بنا لیا ہوگا ورنہ ابھی تک تو گھر ہوتی۔“ ”ہاں معلوم ہے وہ گھر پر نہیں ہے اسی لیے..... اسی لیے تو مجھے تمہارے پاس آنا پڑا۔“

کھڑکڑائی ہوئی آواز نے سونیا کو ایک بار پھر حیران کر دیا، سونیا نے مسکرا کر اسے دیکھا اور ایک نظر اپنی چائے کو دیکھا جو یک یک کر جل گئی تھی۔

”کھانا کھا میں گئے کیا۔“

سونیا نے ہی دھیان میں گم تھی ورنہ محسوس کرتی وقاص پلکیں نہیں جھپک رہا تھا اور تاہی اس کی آنکھوں میں کوئی زندگی کی رقیق تھی۔ سیدھا سپاٹ، جذبات سے عاری چہرہ۔

”نہیں ابھی وقت نہیں ہوا۔“ کھدري آواز میں وقاص نے ایک تنک چاند کو دیکھا اور اپنی آنکھیں سونیا پر جمادیں۔

”اچھا تو پھر چائے نہیں گئے، وے پوچھتا تو بے کار

میں دیکھوں یہ یقیناً الماس ہوگی آج اس کی خیر نہیں بس  
آ رہی ہوں بابا۔“ ڈورنیل دوسری بار بھی لیکن سونیا نے بلند  
آواز میں الماس کو اپنے آنے کا بتایا۔

”آگئی یاد میڈم کو گھر کی۔ یہ کوئی وقت ہے بھلا۔“  
سونیا نے بڑبڑاتے ہوئے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا  
اور بت بن گئی۔ سامنے ہی الماس گیٹ کے پاس کھڑی  
ہوئی کانون کو ہاتھ لگائے ہوئے اسے مسکراتی ہوئی دیکھ  
رہی تھی اور گیٹ کے پاس وقاص گاڑی میں بیٹھا ہوا اسے  
دیکھ کر ہاتھ ہلارہا تھا۔ سونیا نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے  
وقاص کو دیکھا اور فوراً ہی پیچھے بیچھے ہوئے وقاص کو  
لیکن وہاں صرف ٹرے رکھی ہوئی تھی اور کوئی نا تھا۔ سونیا  
تھوڑا کر گری۔

☆ ☆ ☆

”بی بی کافی لو ہے اور کچھ ذہنی اسٹریس کی بھی شکار لگتی  
ہیں شاید خیر یہ میڈیسن یوز کرائیں جلد ہی افادہ  
ہوگا۔“ سونیا کو دور کہیں سے مدہم انجان آواز سنائی دے  
رہی تھی۔

”لیکن یہ بے ہوش کیوں ہوگئی ڈاکٹر۔ ابھی بھلی تو تھی  
ایکدم۔“ وقاص کی پریشانی میں ڈوبی ہوئی آواز سونیا کے  
ذہن میں چھائی ہوئی غنودگی کو کم کرنے میں معاون ثابت  
ہوئی۔

”ہو جاتا ہے ہو جاتا ہے، کوئی مسئلہ والی بات نہیں ہے  
میرا خیال ہے آپ لوگ ادھر نئے آئے ہیں اور شفٹنگ میں  
ایک خاتون خانہ اسٹریس کا شکار تو ہو جاتی ہیں نیند پوری  
کر کے انھیں گی تو بہتر باتیں گی خود کو۔“

”اور کچھ..... میرا مطلب ہے.....“ دور ہوئی آواز  
سے اندازہ ہو رہا تھا ڈاکٹر اور وقاص کمرے سے باہر  
جارے ہیں۔ چاہے کبھی آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں سونیا  
کی۔ ایک بھاری بوجھ تھا جو پلکوں پر آن کر رہا تھا۔

”ماما کب انھیں کی خالہ، کیا ہوا ان کو۔“ بچوں کی آواز  
سن کر سونیا کے ذہن کو جھٹکا لگا۔

”ماما بیمار ہیں کیا۔“

”کچھ نہیں ہوا بچو۔“ ابھی ماما انھیں گی اور آپ کو  
بتائیں گی، اسکول کی تو پچھنی ہو جائے گی اب لیکن چلو تم  
لوگ اپنے کمرے میں تو چلو تاکہ ماما سڑب نا ہو۔“ الماس

جنتاب جب سے آئے ہیں خاموش ہیں۔“ سونیا نے الجھتے  
ہوئے وقاص کا کندھا ہلایا۔ یکا یک اسے جھٹکا لگا جیسے کسی  
گرم چیز کو پکڑا ہو۔

”آپ کو بخار ہے کیا اتنے گرم کیوں ہو رہے ہیں۔“  
”آج کا ہم سب کو انتظار ہوتا ہے۔“ بالآخر وقاص  
نے دیر سے سونیا کو مخاطب کیے بغیر ہی بات کا آغاز  
کیا۔

”بہت اہم رات ہوتی ہے یہ۔“  
”کیوں کیا خاص بات ہے آج۔“ سونیا نے چائے کی  
ایک چسکی لی اور آنکھوں سے وقاص کی توجہ ٹرے کی جانب  
کرائی چاہی لیکن وہ تو کم صم چاند کو دیکھ رہا تھا۔

”آج رات..... ہاں آج کی ہی رات وہ رات ہے  
جو ہمارے لیے بہت اہم ہوتی ہے، زندگی کے فیصلے کرنی  
رات جو کم ہی ملتی ہے۔“

سونیا آنکھیں کھولے وقاص کو ہی دیکھتی چلی گئی جواہری  
دھن میں بولے جارہا تھا۔

”یہ رات بہت قیمتی تصور کی جاتی ہے ہمارے پاس۔  
پورے چاند کی چاند یعنی پورن ماشی۔“  
چائے کا ایک نورہ تھا جو سونیا کے منہ سے نکل کے لان  
کی گھاس پر جا گرا۔

”کیا کہا پھر سے کہنا پورن ماشی کون سی فلم دیکھ کر آئے  
ہیں آپ آفس ہی گئے تھے نا۔“ سونیا نے شرارتی انداز میں  
وقاص کو دیکھا۔

”کہاں آپ کو یہ علم نہیں ہوتا کہ آج تاریخ کون سی  
ہے اور آج آپ مجھے بتا رہے ہیں کہ آج پورن ماشی  
ہے۔“ بابا ہادلی کی گہرائیوں سے سونیا کو تہقہہ لگاتے ہوئے  
بالکل انداز دیکھیں تھا یہ آخری لمبی ہے جو وہ ہنس رہی ہے۔

وقاص اسے غصے سے گھورنے لگا جیسے ہی کچھ بولنے  
کے لیے منہ کھولا، اسی وقت ڈورنیل کی سریلی آواز نے  
اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

”یاد رکھنا..... اگلی پورن ماشی کو میں آؤں گا تمہیں لینے  
اور تم ساتھ چلو گی بھولنا مت۔“

”کہاں لے جا رہے ہیں۔“ سونیا نے چائے کا کپ  
ٹرے میں رکھا۔

”ارے آپ کی چائے تو بالکل ہی ٹھنڈی ہوگئی ہے



نے لہجہ کو تارل رکھنا چاہا۔

اسی وقت سونیا نے کراہتی ہوئی آنکھیں کھولی۔ بالکل پاس الماس کو بیٹھا دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔ الماس نے لپک کر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

”باقی۔“

بچوں نے بھی ماما کو آنکھیں کھولے دیکھ کر فوراً ہی اس کے پاس جا کر لینے کو ترجیح دی۔

”ارے آرام سے آرام سے۔“ الماس نے بچوں کو ٹوکا لیکن سونیا نے بانٹیں کھول کر دونوں کو ہی اپنی آغوش میں لے لیا۔

”کیوں ڈرا دیا تھا یار ہم کو آئندہ میری تو یہ جو کسی کے گھر رات کو رکے۔“ الماس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے سونیا کو دیکھا۔ ”بھائی جان کی حالت دیکھنے والی تھی جب آپ بے ہوش ہو کے گری باجی ایسے بھی کوئی کرتا ہے کیا۔“ بھیکے ہوئے لہجے میں الماس نے سونیا کو بہت کچھ یاد کرا دیا۔

”الماس۔“ سونیا نے سرسراتے ہوئے لہجے میں اسے پکارا۔

”باقی ایسا پھر نہیں کرنا یار میری جان ہی نکل گئی تھی آپ کو ایسے دیکھ کر۔ آپ کے علاوہ میرا ہے ہی کون۔“ بہتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کے سونیا چاہہ بھی کچھ نہ کہہ سکی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

فیصل اپنے ہاتھوں پر لگے خون کو دیکھتے ہوئے ایک ٹمک شمن کو دیکھ رہا تھا، اس کے پاس سخت جھنجھلا ہوا ڈاکٹر ہاتھ میں فائل لیے آیا۔

”کیا ہوا ڈاکٹر سب خیر ہے نا۔“

ڈاکٹر نے ہونٹ پیچنے کے فیصل کو خاموشی سے گھورتا شروع کر دیا۔

”کچھ تو بولو، شمن ٹھیک ہے۔ بولو ڈاکٹر۔“ فیصل نے چیختے ہوئے ڈاکٹر کے کندھے پکڑ کے اسے ہلادیا۔

”بناؤ مجھے وہ ٹھیک ہے نا اسے کچھ ہوا تو نہیں۔“

”ہم کیا بولیں فیصل صاحب آپ شاید ابھی تک عادی نہیں ہوئے ہیں لیکن ہم اسٹاف اس چیز کے عادی ہو چکے ہیں کہ ہر ماہ اسی تاریخ کو آپ کی کوسے میں موجود مسزٹی بارٹ بیٹ اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ ان کا بی ٹی شوٹ کر

جاتا ہے اور آپ ہیں کہ ہم سے پوچھ رہے ہیں شمن ٹھیک ہے کسی دن آپ کی یہ خاموشی آپ کی مسزٹی جان لے لے گی۔“ ڈاکٹر نے چڑتے ہوئے فیصل کو دیکھا جو ایک دم خاموش ہو کر ڈاکٹر سے نظریں چرانے لگا تھا۔

”میرا کام تھا آپ کو سمجھانا اور وہ بے حد ایمانداری سے اتنے سالوں سے سمجھاتا رہتا ہوں لیکن لگتا ہے آپ کو اپنی بیوی سے رتی برابر بھی ہمدردی نہیں ہے آپ چاہتے ہی نہیں وہ ٹھیک ہو۔ ایسی حالت دیکھ کر تو کوئی کتنی بول نہیں لیکن آپ مجھے سمجھ نہیں آ رہی آخر کیا وجہ ہے جو آپ کچھ بولنے سے ڈر رہے ہیں فیصل صاحب۔“ بت بنے فیصل کو دیکھ کر ڈاکٹر نے ہونٹ پیچنے کر سرنٹی میں ہلادیا۔

”دیکھ لیں آپ ابھی بھی ہمارے ساتھ بالکل تعاون نہیں کر رہے ایسی حالت میں اگر آپ کی مسز کو کچھ ہو گیا تو ہم ذمہ دار نہیں ہوں گے، صرف اور صرف آپ کی وجہ سے وہ.....!“ ڈاکٹر نے کچھ پل اپنی بات روک کر اندازہ لگاتا چاہا کہ آیا اس کی بات کچھ اثر کر رہی ہے یا نہیں لیکن خاموش فیصل کو دیکھ کر اس نے بھی ہار ہی مان لی۔

”او کے فیصل صاحب اب میرا مشیر مطمئن ہے کہ میں نے اپنی ہر ممکن کوشش کر لی ہے لیکن آپ..... ایک بار اور سوچ لیں ایسا نہ ہو یہ وقت گزر جائے اور بعد میں آپ پچھتاتے رہیں کیونکہ آپ کی بیٹم کی ذہنی حالت کافی سیریس ہے۔ آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے بس کچھ ہی دن سمجھ لیں آپ لیکن ہو سکتا ہے آپ مجھے تفصیل بتا دیں تو ہم اس کی روشنی میں کوئی لائحہ عمل بنانے کی پوزیشن میں آجائیں معجزے بھی اسی دنیا میں ہوتے ہیں۔“ فیصل نے لا چاری سے سر جھکا کر ہونٹ پیچنے لیے۔

”اسپیک اپ مین کچھ تو بولو۔“ ڈاکٹر کا مبر جواب دے رہا تھا گہری گہری سانس لیتا ڈاکٹر کب کمرے سے نکل گیا جیسے ہوئے سرے کے ساتھ فیصل کو معلوم نہیں ہوا۔

”میرے پاس آپ کو بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“ سرگوشی کرتے ہوئے فیصل نے دل ہی دل میں شمن سے معافی مانگی تم سب لوگ مجھے باگل قرار دے دو گے اگر تمہیں معلوم ہوگا کہ میری ہی شکل والے کسی بندے نے میری بیوی کا یہ حال کیا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

کا سارا ادھیان اس وقت سامنے گھر کی جانب ہے جہاں وہ  
خونی رات آکر گزر چکی تھی اور یہ نہیں کس کو اپنا شکار بنائی  
تھی۔ صبح کی روشنی ابھی پوری طرح نکلی بھی نہیں تھی کہ وہ  
دونوں پریشانی میں جاگ رہے تھے۔

”ابھی کچھ ہی دنوں میں معلوم ہو جائے گا کیوں فکر مند  
ہو رہی ہو رخ۔“ شاہ نے تھکے ہوئے انداز میں بچن کے  
بالکل سامنے رکھی ہوئی چھوٹی سی ڈانگ ٹیبل پر بیٹھے  
ہوئے کہا۔

”کو تو ذرا پھر وہی شیطانی چرخہ شروع ہونے والا ہے  
بلکہ ہو چکا ہے اس کے اثرات دیکھو کب نمایاں ہوتے  
ہیں۔“

”مم کچھ نہیں کر سکتے شاہ جی، کیا کریں نہیں دیکھی  
جاتی لوگوں کی پریشانی میں..... مم..... میں جا کے  
دیکھوں۔“

”آج رک جاؤ۔“ شاہ جی نے رخ تاج کو تسلی دی۔  
”میں کل پوری رات نہیں سو سکی۔“ رخ تاج نے اپنا  
من پسند جواب سن کے سکون کی سانس لی اور اپنے شوہر  
کے لیے ناشتہ بنانے کی تیاری پکڑی جسے محسوس کر کے شاہ  
جی مسکرا دیے۔

”پوری رات فکر رہی یہ نہیں وہ کس کے روپ میں  
آئے گا اور کس کو لے جائے گا اس بار۔“

”ہوں۔“ شاہ جی نے سرسری سا سر ہلایا۔ ”سوئے تو  
وہ بھی نہیں تھے اور ان کو یقین تھا ان دونوں کے علاوہ دواور  
لوگ بھی موجود ہوں گے جو پوری رات ٹینشن میں گزارنے  
کے بعد صبح کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی اس وقت ایک  
دوسرے کو فون کر رہے ہوں گے۔“

”جی فیصل بھائی، میں آج کسی بھی بہانے گھر پر چکر  
لگا لوں گا۔“ شبیر نے تھکے تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر  
بیٹھے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں کون بے گناہ اس بار پھنس گیا اس تین دن کے  
چکر میں۔“ فیصل نے ذہن کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھے  
کے اپنا سر دبا دیا۔

”مجھے بھی بتا دیں شبیر۔“  
”جی بالکل۔“ سکتی ہوئی آنکھوں کو ہتھیلی سے ڈھانپ

”الماس میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“  
سونیا نے ہلا خروچوں کے جانے کے بعد اپنی بہن کو  
اعتماؤں میں لینے کا فیصلہ کیا۔

”بولو باجی۔“ مگن سی الماس نے اپنا موبائل بند کر کے  
سائیڈ میں رکھا اور پوری توجہ سونیا کی طرف کر دی جسے  
محسوس کر کے سونیا نے ایک انجانا سا سکون محسوس کیا یقیناً  
اس کی بہن بات کو سیریس لے گی۔

”دیکھو ہو سکتا ہے تم کو میری بات مذاق لگے لیکن میں  
قسم کھانے پر تیار ہوں کہ اس میں رتی برابر بھی جھوٹ شامل  
نہیں ہے۔“

”کیا ہو گیا باجی۔“ الماس نے ابھی ہوئی سونیا کو بغور  
دیکھا جس کے چہرے پر بے یقینی چھائی ہوئی تھی دونوں  
ہاتھوں کو مضبوطی سے ایک دوسرے میں پوسٹ کیے ہوئے  
وہ آس بھری نگاہوں سے الماس کو بھی دیکھ رہی تھی۔

”میری بات کا یقین کر دو گی نا الماس۔“ سونیا نے  
ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں الماس پر مرکوز کیں۔

”ہاں ہاں باجی بولو تو ہوا کیا ہے آخر کیوں ایسی باتیں  
کر رہی ہو آپ یار۔“

”وہ، وہ رات کو جب تم وقاص کے ساتھ آئی تو.....  
میں.....! سونیا نے اٹک اٹک کے رات کی بات دہرائی  
شروع کی اور سامنے بیٹھی ہوئی الماس کی آنکھیں حیرت  
سے چھلکی گئی۔

.....☆.....  
”ناشتہ طے کا بیگم صاحبہ آج۔“ شاہ جی نے اپنے اندر  
کی بے چینی چھپاتے ہوئے بچن میں گم صم کھڑی رخ تاج  
کو دیکھ کر ہلکے ہلکے انداز میں سوال پوچھا۔  
”رخ تاج۔“ شاہ جی نے آگے بڑھ کے ان کو ہلایا،  
وہ بری طرح چونک گئی۔

”جج جی جی..... کیا ہوا۔“  
”آپ چائے بنانے آئی تھیں شاید پتا نہیں کس گیان  
میں مصروف ہو گئیں ادھر۔“ شاہ جی نے انہیں احساس  
دلانے بغیر چو لپے کی آنچ ہلکی کر دی جو کب سے سگ رہا  
تھا۔

”اوہ سوری..... بس وہ.....“  
رخ تاج کچھ نا بھی بتائیں تو بھی شاہ جی کو معلوم تھا ان



کے لیے قطعی تیار نہیں ہوں۔“

”پلیز میرا یقین کرو۔“ سونیا نے بھرائی ہوئی آوازیں بہن کو دل کی گہرائیوں سے پکارا۔ ”میری بات سنو الماس۔“ جاتے جاتے الماس کے قدم بے اختیار ہی رک گئے۔

”تم مجھے پاگل سمجھ رہی ہوگی لیکن میں پاگل نہیں ہوں تاہی وہ خواب تھا۔“ رکی ہوئی الماس کو دیکھ کر سونیا نے جلد بازی کے ساتھ اپنی بات ختم کی۔

”میں بھی حیران ہوں جب وقاص میرے ساتھ بیٹھا ہوا تھا تو وہ کیسے تمہارے ساتھ گاڑی ڈرائیو کر کے گھر آ گیا۔“

”حشش کیا ہو گیا باجی۔“ الماس نے گہراتے ہوئے بہن کے پاس بیٹھنے ہوئے اسے گلے سے لگایا۔

”پھر تم میری بات پر یقین رکھتی ہونا تمہیں معلوم ہے تا میں نے اس سے پہلے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔“ اثبات میں پلٹے ہوئے سر کے ساتھ الماس نے بہن کے سر پر بوسہ دیا۔

”تم مجھے پاگل تو نہیں سمجھ رہی تا۔“

”اف باجی پلیز مت کرو ایسی باتیں۔“ الماس کی آنکھوں میں بھی نمی آگئی۔ دونوں بہنوں کا تھا ہی کون ایک دوسرے کے علاوہ۔

”پھر ایسا کیوں ہوا میرے ساتھ وہ کون تھا جس کے ساتھ میں لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔“ معصوم انداز میں بولتی ہوئی سونیا الماس کے دل کو چیر گئی۔

”باجی، کیوں پریشان ہو رہی ہو یار۔ ہوتا ہے اتنے دنوں کی محسن ہے پھر پورے مکان کی سینگ اس بار آپ نے اکیلے کی ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے صرف محسن اور نیند کی کمی ہے اوپر سے یہ آپ نے چوٹ بھی لگوائی اپنے پاؤں میں۔“ الماس نے ہلکے پھلکے انداز میں بہن کو بھجاتے ہوئے اس تسلی بھی دی۔

سونیا الماس کو دیکھتی ہوئی اس سے ذرا دور ہو کر بیٹھ گئی۔

”میں بولتی ہوں بھائی جان سے ذرا وقت دس گھر کو بھی یہ کیا پراجیکٹ کے پیچھے ہی لگ گئے ہیں گھر بھی اہم ہوتا ہے آپ اکیلے کیا کیا دیکھیں اب۔“

کرشمہ نے جواب دیا۔ ”آپ بھی یقیناً ساری رات جاگے ہوں گے۔“

”ہاں یار..... کہاں نیند آتی ہے اس رات۔“

”پتہ نہیں کب ختم ہوگا یہ سلسلہ۔“ شمیر نے افسوس سے ہونٹ پیچھے ہونے اپنے دل کی بات کہی۔

”اب ہمت نہیں ہوتی فیصل اس گھر کی بربادی دیکھنے کی۔“

”ہنسا مسکراتا ہوا گھر منٹ میں ہی برباد ہو جاتا ہے۔“

”ہاں شمیر میری بھی برواشت ختم ہی ہوئی جارہی ہے اور شاید کن بھی اب ہمت ہار رہی ہے۔“

”اوہ.....!“

”کچھ ہی دن کا وقت دیا ہے ڈاکٹر نے مجھے دعا کرو خیریت سے یہ وقت گزر جائے تا کہ تم بھی سکون کی نیند سو جاؤ اور اس گھر سے بھی لوگوں کا پیچھا چھٹ جائے جس کی کہانی پر کوئی یقین نہیں کرتا۔“

”کہانی بھی تو ایسی ہے نا کون مانے گا کہ.....!“

”ہاں جب تک وہ خود اس شیطانی چکر میں نا پھنس جائے۔“

”سائنسی دور میں ایسا ہونا ناممکن ہے مگر ہم لوگ جیتی جاگتی مثال ہی تو ہیں اس آسیب زدہ مکان کے۔“

☆ ☆ ☆

”تم یقین کر رہی ہونا مجھ پر۔“ سونیا نے بات ختم کر کے الماس کو دیکھا جو حیرت سے آنکھیں کھولے اسی کو دیکھ رہی تھی۔

”باجی۔“ ایک دم الماس کے منہ سے بلند آواز قہقہہ سن کر سونیا نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

”آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتی۔“ بھائی جان کے ساتھ مل کر یہ شرارت..... نو..... نو نو نو دے۔

”الماس۔“ سونیا نے بے بسی سے اس کو دیکھا۔

”میری بات کا یقین کرو، میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ بخدا وہ وقاص ہی تھا، ہم نے ساتھ بیٹھ کر چائے پی بھی۔“

”باجی بس کرو تا یار۔“ الماس نے ہنس کر اپنا موبائل اٹھایا اور اپنے کمرے میں جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

”میں پہلے ہی اتنی تھکی ہوئی ہوں، پوری رات آپ نے پریشان رکھا اور اب اس وقت میں اس مذاق کا حصہ بننے

”مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا بھائی جان۔“ الماس نے صوفے پر بیٹھ کر اپنا سر دباتے ٹھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”میرا خیال ہے اسٹریس ہی ہوگا ورنہ باجی اتنی تو ہم پرست نہیں کہ.....!“

”لیکن اس کا انداز دیکھا تم نے اتنا پر یقین کیوں تھا۔“ وقاص نے اٹھے ہوئے انداز میں خود ہی سے سوال کیا۔

”پہلے ہی پراجیکٹ کی وجہ سے اتنی ٹینشن ہے، اب یہ۔“

”فکر نہ کریں بھائی۔ میں آف لے لوں گی آفس سے۔“

”لیکن تم نے ابھی تو جوائن کیا ہے آفس اور شروعات میں ہی چھٹیاں اچھا امپریشن نہیں ڈالتیں۔“

”کھر سے بڑھ کر تو نہیں ہے نا بھائی جان باجی ابھی اپنی نیند پوری کر کے اٹھیں گی تو یقیناً ان کی طبیعت پر بہتر اثر پڑے گا وہ واقعی اکیلی ہو گئی تھیں اس بار۔ مجھے خیال کرنا چاہیے تھا۔“ الماس نے افسوس سے اپنے ہاتھ ملے۔

”تھینک یو نیچے۔ تمہاری وجہ سے بڑا آسرا ہو جاتا ہے۔“ وقاص نے سکون کی سانس لی۔

”آپ کی بیگم میری بھی بہن ہوتی ہیں بھائی جان۔ بھولا مت کریں اس بات کو۔“ الماس نے مسکراتے ہوئے

وقاص کو یاد دلایا، ”میرا خیال ہے اب سویا جائے ورنہ ہماری ہی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“

”ہاں لیکن گھر کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے نا۔“ وقاص مزید کچھ بولنے ہی والا تھا کہ بچے چاکلیٹ کھاتے میز پر اترتے ہوئے نظر آئے۔

”یہ کہاں سے آگئی، وہ بھی اس وقت۔“ وقاص نے بچوں کو دیکھ کر ناگوار سی سے سوال پوچھا۔

”وہ فرینڈ نے دی ہے۔“ عمر نے وقاص کے چہرے کے زاویہ دیکھ کر ایک دم جواب دیا۔

”تم نوک نیچے کیوں آئے تم دونوں کو کمرے میں بھیجا تھا نا۔“ الماس نے فوراً ہی خالہ ہونے کا ثبوت دیتے

معاملے کی شہیدگی کو محسوس کیا اور کھڑے ہوئے۔ ”کیوں کو آنکھیں دکھائیں۔“

”یعنی تم سمجھ رہی ہو میں جھوٹ بول رہی ہوں اور یہ سب اہمیت پانے کے لیے گھڑی ہوئی کہانی بنا رہی ہوں۔“ سونیا نے بڑبڑاتے ہوئے بے یقینی سے بہن کو دیکھا۔

”نہیں باجی میں ایسا ویسا کچھ بھی نہیں سمجھ رہی ہوں لیکن میں چاہتی ہوں ابھی آپ یہ دوائی کھائیں اور سکون سے سو جائیں۔“ الماس نے پاس رکھی میڈیسن اٹھائی اور سونیا کی سمت بڑھائی۔ ”جب سو کر اٹھیں گی تو اس بارے میں تفصیل سے بات کریں گے۔ اوکے۔“

”میں نے وقاص سے ہی بات کی ہے الماس اور میں پاگل نہیں ہوں نا ہی یہ کوئی خواب ہے۔ ہم دونوں لان میں بیٹھے ہوئے اس وقت ساتھ چائے پی رہے تھے جب تم اور وہ لیکن دودو وقاص کیسے ہو سکتے ہیں پھر۔“ سونیا نے اپنی بات پر زور دیتے دیتے ایک دم ہی بے بسی سے الماس کو دیکھا۔

”اچھا نا صبح بات کریں گے اس بارے میں میں کوئی آپ کو پاگل نہیں سمجھ رہی ہوں اچھا یہ بے کار بات اپنے ذہن سے نکال دو آپ اور دیکھو ذرا صرف آپ کی وجہ سے اتنی رات گئے میں واپس آئی ہوں اور آپ مجھے سونے بھی نہیں دے رہیں۔“ الماس نے ٹھک کے بہن کو احساس دلانا چاہا۔

”کیا میڈم اب میں اپنے کمرے میں جا سکتی ہوں۔“ سونیا اسے دہمکتی ہوئی خاموشی سے اپنی جگہ لیٹ کر آنکھیں موند گئی۔ الماس نے سونیا کو لیٹتے دیکھ کر سکون کی سانس لی اور چادر اسے اوڑھائی ہوئی باہر نکل گئی، یہ جانے بغیر کہ پیچھے پٹی ہوئی سونیا کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے ہیں اپنی بے بسی پر۔



الماس نے باہر جانے کے لیے جیسے کمرے کا دروازہ کھولا سامنے ہی بت بنے ہوئے وقاص کو دیکھ کے وہ بری طرح چونک گئی لیکن ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا بول کر سائیڈ سے نکل کر لایوچ میں جا بیٹھی۔

”یہ..... یہ سونیا کیا بول رہی تھی الماس۔“ یقیناً وقاص نے کچھ سن لیا تھا اسی کو کنفرم کرنے کے لیے اب الماس کی گواہی لینا چاہ رہا تھا۔



گہری نیند میں تھی وقاص نے الماس کو دیکھا جو خود بھی کھڑی سوئیا کو دیکھ رہی تھی اس کے کسی بھی انداز سے نہیں لگ رہا تھا وہ ابھی چپٹی ہے یا جاگتی تھی۔ آہستگی سے قدم بڑھانی ہوئی الماس نے بغور سوئیا کو چیک کیا، چادر ٹھیک کی اور سوالیہ نظروں سے وقاص کو دیکھا۔ جیسے کہنا چاہ رہی ہو۔ اب کیا کریں۔ وقاص نے لیوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

”کیا تم نے بھی سوئیا کی ہی چیخ سنی تھی۔“

”جی بھائی بالکل۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے سوتے ہوئے ڈرگئی ہوں۔“

”لیکن اتنی جلدی کیسے گہری نیند سو گئی پھر چلو چھوڑو، تم

ایسا کرو، بچوں کے پاس ہی سو جاؤ ورنہ پھر اپنے دوست کے ساتھ چاکلیٹ کھاتے ہوئے نیچے آ جاؤ گے سوئیا کو ڈسٹرب کر دیں گے۔“ وقاص نے تنک کے سر جھٹکا۔

”اوکے..... اوکے آپ فکر نہیں کریں اور تھوڑی سے نیند لے لیں تاکہ آفس جا سکیں ابھی دو تین گھنٹے ہیں، لیٹ بھی ہو جائیں تو خیر ہے رات کافی دیر تک آفس میں ہی تھے نا۔“

”یہ کون دیکھتا ہے بی بی۔ سب یہ نوٹ کریں گے میں لیٹ آیا۔ خیر جاؤ تم۔“ تھکا ہوا وقاص لاؤنج کے صوفے پر ہی نیم دراز ہو گیا اور فوراً ہی آنکھیں بند کر کے بازو موڑ کر اس پر رکھ لیا۔

”تم بھی کچھ ریٹ کر لو۔ پوری رات ہو گئی اسی چکر میں نیند سے بھری ہوئی آواز وقاص کی ٹھنکن بتا رہی تھی۔“

”کوئی بات نہیں بھائی کبھی کبھی تو چلتا ہے ارے یہ بچے کہاں گئے، اتنا سنا تا کیوں ہے۔“ الماس نے میز حیاں چڑھتے ہوئے خود کلائی کی۔

”شامت آتے آتے رہ گئی ان کی تو یہ بچے بھی نا۔“

”یہ لائٹ بند کر دو یار۔“ وقاص نے دیکھتے ہوئے سر کو

تھاڑے ہوئے بند آنکھوں سے ہی الماس سے کہا لیکن وہ

اوپر جا چکی تھی۔ وقاص کے سین پیچھے کالی بیٹی بیٹھی ہوئی

اسے کھور رہی تھی، جس کا اسے کوئی علم نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

”میں نے کہا تھا نا کمرے سے باہر نہیں نکلتا تو کیوں آئے اس وقت معلوم بھی ہے ماما کی طبیعت خراب ہے چلو چلو فوراً اپنے کمرے میں جاؤ۔“

”سوری خالہ۔“ بچوں نے خالہ کے اشارے سمجھ لیے تھے۔

”نہیں رکو مجھے بتاؤ یہ چاکلیٹ آتی کدھر سے ہے اور وہ کون سا دوست ہے جو تم کو یہ دیتا ہے۔“ وقاص رات بھر کا تھکا ہوا تھا اور اب صبح معنوں میں جھنجھلاہٹ لگ رہی تھی۔

”رہنکی بابا وہ چھت پر جو بچے نا وہ ہمارا دوست بن چکا ہے وہ دیتا ہے۔“ مہر نے فوراً ہی صبر راتے ہوئے بچ بتایا لیکن یہ الگ بات تھی کہ یہ بات سن کر وقاص کا سر جھک سے چھت پر جا لگا۔

”چلو اب یہ شروع ہو گئی ہے لگتا ہے کسی بھوت بنگلہ میں آگئے ہیں ہم۔“

الماس دونوں کو منہ پر انگلی رکھ کر خاموش کراتی رہ گئی تھی لیکن تیرا بکمان سے نکل گیا تھا۔

”اچھا اچھا کوئی بات نہیں بعد میں بات کریں گے اس پر چلو ابھی جاؤ اپنے کمرے میں۔“

”لیکن خالہ ہم جھوٹ نہیں بول رہے۔“

”لیس خالہ پکا والا پراس۔ وہ ہمارا دوست ہے، کھیلتا بھی ہے ہمارے ساتھ۔“

”اچھا ادھر آؤ ذرا۔“ وقاص نے عمر کا بازو کھینچا اور اپنے سامنے کھڑا کر دیا۔

”چلو میرے ساتھ چھت پر اور دکھاؤ کہاں ہے وہ دوست۔ دیکھوں میں اسے۔ الماس جابی لاؤ چھت کی اور

اگر مجھے تمہارا وہ دوست نہیں نظر آیا تو خیر نہیں تم دونوں کی پہلے ہی اتنی ٹینشن ہے اوپر سے یہ بچے بھی.....“

سوئیا کی بلند شکاف چیخ نے جہاں وقاص کو بات ادھوری چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا وہیں الماس بھی پھرتی سے بچوں کو اوپر کی جانب دھکیل کر خود سوئیا کے کمرے کی

جانب بھاگی۔

”کک..... کیا ہوا کیا ہوا بھائی جان۔“

دروازے کو تھاڑے وقاص کو دیکھ کر الماس نے خود پر قابو پایا جو حیرت سے بھری ہوئی آنکھیں لیے کمرے میں

دیکھ رہا تھا۔ سامنے ہی سوئیا چادر اوڑھے پر سکون انداز میں

دقاص کی نیند گہری نہیں ہوئی تھی کہ اسے گیند کے نئے کھانے کی آواز سنائی دینے لگی سر جھٹک کر اس نے سونے کی کوشش کی لیکن آواز کی دھمک جیسے سر پر بج رہی تھی۔  
 ”اف یہ بچے سونے نہیں دیتے آج۔“ جھنجھلاتے ہوئے دقاص نے اٹھ جانا ہی بہتر سمجھا۔



الماس نے بڑبڑاتے ہوئے بچوں کے کمرے کا دروازہ کھولا لیکن سامنے خالی کمرہ اس کا منہ چڑھا رہا تھا۔  
 ”ہیں، یہ کہاں چلے گئے۔“ الماس نے ہاتھ روم چیک کیا بیڈ کے نیچے دیکھا اور تھکے ہوئے انداز میں اپنے کمرے کو بھی چیک کرنے لگی یہ بچے کیوں اتنا تنگ کر رہے ہیں آج۔ پہلے ہی صبح سے برا حال ہو چکا ہے الماس نے اپنے کمرے میں جا کر پہلے کپڑے بدلے آرام دہ سوٹ پہنتے ہی سکون کا احساس ملا۔  
 ”چلو جی اب بچوں کو ڈھونڈیں یہ ہی کام رہ گیا اس وقت۔“

”ارے بھئی کہاں چلے گئے ہو یا اس وقت کوئی موڈ نہیں ہے ہائیڈ اینڈی کھینے کا۔“ الماس سمجھ رہی تھی مہر اور عمر چھپ گئے ہیں اور اب منتظر ہیں ان کی خالد ڈھونڈیں۔  
 ”ارے آ جاؤ یا سامنے۔“ قسم سے بہت نیند آ رہی ہے۔

بلکی آواز میں الماس نے ان کو بلانا جاری رکھا اور ایک بار پھر کمرے کا دروازہ کھول کر بچوں کو دیکھنا چاہا لیکن خالی کمرہ دیکھ کے ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ میرس سے منسلک سڑھیاں اترتے ہوئے اب الماس بھیجتا جھنجھلانے لگی تھی۔  
 ”مہر..... عمر..... ویز آریو کڈز۔ دیکھو بابا نے دیکھ لیا تو ڈانٹ پڑ جائے گی مجھے بھی اور آپ دونوں کو بھی اس وقت یہ کھیل اچھا نہیں ہے جلدی سے سامنے آ جاؤ۔“ لان میں اتر کے الماس نے چاروں طرف دیکھا لیکن وہاں بھی سناٹا ہی چھایا ہوا تھا۔ تھکی ہوئی الماس لکڑی کی بنی ہوئی بیچ پر بیٹھ گئی۔  
 ”ٹھیک ہے پھر بھائی جان ڈانٹیں گے روتے ہوئے میرے پاس نہیں آتا اچھا۔“  
 ”میاؤں۔“ مین بیچ کے نیچے سے کالی بلی نے نکل

کے الماس کو ڈرا دیا۔  
 ”یہ کہاں سے آ گئی۔“ الماس نے گھبراتے ہوئے بیچ پر کھسکتے ہوئے کہا۔ بلی اسے دیکھتی ہوئی پرسکون انداز میں وہیں بیٹھ گئی، الماس نے چورنگا ہوں سے اسے دیکھا اور بے خیالی میں بیچ پر ہاتھ پھیرنے لگی لمحہ بعد ہی بلی کو دیکھنے کے لیے اس نے گردن نیچ کر اور سامنے پڑی ہوئی چائے کی ٹرے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ دو کپ چائے جس میں سے ایک آدھا تھا تو دوسرا بھرا ہوا کپ بتا رہا تھا اسے کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ایک دم الماس کی سماعت میں سونیا کی پریلین آواز گونج گئی۔  
 ہم نے لان میں ایک ساتھ بیٹھ کر چائے پی ہے۔  
 ☆ ☆ ☆  
 دقاص بڑبڑاتا ہوا سڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ سامنے ہی چھت کا کھلا دروازہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ غصے سے قدم آگے بڑھاتے ہی ایک بار پھر ٹھٹک گیا۔ بچوں کی دھیمی دھیمی آواز اس کو روکنے پر مجبور کر چکی تھیں۔  
 ”ہم جھوٹ کو نہیں بولتے نا۔“  
 ”بابا نے اتنا ڈانٹا۔ گندے بابا۔“  
 ”اور کیا جھوٹ بولنا گندی بات ہوتی ہے نا۔ بابا سمجھ رہے ہیں تم ہو ہی نہیں اور میں چاکلیٹ بھی نہیں دیتے۔“  
 ”بابا کو معلوم ہی نہیں تم تو ہمارے ہی کمرے میں سوتے ہوتا۔“  
 دقاص نے ہونٹ بھیج کر مہر اور عمر کی آواز سنی اور اب وہ منتظر تھا تیسری آواز کا لیکن جب کوئی آواز سنائی نہیں دی تو اس نے غصے سے عمر کو مخاطب کرنے کے لیے منہ کھولا اور ایک دم کھلے ہوئے منہ کے ساتھ حیران پریشان رہ گیا۔  
 بالکل سامنے دیوار پر تین بچوں کا عکس تھا جبکہ مہر اور عمر اکیلے کھڑے ہوئے تھے دقاص نے گھبراتے ہوئے غور سے اس تیسرے بچے کے عکس کو دیکھا تو اسے نمایاں طور پر محسوس ہوا وہ بچہ کسی گیند کو زمین پر پھینک رہا ہے اور بیچ کر رہا ہے اور شاید اسی آواز سے دقاص سوتے سے اٹھ کر اس وقت چھت پر آیا تھا۔  
 ”تم دونوں کس سے باتیں کر رہے ہو۔“ دقاص نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔  
 ”اپنے فریڈ سے بابا۔“



انجان البشیر جواب باپ کے مکافات عمل بھگتنے والی تھی وہ نہیں جانتی تھی روئیل کو اس کی زندگی میں صرف اور صرف شہر کو سبقت کھانے کے لیے قدرت نے داخل کیا ہے۔  
خونی گھر کا نیا شکار سونا تھی جو اپنی بہن کی عدم موجودگی میں پھنس گئی تھی۔ الماس جس کو نہیں معلوم تھا اس کی دوست نے انجانے میں اس پر کیا کرم کر دیا تھا۔

معصوم بچے جو اپنی ہی دنیا میں مگن نئے دوست کے ساتھ کھیل میں مصروف رہنے لگے تھے ان کو بھی علم نہیں تھا، وہ کس چکر میں پھنس گئے ہیں۔

اور ہاوقاص تو وہ ابھی تک بے یقینی کا شکار تھا ایک طرف بیوی تھی جو اس کے ہوتے ہوئے اسی کے ہم شکل کے ساتھ وقت بتا چکی تھی تو ایک طرف انجانا بچہ تھا جو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے اپنے بچے اس غائبانہ بچے کے ساتھ نا صرف کھیلتے تھے بلکہ اس کی دی ہوئی چاکلیٹ کو کھاتے ہوئے بھی نظر آتے تھے۔

کیا ہونے چاہا تھا اس گھر میں یہ تو وقت ہی بتا سکتا تھا لیکن اس وقت الماس اور وقاص اپنی اپنی جگہ پریشانی کے ساتھ بیٹھے ہوئے سوچ میں گم تھے کہ یہ بات کسی دوسرے کو بتائی جائے یا نہیں کوئی یقین کرے گا اس بات پہ کہ نہیں۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



”کہاں ہے وہ۔“ سرسراتی ہوئی آواز وقاص کو اپنی نہیں لگ رہی تھی۔  
”آپ کے پیچھے ہی تو کھڑا ہے بابا۔“ وقاص فوراً ہی ڈر کر پلٹا لیکن وہاں صرف چمکتی ہوئی کیند کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔



صبح کاذب کی پرسکون روشنی کے باوجود چھائی ہوئی خاموشی اس خونی گھر کی تاریخ دہرانے کے لیے آج پھر سے تیار تھی۔

نہیں دن کا آسیب زدہ چکر جو آج شروع ہو گیا تھا، اب بچانے کس کو اپنے ساتھ لے جانے والا تھا۔

نہیں گھروں کے مخصوص لوگ جو کافی کچھ جانتے تھے لیکن اپنی اپنی مجبوریوں کے باعث کھل کر نہیں بول سکتے تھے

ان لوگوں کے علاوہ اب اس چکر میں وقاص کا خاندان بھی شامل ہونے چاہتا تھا بلکہ ہو گیا تھا۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ اس خونی گھر سے کوئی بچ نکلتا ہے یا اگلے چاند کی پوری تاریخ کو وہ آسیب سونا کو ساتھ لے جائے گا۔

لان میں بیچ کے نیچے بیٹھی ہوئی کالی بلی پرسکون انداز میں کچھ اس طرح بیٹھی ہوئی تھی جیسے گھر کا پہرہ دے رہی ہو۔ یقیناً وہ اس چکر میں شامل تھی۔

فیصل جو گھر کا مالک تھا اور اسی کی بیوی اس خونی گھر کی پہلی شکار تھی اب کوئے کی صورت میں لٹنی ہوئی اپنے شوہر کے لیے مسلسل ذہنی اذیت کا باعث تھی۔

ان دونوں کے علاوہ رخ تاج اور شاہ جی جو ہر کرائے دار کو بھانے کی اپنی سی کوشش کرتے تھے وہ اس بار بھی کمر کس رہے تھے معصوم خاندان کی مدد کرنے کو۔ اب یہ بات الگ تھی کہ ان کی کبھی بات کو کوئی سیریس نہیں لیتا تھا بلکہ ان کا مذاق اڑا کے گھر سے دھکیل دیا جاتا تھا۔

اس سارے قصبے کا مین کردار شہر جو ایک ایک بات جانتا تھا لیکن اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانے کی جائز خواہش کا حصول نا جائز راستہ اپنا کر کرنے پر مجبور تھا۔ اس کی مرحومہ بیوی کی آخر خواہش جو تھی۔

خونی گھر اور اپنے باپ کے اس مکروہ عمل سے قطعی

# درد کا درمان

خالد شاہان

آج کے دور میں جب سبھی اولاد اپنی نہیں رہتی تو دوسروں کی اولاد سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے ایسے شخص کا فسانہ غم جس نے دوسروں کی اولاد کو اپنا سمجھ کر اس پر ساری محبتیں بچھا کر دیں پھر بھی خالی ہاتھ رہا۔

خالد شاہان کی مدتوں یاد رہ جانے والی کہانی

”بس اتنا کافی ہے مجھے زیادہ بھوک نہیں آپ بھی تو کھائیے۔“

یہ اور اس طرح کہ اور جملے وہ سیدھے ساٹ لہجے میں کہتی اور سر جھکا کر کھانے میں مصروف رہتی۔ اس کہ کسی انداز سے خوشی ظاہر نہیں ہوتی تھی اور وہ خود کتنی محبت بھری نگاہوں سے اسے کھانا کھاتے دیکھتے رہتے تھے۔

پورا ہفتہ دو پر گن گن کر گزارتے تھے اور جس روز اسے آنا ہوتا تھا وہ خانساہاں سے کہہ کر اچھی اچھی ڈشز تیار کروائے زیادہ تر اس کی من پسند چیزیں پکواتے تھے۔ ان کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ ایک اینڈ پر وہ فاخرہ آپا انجم بھائی اختر بھائی یا مکمل بیگم کے گھر جانے کے بجائے سیدھی اپنے گھر آجایا کرے۔ اس جگہ جو اس کی اپنی چکی تھی۔ اس گھر میں رہے جو اس کا اپنا تھا مگر وہ ایسا نہیں کرتی تھی۔

ہمیشہ صبح نو دس بجے آتی تھی اور شام ڈھلنے سے پہلے چلی جاتی تھی۔ انہیں بہت افسوس ہوتا تھا۔ آخر وہ ایسا کیوں کرتی تھی اپنا گھر چھوڑ کر دوسروں کے گھر جا کر رہنے میں اسے کیا ملتا تھا۔ پہلے بھی تو وہ اسی گھر میں رہتی تھی پھر اب ایسی کیا بات ہوئی ان چند مہینوں میں ایسی کون سی تبدیلی آگئی تھی اس معاملے پر وہ جتنا سوچتے دل کی اداسی اتنا ہی بڑھ جاتی پھر وہ یہ سوچ کر ٹھکرا کر کہنے کے چلو یہ بھی غلیٹ ہے کہ وہ چند گھنٹوں کے لیے ہی کسی آتو جاتی ہے اس گھر میں۔ اگر وہ نہ آتی تو وہ کیا کر لیتے۔

وہ چند گھنٹے ان کے لیے بڑی خوشی اور مسرت کے لمحے

پورے ایک ہفتے بعد آج صبح ہی حبیہ آئی تھی اور شام ڈھلنے سے پہلے واپس چلی گئی۔ جواد کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ٹھنڈی ہوا کا خوشگوار ہوا کا ایک جھونکا آ کر گزر گیا ہو۔ اس کہ آتے ہی انہیں یوں لگتا تھا جیسے ایک دم ہی بہت سارے ہنگامے جاگ اٹھے ہوں اس کی موجودگی سے انہیں گھر میں بھر پور رونق کا احساس ہوتا تھا حالانکہ وہ ان سے کم بات کرتی تھی۔ اس کی زیادہ تر کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ انہیں مخاطب نہ کرے۔

وہ سوچ سوچ کر خود ہی بات کرتے مگر وہ ان کی بات کا بہت ہی مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتی تھی۔ ان کا کتنا دل چاہتا تھا کہ جب ان سے بہت ساری باتیں کرے۔ کچھ اپنی کہے کچھ ان کی سنے۔ مگر اس کہ پاس تو کچھ کہنے سننے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں یا پھر وہ کچھ کہنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ وہ آ کر بہت دیر سے انداز میں انہیں سلام کرتی، ان کی خیریت پوچھتی اور کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ اس کا یہی اچھی اجنبی سا انداز ان کے دل کو بہت تکلیف دیتا تھا اپنے کمرے میں کسی وہ باتیں کیا کرتی رہتی تھی۔

دو پہر کے کھانے کے وقت ان کی ملاقات ہوتی۔ وہ بڑی محبت سے ایک ایک ڈش اٹھا کر اس کہ سامنے رکھتے۔ اصرار کر کے اسے کھاتے۔ اکثر اوقات خود سالن لکال کر اس کی پلیٹ میں ڈالتے۔

”آپ رہنے دیں میں خود کھا لوگی۔“





بہی بھی وہ یہ ضرور سوچتے تھے کہ جب کون کی تنہائی کا ڈرا  
بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ اسے گھر سے جاتے ہوئے اسے  
یہ احساس بالکل نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنے پیچھے کیسے سناٹے  
چھوڑ کر جا رہی ہے۔

آج بھی اس وقت سے جب اسے ہاسٹل چھوڑ کر  
آئے تھے وہ یہی سوچے جا رہے تھے۔ گاڑی جب گزرتی  
ہوئی کہ سامنے رکی تو اس نے اترنے سے پہلے کہا کہ اگلے  
پلے میں گھر نہیں آسکوں گی۔

”کیوں“ وہ چونک پڑے۔  
”فیاض بھائی کچنک کا پروگرام بنایا ہے۔“  
”اچھا کس جگہ جانے کا پروگرام ہے۔“  
”گارڈن۔“

”ہوں اور کون کون جائے گا۔“

”سارے کزنز ہوں گے۔“ انہوں نے امید بھری

ہوتے تھے وہ ان کہ پاس زیادہ دیر نہیں بیٹھتی تھی۔ ان سے  
زیادہ باتیں بھی نہیں کرتی تھی لیکن پھر بھی اس کی موجودگی کا  
احساس انہیں طمانیت بخشتا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں ہوتی  
تھی لیکن اس کی چوڑیوں کی جھنکار ان کہ کانوں میں گونجتی  
رہتی تھی۔ ایک طرف احساس خوشی اور احساس مسرت اور  
دوسری طرف یہ خیال کہ وہ پھر چلی جائے گی اور وہ پورے  
ایک پلے تک وہ اس کی صورت دیکھنے کو ترستے رہیں گے۔  
پھر وہ ہوں گے اور ان کی تنہائیاں یہ گھر ہوگا اور اس  
میں کوٹھے ہوئے سناٹے خوشی کی یہ گڑبائیں کتنی تھوڑی ہو  
تی تھیں۔ مگر چاہے ہوئے بھی وہ اسے اس گھر میں رہنے پر  
مجبور نہیں کر سکتے تھے۔

کیونکہ وہ سہمیں رہنا اس کی خوشی تھی اور اس کی خوشی تو  
انہیں دنیا میں ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھی۔ وہ اس کی خوشی کو  
اپنی خواہش اور اپنی آرزو پر قربان تو نہیں کر سکتے تھے مگر

لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم جھڑا کو تو آسکتی ہو۔ جمعہ کی صبح کو میں تمہیں آپا کہ گھر چھوڑ آؤں گا۔“

”نہیں رات کو وہیں رہنے کا پروگرام ہے۔“

”گویا جمعرات کی شام کو ہی تم لوگ پکنک کے لیے چلے جاؤ گے۔“

”جی۔“ انہوں نے دبے لفظوں میں کہا۔

”میرا خیال ہے کہ رات کو ایسی جگہ پر رہنا مناسب نہیں ہے۔“ اس نے دھیرے سے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

”آپ خوف زدہ ہیں۔“

”ہاں ایسی جگہوں پر بعض اوقات بڑی خوفناک وارداتیں ہو جاتی ہیں۔“

”مگر ہم لوگ تو دس پندرہ افراد ہوں گے دو تین بزرگ بھی ساتھ جائیں گے۔“

”اچھا۔“

ان کے دل میں ادا سی کی لہر دوڑ گئی۔

گاڑی کا دروازہ اس نے کھولتے ہوئے کہا۔

”آپ بھی ہم لوگوں کے ساتھ چلتے۔“

کس قدر رکی سا انداز تھا نہ کوئی ضد نہ کوئی التجا اور نہ کوئی اصرار۔ بہر حال اتنا بھی غیبت تھا کہ اس نے ان سے کہا تو تھا چلنے کے لیے۔

اصرار نہیں کیا تو کیا ہوا۔ وہ گاڑی کا دروازہ پکڑے ان کا جواب سننے کی منتظر تھی اور وہ اسٹیرنگ پہ ہاتھ رکھے اپنی سوچوں میں گم تھے۔

اس نے پھر کہا ”اگر آپ چلنا چاہیں تو میں ذوق بھائی سے کہہ دوں گی۔“

”اچھا میں سوچوں گا پھر میں خود ہی ان کو اطلاع کر دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

ہوسٹل میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک دفعہ پلٹ کر دیکھا اور آہستہ سے ہاتھ ہلا کر اندر چلی گئی۔ انہوں نے بھی مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور گاڑی اشارت کر دی۔ واپسی میں راستہ انہیں بہت طویل معلوم ہوا۔ گھر تک پہنچنے پہنچنے

ان کا دل دو مانع ہو چکا تھا۔

گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ برآمدے میں آئے۔ جب کے کمرے، بند دروازوں اور درجوں پر نگاہ پڑتے ہی انہیں گھر کی دیرانی کا احساس ہوا۔ انہوں نے

برآمدے میں رک کر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا اور ریلنگ کے قریب کھڑے ہو کر سگریٹ سلگایا اور

وہی کھڑے کھڑے دو تین طویل کش لیے پھر اندر چلے آئے۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں وہ بلا مقصد

ہی چکر لگاتے رہے باورچی کھانے کے قریب سے گزرتے ہوئے انہوں نے دیکھا خانساں اور اس کی

بیوی اطمینان سے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

وہ ایک دم پلٹ آئے وہ دونوں انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

”معلوم ہوتا ہے کہ آج پھر تمہاری چھٹی ہے۔“ احمد

نے کہا۔

”جی صاحب جب بی بی رات کے لیے سالن تیار کر کے گئی ہیں۔“ خانساں نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

”اچھا اور کیا لپکایا ہے۔“

”ایک سوئیٹ ڈش بھی تیار کی ہے اس کی ترکیب ایک

رسالے میں پڑی تھی۔“ احمد قدرے مسکرائے۔

”جی صاحب انہیں معلوم ہے نا کہ آپ کو بیٹھا پسند

ہے اسی لیے وہ آئے دن کچھ نہ کچھ بناتی رہتی ہے۔

”ہاں وہ کچھ نہ کچھ بناتی رہتی ہے اور تمہارے بھی مزے ہو جاتے ہیں۔“ احمد کے ہونٹوں پر کھنکھری مسکراہٹ

گہری ہو گئی۔ خانساں بھی اپنی بیٹی کی ظاہر کرنے لگا۔ احمد

نے کہا۔

”تم جب کو منع کیوں نہیں کرتے کہ وہ یہاں آرام کرنے

آتی ہے اور تم اسے باورچی کھانے میں.....“

خانساں جلدی سے بولا۔

”صاحب میں تو بہت منع کرتا ہوں مگر وہ مانتی ہی

نہیں۔“ خانساں کی بیوی نے کہا۔

”صاحب جی وہ کہتی ہے کہ پورے ہفتے تو وہ گھر سے

دور رہتی ہوں یہی تو ایک دن ملتا ہے مجھے گھر کا کام کرنے

کا۔“

”ہوں۔“ احمد نے سگریٹ فرش پر ڈال کر پیروں سے



احمد اپنے دل کی تمام تر نیکیوں اور تمام تر پاکیزگی کے باوجود جب کے نزدیک کیا تھے یہ تو انہیں آج ہی معلوم ہوا۔ انہوں نے اسی بے ترتیبی کے ساتھ ساری چیزیں الماری میں ٹھونی اور الماری لاک کیے بغیر چابی اسی طرح چھوڑ کر اپنے کمرے میں آئے اور بے جان سے ہو کر گر پڑے۔

پاکش وہ اس کی الماری نہ کھولنے اور اگر الماری کھول ہی لی تھی تو اس کی ڈائری نہ پڑھتے۔ انہوں نے سوچا اس قدر تکلیف دہ انکشاف تو نہ ہوتا ان پر اس کے جذبات و احساسات تو عیاں نہ ہوتے۔ وہ اتنے بے سکون تو نہ ہوتے اس وقت احمد کا دل جا رہا تھا کہ وہ ان تمام کتابوں کو آگ لگا دیں انہیں جلا کر رکھ کر دیں جنہیں پڑھ کہ جب کے دل و دماغ نے سوچ کا یہ انداز پناہ تھا۔

یہ کتابیں اور کہانیاں ہی تھیں جنہوں نے جب کو ان سے اپنی دور کر دیا تھا۔ یہ کیسی کہانیاں تھیں اور کیسے قصے تھے جنہیں پڑھ کر مقدس رشتوں پر سے بھی انسان کا اعتماد ٹھ جاتا تھا ان کہ ارد گرد ایک شور تھا جو کانوں کے پردے پھاڑے دے رہا تھا ایک طوفان تھا جس میں ان کا وجود ایک تنکے کی مانند بہا جا رہا تھا۔

☆☆☆.....

وہ چودھویں کی رات تھی۔ اس روز صبح سے لے کر شام تک مسلسل بوند باندی ہوتی رہی تھی۔

فضا میں گیلیے پتوں ٹہنیوں اور پولوں کی مہک رچی ہوئی تھی ہوا کے سب رفتار جھونکے کیل میٹی کی سوندھی سوندھی خوشبوؤں اڑائے لیے پھر رہے تھے۔ احمد معمول کے مطابق اس روز بھی دیر سے گھر آئے تھے۔

گیٹ سے اندر داخل ہونے سے پہلے انھں نے کچھڑ میٹی سے بھرے ہوئے جوتوں کو خوب زور زور سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور پھر بلا ارادہ ان کی نگاہ اوپر اٹھ گئی اس کی بہن نورین اور پروین حجت پر کھڑی تھیں ان کے ساتھ ایک چہرہ اور بھی نظر آ رہا تھا ایک اجنبی چہرہ ایک نامانوس چہرہ ان کی نگاہوں میں تجسس سا سمٹ آیا۔ دو ایک سیکنڈ تک وہ پلٹیں چھپکائے بغیر اوپر ہی دیکھتے رہے ان کہ بہن پروین نے انہیں دیکھ کہ ہاتھ ہلایا۔ وہ جواب میں ہاتھ بھی نہ ہلا سکے۔ دل ہی دل میں اس نامانوس چہرے کے متعلق

پلٹے ہوئے کہا اور باورچی کھانے سے باہر آئے۔ ”میں پورے ہفتے تو گھر سے دور رہتی ہوں۔“ خانساں کی بیوی کی آواز کی بازگشت ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ جب کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”تم سے کس نے کہا ہے جب کہ تم اپنے گھر سے دور ہو۔ یہ تمہاری اپنی خواہش اور خوشی تھی۔“ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر جب کی رنگیں تصویر رکھی تھی بیڈ کے نیچے اس کی سرخ چپل رکھی تھی اس کے کمرے میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھتے ہوئے ان کی نگاہ الماری پر پڑی الماری میں چابی لگی رہ گئی تھی۔ شاید وہ الماری بند کر کے چابی نکالنا بھول گئی تھی الماری کے اندر لٹکتے ہوئے ڈوپٹے کا ایک سرادونوں پٹوں کہ درمیان دب کر باہر نکل آیا تھا۔ انہوں نے قریب جا کر الماری کو چیک کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ تو الماری کو لاک کرنا ہی بھول گئی تھی۔ انہوں نے الماری کھول کر ڈوپٹے کا سر اندر کرنے کی کوشش کی تو کپڑوں کا ایک ڈچمر سا ان کے قدموں میں آن گرا۔ انہیں احساس ہوا الماری میں کپڑے بڑے بے ترتیبی سے ٹھنٹے ہوئے تھے کپڑوں کے علاوہ اور بھی چیزیں موجود تھیں۔ اسی چکر میں کپڑے زمین پر آ گرے تھے۔ انہوں نے کپڑے اٹھا کر اسی طرح الماری میں ٹھونسنے کی کوشش کی تو پرانی ڈائیریاں زمین پر گر پڑیں انہوں نے ڈائیریاں بھی اٹھا کر الماری میں رکھ دیں مگر پھر ایک دم ہی ان کا دل چاہا کہ وہ اس کی ڈائری پڑھیں وہ ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک جاتے چار پانچ منٹ ایسے ہی گزر جاتے کہ کھولیں انہیں اسے پڑھیں یا نہ پڑھیں۔ پہلے انہوں نے سرسری سی نگاہ ڈالی۔ مگر دو تین جگہ اپنا نام دیکھ کر ان کا تجسس بڑھ گیا اور وہ پڑھتے چلے گئے وہ تمام اوراق جن میں ان کا ذکر تھا یہ گزشتہ سال کی ڈائیریاں تھیں نیا سال شروع ہوئے چار ہی مہینے ہوئے تھے اور نینو سال کی ڈائیریاں یقیناً اس کے پاس ہوگی۔ الماری میں دو تین اور بھی ڈائیریاں رکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے جو کچھ پڑھ لیا تھا وہ ہی ان کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھا۔

آج انہیں معلوم ہوا کہ جب کی وہ بے گامگی اور لاشعقی کس لیے تھی۔ اس کے اور احمد کہ درمیان اجنبیت کی وہ دیوار کس لیے کھڑی تھی۔

سوچے ہوئے اندر چلے گئے سامنے ہی انہیں امی نظر آئی  
ان کے قریب بیٹھے ہوئے احمد نے بڑی راز داری سے  
پوچھا۔

”کون آیا ہے امی۔“  
”تمہیں کیسے معلوم کہ کوئی آیا ہے۔“  
”اوپر چھت پر نورین اور پروین کے ساتھ کوئی لڑکی  
کھڑی ہے۔“

”اچھا تو یوں کہو باہر سے ہی دیکھ لیا۔ میں بھی حیران  
تھی کہ گھر میں کھتے ہی تمہیں کیسے خبر ہوئی۔“  
”جی۔“

”قوامی بتا یا نہیں کہ کون ہے۔“  
”عالیہ ہے۔“  
”کون عالیہ۔“

”تمہارے عمران چچا کی بیٹی۔“  
”عمران چچا آئے ہوئے۔“  
”نہیں وہ تو نہیں آئے۔“  
”پھر۔“

”شریم گئے ہوئے تھے اپنے باپ کے پاس ملنے  
کے لیے انہی کے ساتھ آئی ہے۔“  
”شریم بھائی کب واپس آئے۔“  
”ایک ہفتہ ہوا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آج وہ بھی آئے تھے۔“  
”ہاں سہ پہر کو آئے تھے تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔“  
”تو یہ محترمہ واپس کس کے ساتھ جائیں گی۔“  
جہاں نے اپنے بیٹے کا یہ جملہ سن کر اسے حیرت سے  
دیکھا اور بولیں۔

”تم کیوں فکر مند ہو رہے ہو اس کا بھائی آ کر خود ہی  
لے جائے گا۔“  
”تو گویا شریم بھائی ابھی دوبارہ آئیں گے۔“

”ہاں۔“  
”تمہیں یہ فکر لگ سکتی کہ کہیں تمہیں نہ چھوڑنا پڑے۔“  
احمد مسکرا کر بولے۔

”نہیں یہ بات نہیں تھی میں نے تو ویسے ہی پوچھا  
تھا۔“ جہاں زریب مسکراتی رہی پھر بولی۔  
”تمہیں تو عالیہ یاد بھی نہیں ہوگی۔“

”نہیں مجھے نہیں یاد۔“

”بہت چھوٹی سی تھی جب ایک دفعہ یہاں آئی تھی۔“  
”اچھا۔“ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ نورین  
نے باپ پروین نے اس کا کرتا پاجامہ استری کر کے ٹیگر پر لٹکا  
دیا تھا۔ انہوں نے غسل کر کے کپڑے تبدیل کیے اور باہر  
نکلنے کا ارادہ کر رہی رہے تھے کہ عالیہ اس کی بہنوں کے ساتھ  
کمرے میں آگئی احمد کی لٹاہ جو بھی اس کی طرف آگئی اس  
نے اپنی نرم اور میٹھی آواز میں کہا۔

”آداب۔“ احمد نے سر کے اشارے سے جواب  
دیا۔ نورین نے کہا۔

”احمد بھائی یہ عالیہ ہے۔“ وہ دھیرے سے مسکرا کر  
بولے۔  
”ہاں مجھے معلوم ہے کہ یہ عالیہ عمران ہے۔“ نورین  
اور پروین ان کی بات سن کر مسکرائی۔ عالیہ نے بھی احمد کی  
طرف دیکھا اور اپنی نظریں جھکا دیں اور پھر چلی گئی شام کو  
عالیہ کا بھائی آ کر اسے لے گیا۔

اگلے دن احمد شریم بھائی کے گھر گیا۔ باہر لان میں ہی  
سب بیٹھے تھے وہ اپنی بھابی کے ساتھ بیٹھی تھی احمد کو دیکھ کر  
بھابی جائے بنانے چلی گئی اور احمد نے عالیہ کو دیکھ کر کہا۔  
”عالیہ نزلہ ہو رہا ہے آپ کو۔“

”جی۔“ اس نے رومال سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے  
کہا۔

”یہاں کا موسم آپ کو اس نہیں آیا۔“  
”ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔“ وہ مسکرائی۔  
”پھر یہاں کس طرح رہ سکتی ہیں آپ۔“  
”یہاں ایڈمیشن لینا ہے تو پھر یہاں رہنا بھی پڑے  
گا۔“

”وہ سن کیوں نہیں ایڈمیشن لے لیا تم نے۔“  
”بھائی جان اور بھابی کا اصرار تھا کہ میں ان کے  
ساتھ ہی رہوں۔“

”ہمارا شہر پسندا یا آپ کو۔“  
”ابھی تو میں پوری طرح نہیں مگھوی ہو لیکن جتنا کچھ  
بھی دیکھا ہے اس لحاظ سے پسندا یا۔“ پھر وہ کچھ دیر بیٹھ کر  
گھر جانے کے لیے اٹھے تو اسی وقت ملازم کرم کرم چائے  
لے آیا۔



”میں جائے نہیں بیوں گا۔“ احمد نے درتپے کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔  
”کیوں۔“

اس نے قدرے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔  
”میرا خیال ہے کہ ہارش آنے والی ہے اگر میں تھوڑی دیر بھی رک گیا تو پکس جاؤ گا۔“  
”کوئی بات نہیں۔ کبھی تو ہارش رکے گی۔“  
”ہاں مگر معلوم نہیں کب۔“

عالیہ کوئی جواب دیے بغیر پیالیوں میں چائے اڑھیلے گئی۔

”ارے آپ نے تو چائے بنائی بھی شروع کر دی۔“  
”جی بس اب آپ چائے پی کر ہی جائیں۔“ وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔  
”ابھی۔“ احمد نے کہا۔

”دیکھیے میں نہ کہتا تھا کہ ہارش آجائے گی۔“ عالیہ ان کی بات سن کر مسکرائی اور اپنا کپ رکھ کر درتپے میں آ گئی۔  
احمد صوفے کی پشت سے سرٹکائے اس کی پشت پر گھرے بالوں کو دیکھتے رہے جو رہن کی قید سے آزاد ہونے کے لیے چل رہے تھے۔ عالیہ نے ایک دم پلٹ کر احمد کی طرف دیکھا اور بولی۔

”آپ کو ہارش کیسی لگتی ہے۔“  
”آپ کو کیسی لگتی ہے۔“

”مجھے تو بے پناہ اچھی لگتی ہے۔“ عالیہ نے ایک لمحے کو اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت اور خوشی تھی۔

احمد نے بڑی دہش سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہر دمے کی ریٹنگ کے قریب کھڑے ہو گئے۔ عالیہ نے ریٹنگ کے سہارے جبک کر دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اس کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک جھبک گئے اور بالوں پر ہارش کی فضا یوں میں چمکنے لگیں۔ احمد نے کہا۔

”آپ غالباً بھول رہی ہے کہ آپ کو شہید بنزہ ہے۔“  
”تو کیا ہوا۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”اب یہ بھی بتانا پڑے گا کہ ہارش میں بیگنے سے طبیعت اور زیادہ خراب ہو سکتی ہے۔“

”آپ تو بھائی جان کی طرح ہاتھیں کرنے لگے۔“ اسی وقت بادل بڑے زور سے گرے اور عالیہ سہم کر ہٹ گئی۔ احمد مسکرائے۔

”بہت خوف آتا ہے جب بادل گر جتے ہیں اور بجلی چمکتی ہے۔“ اس نے کبھی ہوئی لٹا ہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر ہارش بہت دیر تک نہیں رکی وہ دونوں ہر دمے میں بیٹھے ہاتھیں کر رہے تھے احمد کو اندازہ ہوا کہ وہ کافی باتوں پر ہے۔

وہ شہر کی باتیں اس کے موسم کی باتیں اور اپنے بھائی بہنوں کی باتیں وہ اسی طرح کر رہی تھی جیسے احمد کی اس سے بڑی پرانی واقفیت ہو اور جب احمد گھر جانے کے لیے اٹھے تو اس نے کہا۔

”اب کی بار جب آپ آئیں گے تو فورین اور پروین کو بھی لیتے آنا۔“

”بہت بہتر اور کوئی حکم۔“  
”نہیں بس فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔“ اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ احمد نے کہا۔

”اگر اجازت ہو تو میں بھی کچھ عرض کروں۔“  
”جی اجازت ہے۔“

”اب آپ کی باری ہے ہمارے گھر آنے کی۔“  
”اچھا پھر میں ہی آ جاؤں گی۔“

اس روز ذرات پھر ہارش والے وقت سے ہوتی رہی اور احمد کی آنکھیں بہت دیر تک بے خواب رہی۔ ساری رات دو جاگ چمکتے رہے ایک بہت اوپر بلند یوں پر نیچے چمکتے آکاش پر اور دوسرا ان کے گھر کی چمکت پر ان کی بہنوں فورین اور پروین کے بیچ میں جگمگاتا ہوا چاند۔

وہ صاف و شفاف ملائم ہاتھ کہنیوں تک جھپکتے رہے۔ کالج کی سرخ و سنہری چوڑیوں سے قطرہ قطرہ پانی چمکتا رہا اور بالوں میں ڈیڑھ سو نفرتی موتی جھلکاتے رہے۔ برستے ہوئے بادل۔ بجلی ہوئی ہوا آپ کے جموٹے اڑتا ہوا سبز کپڑا۔ وہ ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر کے بچوں کے سے انداز میں ہارش کے لیے پسندیدگی کا اظہار کرنا۔ کچھ لمحے کچھ گٹھیاں اور کچھ ہاتھیں۔

ہمیشہ کے لیے دلوں پر نقش ہو جاتے ہیں۔ کچھ چہرے وقت کی اڑتی ہوئی دھول میں بھی کبھی نہیں دبتے کچھ

”نہیں۔“

”پھر۔“

”پھر کچھ بھی نہیں۔“ احمد نے کہا۔

”سنا ہے کہ تم لوگ چھٹیاں گزارنے لاہور جا رہے

ہو۔“

”جی ٹھیک سنا ہے۔“

”ہم سے تو ذکر بھی نہیں کیا لوگوں نے۔“

”لوگ اگر یہاں تشریف لاتے تو ان سے ذکر بھی کیا

جاتا۔“

وہ خلاف معمول سنجیدہ تھی۔

”کیا بہت دن ہو گئے ہیں مجھے یہاں آئے ہوئے۔“

”جی آج پورے اکیس روز بعد آئے ہیں آپ۔“ احمد

دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ اس نے ان کے نہ آنے کے

دن اگھویں پر شمار کر رکھے ہیں۔

”آپ بھی تو نہیں آئیں کافی دنوں سے۔“ انہوں

نے قصداً جھوٹ بولا۔

”میں تو ابھی کچھ دن پہلے تو گئی تھی آپ خود ہی نہیں

تھے۔“

”اچھا آپ سے ذکر نہیں کیا کسی نے۔“

”کیا تھا تفریحاً۔“

”تفریحاً اور کیا کچھ کرتے ہیں آپ۔“

”تم سے باتیں کرتا ہوں۔“ احمد نے یہ کہہ کر اس کے

تاثرات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

عالیہ کہ چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ اس کی

آنکھوں میں نمی سی ابھری۔ اس نے پلٹیں جھپکا کر اپنی

کیفیت کو چھپانے کی کوشش کی لیکن احمد کو سمجھنے کے لیے وہ

دو تین لمحے ہی کافی تھے۔

احمد نے محض اسے تنگ کرنے کے لیے کہا۔

”تم بھی تفریحاً باتیں کرتی ہوتا مجھ سے۔“ ان کا یہ

مذاق عالیہ کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا وہ ایک دم اٹھ

کھڑی ہوئی اندر جانے لگی احمد اسے روکتے رہ گئے۔

لیکن وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ انہیں پہلی بار

احساس ہوا کہ اس قدر باتوں اور ہنسنے والی لڑکی اندر سے

کتنی حساس ہے کہ وہ اٹھ کر اس کے کمرے کی طرف چل

دیے کئی دفعہ دستک دیتے پر بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا

یادیں کبھی ذہن سے جدا نہیں ہوتی۔ لحوں کا طویل ہونا

کوئی شرط نہیں ہے۔ کبھی کبھی برسوں گزر جاتے ہیں اور کچھ

نہیں ہوتا۔ بس جیسے ہوا کا ایک جھونکا آ کر گزر جائے اور

کچھ بھی نہ ہو اور کبھی کبھی چند مختصر سے لمحے گزرتے

ہوئے وقت کا بہت تھوڑا سا حصہ ہمیں ایسی ایسی سوچاقتیں

دے جاتا ہے جن کے اچھوتے پن سے انکار ممکن ہی نہیں

ہوتا ایسے ہی لمحات اور ایسی ہی گھڑیاں احمد کی زندگی میں

بڑی خاموشی سے اور بالکل اچانک آ گئے تھے انہیں یوں

محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کا سارا حسن اور ساری رعنائی

اس مختصر سے وقت کی بانہوں میں سٹ کر آئی ہو۔

.....☆☆☆.....

چھٹیوں میں وہ اپنے گھر والوں سے ملنے کے لیے

لاہور جا رہی تھی احمد کی بہنوں نے انہیں بتایا تھا لیکن خود

عالیہ نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا ویسے وہ خود بھی کافی دنوں

سے شرم کے گھر نہیں گئے تھے۔

اس روز صدر میں عالیہ انہیں نظر آئی۔ وہ اپنے بھائی

اور بھابھی کے ساتھ شاپنگ کر رہی تھی سب سے پہلے عالیہ

کی ہی نظر ان پر پڑی۔ اس نے شرم بھائی سے کہا۔ ”شریم

نے ہاتھ کا اشارہ کر کے احمد کو اپنے قریب بلایا۔ واپسی میں

وہ انہیں اپنے ساتھ ہی گھر لے آئے شام کی چائے سب

نے ساتھ لی۔ شرم بھائی اور بھابھی اپنے ایک دوست کی

شادی کے سلسلے میں رات کے کھانے پر مدعوں تھے۔ ان

دونوں کے جانے کے بعد احمد عالیہ کے ساتھ باہر برآمدے

میں ہی بیٹھ گئے۔ کئی منٹ گزر گئے وہ دونوں خاموش

رہے۔ احمد نے محسوس کیا کہ عالیہ کچھ چپ چپ سی ہے وہ

خود تو اس لیے خاموش تھے کہ وہ عالیہ کے بولنے کے منتظر

تھے۔ کیونکہ باتیں ہمیشہ زیادہ تر وہ ہی کرتی تھی۔ وہ خود تو

زیادہ تر سنتے ہی رہتے تھے۔ آخر کار احمد کو ہی بولنا پڑا۔

انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”عالیہ آج روزہ رکھا ہے تم نے۔“ اس نے حیران ہو

کر ان کی طرف

دیکھا اور بولی۔

”روزہ کیسا روزہ۔“

”چپ کا روزہ۔“ وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی اور

بولی۔



توانہوں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

”بہتر ہے کہ تم اندر آنے کی اجازت دے دو۔ ورنہ بغیر اجازت ہی اندر آتا پڑے گا۔“ اس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گئے وہ اپنا سوٹ کیس بستر پر رکھے کپڑے تہہ کر کے رکھ رہی تھی احمد اس کے قریب رک کر بولے۔

”بڑے زوروں میں تیری موری ہے جانے کی۔“

اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”بہتر ہوگا کہ اس وقت آپ اپنے کھر چلے جائیں۔“

”کیوں۔“

”موز نہیں ہے باتیں کرنے کا۔“

”ہاں۔“

”اداس موری ہو۔“

”ہاں۔“ اس نے سر ہلایا۔

”اداسی کی وجہ کچھ نہیں آئی وہ خاموش رہی۔“

”تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ اپنے گھر والوں سے ملنے

جار رہی ہوں وہ سر جھکائے اپنے کپڑے تہہ کرتی رہی۔

”شریم بھائی اور بھابی یاد آ رہے ہیں۔“ اس نے پھر

بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

”اچھا تو پھر غمور کی یاد آ رہی ہے۔“

انہوں نے شریم کے ملازم کا نام لیا۔

عالیہ ایک دم ہنس پڑی احمد نے کہا۔

”دیکھا کیسا صحیح اندازہ لگا یا میں نے۔“

”آپ پاگل ہو گئے ہیں۔“

”بالکل۔“ اس نے جھینپ کر کہا۔

”اچھا تو پھر تم ہی بتا دو کہ کون یاد آ رہا ہے۔“ احمد نے

کہا۔

عالیہ نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا ”مجھے نہیں معلوم

کون یاد آ رہا ہے۔“

”میں جانتا ہوں مابذلت یاد آئیں گے۔“ احمد نے

کہا۔

ایک لمحے کے لیے عالیہ کا چہرہ ہمتا اٹھا پھر فوراً ہی منہ

پھیرتے ہوئے بولی۔

”جی نہیں۔ میں ایسے لوگوں ہرگز یاد نہیں رکھتی جو کسی

سے محض تفریحاً بات کرتے ہوں۔“

احمد نے اس کے قریب جھک کر سر رکھی۔

”کیا سننا چاہتی ہو میری زبان سے۔“ عالیہ ایک دم

نروس ہو گئی اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ احمد درپچے کی طرف

بڑھتے ہوئے بولے۔

”کچھ کہنے یا انہ کہنے سے فرق تو موزی پڑتا ہے عالیہ

جذبات و احساسات لفظوں کے سہاروں کے محتاج تو موزی

ہوتے ہیں۔ عالیہ کو خاموش پاکر انہوں نے کہا۔

”کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوتا۔“ عالیہ نے آہستہ سے اقرار

میں سر ہلایا۔

”کیا ساری چھٹیاں گزار کر آؤ گی۔“

”ہاں شاید۔“

”نہیں۔ جلدی آنا میں انتظار کرو گا۔“ اور عالیہ کے

کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئے۔ عالیہ

کوشش کہ باوجود ایک مہینے سے پہلے واپس نہ آ سکی۔ گھر

والوں کی خواہش تھی کہ وہ اپنی ساری چھٹیاں لاہور میں

گزارے۔

☆☆☆.....

پورا ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ ایک شام احمد نورین اور

پروین کے ساتھ ان سے ملنے چلے آئے عالیہ شریم بھائی

اور بھابھی کے ساتھ باہر لان میں بیٹھی تھی۔ ذرا دیر پہلے

ہی ان لوگوں نے شام کی چائے پی تھی۔ عالیہ کہ ہاتھ میں

شام کا کوئی تازہ اخبار تھا۔ پروین اور نورین نے شریم بھائی

اور بھابھی کو سلام کرنے کے بعد عالیہ سے کہا ایک ہفتے سے

آئی ہوئی ہو۔ اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ہم سے ملنے

آ جاتیں۔

عالیہ نے مسکرا کر کہا۔

”میں آپ لوگوں کو آنے کا انتظار کر رہی تھی۔“ اس

روز احمد کو عالیہ سے بات کرنے کا ذرا سا بھی موقع نہ مل

سکا۔ وہ نہ ان کی سن سکے نہ اپنی کچھ کہہ سکے۔ ان دونوں

کے درمیان چند رسمی باتیں ہوئی اور بس۔ کچھ روز بعد وہ

آفس سے گھر واپس آئے تو عالیہ آئی ہوئی تھی۔ وہ پروین

نورین اور اپنی چچی کے لیے لاہور سے خریدی ہوئی کچھ چیز

یں لائی تھی جو اس کی امی نے بھجوائی تھیں۔

پروین احمد کے لیے کھانا لینے باورچی خانے میں گئی

آئی جا ہے۔“ نورین نے شرارت بھری نگاہوں سے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
احمد نے عجبیہ سے کہا۔

”لھیک ہے امی ابو اپنی بہو لے آئیں اور تم اپنی بھابھی لے آؤ۔ لیکن لڑکی میری پسند کی ہوگی۔“  
نورین نے کہا۔

”اچھا ذرا ہمیں بھی تو پتا چلے آپ کی پسند کا۔“ احمد نے ایک لمحے کے لیے ذرا توقف کیا اور بولے۔ ”عالیہ۔“  
نورین نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔  
”شکر ہے کہ ہماری اور آپ کی پسند کا ٹکراؤ نہیں ہوا۔“  
احمد نے امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں امی ایسی ہے میری پسند۔“ جہاں مسکرا کر بولیں

”میری پسند کیوں کہہ رہے ہو عالیہ ہم لوگوں کو بھی پسند ہے۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولیں۔

”عرفان بھائی تو لاہور چلے گئے۔ بھابھی ابھی یہیں ہیں ان سے ہی ذکر کرو یا جائے۔“ احمد نے کہا۔

”نہیں امی ابھی رہنے دیں۔“  
”کیوں۔“

”عالیہ کا فاضل ایئر ہے۔ امتحان ہو جائے پھر دیکھا جائے گا۔“

نورین نے کہا۔ امتحانوں میں تو ابھی کافی ماہ ہیں بھائی جان۔ مگر میرا خیال ہے کہ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

مگر جہاں کو ان کی رائے سے اتفاق نہیں تھا۔ انہوں نے کہا۔

”نہیں میں بھابھی سے تو ذکر کر ہی دوں گی بے شک وہ ابھی عالیہ کو نہ بتائیں۔“ احمد نے بھی اپنی بات منوانے کے لیے زیادہ اصرار نہ کیا لیکن اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ جہاں کو اسی روز اپنے بھائی کی شدید علالت کا خط ملا اور وہ حیدرآباد روانہ ہو گئیں۔

عالیہ کی امی ہالو بھی ایک ہفتے بعد لاہور چلی گئیں۔ جہاں تو اپنے بھائی کے اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد کراچی آ گئیں۔

لیکن بات جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا گیا۔ احمد معلوم نہیں کیوں مطمئن تھے۔ عالیہ سے ملنے اور اس سے باتیں کرتے تو اسے اپنی قسمت پر اور

تو عالیہ نورین کے ساتھ ڈانٹنگ روم میں آگئی تھوڑی ہی بر بعد احمد بھی کپڑے تبدیل کر کے اور منہ ہاتھ دھو کر وہیں آگئے احمد نے کرسی کھینٹ کر بیٹھے ہوئے کہا۔

”اور کیا خبریں ہیں لاہور کی۔“

”کوئی نئی خبر نہیں ہاں البتہ آپ کے یہاں ایک خوشخبری سنی ہے۔ غالباً پروین کی شادی کی طرف اشارہ ہے نہ ہمارا۔“

”جی۔“

اسی وقت پروین کھانا لے کر آگئی احمد نے کنگ کھیں سے پروین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں اصل میں اس لڑکی نے ہمیں بہت تنگ کر رکھا ہے، لہذا ہم نے سوچا کہ اسے نکالنے کی فکر کرنی چاہیے۔“

پروین نے پیار بھری ناراضی سے احمد کی طرف دیکھا۔ احمد نے سالن کا ڈولگا اپنی طرف کھسکایا اور مسکراتے ہوئے کھانا نکالنے لگا۔

☆☆☆.....

پروین کی شادی پر بڑا ہنگامہ تھا۔ لاہور سے عالیہ کے ابو عرفان اور اس کی امی ہالو بھی آئی تھی۔ شادی سے ایک ہفتہ پہلے ہی نورین، عالیہ کو اپنے گھر لے آئی تھی شادی کے دنوں میں احمد نے عالیہ کے اتنے بہت سارے روپ

دیکھے کہ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکے کہ اب دل کی بات زبان پر آ ہی جانا چاہیے۔ ان کو اپنی امی سے یہ بات کہہ دینی چاہیے کہ وہ ان کے لیے ادھر ادھر لڑکیاں دیکھنے کے بجائے۔ عالیہ کا انتخاب کر لیں۔ کچھ عرصہ پہلے انہوں نے

سنا تھا کہ امی ان کے لیے رشتہ دیکھتی پھر رہی ہیں پھر جب پروین کے رخصت ہونے کے بعد سب مہمان چلے گئے اور گھر

میں سناٹا چھا گیا تو ایک روز جہاں نے احمد سے کہا۔

”پروین کہ جانے سے گھر بڑا سوتا سوتا لگتا ہے۔“

احمد نے قریب بیٹھی ہوئی نورین کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور جب ہم نورین کو بھی نکال دیں گے تو تو پھر اور سناٹا ہو جائے گا۔“ نورین نے کہا کہ اس سے پہلے ہم لوگ

آپ کی بیگم صاحبہ کو لے آئیں گے۔

”اچھا تو یہ پروگرام بنا رکھا ہے آپ لوگوں نے۔“

”جی اس روز ابو کہہ رہے تھے اب گھر میں ہماری بہو



”اٹکا تو ہو چکا امی اب کیا ہاتی ہے۔“ ان کے ہونٹوں پر ہنسی سی مسکراہٹ بھری تھی۔  
 ”تمہارے ابو کہہ رہے تھے کہ وہ خود عرفان بھائی سے بات کریں گے۔“  
 ”جی جان جب زبان ہی دے چکی ہے۔ تو وہ ہرگز نہیں مانے گی۔“

”کوشش کر لینے میں آخر کیا حرج ہے۔“ احمد چپ چاپ بیٹھے ناشتہ کرتے رہے آفس جاتے ہوئے بمقام سے میں انہیں لوریں لی اس کا چہرہ بھی اتر ا ہوا تھا۔ آفس سے واپسی پر وہ شریم بھائی کے گھر چلے گئے۔ شریم بھائی گھر میں نہیں تھے بھابھی سو رہی تھی۔ عالیہ اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھی پڑھ رہی تھی ملازم نے اس کے کمرے کے باہر ہی رک کر اسے احمد کھانے کی اطلاع دی۔ اس نے پلٹ کر کھڑکی سے باہر دیکھا اور کتاب میز پر رکھ کر کھڑکی ہو گئی۔ ملازم نے احمد کو ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا تھا چند منٹ بعد عالیہ بھی وہاں آئی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں اداب کہا اور ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔  
 ”کیا بات ہے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“  
 ”ہاں ٹھیک ہے۔“

”ٹھیک معلوم تو نہیں ہوتی چہرہ بہت اتر ا ہوا ہے۔“ وہ کئی انکسی کرتے ہوئے بولے۔  
 ”یہ بتاؤ کہ امتحانوں سے کب فراغ ہوں گی تم۔“  
 ”ابھی تو وقت لگے گا کیوں۔“

”تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہے۔“ عالیہ نے حیرت زدہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ کس قدر اچھے اچھے لگ رہے تھے۔

اس نے بہت پوچھا مگر احمد نے اسے کچھ بھی نہ بتایا۔ حالانکہ ان کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے ذہنی اور دلی کرب کو اس سے نہ چھپا جب اس سے سب کچھ کہہ دیں۔ امتحان ختم ہوئے تو ایک دن بھابھی نے اسے بتایا کہ امی جان اب تمہاری شادی جلد ہی کرنا چاہتی ہے خالہ نے بچپن میں ہی تمہیں اپنے بیٹے کے لیے نامک لیا تھا۔ یہی خلاف توقع خبر تھی اس کے لیے۔ بارہ صدے اور حیرت کہ کافی دیر تک وہ کچھ بول نہ سکی۔ پائلیس جھپکائے بغیر

زیادہ احتیاد ہو جاتا۔ عالیہ کے امتحانوں بس صرف ایک ماہ باقی تھا۔ بھی ایک روز شریم بھائی بھابھی کے ساتھ ان لوگوں سے ملتے آئے تو جہاں نے موقع غنیمت جان کر انہی سہاچلے کہ لیے کہہ دیا۔ اس روز عالیہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں آئی تھی اور احمد بھی گھر نہیں تھے۔  
 شریم بھائی نے کہا۔

”جی جان میرا خیال ہے کہ آپ اس سلسلے میں امی کو خط لکھیں۔ ویسے میں بھی دو چار روز میں خط لکھنے والا ہوں۔ اچھا ہوا آج آپ نے ذکر کر دیا۔“  
 جہاں نے بڑے بھروسے اور احتیاد کے ساتھ بالو کو خط لکھا اور بڑی بے چینی سے ان کے جواب کا انتظار کرنے لگیں اور جب بالو کا جواب آیا تو جہاں کی ساری امیدیں اور آرزوئیں خاک ہو گئیں۔

بالو نے لکھا تھا۔ کہ عالیہ بچپن سے ہی اپنی خالہ کے جیسے معظم سے منسوب ہے پچھلے دنوں کراہی میں اپنے قیام کے دوران میں اپنی بہن کو از سر نو زبان دے چکی ہوں کہ عالیہ کے امتحان ختم ہوتے ہی اس کی شادی معظم سے کر دوں گی۔ معظم خود بھی عالیہ کو بہت پسند کرتا ہے۔“  
 جس وقت بالو کا خط آیا۔ احمد وہیں موجود تھے۔ ان کی امی خط پڑھ رہی تھیں اور وہ خود ان کے چہرے کے تاثرات کو پڑھ رہے تھے اپنی امی کے چہرے کے بدلنے ہوئے رنگوں کو دیکھ کر انہیں یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی کہ عالیہ کی امی نے انکار کر دیا ہے۔

اس رات پہلی مرتبہ انہیں اپنے جذبات کی شدت کا اندازہ ہوا۔ عالیہ انہیں اچھی لگتی تھی۔ وہ انہیں بہت اچھی لگتی تھی۔ لیکن یہ تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اگر عالیہ ان کی نہ ہوئی تو کیا ہوگا۔ ان کے دل پر کیسی قیامت گزرتی تھی اور عالیہ بے خبر تھی وہ اسے ابھی بتا بھی نہیں سکتے تھے اس سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے اس کے امتحان ختم ہونے تک وہ اپنے لبوں پر خاموشی کی مہر لگانے پر مجبور تھے۔ اس اتنی بڑی اذیت کو چپ چاپ سہتے رہنے پر مجبور تھے۔ صبح کو ان کی امی نے چہرہ دیکھتے ہی اندازہ لگالیا کہ وہ رات بھر سو نہیں سکے ہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے کی امت بندھاتے ہوئے کہا۔

”احمد بیٹے تم تو ابھی سے ماپوس ہو گئے۔“



ہا بھی کی طرف اس طرح دیکھتی رہی جیسے اس خبر کی صداقت پر یقین نہ ہو۔

مگر بھابھی کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی دیکھ کر سے اس خبر کی صداقت پر یقین کرنا پڑا۔

پھر ایک دن عالیہ کی شادی ہو گئی اس کے بعد احمد نے عالیہ کو نہیں دیکھا عالیہ کی شادی کے بعد وہ تقریباً چار برس ملک میں رہے اس دوران انہوں نے سنا کہ عالیہ کے یہاں ایک بیٹی کی پیدائش ہوئی ہے۔

پھر وہ سی اے کرنے ملک سے باہر چلے گئے وہیں بیس اپنی امی کے خط سے معلوم ہوا کہ عالیہ کے ہاں بیٹی ہوئی ہے جب بھی ان کو عالیہ کے متعلق خبر ملتی ان کے دل سے یہی دعا نکلتی عالیہ خدا کرے تم ہمیشہ خوش رہو۔ احمد چارٹرو کا ڈنٹ بن گئے تھے وقت بڑی تیزی سے گزر گیا تھا ان کی دونوں بہنوں پر دین اور نورین کے بچے بھی اب تو بڑے ہو گئے تھے حال ہی میں انہوں نے اپنے بچوں کا گروپ فوٹو بھیج دیا تھا۔ وہ سب کتنے خواہش مند تھے کہ بعد اب واپس وطن آ جائے بہنوں کو اپنے بھائی اور ماں باپ کو اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان تھا مگر ان کا وطن واپس آنے کو نہیں چاہا رہا تھا۔

سب کی منت اور خواہش پھر سے خط پڑھ کر انہوں نے وطن واپس جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھی کہ ان سے شادی کے لیے نہ کہا جائے گھر والوں نے سوچا چلوں اتنا بھی غنیمت ہے کہ انہوں نے وطن واپس آنے کی حامی توں بھری اور جس روز احمد وطن واپس آئے اس وقت عالیہ کی شادی کو پورے گیارہ سال ہو چکے تھے بھولی بھری یادوں نے ان کا دامن تھام لیا دل کو کئی کہانیاں یاد آ گئی انز پورٹ سے گھر پہنچے تو تو سب ان کے ساتھ تھے ٹیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی بے اختیار ان کی نگاہ اوپر چھت کی طرف اٹھ گئی تصور میں دو چاند جگمگانے لگے ایک چاند اوپر آسمان کی طرف۔ اور دوسرا چاند چھت پر ان کی دونوں بہنوں کے بیچ جگمگاتا ہوا چمکتا ہوا حسین چاند وہ چاند جیسے وہ غلطی سے اپنے گھر کے آئین کا چاند سمجھ بیٹھے تھے احمد نے برآمدے کی میز پر ہاتھ چڑھتے ہوئے سوچا جو وقت گزر جاتا ہے وہ پھر واپس نہیں آتا لیکن یادیں وہ انمول موتی ہیں جو دل کے سمندر کی تہ میں کہیں نہ کہیں چھپی رہتی

ہے کس قدر قیمتی سرمایہ ہوتی ہے یہ یادیں۔

وہ سب کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ سب لوگ انہیں اپنے درمیان پا کر بہت خوش تھے سب ہنس بول رہے تھے۔ وہ بھی مسکرا رہے تھے اور سب کی باتوں کا جواب دے رہے تھے لیکن ان کا ذہن جانے دردی کون کون سی دلیہزوں کو پار کر رہا تھا۔ احمد کئی سالوں بعد وطن واپس آئے تھے شروع شروع میں انہیں عجیب عجیب سا لگا لیکن آہستہ آہستہ زندگی معمول پر آئی گئی کئی عرصے کے بعد اسی شہر میں بھی۔ لیکن وہ اسے نہیں ملے انہوں نے اپنے آپ کو از سر نو مصروف کر لیا تھا کچھ وقت اور گزرنا ایک شام وہ آفس سے واپس آئے تو انہوں نے بڑی روح فرسا خبر سنی۔ عالیہ کے شوہر معظم گاڑی کے حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی زندگی کے دن بہت تھوڑے تھے وقت اتنا بڑا گھلاؤ دے کر آگے بڑھ گیا عالیہ کی زندگی اندھیر ہو گئی احمد اپنی امی ابو یا کبھی نوریں یا پروین کی زبانی سنتے تھے

کہ عالیہ بالکل گم سم سی ہو کر رہ گئی ہے اس کی صحت دن بدن گرتی جا رہی ہے۔ شادی کے بعد اس کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی اب تو آدمی بھی نہ رہی۔ احمد معظم کے جنازے میں تو ضرور شریک ہوئے تھے لیکن اس کے بعد سے اب تک اس کے گھر قدم تک نہ رکھا تھا۔ اب تو وہ اپنی عدت کے دن پورے کر کے اپنی بیٹی کے ساتھ شریم بھائی کے گھر آ گئی تھی۔ احمد کو شریم بھائی کے گھر جانے سے کون روک سکتا تھا۔

لیکن وہ کوئی بھی قدم اٹھانے پر آمادہ نہ تھے جوان کی یا عالیہ کی رسوائی کا سبب بننا۔ اپنے دامن میں درد و الم کی داستان لیے ایک سال گزر گیا معظم کی برسی ہو گئی پھر احمد نے سنا کہ عالیہ کے گھر والے اسے عقد سانی کا مشورہ دے رہے ہیں پہلے یہ صرف مشورہ تھا۔ آہستہ آہستہ اس مشورے نے اصراری صورت اختیار کر لی۔

عالیہ سب کے مشورے سب کا اصرار سن کر یا تو پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی۔ ایک روز احمد کی امی نے ان سے کہا۔

”بیٹے اگر تم کہو تو عالیہ کے لیے تمہارا رشتہ لے کر جاؤ“ احمد نے حیران ہو کر اپنی امی کی طرف دیکھا۔ امی



احمد تھوڑی دیر بیٹھ کر گھر جانے کے لیے اٹھے تو شریم بھائی نے کہا ”اگر تم عالیہ سے ملنا چاہو تو اندر جا کر مل لو۔“ احمد نے

صاف گوئی سے کہا۔  
”مجھے اور تو کچھ نہیں کہنا صرف اپنی صفائی پیش کرنی ہے۔“ شریم بھائی نے حیران ہو کر پوچھا۔  
”کس بات کی صفائی۔“

”آج عالیہ نے فون کر کے میری خاصی خبر لی ہے ان کا خیال ہے کہ آپ لوگ میرے اکسانے پر انہیں شادی کے لیے مجبور کر رہے۔“ بھابھی نے کہا۔

”وہ بے چاری اصل میں ذہنی طور پر پریشان ہے۔“ شریم بھائی افسردہ ہو کر بولے۔

”عالیہ تو نہ کبھی کی بات کر رہی ہے۔ احمد تم بتاؤ ہم اس کی بات مان کر اسے اس کے حال پر کیسے چھوڑ دیں۔“ احمد نے کہا۔

”لیکن جبر کرنا بھی تو مناسب نہیں شریم بھائی۔“ عالیہ کی شادی کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے وہ اس وقت یہ بھول ہی گئے تھے کہ اس کی بیٹی قریب ہی بیٹھی ہے وہ ایک دم بول پڑی۔

”نہیں میری امی شادی نہیں کریں گی۔ اگر میری امی نے شادی کر لی تو میں کس کے پاس رہوں گی۔“ بھابھی نے کہا۔ ”تم اپنی امی کے پاس ہی رہو گی بیٹی۔“

”نہیں ممائی جان میری سہیلی کی امی نے شادی کر لی تھی میری سہیلی انم کہ دوسرے ابو اس سے بالکل پیار نہیں کرتے۔“ شریم بھائی نے کہا۔

”نہیں بیٹی ایسا کیسے ہو سکتا ہے وہ ضرور اسے پیار کرتے ہوں گے آخر وہ اس کے ابو ہیں۔“

”ماموں وہ اس سے پیار نہیں کرتے انم بتا رہی تھی کہ اس کے ابو کہتے ہیں کہ اس سے میری کیا رشتہ داری ہے یہ نہ میری بیٹی ہے نہ میں اس کا باپ ہوں۔“ شریم بھائی نے اس کی توجہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا تم جا کر اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیلو دیکھو وہ شاید جلی پکڑ رہے ہیں۔“ وہ سب کچھ بول کر اڑتی ہوئی رنگ برنگی تلی کی طرف بھاگ گئی۔ احمد راند چلے گئے۔ دو تین دفعہ دستک دینے پر عالیہ اٹھ کر دروازے کے

نے پھر کہا۔  
”دیکھو نہ بیٹے عالیہ کی کہیں نہ کہیں شادی ہو ہی جانی ہے کبھی کی خواہش ہے کیا حرج ہے۔ اگر وہ ہماری ہی بہو بن جائے۔“

”لیکن امی جب وہ شادی نہیں کرنا چاہتی ہو تو آپ سب کیوں اس کے پیچھے بڑھ رہے ہیں۔“  
”وہ تو نہ بھی کی باتیں کر رہی ہے آخر ایسے کیسے زندگی گزارے گی۔“

”اپنے جذبات اور احساسات کو عالیہ خود ہی سمجھتی ہوگی۔“  
”ابھی اس کے زخم تازہ ہیں اسے سنبھلنے میں وقت لگے گا۔“

”آپ کیوں لوگ اپنی بات منوانے کے لیے بھند ہیں۔“ احمد یہ کہتے ہوئے آزرده ہو گئے۔

لیکن جانے کس روز احمد کی امی جہاں نے اپنے دل کی بات شریم بھائی تک پہنچا دی۔ عالیہ کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچی۔ اس نے سختی سے انکار کر دیا لیکن اس کے گھر والوں نے بھی ہمت نہ ہاری۔ احمد کے گھر والوں کے بار بار اصرار سے عالیہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ احمد کی خواہش پر وہ لوگ ایسا کر رہے ہیں۔ ایک دن عالیہ نے فون پر احمد کی اچھی طرح خبر لی۔

اور معلوم نہیں کیا کیا بولتی رہی۔ احمد اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکے وہ انہیں کچھ کہنے کا موقع دیتی تو وہ کچھ کہتے وہ تو بس اپنی ہی شادی رہی اور اس کے بعد فون بند کر دیا۔ احمد نے کتنے عرصے بعد اس کی آواز سنی تھی کئی منٹ تک تو وہ کھوئے سے رہے۔

اس شام وہ شریم بھائی کے گھر چلے آئے۔ احمد کو دیکھتے ہی شریم بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اپنے چاروں بچوں کا تعارف کراتے ہوئے شریم بھائی نے کہا۔  
”یہ ہیں تو تمہارے اٹکل لیکن اس گھر کا یہ راستہ بالکل بھول گئے تھے آج معلوم نہیں کیسے ادھر آ گئے۔“ احمد کے چہرے پر نہ کوئی شرمندگی تھی نہ کوئی مسرت ہونٹوں پر بے جان سی مسکراہٹ بکھیرے وہ شریم بھائی کے بڑے بیٹے اشعر سے ہاتھ ملاتے ہوئے جیسے لہجے میں اس کا حال پوچھتے رہے۔



فریب آئی۔  
 ہے پیشانی بیٹوں سے زیادہ پیارح ہوتی ہے۔“

”مگر احمد.....“

”اگر مگر کچھ نہیں جبہ کی موجودگی میں مجھے کسی کی کسی محرومی کا احساس نہیں ہوتا۔ بیٹے بہت بے مروت ہوتے ہیں۔ بیٹیاں ہمدرد مگسکار اور تنہائی کی ساتھی ہوتی ہے۔“ احمد جبہ کو بچ چاہتے تھے ان کی نئی لکھی بن کرتار ہوئی تو اس کا نام بھی انہوں نے جبہ کے نام پر جبہ منزل رکھا ان کے ہر انداز سے عیاں تھا کہ وہ جھکو دیوار پر چاہتے ہیں جبہ بیٹی جبہ بیٹی کہتے ان کی زبان ہی نہیں نکلتی تھی وہ بھی بڑی خاموش طبیعت اور جب چاہ سی لڑکی اپنے جذبات کا اظہار کرنا شاید اس نے سیکھا ہی نہیں تھا شریں بھائی اپنی فیملی کے ساتھ دینی جا کر شفٹ ہو گئے تھے تو وہ اور بھی کم مسم ہو گئی لیکن جب کچھ عرصے بعد اس کی بڑی خالہ آبا چھوٹے ماموں انجم بھائی کراچی آئے تو اس کی خاموشی ختم ہوئی اور جب اس کی پھوپھی بھی کافی عرصے بعد وطن واپس آئیں تو اس کا چہرہ اور کل اٹھا لیکن اس کے چہرے پر یہ کیفیت اپنی خالہ ماموں اور پھوپھی کی موجودگی ہی میں نظر آتی تھی کمر میں تو اس کا وہی انداز تھا خاموش سا۔

وقت کا ایک طویل کارواں گزر گیا سب کی اولادیں جوان ہو گئی جبہ بھی بڑی ہو کر بالکل عالیہ کی طرح خوب صورت لگی تھی۔

احمد کی زندگی میں ایک شام ایسی آئی کہ عالیہ ان سے ہمیشہ کے لیے چھڑ گئی۔

ان کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنے آپ کو سنبھالیں یا جبہ کو سنبھالیں وقت کس طرح گزر گیا تھا انہیں حیرت ہوئی تھی عالیہ ان کے لیے درو کا جلتا ہوا صحرا چھوڑ گئی تھی مگر انہیں ایک اطمینان سا تھا کہ درد کے اس جلتے صحرا میں وہ تنہا نہیں تھے جبہ بھی تو تھی عالیہ کی نشانی۔ انہوں نے یہ سوچ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کے پاس ان کی بیٹی تو تھی ان کے درد دکھ اور ان کے تنہائیوں کی ساتھی۔

پر سے کے لیے آئے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے جب ایک روز وہ حیران رہ گئے ہات ہی حیران ہونے کی تھی جبہ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ہوسٹل میں رہے گی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہوسٹل میں رہتا اس کی خواہش ہے بقول اس کے اس نے عالیہ سے بھی ہار اپنی

احمد کو دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گئی شاید سوچ رہی تھی کہ انہیں اندر بلائے یا نہ بلائے۔ آخر کار چند سیکنڈ کے بعد اس نے ایک طرف ہٹ کر اندازاً نے کاراستہ دیا۔

”تشریف رکھیں۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

احمد اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کتنی بدل گئی تھی وہ۔ سفید ملنگھی ساڑھی۔ بکھرے ہوئے ہال اجڑا ہوا چہرہ آنکھوں کے گرد گہرے گہرے ہلکے احمد ان کے چہرے سے لگا ہیں بھانا بھول گئے ان کا ذہن بھٹک گیا۔

یادوں کے دریا بہہ رہے تھے وہ اگئے وقت کی اڑتی دھول کے پیچھے ایک چاند سا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ ریم بھم برستی پھوار میں دو صاف و شفاف ہاتھ کہنیوں تک بھٹکے جا رہے تھے۔ ایک دھیمی دھڑاوازی باز گشت سنائی دے رہی تھی۔

”آپ کو ہارش کیسی لگتی ہے مجھے تو بے پناہ اچھی لگتی ہے۔ عالیہ پوچھ رہی تھی۔

”کیسے آنا ہوا۔“ وہ چونک پڑے اور بولے۔

”میں تمہاری غلط فہمی دور کرنے آ ہوں۔“

”کیسی غلط فہمی۔“ پھر احمد اپنی صفائی میں جو کچھ کہہ سکتے تھے کہتے رہے وہ سر جھکائے جب چاہ سکتی رہی۔

عالیہ کہ بار بار کتنی سے انکار کرتے کہ باوجود وہ احمد کی ہو گئی وہ اپنی تقدیر کے کنبے کو ماننا نہیں سکتی تھی اس کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ ایک ہا پھر وہیں بنے۔ سو وہ مجبور ہو گئی لیکن وہ بیٹیوں تک اپنے آپ کو نہ سمجھا سکی۔ نہ سنبھال سکی اس کے نزدیک یہ تقدیر کا مذاق تھا بہت بھیا تک مذاق۔

احمد کی رفاقت میں زندگی کسی اور ہی انداز سے گزرنے لگی۔ عالیہ کو احمد سے ہر خوشی کی لیکن احمد کی محرومی کا احساس اسے بھی بھی آرزو کر دیتا تھا۔ ان کی قسمت میں اولاد کی خوشی نہیں لکھی تھی۔ عالیہ کہ ہاں تین بیٹوں کی ولادت ہوئی مگر وہ دو تین بیٹیوں سے زیادہ نہ جی سکے آخری بیٹے کی پیدائش کے وقت کچھ ایسی وحید گیاں ہوئی کہ عالیہ پھر ماں بننے کے قابل نہ رہی۔ عالیہ کو اس بات کا بہت دکھ تھا مگر احمد کو اس کی خوشی اس کی زندگی بہت عزیز تھی عالیہ جب بھی اس بات کا تذکرہ کرتی تو احمد ہنس کر کہتے ”ایسی بات مت کرو عالیہ مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ جب میری بیٹی نہیں



کے وجود سے ہی ہمیشہ خائف رہی ہوں۔ بے پناہ ڈری ہوئی کبھی ہوئی کسی جب بھی اپنے ذہن کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ احمد صاحب میرے باپ ہیں دل میں ان بے شمار پڑھے ہوئے قصوں کا خیال آ جاتا ہے جن ماؤں کے دوسرے شوہران کی بیٹیوں کے محافظ نہیں یلڑے ثابت ہو تے ہیں۔

دل کو بار بار سمجھایا کہ دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں لیکن یہ وہم یہ ڈر یہ خوف بھی دل و دماغ سے نکلا ہی نہیں کہ جو یہ میری امی کے دوسرے شوہر کا روپ ہے۔

بے حد شفیق مہرباں اور محبت کرنے والے باپ کا یہ بالکل معمول ہے ایک خول چڑھا ہے کسی بھی لمحے یہ خول اترے گا اور میرے سامنے شفیق اور مہربان محبت کرنے والے باپ کے بجائے ایک یلڑا کھڑا ہوگا۔

ایک بھڑپا کھڑا ہوگا۔ بس اس لمحے کے تصور سے خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ الفاظ تھے کہ سننا تے ہوئے جرجیلے تھے کہ خیر تو کیسے برے تھے تو جیسی کہ بھئی میں تہائی ہوئی گرم گرم سلائیں۔ سننا تے ہوئے خیر احمد کے دل میں ہیوست ہو گئے تھے۔

”خداوند تمام عمر کی شرافت اور پارسائی کا یہ صلہ۔ انسا ن کتنا حقیر ہے اور بے بس میں تو سمجھتا تھا کہ دوسری بیوی ہونا ہی بل صراط پر چلنا ہے غریب عورت تمام عمر بیڑی تر جمی لگا ہوں کے وار سبھی رہتی ہے لیکن آج احساس ہوا کہ دوسرا شوہر ہونا بھی شاید ناقابل معافی جرم ہے۔ میں تو اپنی دل کی اور اپنی روح کی تمام تر پانچ کیز کیوں کے ہا جو آج خود اپنی لگا ہوں میں گر گیا ہوں میری عمر کی یہ منزل جب کہ شاید زندگی سے لحد کا قاصد بھی بہت کم رہ گیا ہے اور.....

اور روح برنگ با آتش شدید گھاؤ۔  
ان کی آنکھوں کے گھوٹے بھگ گئے۔ دواؤ نسوں کلپیوں سے پہتے ہوئے ان کے سفید بالوں میں جذب ہو گئے۔



اس خواہش کا ذکر کیا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا احمد سوچ میں پڑھ گئے۔ انہوں نے اسے بہت سمجھایا اپنے اکیلے پن اور تنہائی کا احساس کرایا مگر جب کے اوپر کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا اس کا انداز تھا کہ کرنے کا ساتھ احمد مجبور ہو گئے پھر انہوں نے جب کہ سمجھانے کے بجائے اپنے آپ کو سمجھایا میں اتنا خود غرض کیوں ہو گیا ہو محض اپنی تنہائی اور اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے اسے ہو سکتا میں رہنے کی اجازت نہیں دے رہا ایک طرف تو اس سے بے پناہ محبت کا دعویٰ اور دوسری طرف یہ انداز کہ اس نے پہلی بار کسی خواہش کا اظہار کیا تو اسے پوری کرنے سے انکار انہوں نے اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے جب کہ ہو سکتا میں رہنے کی اجازت دے دی ہو سکتا میں شفت ہونے کے بعد سے جب نے یہ انداز اختیار کیا تھا کہ وہ جعرات کی شام کو بجائے جب منزل آنے کے اپنی خالہ کے گھر چلی جاتی اور بھی اپنی پھوپھی کے گھر رہ جاتی احمد سے ملنے کے لیے وہ جیسے کی صبح کو نو دس بجے آئی اور شام ڈھلنے سے پہلے چلی جاتی۔ احمد وہ پورا ہفتہ لکھنؤ پر گن گن کر گزار دیتے مگر جب وہ آتی تو اس قدر عطا رہتی اور اپنی تلی بات کرتی کہ وہ ہی چپ ہو کر رہ جاتے۔ احمد سمجھتے تھے کہ خاموش رہنا اس کی عادت ہے اور ادھر عالیہ کی وفات کے بعد اس کی اور بھی زیادہ خاموشی کو وہ سمجھتے تھے کہ اس کو اپنی ماں کی موت کا بہت دکھ ہے مگر آج جب کہ ڈائری کے چند اوراق پڑھ ان کی آنکھیں کھل گئی تھیں پردہ ہٹ گیا تھا رخ پر پڑا ہوا نقاب الٹ گیا تھا۔ وہ جیسے دیکھ کر احمد سمجھتے تھے وہ جس کی موجودگی کے احساس نے ان کو دل سے اپنے تینوں بیٹوں کی محرومی کا احساس متاد یا تھا وہ ان سے کتنی دور ہوئی اس نے لکھا تھا۔

”میرے اور ان کے درمیان بھلا رشتہ ہی کیا ہے وہ میرے باپ نہیں میں ان کی بیٹی نہیں تو وہ صرف میری امی کے شوہر ہیں دوسرے شوہر امی کے دوسرے شوہر کو اپنا باپ کہتے ہوئے میرا اعتماد ہمہ سے ہی منزل رہا ہے۔ باپ اور بیٹی کا رشتہ بڑا مقدس ہوتا ہے اس رشتے پر تو اندھا اعتماد ہوتا ہے کبھی ہولے سے بھی ذہن میں یہ خیال نہیں آتا کہ یہ شخص صبح میرا محافظ ہے بھی کہ یا نہیں۔

یا ہماری پناہ گاہ بھی ہے یا نہیں جبکہ میں احمد صاحب

# سراب

زارا رضوان

کسی فلسفی نے کیا خوب کہا ہے کہ دنیا کا نظام تین طبقے چلاتے ہیں ایک نچلا طبقہ جو تین وقت کی روٹی پر راضی ہو جاتا ہے اگلے دن کا نہیں سوچتا ایک اوپر کا طبقہ جس کے لیے دولت ہی سب کچھ ہوتی ہے رشتوں کا تقدس شرم و حیا سب کچھ ٹانوی ہوتا ہے مگر سب سے زیادہ خطرناک اور حساس طبقہ مڈل کلاس ہوتا ہے جو نیچے آنا نہیں چاہتا اور اوپر والے اسے اوپر آنے نہیں دیتے آج کل سوشل میڈیا نے اسے سب سے زیادہ متاثر کر رکھا ہے جو اس طبقے کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو نئے اور رنگین خوابوں میں مبتلا کر کے تباہی کی گہری کھائی میں گرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

فیس بک پر رنگین خواب دیکھنے والی دوشیزہ کی روداد

”یہ لیں رکھ دیا منحوس کو اب خوش۔۔“ رقیہ بیگم ہنہ کہہ کر چائے پینے لگ گئیں۔ مسکراہٹ اب تک اس کے چہرے پر قفس کر رہی تھی۔

☆☆☆

”حد ہے تھوڑا صبر نہیں کر سکتے۔ ناشتا کر رہی تھی۔“ گاڑی کا ہارن سن کر ایمین بھاگی بھاگی آئی۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ چہرہ دھوپ کی تمازت سے چمک رہا تھا۔

”تھوڑا سا؟ میڈم پچھلے میں منٹ سے کھڑا ہوں۔ روز مجھے آفس کے لیے لیٹ کروا دیتی ہو اب بیٹھو بھی۔“ اس کو کھڑا دیکھ کر بولا تو فوراً بیٹھ گئی۔

”یہ تم کیا ہر وقت فیس بک میں مگھی رہتی ہو جب دیکھو موبائل ہاتھ میں رہتا ہے۔ مگھی تو جان بخش دیا کرو۔“ ایمین کے ہاتھ میں موبائل دیکھ کر راجیل جل ہی تو گیا۔

”جان کس کی بخشوں؟ فیس بک کی یا موبائل کی؟“ بات کاٹ کر ٹائپنگ کرتے ہوئے ایمین نے شوخی سے کہا۔

”ہو سکے تو دونوں کی۔“ راجیل نے تپ کر جواب دیا۔ اس کی شوخی راجیل کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ ایمین نے کوئی جواب نہ دیا۔

”ایکس آف ایوری تھک از بیڈ۔ کوئی اچھی چیز

جیسے میچ کی ہیپ ہوئی اس نے فوراً موبائل اٹھایا اور توج پڑھنے لگی۔ چہرے پر مدھم مسکراہٹ بکھر گئی۔ اگلے ہاتھ سے بریڈ آلیٹ کھاتے ہوئے اسپڈ سے توج ٹائپ کرنے لگی۔ رقیہ بیگم نے کچھ لمبی نظروں سے دیکھا۔ چہرے پر ناگواری کے اثرات کے واضح تھے۔

”بھی چھوڑ بھی دیا کرو اس منحوس کا پیچھا۔ جسے دیکھو کسی میں گھسا رہتا ہے جیسے کھانے کو پیسے دیتا ہو۔“

”امی جان ضروری نہیں ہر چیز کھانے کے لیے پیسے۔ کچھ چیزیں انسان کو تفریح دینے کے لیے ہوتی ہیں، سکون دینے کے لیے ہوتی ہیں۔“ ساتھ ساتھ ٹائپنگ جاری تھی۔

”اس میں سکون کہاں ہے سکون چاہیے تو نماز پڑھو، قرآن پڑھو، اللہ کو یاد کرو۔“ رقیہ صابر نے بریڈ پر جیم لگا کر اس کی پلیٹ میں رکھا۔ وہ خاموشی سے میچ ٹائپ کرتی رہی۔

”بعد میں بات ہوگی۔ آئی ایم ہیونگ بریک فاسٹ۔“ میچ سینڈ کیا۔ پھر ٹیبل پر پڑی چیزوں کی تصویریں بنانے لگی۔ موبائل ایپ سے اچھی طرح ایچ کو ایڈٹ کیا، کنکشن لگا کر پوسٹ کا بن دبا دیا۔ وہ جانتی تھی تھوڑی ہی دیر میں لائک اور کمینٹس کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ موبائل واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔





لیکن مجھے جہیں مسٹر فیک بک کہہ کر مخاطب کرنا بہت عجیب لگتا ہے۔ آئی مین تم خود سوچو نکل کتاب۔  
 ”حقیقت ہے جناب! فیس بک میں سب فیک ہوتا ہے، اسٹیشن، تصاویر، جیس، جگہ سب نکل دیا ہے یہ۔  
 حقیقت سے کوسوں دور۔“

”خیر اب ایسا بھی نہیں۔ یہاں بہت سے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنہوں نے فریب و جھوٹ کے بجائے اپنا آپ اصل پیش کیا ہے۔ حقیقت سے فیس بک چلا رہے ہیں۔“ سوئٹ پرنسز نے اس کی بات سے اختلاف کیا۔  
 ”میں نے کب انکار کیا اس بات سے وہ لوگ یا تو سلیمہ ٹی ہیں یا شاعر، رائٹر، منکر وغیرہ وغیرہ جن کو سب جانتے ہیں اکثریت ایسے لوگوں کی بھی ہے جو ٹیلی فرینڈز سے فرینڈز تک چلے آ رہے ہیں۔“ مسٹر فیک بک کی بات پر اس نے لالک کا آنگن بنایا۔

”اچھا چلو ایک کام کرتے ہیں تم مجھے اپنی تصویر دکھاؤ میں تمہیں نام بتا دوں گا ٹھیک ہے؟“ مسٹر فیک بک نے ڈبل کی۔ کافی دیر تک وہ لپ ٹاپ کو دیکھتا رہا لیکن میسج نہیں کوئی میسج تو ٹیکسٹ نہیں نہ آیا۔  
 ”یہ کیسی شرط ہے؟“ کافی دیر بعد اس نے جواب دیا۔  
 ”شرط؟ محبت شرط سے ماورا ہوتی ہے پرنسز۔“

”محبت؟ ہم اچھے دوست ہیں۔ محبت کے لیے ایک دوسرے کو جاننا ضروری ہے، مراسم ضروری ہیں۔ ایسے کیسے محبت ہو سکتی ہے؟“ مسٹر فیک بک کے اس میسج نے اس نے انداز ایک عجیب سی بے چینی بھر دی۔

نہیں فیس بک جس پر لگ کر تم سب کچھ بھولی ہوئی ہو۔ ایکزام ہونے والے ہیں پڑھائی پر توجہ دو۔۔۔  
 ”میں جو مرضی کروں آپ کو کیا تکلیف ہے۔ اپنے کام سے کام رکھا کریں آپ ہنہ آ یا برا اعتراض کرنے والا۔۔۔“  
 ایمن نے بات کاٹ کر بدلتی سڑی سے کہا تو اس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔

☆☆☆.....

تم کو دیکھا تو خیال آیا  
 زندگی دھوپ تم گھٹا سایہ  
 مسٹر فیک بک کی طرف سے اس شعر کو ٹیک کئے جانے پر کتنی دیر وہ ان لفظوں کے حصار میں کھولی رہی۔ لالک کا بن دبا کر پوسٹ میں دل والا آگن منتخب کیا۔  
 ”کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں جو ابھی تک اپنی تصویر نہیں دکھائی نہ ہی اپنا نمبر دیا۔“ تھوڑی دیر بعد مسٹر فیک بک کا میسج پرنسز آیا۔

”تو تم نے کون سا اپنا نام بتایا ہے اب تک؟“ فوراً جواب دیا۔

”اف! تم بھی کمال کرتی ہو میری تصاویر بیچ میری فیل کی تصاویر دیکھ لیں اب بھی نام کی گنجائش رہ جاتی ہے۔“  
 ”بالکل۔“ مختصر سا جواب ملا۔

”تم نے بھی تو اپنے نام پر آئی ڈی نہیں بنائی سوئٹ پرنسز میں نے بھی اعتراض کیا؟ نہیں نہ کیونکہ میرے لیے تم پرنسز ہی ہو۔“ سوئٹ پرنسز کا دل دھڑکا۔  
 ”میری بات اور ہے تم مجھے پرنسز کہتے ہو وہ ٹھیک ہے

”جیتی رہو بیٹا۔“

”ہر چیز کی زیادتی نقصان دہ ہوتی ہے ایسی۔“ وہ جانے ہی لگی جب انہوں نے مخاطب کیا۔  
”میں بھی نہیں ابو۔“ وہ حقیقتاً نہ سمجھ سکی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

”بیٹھو بیٹا دیکھو تمہاری امی کو شکایت ہے کہ تم موبائل بہت زیادہ استعمال کرنے لگ گئی ہو۔ یہ اچھی بات نہیں۔ اس سے آنکھیں متاثر ہو سکتی ہے اور جسم کی نقصانات ہیں۔“ کتاب بند کی اور صیک اتار کر ٹیبل پر رکھ دی۔  
”ایسی تو کوئی بات نہیں ابو وہ بس کسی فرینڈ کا میسج آجائے تو الگ بات ہے ورنہ اتنا تو پوچھ نہیں کرتی۔“  
”بہر حال اعتدال میں رہ کر استعمال کرو۔“ صیک لگا کر دوبارہ کتاب کھول لی ساتھ ساتھ چائے پینے لگ گئے۔  
ان کی خاموشی کا مطلب تھا وہ جاسکتی ہے۔

”مجھے کوئی ایسا نہیں ملا جو مشکوک ہو۔ کل 27 نمبرز ہیں زیادہ تر ٹیلی نمبرز کے ہیں یا اس کی دوستوں کے جنہیں پورا یقین ہے کہ.....“ انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔  
”ماں کی نظرس وائی فائی کے مسئلے سے زیادہ تیز ہوتی ہیں صابر صاحب۔ وہ سب کچھ معمول سے ہٹ کر کر رہی ہے۔“ چائے کا کپ پکڑتے ہوئے کہا۔

”کیا کہوں۔“ چمچہ سمجھ نہیں آ رہا۔ ”چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور سر مٹلے لگے۔

”سمجھنا کیا ہے۔“ پیپر کے فوراً بعد شادی کروینی چاہیے۔“ انہوں نے اپنے پیش فیصلہ کیا۔  
”یہ کیا بات کر رہی ہو رقیہ؟ ایک شک کی بنیاد پر ایسا کرنا قطعاً ٹھیک نہیں یا تو اس سے کھل کر بات کی جائے۔“ وہ ایک دم کھڑے ہو کر ٹپٹلے لگے۔ اپنی بیٹی پر ان کو خود سے زیادہ بھروسہ تھا مگر رقیہ بیگم کی بات بھی نظر انداز نہ کر سکتے تھے آخر کو وہ ماں ہیں اور اولاد کو ماں سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا۔  
”کناج تو کر سکتے ہیں نہ؟“ رقیہ بیگم نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہاں اس پر غور کیا جاسکتا ہے۔“ وہ ابھی تک گفتگو میں تھے  
”غور نہیں صابر صاحب میل کرتا ہے۔ میں آج ہی بلکہ ابھی جا کر راجیل سے بات کرتی ہوں۔“

”تم مجھے جانتی ہو۔ مجھے دیکھا ہوا ہے۔ کیا جاب کرتا ہوں اس سے واقف ہو۔ مجھے دیکھو صرف تمہاری آنی ڈی کو لے کر چل رہا ہوں مگر پھر بھی محبت ہو ہی گئی جس دن تمہارا بیج نہیں آتا دل بے چین ہو جاتا ہے۔ صبح، دوپہر، شام، رات تمہارے بیج کی ڈوز چاہیے ہوتی ہے۔ اپنا فون، کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ ادھر اور لگتا ہے بلکہ نہیں ادھر تو میں خود ہو جاتا ہوں۔“

”بیج دیکھ کر اس کا دل دھڑکا۔ کافی دیر بیٹھا تو چلا آیا تو اس کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ جب تک مسٹر فیس بک کا بیج نہ آئے وہ بے چین رہتی ہے، بار بار موبائل چیک کرتی ہے۔ اپنا انٹرنیٹ بیج بھی ختم ہونے نہیں دیتی۔ جبکہ باقی فرینڈز کے لیے اس کی سوچ ایسی ہے نہ دل یوں دھڑکتا ہے۔“  
”کہاں گئی؟“ کافی دیر تک جواب نہ ملنے پر بیج آیا۔  
”بعد میں بات کرتی ہوں۔ کھانا کھا لوں۔“ جلدی سے رہ پلائی کیا اور کرسی کھسکا کر بیٹھ گئی۔

”بیج کی چپ ہوتی تو منہ تک جاتا نوالہ رک گیا۔ کھانا کھاتے بیج پڑھا تو دل کو بے سبب، بے وجہ بے قرار پایا۔ ابھی سوچیں، منتشر دھڑکن، بے چین ہل کھانے میں وجہ تھم چار آنکھوں نے یہ منظر بہت غور سے دیکھا۔

☆☆☆☆

”ایمن۔“

”جی ابو۔“ صابر صاحب کے پکارنے پر کمرے تک جاتے قدم رک گئے۔

”بیٹا اگر کسی ٹیسٹ وغیرہ کی تیاری نہیں کر رہی تو ایک کپ چائے بنا دو۔ تمہاری امی پکڑے پریس کر رہی ہیں۔“  
”قریب کی صیک اتار کر اس کو بخود دیکھتے ہوئے بولے۔  
”جی ابو ابھی لائی۔“ موبائل کو سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ کچن کی جانب بڑھ گئی۔

”حکمت غیر اخلاقی تھی مگر نہ چاہتے ہوئے بھی ان کو موبائل اٹھاتا بڑا کال ہسٹری، میسجز یہاں تک کہ کاغذیں چیک کئے لیکن کوئی مشکوک نمبر ملا نہ ہی ایسا بیج جس سے وہ غلط اندازہ لگا سکتے۔ موبائل واپس رکھا، قریب کی صیک سیٹ کی اور دوبارہ کتاب میں گم ہو گئے۔

”یہ لیں ابو آپ کی ادھر والی چائے۔“ ایمن نے چائے کا کپ تھمایا



”جیسے آپ کی مرضی۔ پر ایمن کی رضامندی بھی ضروری ہے رقیہ بیگم۔“  
”آپ بے فکر رہیں میں اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کروں گی۔“

☆☆☆☆

”اندرا جائیں۔“ دستک پر راجیل نے کہا۔  
”ارے خالہ جان آپ مجھے بلا لیا ہوتا۔ آپ نے کیوں زحمت کی؟“ لیب ٹاپ سائیڈ پر رکتے ہوئے کہا۔  
”کنواں بھی عیساے کے پاس گیا ہے؟“ رقیہ بیگم نے کہا تو راجیل نے نا بھیجے کے عالم میں دیکھا۔  
”راجیل۔“ رقیہ بیگم جبکہ گئیں انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے بات کریں۔  
”خالہ جان اپنا ہمتی ہیں اور جھجکتی بھی ہیں آپ بے جھجک مجھ سے کہہ ڈالیں جو بھی بات ہے۔“ راجیل نے ان کے ہاتھ میں ہاتھ رکھا تو رقیہ بیگم کا اعتماد بحال ہوا۔  
”ایمن کے پھر زخم ہونے والے ہیں میں چاہتی تھی ایگزام کے بعد شادی کروں اس کی۔“  
”یہ تو اچھی بات ہے خالہ جان دیکھا کوئی رشتہ۔“

”بیٹا وہ صفیہ اور ظہور کی خواہش تھی کہ تم اور ایمن میرا مطلب ہے انہوں نے ایمن کے پیدا ہوتے ہی اسے تمہارے لیے مانگ لیا تھا لیکن اگر تمہیں کوئی اور پسند بیٹا۔“ آج رقیہ بیگم کو اندازہ ہوا بیٹی کی ماں ہو کر رشتے کی بات کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔

”میری زندگی کو دے کاغذ کی طرح ہے خالہ جان اور دل کے کاغذ پر کسی کا نام بھی درج نہیں امی ابو کی خواہش اور آپ کی چاہت سر آنکھوں پر۔ ایمن یوں بھی مجھے دل سے عزیز ہے۔“ راجیل نے ان کی مشکل آسان کر دی رقیہ بیگم کے کندھے سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ اب ایمن سے بات کرنا بھی جونی الوقت سپر زکے بعد کرنے کا ارادہ کیا۔

☆☆☆☆

صفیہ اور رقیہ دو بہنیں ایک ہی گھر بیاہ کر آئی تھیں صابر احسن، شاہد احسن، ظہور احسن، منظور احسن چار بھائی تھے۔ منظور الیکٹریکل انجینئر تھے۔ یونی ایس آسٹریلیا سے انجینئرنگ کی ڈیگریاں لی تو فیملی (دو بیٹے شاہد احسن اور سعید اور ایک بیٹی عنایہ) کو لے کر سیٹل ہو گئے۔ ظہور احسن جاکلڈ

ایپنٹسٹ تھے جو صابر کے گھر سے دوگلی پیچھے رہتے تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں عنایہ اور مہرین ظہور کڈنی ایپنٹسٹ تھے جن کی شادی رقیہ بیگم کی بہن صفیہ سے ہوئی۔ ان کے دو بیٹے تھے راجیل اور کھیل جبکہ صابر ایک فرم میں بڑے عہدے پر فائز اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان کی ایک بیٹی بھی تھی ایمن جو کہ دو دلوں کہیں ایک ہی گھر میں بیاہ کر آئی تھیں اس لیے سلوک و اتفاق کی وجہ سے انہوں نے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ ایمن کی پیدائش پر صفیہ نے راجیل کے لیے اس کو اپنی بہن سے مانگ لیا تھا۔

صفیہ اور ظہور احسن کے ساتھ زندگی نے وفاندہ کی۔ وہ دو دلوں ایک کار ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے۔ کھیل اور راجیل کی پرورش رقیہ اور صابر احسن نے کی۔ کھیل نے انٹرمیڈیٹ کرتے ہی باہر جا کر تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی جسے دو دلوں میاں بیوی نے تردید کے بعد مان لیا۔

☆☆☆☆

”اب فارغ ہوئی ہوں کھانا کھا کر۔“ دو بارہ میچ آیا تو اس نے فوراً جواب دیا۔  
”آج وال کھاتی ہے یا کوئی سبزی جمی بکچر نہیں لگائی۔ ایم آئی راسٹ؟“

”نہیں۔“ مختصر میچ کیا۔  
”کیا نہیں؟“ پوچھا گیا۔  
”امی نے آلو کو فتنے بنائے تھے۔ بے دھیانی میں ایچ بنانا یاد نہیں رہا۔“

”دھیان کہاں ہے پرسن کا ذرا ہمیں بھی تو پتہ چلے؟“  
”کہیں نہیں۔ بس پڑھائی کی وجہ سے۔“

”پڑھائی یا میں؟“  
”دونوں۔“ اسے دل سے اعتراف کرنا پڑا۔

”یہ تو سیاسی بیان ہوا۔“  
”تھو بھی سمجھ لو۔“ میچ کھاتا ساتھ میں دل والا آنگن بنایا تھوڑا جھجک ہوئی مگر سینڈ کر دیا۔

”ارے وا! آج دل دے ہی دیا۔“ جواب میں اس نے دل والے آنگن کی لائن لگا دی۔  
”دل تو کب کا دیا ہوا تھا بتایا آج ہے کہ۔“  
”کہ۔“  
”یہ دل آپ کا ہوا۔“ وہ شوخ ہوئی۔

پاس سب مرچکی تھی۔ سب کے سامنے خود کو نابل رکھنے کی کوشش کرتی کہ کوئی محسوس نہ کر لے لیکن جیسے ہی کمرے میں آئی دل بے چین ہو جاتا۔

”اس نے جب سے تصویر دیکھی ہے کوئی بات نہیں کی میں اس کو پسند نہیں آتی شاید نہیں..... نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے میری معصومیت و خوبصورتی کے تو سب گرویدہ ہیں پھر شاکر کیسے نہیں کوئی اور بات ہے۔ شاید مصروفیت مگر سب تو وہ مسلسل دیکھ رہا ہے شاید وقت کی کمی کے باعث۔“ اس کی بڑبڑاہٹ جاری تھی جس کا خلاصہ تھا ”شاید“ شاکر کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ گھائل ہو چکی تھی، محبت اپنا وار کر چکی تھی۔

اب ہوا معلوم احساس محبت  
جب تم نہ تھے تو کچھ نہ تھا

.....☆☆☆.....

”خیریت؟ میں دیکھ رہا ہوں تم کی دونوں سے پریشان ہو۔“ ایمن کو ٹیس پر ٹھٹھا دیکھ کر راجیل نے پوچھا۔ اس کے چہرے میں بے چینی کو راجیل نے واضح طور پر محسوس کیا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ ایگزٹ کی وجہ سے۔“  
”ٹھنکنے کی بجائے اگر تیار کر لو تو زیادہ بہتر نہ ہو۔“  
”میں جانتی ہوں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ یو ڈونٹ نیڈ ٹو ٹیل می۔“ ہمیشہ کی طرح ایمن نے راجیل کو جھٹکا کر رکھ دیا۔

”ماسٹر یوز لینک تو آئی ڈونڈ مس ایمن صابر! بیکو یو آر گونگ ٹو بی مائی بیٹر ہاف، آئندہ بد تمیزی کرنے سے پہلے سوچ لیتا۔“ راجیل نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی تو وہ حیرانگی سے اس کا یہ روپ دیکھتی رہ گئی اس نے آج تک ایمن سے اس انداز میں کہاں بات کی تھی۔

”امی یہ سب کیا ہے؟“ سلاڈ کا تھی رقیہ بیگم کے ہاتھ رک گئے۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے ایمن کو دیکھا جس کا لہجہ تیار ہاتھ اوڑھنے میں ہے۔ دوبارہ سلاڈ بتانے میں مگن ہو گئیں۔

”میں آپ سے پوچھ رہی ہوں کچھ۔“ جواب نہ پا کر اس نے تپ کر کہا۔  
”سکینڈ تم ذرا باہر جاؤ۔“ ماسی جی اچھا کہہ کر کچن سے

”دل میں جگہ دے ہی دی ہے تو یہ بتاؤ کب دیدار کراؤ گی اپنا؟“ وہ اسی بات پر آ گیا۔

”میرا نام شاکر ہے۔ کیا کرتا ہوں، کہاں رہتا ہوں تم سب جانتی ہو۔ میرے جذبات سے بھی غافل نہیں تم۔“ وہ شش و پنج تھی مگر میسج آیا۔

”رسٹائی کے حساب سے نام پرانا نہیں؟ اودو اچھا اب کبھی بھی نام میسج راز میں رکھا گیا تھا۔“ میسج سینڈ کیا۔

”نام نیا یا پرانا نہیں ہوتا مادام۔ نئی پرانی سوچ ہوتی ہے اینی ویز اب تمہاری باری۔“ شاکر نے کہا۔

”ویٹ (انتظار)۔“ اب کی بار بغیر جرح کیے وہ مان گئی۔ اپنا مان، اعتماد، دل دے دیا تو تصویر کی کیا بات!

دروازہ بند کر کے جلدی سے ہلکا میک اپ کیا۔ مختلف زادپوں سے آٹھ دس سیلی لے کر اچھی والی سیلی کو ایفیکٹ دے کر سینڈ کیا۔

”آریوریڈی ٹوسی می۔“ اس نے ہاپ کر یٹ کیا۔  
”شدت سے۔“

”اس می ایمن..... ایمن صابر۔“ تصویر کے ساتھ کمٹ لکھ کر ساتھ میں سائل آگن بنایا۔

”کچر ڈیلیٹ کر دینا دیکھ کر۔“ بیوقوفانہ سی بات جو ہر لڑکی تصویر بھیجنے کے بعد کہتی ہے اور یقین رکھتی ہے مد مقابل ایسا ہی کرے گا۔

اس کو سوا لٹ کا جھٹکا لگا۔ اسے لگا آسمان گھونسنے لگا ہے یا وہ حواسوں میں نہیں وہ سر پکڑ کر بیٹھا تھا جب سیپ ہوئی۔

”کیا ہوا؟“ کافی دیر بعد جواب نہ آیا تو پوچھا گیا۔  
”کچھ نہیں۔ تھوڑا بڑی ہوں۔ بعد میں بات کرتا ہوں۔“ وہ فوراً سائن آؤٹ ہو گیا۔

ایمن حیران پریشان فیس بک میسج دیکھتی رہ گئی۔ آج سے پہلے اس نے اس ٹون میں کہاں میسج کیا تھا۔

.....☆☆☆.....

شاکر کی مصروفیت گھنٹوں سے دنوں پر محیط ہو گئی۔ تین دن گزر گئے لیکن اس کی جانب سے کوئی میسج نہ آیا۔ سارا سارا دن وہ فیس بک میسج چیک کرتی کہ شاید جواب آیا ہو۔ بار بار میسج کرتی لیکن میسج کو دیکھ کر بھی وہ کوئی رپلائی نہ کرتا۔ وہ مانتی بے آپ کی طرح تڑپ رہی تھی۔ بھوک



بار چلی گئی۔  
”پہلے یہ بتاؤ یہ کون سا طریقہ ہے بات کرنے کا؟“  
پوچھ ہی لیا۔

ایک خاموش کھڑی میز کا کونا کھرتی رہی۔ کیا کہتی  
کس کا نام لیتی اس کا جو پچھلے پانچ دن سے غائب تھا  
جواگ بھڑکا کر یوں خاموش بیٹھا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔  
”کیا ہوا؟“ وہ نرم پڑیں۔  
”وہ کہتا ہے کہ وہ اور میں میرا مطلب وہ کہتا ہے  
میری شادی اس سے ہوگی۔“ اس نے جھجک جھجک کر بات  
مکمل کی۔

”تو کیا غلط کہا اس نے۔“ صغیرہ نے اپنی تہاری پیدائش پر  
ہی کہہ دیا تھا کہ وہ چھپیں اپنی بہو بنائیں گی۔“ کھیرے کو  
پلیٹ میں رکھتے ہوئے یوں تو ایمن کا دل پل بھر کودھڑکا  
شاگرے دوری کے خیال نے اس کو ہلادیا۔  
”ہم دونوں میں ذرا بھی انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے۔  
آئی مین اس کو میری ہر بات سے اختلاف رہتا ہے، ہم  
دونوں کی سوچ الگ ہے۔“ اس نے ماں کو سمجھانے کی  
کوشش کی۔

”اس بات کی گارنٹی کہ جس سے تمہاری شادی ہوگی  
تمہاری اس سے انڈر اسٹینڈنگ ہوگی؟ دیکھو بیٹا ذہنی ہم  
آہنگی کے لیے ایک عرصہ چاہیے ہوتا ہے۔ اچھی زندگی  
گزارنے کے لیے سوچوں کا ملنا ضروری نہیں اور یہ بھی  
ضروری نہیں جس کی سوچ آپس میں ملتی ہو وہی اچھی زندگی  
گزار سکتے ہیں۔ دو متضاد سوچ رکھنے والے پہل بھی بہت  
اچھی زندگی گزارتے ہیں۔“ رقیہ بیگم نے اس کو قائل کرنے  
کی کوشش کی۔ زبردستی وہ بہر حال نہیں کر سکتی تھیں۔  
”میں نے اس کو اس نظر سے بھی نہیں دیکھا نہ سوچا۔“  
ایمن نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ماں کی باتیں اسے بہت حد  
تک درست لگیں۔

”تو اب سوچ لو۔ کوئی جلدی نہیں۔“  
”سوچنے کے بعد بھی دل نہ مانا تو؟“ اس نے پوچھا۔  
”میں زبردستی کی قائل نہیں ایکی یہاں نہ دل مانا تو  
کہیں اور تو کرنی ہی ہے شادی مگر تمہارے خدشات ہر  
رشتے پر لاگو ہوتے ہیں یا تو.....“ رقیہ بیگم نے بات  
ادھوری چھوڑ دی۔ ایمن کی سوالیہ نگاہوں کو وہ دیکھ چکی  
تھیں۔

”تو اب سوچ لو۔ کوئی جلدی نہیں۔“  
”سوچنے کے بعد بھی دل نہ مانا تو؟“ اس نے پوچھا۔  
”میں زبردستی کی قائل نہیں ایکی یہاں نہ دل مانا تو  
کہیں اور تو کرنی ہی ہے شادی مگر تمہارے خدشات ہر  
رشتے پر لاگو ہوتے ہیں یا تو.....“ رقیہ بیگم نے بات  
ادھوری چھوڑ دی۔ ایمن کی سوالیہ نگاہوں کو وہ دیکھ چکی  
تھیں۔

”تو اب سوچ لو۔ کوئی جلدی نہیں۔“  
”سوچنے کے بعد بھی دل نہ مانا تو؟“ اس نے پوچھا۔  
”میں زبردستی کی قائل نہیں ایکی یہاں نہ دل مانا تو  
کہیں اور تو کرنی ہی ہے شادی مگر تمہارے خدشات ہر  
رشتے پر لاگو ہوتے ہیں یا تو.....“ رقیہ بیگم نے بات  
ادھوری چھوڑ دی۔ ایمن کی سوالیہ نگاہوں کو وہ دیکھ چکی  
تھیں۔

”تو اب سوچ لو۔ کوئی جلدی نہیں۔“  
”سوچنے کے بعد بھی دل نہ مانا تو؟“ اس نے پوچھا۔  
”میں زبردستی کی قائل نہیں ایکی یہاں نہ دل مانا تو  
کہیں اور تو کرنی ہی ہے شادی مگر تمہارے خدشات ہر  
رشتے پر لاگو ہوتے ہیں یا تو.....“ رقیہ بیگم نے بات  
ادھوری چھوڑ دی۔ ایمن کی سوالیہ نگاہوں کو وہ دیکھ چکی  
تھیں۔

رنگت اور معمول سے ہٹ کر مل۔  
 ”شکر یہ بیگم صاحبہ۔“ صابر صاحب نے چائے کا  
 کپ پکڑتے ہوئے کہا وہ خاموش رہیں۔  
 ”کیا بات ہے؟ پریشان لگ رہی ہو؟“ جواب نہ پا کر  
 صابر افسانہ نے پوچھا۔

”ایم کی حرکتوں نے پریشان کر رکھا ہے۔“  
 ”کیا مطلب حرکتوں نے کیا ہوا؟ کوئی بات ہوئی  
 ہے؟“ رسالے سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔ ان کو لگا وہ بھر  
 شک کی بنا پر پریشان ہو رہی ہیں۔  
 ”آپ کو ان اخبارات اور رسالوں سے فرصت ملے تو  
 دیکھیں آپ کی بیٹی میں کتنی تبدیلیاں آچکی ہیں۔“ رقیہ بیگم  
 نے ان کے ہاتھ سے رسالہ لیا اور سائیز پر رکھا۔

”ارے ابھی تبدیلیاں تو وقت کے ساتھ ساتھ انسان  
 میں آتی جاتی ہیں۔ اب وہ ہمیشہ ایک ساتھ نہیں رہ سکتا۔“  
 ”کئی روز سے وہ پریشان لگ رہی ہے ابھی ابھی  
 ٹھیک سے کھا پی نہیں رہی۔ پرسوں میں نے کر لیے بنائے  
 تھے جو اس کو سخت ناپسند ہیں۔ مارکیٹ جانا تھا اس لیے اس  
 کے لیے کچھ اور بنا نہ سکی آپ جانتے ہیں اس نے چپ  
 چاپ کھانا کھا لیا۔ ورنہ وہ کتنا وادیلہ چالی گھی رات سو گیا  
 نے چار مضر ہادام والا دودھ دینے لگی اس نے چپ چاپ  
 پی لیا۔ وہ کبھی دیکھے بھی نہ پونا دور کی بات ہے۔“  
 ”یہ کوئی بڑی بات نہیں مجھے بھی بیگن پسند نہیں تھے پر  
 اب کھا لیتا ہوں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو خود کو بدل لیتے  
 ہیں۔“

”آپ میری بات سمجھ نہیں رہے یا سمجھنا نہیں چاہتے؟  
 ماں کی نظر گزور بھی ہو تو بھی وہ اولاد کی حرکات و سکنات  
 سے جان بیتی ہے کہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہے۔ آپ ہیں کہ  
 دلائل پر دلائل دیے جا رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ بغیر کسی  
 وجہ کے وہ کر لیے کھانا شروع کر دے، بغیر حیل و حجت ہادام  
 والا دودھ پی جائے۔ آپ کو بیگن نہیں پسند تھے لیکن میں  
 نے فورس کیا تو کھائے نہ؟“

”صاف صاف بات کرو۔ تم وہی کہنا چاہ رہی ہو جو  
 میں سمجھ رہا ہوں؟“

”جی جی سمجھے آپ خود دیکھیں اس کے پیچھے شروع  
 ہونے والے ہیں لیکن اس کی توجہ بڑھائی میں ہے ہی نہیں

چاہتی ہیں میں کیسے تمہارا نام لوں؟ کس حق سے لوں؟ تم  
 نے تو اس دن سے ہر لحاظ توڑ رکھا ہے۔ بیچ دیکھ کر جواب  
 نہیں دیتے ایک بار فیصلہ کر دو شکر میرے حق میں یا  
 میرے خلاف!“

کتنی دیر جواب کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ دو منٹ  
 پانچ منٹ گیارہ منٹ کرتے کرتے گھنٹہ گزر گیا۔ احساس  
 خراب ہوا جب دروازے پر دستک ہوئی جلدی سے سائن  
 آؤٹ کیا۔ موبائل سائیز پر رکھ کر کتاب کھول لی۔

”آپ کے لیے ہادام اور چاروں مضر والا دودھ بھیجا  
 ہے باقی نے۔“ سونیا نے دودھ سائیز ٹیبل پر رکھا اور کھڑی  
 رہی۔

”کیا ہوا کھڑی کیوں ہو؟“ ایمن کے کھڑے دیکھ  
 سوال کیا۔

”بی بی جی نے کہا آپ کو پلا کر ہی آؤں۔“  
 ”تم جاؤ میں پی لوں گی۔“ ایمن نے ٹالا۔ ول فیس  
 بک پر لگا ہوا تھا۔

”نہیں باجی میں ایسے نہیں جاسکتی۔“ سولہ سالہ سونیا  
 نے یوں گردن جھکا لی جیسے جرم کرتے پکڑی گئی ہو۔ ایمن  
 کو اس کی اس حرکت پر ہنسی آگئی۔

”تم بھی کمال کرتی ہو۔“ ایمن نے دودھ کا گلاس  
 ایک سانس میں خالی کیا اور اس کو تھما دیا سونیا حیران  
 پریشان خالی گلاس لے کر چلی گئی۔

☆☆☆

”بی بی جی آپ کہتی تھیں وہ ہادام والا دودھ نہیں پیتی۔  
 پر ایسی باجی نے تو گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔“  
 سونیا نے فاحشانہ انداز میں خالی گلاس رقیہ بیگم کو دکھایا۔

”بوتا خوش نہ ہو جھلی بندہ پریشان ہووے یا ابھمن دا  
 شکار ہووے تاں اولوں پئی نگہ او کی کر رہا ہے۔ پیہر ایں  
 نہ تہے اوتا پی لیتا ورنہ کدی منہ وی نہ لگاؤندی (زیادہ  
 خوش نہ ہو جھلی! جب بندہ پریشان ہو یا ابھمن کا شکار ہو تو  
 اسے پیہ نہیں چٹاؤ کہہ کر رہا ہے۔ پیہر ہیں نہ بھی پی لیا  
 ورنہ کبھی منہ بھی نہ لگاتیں) سیکھنے نے برتن دھوئے ہوئے  
 بیٹی سے کہا۔

رقیہ بیگم بہت کچھ نوٹ کر رہی تھیں، دیکھ رہی تھیں، سمجھ  
 رہی تھیں بیٹی کے چہرے پر پریشانی کے رنگ، اڑی اڑی



سارا وقت موبائل کے ساتھ چپکلی رہتی ہے جیسے قارون کا خزانہ نکالنا ہو۔“

”دیکھو رقیہ تمہاری بات اپنی جگہ درست غلطی بات کرنے میں ہے۔“

”میں نے پوچھا تھا۔“ ایسی سے کی گئی ساری بات بتا دی۔

”اچھا ہوا پھر کیا لیکن غلطی کر گئی موقع، جگہ اور طریقہ کار غلط خاتم نے ماں بن کر بات کی تھی۔ اب جاؤ اور دوست بن کر بات کرو، اعتماد، آرام و دُعا سے۔ اس کو اپنا اعتماد دو تاکہ وہ کسرٹ اہل ہو کر تم سے دل کی بات سمیٹ کرے۔“

”آپ شاید صحیح کہہ رہے ہیں مجھے طریقے سے بات کرنی چاہیے تھی۔“

”آپ خود کیوں نہیں بات کرتے؟ میرے رعب کی وجہ سے ممکن ہے وہ بتائے نہ۔“ انہوں نے سوچ کر کہا۔

”یہ بہتر ہے میں مناسب وقت دیکھ کر بات کرتا ہوں۔“

”ابھی کر لیں۔“

صابر احسن اشاعت میں سر ہلا کر ایمن کے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆.....

”تم شادی کر لو جہاں تمہارے جوش چاہتے ہیں۔“

شا کر کا غصہ جواب اس کو بے مول کر گیا۔

چنگاری جلا کر اٹھتے دھوئیں کا نظارہ کر رہا ہے کوئی

چلے آؤ چلے آؤ محبت سے کنارہ کر رہا ہے کوئی

”یہ کیسی محبت ہے؟ اپنے ہونے کا احساس ولا کر کہہ دینا کسی اور کی ہو جاؤ اتنی آسانی سے کہہ بھی کیسے دیا تم

نے؟ کیوں محبت کا احساس چنگا؟ کیوں میرے جذبات کے ساتھ کھیلے؟ کیوں مجھے کھڑے کھڑے بے مول کر دیا؟

آخر کیوں شا کر؟ کیا قصور تھا میرا؟“ ایمن کا ہر لفظ ہچکیاں لے کر رو رہا تھا، سسک رہا تھا، آہ و بکا کر رہا تھا مگر افسوس وہ کہاں دیکھ سکتا تھا، الفاظوں کو کوئی دیکھ سکا ہے بھلا؟ اس میں چھپا درد، دکھ، آسوس، شدت کرب و غم سمجھ سکتا ہے جو ویسے ایسی جذبات دکھتا ہو۔

”تمہاری محبت کی قدر کرتا ہوں سو ہیٹ پر سبز میں سے ویسی محبت کرتا ہوں جیسے اپنے سوشل میڈیا دوست سے۔ یہ وہ محبت نہیں جو تم نے بھی۔“ وہ اسے اب بھی فیر

بک آئی ڈی سے پکار رہا تھا یعنی اس کی زندگی میں ایمن کا وجود اب تک سو ہیٹ پر سبز ہی تھا نہ کہ ایمن صابر۔

”جذلوں کا اظہار شدت کیا تھا سب؟“ ایمن گنگ رہ گئی۔

”اُدھ کم آن بار اتم ایسے ری ایکٹ کر رہی ہو جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو تم بھی لڑکی ہر لڑکے کے ساتھ اور میرے جیسا ہر لڑکی کیساتھ ایسی باتیں کرتا ہے۔ اس ٹوٹ لاینگ ڈیٹ ٹوٹ ایمٹ آل۔“

ایمن کے تن بدن میں آگ لگ گئی شاکر نے اس کو ان لڑکیوں کی لائن میں لا کھڑا کیا جو لڑکوں سے بات کرنے کو برا سمجھتی ہیں نہ گناہ۔

”میں کئی بار اپنے اسٹیلٹس میں کہہ چکا ہوں یہ فیس بک کم لیک بک زیادہ ہے۔ لیک کا مطلب تو جھوٹی ہونہ ہر

بندہ لکھی ہے، چہرے پر چہرہ چڑھایا ہوا ہے جو دکھتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو ہے وہ نظر نہیں آتا۔“

”میں ایسی نہیں ہوں۔“ اس نے اپنا دفاع کیا۔

”مجھے کیا پتہ میں کون سا جہیں پر سکی جانتا ہوں سوائے

اس کے کہ تم راجیل کی کزن ہو۔“

ایمن کے سر پر جیسے بم گرا

”واٹ؟ پاؤڈر یا تو ہم۔“

”وہ میرا کو لیک ہے۔ اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں تمہیں مجبور رہی ہے بھی پیچھے ہٹ رہا ہوں ورنہ

میں دوستی توڑنے کا قائل نہیں۔“

”میں لعنت بھیجتی ہوں مرد عورت کی دوستی پر۔“ وہ بھر مچی۔

”ہائے۔“ شاکر نے جواب دیا۔ کرسی کی پشت پر سر رکھے وہ پرسکون ہو گیا۔ ایک بہت بڑا بوجھ اس کے سر سے اتر گیا میں لعنت بھیجتی ہوں مرد عورت کی دوستی پر ایمن کے

اس جملے نے اس کو اند تک سرشار کر دیا۔

ایمن نے لاگ آؤٹ کیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تیز لیل، اراٹوں کا خون، ٹھکرائے جانے کا احساس اسے اپنا آپ بے معنی، بے مول لگا سب آسوسوں میں

ہتے دیا۔

ہمارا رشتہ بدلنے والا ہے۔ ٹیک اٹھ سیر لیں۔“ کافی دیر بعد راجیل نے مخاطب کیا۔  
”وای خذ آئی۔“

راجیل کو لگا وہ دیوار بد تیزی سے ٹکریں مار رہا ہے جو انسان کو زخمی نہیں کرتی بلکہ بے عزت کرتی ہے۔  
”ہٹ دھری، ضد، اگر انسان کو توڑ دیتی ہے ایسی۔“  
”غلط! ایک دم غلط کہا انسان کو ان میں سے کچھ نہیں توڑتا نہ ہٹ دھری، نہ ضد اور نہ ہی اگر۔ انسان کو محبت توڑتی ہے صرف محبت۔“

”تم کسی کو پسند کرتی ہو؟“ راجیل کے پوچھنے پر امین خاموش رہی نظریں موبائل کی بند اسکرین پر گاڑھے وہ ذہنی طور پر کہیں اور مچی۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے ایسی جہیں کوئی اور پسند ہے؟“ اس نے راجیل کی طرف دیکھا کیا کچھ نہیں تھا اس کی آنکھوں میں خاموش محبت، اُن کی چاہت، پاکیزہ جذبوں کا ٹھانٹھا رہا سمندر پر اس کا لہجہ اس کی نظروں سے بالکل متضاد تھا۔ توڑنا سوال، خاموش شکوہ، ٹوٹا مان، شکستہ خواب، اُن کی دینی محبت کی بجھتی لو، امین اس کی نظروں کی تاب لاسکی نہ اس کے لہجے کی پیش کو برداشت کر پائی۔ چہرہ اس حد تک نیچے کر لیا جیسے زمین میں سما جانا چاہتی ہو۔ شاید وہ ڈرنے کی وجہ سے راجیل اس کی آنکھوں میں وہ سب نہ دیکھ لے جو اس نے راجیل کی آنکھوں میں اپنے لیے دیکھا مگر نہیں راجیل کی آنکھوں میں ایسا کچھ نہیں تھا جین امین۔ اس کی آنکھوں میں تھا ہی کیا؟ ٹوٹنے والی کی کرچیاں، مرجھائے جذبوں کی چپاں، مان و اعتماد کا بکھرا وجود، محبت کی تدلیل اور ٹھکرانے جانے کا غم اس نے ہار نہ مانی تھی شاکر سے بھربھات کر کے کا عزم لیے بیٹھی تھی اسے یقین دلانے کے لیے کہ وہ اور لڑکیوں کی طرح نہیں ہے مگر راجیل کی آمد نے سب ڈالو ڈول کر دیا۔

امین کی خاموشی اسے بہت کچھ سمجھا رہی تھی۔ راجیل کو وہاں کھڑا رہنا اپنی توہین لگا لے لے ڈگ بھرتا وہ چلا گیا آٹسو امین کی آنکھ سے نکلا اور ڈوٹے میں جذب ہو گیا۔  
راجیل کے جذبوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا اکاؤنٹ لاسن کیا۔ اپنی اور شاکر کی کنورسیشن دوبارہ پڑھنے بیٹھ گئی ایک ایک لفظ دل چیر رہا تھا۔ دل کو پھڑکیا، عزت

☆☆☆☆

جیسے ہی صابر الحسن اندر داخل ہوئے روتی ہوئی ایمن کو لکھ کر پریشان ہو گئے۔

”ایسی کیا ہوا بیٹا؟ کیوں رو رہی ہو؟“ اپنے ساتھ بٹاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے وہ سوئے جا رہی تھی۔ کبھی بھی تو کیا صابر نے اس کو رونے دیا کہ دل کا غبار ہلکا ہو۔

”میں ٹھیک ہوں ابو۔“ آنسو پونچھتے ہوئے ایمن نے نو دو کو سنبھالا۔

”میری ایک دوست کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ اس کو بہت پیار کرتے تھے۔ کیسے رہے گی یہ سوچ کر بس ل بھر گیا۔“ اس سے بہتر بہانہ کوئی نہ ملا۔

”اللہ ان کے درجات بلند فرمائے موت برحق ہے بیٹا۔ کوئی اپنے پیارے کو کھوتا نہیں چاہتا مگر سب کو جانا ہے ایک دن کہو تو ساتھ چلوں تمہارے۔“ ان کو یہ وقت مناسب نہ لگات بات کرنے کا۔

”نہیں ابو۔ میں برداشت نہیں کر سکوں گی اس کا رونا۔ پھر کسی دن چلی جاؤں گی۔ آرام کرنا چاہتی ہوں۔“  
”ٹھیک ہے تم آرام کرو۔“

”کیا بات ہوئی؟“ جیسے ہی صابر الحسن کمرے میں داخل ہوئے رقیہ بیگم نے فوراً پوچھا۔

”تم بھی حد کرتی ہو۔ بیٹھے دو۔“ صابر الحسن صوفے پر بیٹھے ہوئے بولے کھونٹ کھونٹ پانی پیا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بات نہ کرنے کی وجہ بتا دی۔

”اچھا کیا۔“ رقیہ بیگم نے کہا اور کپڑے الماری میں رکھنے کیلئے بڑھ گئیں۔

☆☆☆☆

”کیا کر رہی ہو۔“ موبائل پر چلتے ہاتھ پل بھر کر زکے۔

”نظر کمزور تو نہیں آپ کی دیکھ سکتے ہیں۔“ ہمیشگی طرح تروخ کر جواب دیا۔ راجیل ہنسا کچھ کہے اسے دیکھا رہا۔ امین انجان بنی اپنے آپ میں مگن رہی جیسے اس کے سوا وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔

”میں نے پہلے بھی کہا تھا اپنا طرز مخاطب بدل لو کیونکہ



نفس کو سائید پر رکھا، شعر لکھا اور سینڈ کر دیا۔

”تم سمجھتی کیوں نہیں یار۔“  
”تمہیں راجیل سے کیا خدشہ ہے آخر۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ٹرسٹ می۔“ اس نے یقین دہانی کرائی۔

”اوہ گاڈ! راجیل راجیل راجیل۔ یار مجھے راجیل کا ڈر خوف نہیں۔ وہ میرا کوئی گھمبیر ہے ڈش ایٹ کوئی باس نہیں جو اس سے ڈروں گا۔“

”پھر کیا مجبوری ہے۔“  
”تم تو پیچھے ہی پڑ گئی ہو میرے۔ برا ہوا جو تمہیں رپلائی کر بیٹھا۔“

”میں پیچھے بڑی ہوں؟ شاکر میرے پیچھے لگ کر تم نے مجھے محبت کا یقین دلایا اور جب میں نے تمہارے ساتھ قدم ملائے تو تم پیچھے ہٹ بیٹھے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ کیسی ڈشٹی کی ہے میرے ساتھ نہ دن میرے ہیں نہ راتیں تمہارا خیال، تمہاری باتیں، تمہاری سوچ، تمہاری.....“ ایمن کو اس کا طرز خطاب تو یں آئیز لگا۔

”انف! زائف۔ میں سب سے اس طرح کا ٹیسی مذاق کرتا ہوں۔ میرا اسٹینڈ دیکھ لو بلکہ وہ تو تم روز ہی دیکھتی ہو۔ پھر بھی مجھ سے شکوہ۔“ اس نے ایمن کی بات کاٹ کر بری طرح جھڑکا۔  
”ایک بات کا جواب دے دو۔“  
”پوچھو۔“

”کیا سب لڑکیوں سے محبت کا اظہار کرتے ہو؟ چاہت کے رنگ بکھیر کر ان کی زندگیاں بھی اسی طرح بے رونق کرتے ہو جیسے میری کی؟“ شاکر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔  
”ایمن اس کی محبت میں پور پور ڈوب چکی تھی۔“  
”نہیں۔“ اس میں ہمت نہ تھی مزید کچھ کہتا۔  
”پھر میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا؟“

”میں خود اظہار نہیں کرتا تھا۔ میرا ساتھ کچھ زیادہ کر گیا۔ یہ میری غلطی ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو لیکن میں تمہیں نہیں اپنا سکتا تم جہاں تمہارے والدین کہتے ہیں شادی کر لو۔ میرا ساتھ تمہیں کچھ نہیں دے گا سوائے بوارے کے اب بیچ مت کرنا تمہیں ان فریڈ کر رہا ہوں ٹیکہ کبیر۔ ہائے۔“ شاکر کا تفصیلی جواب اس پر منوں مٹی ڈال گیا وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ سر بیچ پر رکھے اپنی تذلیل پر ٹھکرائے جانے پر رو

اداسی روح کے اندر کہیں پر تمہارا نام لکھ کر رکھ گئی ہے محبت عزت نفس، انا، خودداری اور غیرت کو دیمک کی طرح یوں چاٹ جاتی ہے کہ کسی کو پانے کی چاہ انسان میں کچھ بھی کر جانے پر مجبور ہو جاتا ہے جھک جانے پر۔ ہار جانے پر۔ مگر ہار جیت کہاں معنی رکھتی ہے معنی رکھتی ہے تو محبوب کی چاہت۔ محبت کا جواب محبت سے ملے تو انسان خود کو ہوا میں اڑتا محسوس کرتا ہے، یوں لگتا ہے ساری دنیا اس کی دسترس میں آگئی ہو دل میں محبت کا بیج بو کر پانی نہ دیا جائے تو پودا مر جاتا ہے۔ احساس چاہت دلا کر کنارہ کر لیا جائے تو دل ہر شے سے کنارہ کر لیتا ہے، خوشی سے، آسودگی سے، خواہشوں سے یہاں تک کہ خود سے بھی۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا خود کو تنہا کر لیا پریشان حال، افسردہ، شکست کم مائیگی کا احساس کچھ کے لگا تا تو دل تڑپ جاتا۔

”بیچ سین ہوا لیکن جواب نہ دیا! شاکر یہ کیسی محبت ہے؟ کس چیز کا بدلہ لیا ہے مجھ سے؟ محبت کی آگ لگا کر خاموش بیٹھے ہیں بنا دیکھے کہ میرا وجود کس قدر جل گیا ہے جل کر خاکستر ہو گیا ہے راجیل میرا کزن ہے تو کیا ہوا یہ جان کر کہ وہ میرا کزن ہے کیا تمہاری محبت ختم ہو گئی ہے؟ جواب دو کچھ تو بولو۔“ دوبارہ بیچ سینڈ کیا۔

شاکر نے عجیب سا منہ بنا کر بیچ پڑھا۔ اسے کیا پتہ تھا جانے انجانے میں وہ ایک معصوم دل سے کھیل رہا ہے۔ وہ اس کھیل کا عادی بن چکا تھا۔ وہ اس سے بھی دل لگی کر رہا تھا جیسے سب سے کرتا تھا لیکن کوئی اس کو سیریس کہاں لیتی تھی مسکا لگاتا، تعریفیں کرتا، بچھ بچھ جانا اس کی عادت تھی لیکن اس بار یہ عادت اس کو بھی پڑ گئی تھی جو محبت کا طوق بن کر کسی کے گلے میں جھول رہی تھی۔

مٹی میں ملا دے کہ جدا ہو نہیں سکتا اب اس سے زیادہ میں ترا ہو نہیں سکتا ایمن نے بیچ دیکھا جس میں ہر بات واضح تھی لیکن وہ تو جیسے سمجھنے کو تیار ہی نہ تھی۔  
”کیوں نہیں ہو سکتے میرے؟“



”ہاجی جائے۔“ سونپاڑے لئے کھڑی رہی۔  
”لے جاؤ نہیں پائی۔“

”آپ نے ناشتہ نہیں کیا دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھایا شام کو لان میں بیٹھیں رو رہی تھیں۔ سب ٹھیک تو ہے ہاجی۔“ اسکول جانے کی وجہ سے اس کی اردو ماں کی نسبت کافی بھرتی لیکن لہجے میں پھالی بچ آجاتا تھا۔  
”اگر سب ٹھیک نہ ہوا تو کیا تم ٹھیک کر دو گی؟“ ایمن نے تنک کر پوچھا۔

”شاید کر دوں یا شاید کوئی پتے کی بات بتا دوں جس سے آپ کے وہ دھم منڈل ہو جائیں جو آپ سب سے چھپا رہی ہیں۔“ سونپاڑی بات پر ایمن نے چونک کر اس کو دیکھا جس کا چہرہ بہت کچھ بتا رہا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا میں کیا چھپا رہی ہوں سب سے۔“ ایمن کا لہجہ دم تھا لیکن غصے کا عنصر شامل تھا۔

”ہاجی۔“ سونپاڑے اس کا ہاتھ پکڑا ایمن نے اسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو میں سن رہی ہوں تم کہو۔

”آپ کو پتہ ہے اماں مجھے یہاں کیوں لاتی ہیں تاکہ میں گھر میں ایکی نہ رہوں ٹوٹی اور بڑو تو سارا لون ور کشاپ ہوتے ہیں اور میں اکیلی۔“

”پہلے بھی تو تم اکیلی رہتی تھی۔“ ایمن اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ پائی کہ وہ کہنا کیا چاہتی ہے۔

”پہلے بات اور تھی ہاجی۔“ ایمن نے ابھی نظروں سے دیکھا جیسے کہنے سے قاصر ہو۔

”ہاجی غور سے سننا۔ آپ کو ساری بات کی سمجھ لگ جائے گی۔“ سونپاڑی سمجھ گئی کہ وہ ابجمن کا شکار ہے۔

”میری دوست ٹڈل کلاس جیلی سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ اکثر میرے گھر پڑھنے آتی تھی ہم لوگ مل کر پڑھتے تھے بہت ذہن اسٹوڈنٹ تھی وہ اس کا بھرا (بھائی) دوہنی سے سب کیلئے گفٹ لایا تو اس کو بڑا والا موہا ہل دیا۔ وہ پہلے تو اتنا استعمال نہیں کرتی تھی براہستہ آہستہ وہ فون میں لگی رہتی۔ میرے گھر آ کر بھی وہ فون سے چلی رہتی جس کا نتیجہ اس کے گم گھبرا آنے کی صورت میں نکلا۔“

”تم جو کہنا چاہتی ہو وہ کہو۔“ ایمن اکثر مٹی سونپاڑی

ہاتھیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔

”وہی تو کہہ رہی ہوں آپ حوصلے سے سنیں تو۔ جائے نہیں ساتھ ساتھ۔“ ایمن نے جائے کا کپ اٹھالیا۔

”میں نے بہت کہا شانہ فون کا استعمال نہ کیا کرو تم فیل ہو جاؤ گی۔ اس نے میری ایک نہ سنی۔ آپ کو پتہ ہے جب وہ موہا ہل میں پڑی ہوئی تو اس کے چہرے کے تاثرات بدل جاتے، ہونٹوں پر مسکراہٹ رہتی، رنگ لال ہو جاتا

میں سمجھ گئی معاملہ کچھ اور ہے میں نے بہت سمجھا یا کہ وہ جس راستے پر چل رہی ہے وہ غلط ہے اس نے کہا وہ اس کا فیس بک کا دوست ہے، اس کو پسند کرتا ہے اس سے شادی کرے گا۔ مجھے اس کی تصویر دکھائی۔ کافی گورا چٹا لڑکا تھا۔ دیکھنے میں راجیل بھرا (بھائی) کی طرح اچھے گھر کا لگتا تھا۔ شانہ نے اپنی کتنی ہی تصویریں اس کو بھیجیں۔ یہ دھڑا

دھڑا۔ فون پر لمبی لمبی ہاتھیں ہونے لگیں گفٹس دینے لگ گیا۔ شانہ جھوٹ بولتی کہ دوست نے دیا ہے۔ میں نے کہا یہ غلط ہے، سب سراپ ہے، دھوکہ ہے، یہ لڑکے

وقت گزاری کے لیے دوست بناتے ہیں نہ کہ شادی کے لیے۔ اس نے میری ایک نہ مانی۔“ وہ سانس لینے کو رکھی ایمن کا دل لب ڈب کر رہا تھا اسے لگا سونپاڑے اسی کی کہانی بتا رہی ہو۔

”پھر۔“ سیکین کی خاموشی لمبی ہوئی تو ایمن نے پوچھا۔

”پھر کیا تھا ہاجی۔ شانہ نے اس کو زور دینا شروع کر دیا کہ شادی کے لیے ماں باپ کو گھر بھیجے کیونکہ شانہ کی نسبت بچپن سے اپنے تایا زادے سے ملے تھے۔ وہ لوگ کم عمری میں لڑکیوں کی شادی کر دیتے ہیں اس لیے لڑکے والوں نے

اس کے والدین کو کہا تعلیم چھوڑو شادی کا سوچو۔ اس لڑکے نے شانہ کو خوب سے عزت کیا کہا کہ ٹڈل کلاس ہو کر امیر گھر کے لڑکے جھانسنے کیلئے فیس بک استعمال کرتی ہو تم لوگ تاکہ گفٹ وغیرہ لو وہ تم بہت زیادہ اور قیمتی جیتی لے چکی ہو

اب جس سے مرضی شادی کرو۔ میرے پیچھے کیوں پڑی ہو شانہ نے خود کشی کی دھمکی دی تو کہتا تھا میری تصویریں فیس بک میں جگہ جگہ ڈال دوں گا دھمکی وغیرہ دی تو چپ چاپ

واپس پلٹ جاؤ شانہ ثرانی نے نیند کی گولیاں کھالیں اچھا ہوا بروقت بجا لاور نہ اس چندری نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی ماں باپ کو ڈھیل گرا لے کی۔ لوگوں نے ہاتھیں تو خوب بنائیں

نہیں

نہیں

نہیں

نہیں

نہیں

نہیں

نہیں



وہ کم عمر ہو کر اس کو محبت اور سراب کا فرق سمجھا سکتی تھی اس کا دل ہلکا ہو چکا تھا آہستہ آہستہ وہ نائل ہو گئی اور اپنی پہلی زندگی کی طرف لوٹ آئی نہ لوٹا تو اس کی شادی بے مول ہونے کا احساس اس کو اکثر تکلیف دیتا۔

”کیسے ہو رہے ہیں بھیر؟“ آتشکریم کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”بہت اچھے۔“ امین نے مسکرا کر کہا تو راحیل کو نہ صرف اپنی سماعت بلکہ بصارت کی کمزوری پر شبہ ہوا۔ امین اس کے ساتھ کس کر بات کر لے ناگھن۔

”اوڈیش گریٹ بیسٹ آف لگ۔“  
”تھینکس۔“ وہ دوبارہ اکناکس کے سوالوں میں گم ہو گئی۔  
”آتشکریم پھل ملتی۔“

”اوہ سوری۔“

”اس اوس کے تم تیاری کرو میں چلتا ہوں۔“ راحیل کیلئے اتنا کافی تھا کہ وہ نائل ہو گئی ہے مہلا آتشکریم اٹھا کر وہاں سے چلا گیا۔

.....☆☆.....

امین کی رضا مندی سے بھیر کے بعد رقیہ بیگم نے راحیل اور امین کی شادی کے دن رکھ دیے۔ شریل بھی اپنی وائف کے ساتھ پہنچ گیا تو رونق دو ہلا ہو گئی اس نے اپنی پسند سے شادی کی تھی اس لئے رقیہ بیگم اپنی بیٹی اور بھانجے کی شادی بہت دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھیں۔ سب ارمان پورے کرنا چاہتی تھیں۔ صابر امین کے کہنے پر شریل کا دعوت دینے بھی رکھ دیا تاکہ خاندان والوں کو ہاتھیں کرنے کا موقع نہ ملے۔

امین بچے دل کے ساتھ سب تیار ہاں کر رہی تھی شاکر راحیل کا کوئی تھا اور وہ انوائیڈ نہ ہو سکتی تھیں جیسے جیسے دن قریب آ رہے تھے اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی راحیل نے اس کے چہرے پر اضطراب دیکھا، اُن کبھی بے چینی جو ہر وقت اس کے وجود کا احاطہ کرتی تھی، لب کچھ کہنے کو تیار تھا۔ اسے لگتا وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں پا رہی۔

”ایمی۔“ ہاتھوں میں مد شدہ کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے کمرے تک جاتی امین پلٹی۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے آؤ پلیز۔“ اس کے

مگر پردہ دل ہی گیا اُچائی ماہ ہو گئے ہیں شادی کو۔“ سوچنا چپ ہو گئی امین سمجھ چکی تھی وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔

”اماں ڈر نہیں کہ میں گھر میں ایسی ایسی دیکھی باتیں نہ سوچوں خالی دماغ شیطان کا گھر بن جاتے ہیں اس لیے اس نے مجھے کہا کہ اسکول سے سیدھا کھانا آ جا یا کروں پھر رات کو ان کے ساتھ ہی گھر جاؤں۔“ امین نے کچھ نہ کہا چائے کے خالی کپ کو ہاتھ میں تھامے بیٹھی رہی۔

”ہاجی آپ جب بھی موہاں استعمال کرتی ہیں میرا دل ہول جاتا ہے۔ جب آپ مجھے ایسی باتیں نہیں بلکہ شانہ لگتی ہیں وہی مسکراہٹ، وہی ایکسپریشنز۔ میں آپ سے عمر میں چھوٹی ہوں ہاجی لیکن عقل کا تعلق عمر سے نہیں ہوتا۔“

”تم کہنا چاہتی ہو میں بے عقل ہوں۔“ امین نے پوچھا۔

”یہ جتنی محنت کا غول ہوتا ہے نہ ہاجی یہ بڑے سے بڑے عقلمند کو بے عقل بنادیتا ہے جیسے شانہ جیسی ذہین لڑکی کو بنایا۔ آپ بھی تو اسی مٹی کی بنی ایک لڑکی ہیں۔“

”محبت لگتی نہیں ہوتی سوچا۔“ امین کو محبت کیلئے یہ لفظ اچھا نہ لگا۔

”ہوتی ہے ہاجی بالکل ہوتی ہے جیسے شانہ کی محبت آپ کی محبت اس لڑکے کی محبت جس نے شانہ کو اپنی چاہت کا جھوٹا یقین دلایا اس لڑکے کی محبت جس نے آپ کو درغلا یا۔ اصلی محبت تو بہت پاکیزہ اور انمول ہوتی ہے ایسی ہاجی جس میں سب سے اہم چیز عزت ہوتی ہے، مان ہوتا ہے، اعتماد ہوتا ہے۔ بغیر ان کے محبت بھی محبت ہے مہلا سب سراب ہے۔“ امین کو وہ ماسی کی بیٹی کم ایک رہنما زیادہ لگی جو جھٹکتے ہوئے کوراستہ سمجھا رہی تھی۔

”تم جاؤ مجھے آرام کرنا ہے۔“

”جی ٹھیک امید کرتی ہوں جب انھیں گی تو وہی پرانی والی ایسی ہاجی ہوگی جتنی کھیتی۔“ فرے اٹھاتے ہوئے کہا تو ایسی کوشاںات میں سر ہلانا پڑا۔

.....☆☆.....

”اصلی محبت تو بہت پاکیزہ اور انمول ہوتی ہے ایسی ہاجی جس میں سب سے اہم چیز عزت ہوتی ہے، مان ہوتا ہے، اعتماد ہوتا ہے۔ بغیر ان کے محبت بھی محبت ہے مہلا۔“ سیکینہ کا ایک ایک لفظ امین کے دل پر بھاری بن کر برسنا تھا

ہاتھوں سے کپڑے لیکر کمرے تک لے گیا۔  
 ”تمہیں رکھ دوں۔“ بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”عزت کے ساتھ مخاطب کرنے کا شکریہ۔“ تفکر  
 جناب۔“ وہ تھوڑا سا جھکا۔  
 ”فلٹر کر رہے ہیں؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے  
 دیکھا۔

”نہ ہرگز نہیں اچھا لگا ان فیکٹ۔“  
 ”آپ کو کچھ کہنا تھا شاید۔“ ایمن اصل بات کی طرف  
 لائی۔

”شاید نہیں بھینا کہنا ہے۔ بلکہ کچھ باتوں کو کلیئر کرنا  
 بہت ضروری ہے تاکہ آنے والی زندگی خوشگوار بن سکے۔“  
 ایمن کا دل مضمی میں آگیا اسے لگا شاکر نے راجیل کو  
 سب بتا دیا ہے وہاں، مضمی سوچیں، عین ممکن راجیل کی  
 طرف سے ساری عمر کا طعنہ اسے اپنا گڑبڑ انا یاد آیا، عزت  
 نفس کو ایک طرف رکھ کر شاکر سے محبت کی بھیک مانگنا یاد  
 آیا، ذلت، رسوائی، کم مانگی!

”کیا تم پر خالہ جان نے شادی کے لیے دباؤ ڈالا  
 ہے؟“ وہ خاموش کھڑی ناخن کھرچتی رہی۔  
 ”دیکھو ایمن اگر تم خالہ جان کے دباؤ میں آ کر شادی  
 کے لیے راضی ہوئی ہو تو بتا دو میں خود منع کر دوں گا لیکن  
 زبردستی کی شادی ہرگز نہیں یہ چاروں کا ساتھ نہیں عمر بھر کی  
 بات ہے۔“

”مجھے کسی نے زور نہیں دیا۔ یہ سب میری مرضی اور  
 رضامندی سے ہو رہا ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔  
 ”مرضی و رضامندی کے ساتھ خوشی کا لفظ استعمال کرتی  
 تو مجھے سکون مل جاتا۔ بہر حال میرے لیے اتنا کافی ہے۔“

راجیل نے کہا اور چلا گیا ایمن کی جان میں جان آئی کہ وہ  
 شاکر والے معاملے سے لاعلم ہے۔ یعنی شاکر نے اس کو  
 نہیں بتایا شکر ہے بھرم رہ گیا۔

اس نے لیپ ٹاپ اٹھایا اور فیس بک اکاؤنٹ ڈی  
 ایکٹیوٹ کرنے کیلئے لاگن کیا غیر ارادی طور پر شاکر کی  
 پروفائل وزٹ کرنے لگی۔ ارد گرد سے بے خبر وہ اس کے  
 پراسٹیشن کو بڑھتی، کبھی تصویریں دیکھنے لگتی۔  
 ”اس کی تصویریں آپ کے پاس کہاں سے آئی باجی؟“

ایمن ایک دم ہڑبڑائی اور لیپ ٹاپ کا ڈھکن گرا دیا۔  
 آج اسے مایوں بیٹھنا تھا۔ شرنیل کی بیوی کنزیری بار



پاراس کو چھیڑتی تو وہ منہ نیچے کر لیتی کنزئی جسے شرم سمجھ رہی تھی وہ درحقیقت ایک ڈرتا تھا جب تک وہ راحیل سے بات نہ کر لیتی اس ڈر سے نجات نہ پاسکتی تھی۔

”بھابھی اب بس بھی کریں۔“ امین نے تھک کر کنزئی کو منع کیا۔

”سونیا ایک کام کرو گی پلیز۔“ جیسے ہی کنزئی کمرے سے گئی کپڑے استری کرتی سیکہ کو کہا۔

”کیوں نہیں۔“

”راحیل کو بلا دو۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے۔“

”شادی میں تین دن باقی ہیں باقی اتنی بھی کیا جلدی۔“ سونیائے جان بوجھ کر چھیڑا۔

”اچھا بلائی ہوں۔“ امین کو پریشان دیکھ کر کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

”آجائیں۔“ دستک پر فوراً جواب دیا۔

”تم نے بلوایا تھا۔“ راحیل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا امین کی نگاہیں جھک گئیں۔ غیر ارادی طور پر ہاتھوں کو سلنے لگی۔

”آپ میرے پاس آئے تھے کچھ کلیر کرنے اصولاً مجھے آنا چاہیے تھا بات کرنے کیلئے مگر سب گھر پر موجود ہیں اس لیے مناسب نہ لگا تو بلوایا۔“

”ہاں کہو کیا بات ہے؟“

”وہ راحیل بات یہ ہے کہ دراصل میں اس رشتے پر دل سے راضی ہوں۔ آپ کوئی ایسی ویسی بات.....“ اسے سمجھ نہ آئی کیسے بات شروع کرے۔

”تم بتا چکی ہو۔“ اس نے بات کاٹ کر کہا۔

”انچھو نیلی۔“ تھوڑا ڈرتے تھوڑا جھجکتے امین نے شروع سے آخر تک سب راحیل کو بتا دیا کئی بار لکھڑائی، کئی بار رکی لیکن راحیل کے حوصلہ افزاء رویے نے بات مکمل کرنے میں کافی مدد دی۔

”شکر ہے تمہیں جلدی احساس ہو گیا۔ ورنہ شاکر جیسے لوگوں سے کچھ بعید نہیں وہ لڑکیاں لٹو کی طرح بدلتا ہے اچھا دن تھا جب میرا کمپوٹر خراب ہوا اس کے سسٹم سے ڈیٹا لینا تھا ایم ڈی نے مجھے کہا کہ سسٹم فیکٹورنگ فولڈر سے ڈیٹا اٹھا لوں میں ڈیٹا اٹھا ہی رہا تھا کہ فیس بک پر بیچ آیا اور غلطی سے اوپن پر کلک ہو گیا مجھے جھکا لگا جب تمہاری تصویر

دیکھی۔ اپنا وہم سمجھا کیونکہ کچھ کافی چینی تھی لیکن تمہارے بیڈ ڈیزائن اور ٹیبل لیپ نے کنفرم کر دیا کہ آئی ایم نوٹ رائٹ۔“ راحیل چپ ہو گیا۔

”شاکر میرے سر پر ہی کھڑا تھا کافی غلٹ میں لگ رہا تھا۔ وہ بیچ شاکر نے نہیں میں نے کیا تھا کہ بڑی ہوں تب اس سے بات کی اور بتایا کہ تم میری کزن ہو لہذا آئندہ تم سے کوئی رابطہ نہ رکھے وغیرہ وغیرہ تھوڑا بہت دھمکی بھی دی کہ میرے چاچو کے دوست رینجز میں ہیں اگر بات نہ مانی تو اچھا نہ ہوگا اس لیے وہ پیچھے ہٹ گیا۔“

”تم نے صرف تصویر ہی دیکھی مم..... میرا.....“

”مطلب.....“

”تصویر دیکھ لینا ہی کافی تھا ای تم جیسی لڑکی کسی لڑکے کو ایسے ہی تصویر نہیں بھیج سکتی۔“

”آئی ایم سوری راحیل آئی نو آئی واز روئنگ میں سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اس کی چکنی باتوں نے مجھے باور کرایا کہ.....“ وہ رک گئی۔ راحیل سمجھ گیا وہ کہتا چاہتی ہے لہجے کی پختگی، آنکھوں کی نمی اس بات کی گواہ تھی کہ وہ سچ کہہ رہی ہے اور پشیمان ہے جو ہوا۔

”محبت صرف لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی بہر حال۔“

اپنے دل سے سارے خدشات نکال دو میں ان مردوں میں سے نہیں جو عورت کی کوئی بات پکڑ کر ساری عمر طعنہ دے وہ ایک غلطی تھی جو تم نے انجانے میں کی یا یوں کہہ لو انجانے میں ہوئی تمہیں احساس ہوا یہ بہت ہے۔“ راحیل کی بات اس کو اندر تک سرشار کر گئی اس کے دل سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

”میں کوشش کروں گی کہ ایک اچھی اور وفا شعار بیوی بن سکوں۔ سونیا کی شکر گزار ہوں جس نے میری رہنمائی کی۔“ امین نے دل سے کہا۔

”ڈیٹس لائیک آگڈ کرل۔“ راحیل نے کہا تو امین دل سے مسکرا دی یہ مسکراہٹ اس اعتماد کی معراج تھی جو اس کو بخشا گیا تھا۔



# ہمیں بیان کیسے کرو گے سلمان بشیر

قید میں سانس لیتا ایک بچہ جب جوان ہوتا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی ماں سے ملے اس کے ہاتھ سے روٹی کھائے لیکن جب وہ اپنی ماں کے پاس پہنچتا ہے تو خواہش ادھورہ رہ جاتی ہے۔

کبھی نہ بھولنے والی ایب اچھوتی تحریر

نہیں سیکھتے تھے اگر مانی کو نکال دیتے تو اس کی ماں بھی گھر سے چلی جاتی اور ان کے گھر کے ڈھیر سارے کام کرنے والا پیچھے کوئی نا بچتا۔ ان کو ایسے نوکر کی ضرورت تھی جس کو تنخواہ نا دینی پڑتی اور مانی کی ماں ان کے لیے سب سے بہترین انتخاب تھی۔

تین سال تک مانی کو جسمانی اور ذہنی طور پر مار چر کرنے کے بعد اس کے سوتیلے باپ نے اس کو سب کے سامنے پاگل ظاہر کر دیا۔

کھیتوں میں مانی سے سارا دن گرمی میں غلاموں کی طرح کام کرایا جاتا۔ کھانے کے نام پر آدمی روٹی دی جاتی۔ شکر کی جگہ مرچیں پیس کر دی جاتیں۔ گھر سے آئی کسی مانی کے لیے حرام قرار دے دی گئی۔ بات بات پر مار پڑتی۔ جھڑکیں سننے کو ملتیں۔

یہ سب سلوک اس کی ماں کو پتہ تھا مگر وہ خون کے آنسو پی جاتی۔

مانی کو ذہنی طور پر اس طرح اذیت دی گئی کہ وہ بیٹھے بیٹھے خود سے باتیں کرنے لگتا۔ اسے ہال اور جسم نوپنے لگ جاتا۔ کبھی زور زور سے روتا تو کبھی بلا وجہ ہنسنے لگ جاتا۔

پاگل پن کی وجہ سے اس کا داخلہ گھر کی حدود سے کاٹ کر باہر ڈیرے تک ہی رکھ دیا گیا تھا۔

مانی کا ذہنی توازن تب بگڑنا شروع ہوا جب اس کی جوان بیوہ ماں دوسری بار دلہن بن کر اس کو اپنے دوسرے شوہر یعنی مانی کے سوتیلے باپ کے گھر لے آئی۔ اس وقت عمران (مانی) کی عمر سات سال تھی۔ مانی ایک سہا ہوا سا معصوم بچہ تھا۔ ماں سے اس کو سب سے زیادہ محبت تھی۔ اس کا مرحوم باپ بھی اس کو بہت عزیز تھا مگر اب اس کی دنیا صرف ماں تھی۔

اس کی پیدائش اس کے نکضیاں میں ہوئی تھی۔ اسی لیے اسے اپنی نانی کا گاؤں بہت پیارا تھا۔ باپ کی وفات کے کچھ مہینے بعد اس کی ماں کو مجبوراً شادی کرنا پڑی۔ مانی جب اپنے سوتیلے باپ کے گھر لایا گیا تو اس کے ساتھ شروع سے ہی غلاموں کے جیسا سلوک کیا جانے لگا۔

اپنا باپ اپنا ہی ہوتا ہے۔ دوسرا کوئی بھی سکے باپ کی طرح پیار نہیں دے سکتا۔

اس کی ماں جانتی تھی کہ اس کے نئے سرال والے اس کے بیٹے کو اپنا نہیں سکتے۔ اسی لیے وہ مانی کو بات بات پر ٹوکتے تھے۔ غصہ کرتے تھے۔ سارا دن باہر کھیتوں میں کولہوں کے نیل کی طرح کام کراتے تھے۔

اس کے سوتیلے دونوں چچا اور باپ اس کو گھر سے نکالنا چاہتے تھے مگر وہ اس کی ماں کی وجہ سے اس کو نکال



# URDU TUBE

A HOME OF ENTERTAINMENT

آنگھوں اور منہ پر زور سے ہاتھ رکھ کر ایک انکشن لگایا۔  
کچھ لمبے کے بعد مانی بے ہوشی کی اندھیر گہری میں چلا  
گیا۔ نقاب پوش آدمیوں نے مانی کو چادر سے ڈھک کر  
ایک کار میں ڈالا اور وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئے۔ جب  
مانی دس سال کی عمر سے ٹھوڑا آگے قدم بڑھا چکا تھا۔  
وودن کے بعد ماں کو بیٹے کی گمشدگی کا علم ہوا تو اس  
نے رورو کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اپنے خاوند کو بہت برا  
بھلا کہا کہ یہ سب اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اسی کے ستم  
سب سے سب سے اس کا بیٹا گھر سے بھاگ گیا ہے۔  
مگر اسکو یہ نہیں پتہ تھا کہ مانی گھر سے بھاگ نہیں تھا۔  
بلکہ اس کی بولی لگا کر اسے بازار میں فروخت کر دیا  
گیا تھا۔ وہ سارا دن مانی کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہتی۔  
مانی کو اپنے ساتھ اس گھر میں لانے کے لئے خود کو کوستی۔

مانی پاگل نہیں تھا۔ مگر وہ کچھ سوچنے بھننے کی صلاحیت  
کو چکا تھا۔ اس پر ہونے ستم اس کو بخون ثابت کر چکے  
تھے۔

جب اس کی ماں ڈیرے پر اس کے لیے کھانا لے کر  
آتی تو وہ ماں کے گلے لگ کر خوب روتا۔ اس کی ماں کی  
گود میں اس کو بہت سکون ملتا تھا۔ اس کی ماں بھی اس کی  
حالت دیکھ کر روتی رہتی۔ اس کو اپنے ہاتھوں سے کھانا  
کھلانے کے بعد جب واپس جانے لگتی تو مانی اپنی ماں  
کے پیچ پکڑ لیتا۔ روتے ہوئے ماں سے لپٹ جاتا اور  
رکنے کا کہتا۔ مگر اس کی ماں کو بیٹے سے ملنے کے لیے جتنا  
وقت دیا جاتا وہ ختم ہو چکا ہوتا تھا۔

ایک دن مانی کھیتوں کے قریب ہی لگے برآمد کے پیڑ  
کے نیچے سو رہا تھا جب دو نقاب پوش آدمیوں نے اس کی

رہتی۔

☆☆☆.....

کچھ سو رہے تھے تو کچھ جسم پر لگے زخموں کی وجہ سے کراہ رہے تھے کچھ آنکھیں بند کر کے اپنے گھر بار اور والدین کو یاد کر رہے تھے تو کچھ اپنے گھر کے کھانے کو یاد کر رہے تھے۔

کسی کو اسکول جانے کی چاہ تھی تو کسی کو مرنے کی۔ مگر وہاں موت بھی نہیں ملتی تھی ہاں لیکن تکلیف ضرور ملتی تھی اور وہ بھی پیٹ بھر کر۔

دو مسلح افراد مانی کو اٹھا کر وہاں چھوڑ گئے۔ مانی اس وقت بھی بے ہوشی کی حالت میں تھا شاید اس کو بے ہوشی کی دوا زیادہ مقدار میں دی گئی تھی۔

ان تین لڑکوں کے درمیان مانی اکتیسواں لڑکا تھا جس کی زندگی اب تک بننے والی تھی۔

تہہ خانہ بہت بڑا تھا۔ دیواروں کے ساتھ موٹے شیشے کی طرح کی ایک اور دیوار بنی ہوئی تھی تاکہ آواز کہیں باہر نہ جا سکے۔ ویسے بھی وہاں اس دیرانے میں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مارتا تھا۔ وہاں کسی کی چیخ و پکار کسی دوسرے تک نہیں پہنچتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود احتیاط کی گئی تھا تاکہ کوئی مسئلہ درپیش نہ ہو۔

اس تہہ خانے کی مشرقی سیمنٹ سے بنی دیوار پر ایک زرد رنگ کا زیرو واٹ کا بلب ایسے سحر انگیزی طور پر روشن تھا جیسے کسی قبرستان میں کسی ادیب مدثر عرصے کی قبر پر کوئی دیا جلا دیا گیا ہو۔ مانی کو ہوش آ گیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی اس تہہ خانے میں جا گئے لڑکے مانی کی طرف لپکے۔ مانی اس خوفناک جگہ کو دیکھ کر حیرت کے مارے ڈرتے ہوئے کانپ رہا تھا۔ اس کے سامنے قیدی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے اور اس سے اس کے اغوا ہونے کی رواداد جاننے کی سعی کرنے لگے۔

کچھ تو ایسے تھے جن کو باہر کی دنیا دیکھے اک لمبا عرصہ بیت گیا تھا اور وہ اس سے باہر کی دنیا کے بارے میں پوچھنے لگے کہ اب باہر کی دنیا میں کیا کیا تبدیلیاں آ گئی ہیں۔

ایک گھنٹے کے بعد مانی جب کچھ سنبھلا تو اس نے بتایا

کہتے ہیں کہ وقت کے ساتھ دکھ کی شدت میں کمی آ جاتی ہے مگر یہ بات شاید مانی کی ماں کے لیے نہیں کہی گئی تھی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا تو ان تینوں مانی کی گمشدگی کا غم اس کی ماں کے دل میں چٹان کی طرح مضبوط ہوتا گیا۔ وہ بے چاری تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کا بیٹا کس دیس میں تھا۔ کیا کر رہا تھا۔ کچھ کھاتا بھی تھا یا نہیں۔

سارا دن کام کاج کے ساتھ وہ مانی کی واپسی کی دعا نہیں کرتی رہتی تھی۔ بیٹے کی جدائی کا دکھ اسے رفتہ رفتہ دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ مانی کی جدائی کے لمحے کسی آکاس نیل کی طرح اس کی ماں سے چٹے ہوئے اسے زہر آلود کر رہے تھے۔

وہ ایک گھنیری کالی رات تھی۔ ماحول پر اندھیری چادر کچھ ایسے بچھی ہوئی تھی کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

دو ہٹے کٹھے پٹھان موچھوں کو تاؤ دیتے پتھر ملی تاہم اور زمین پر ایسے چل رہے تھے جیسے وہ کوئی ہموار سڑک ہو اپنی زبان میں وہ ایک دوسرے سے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ ان سے کچھ گز بیچے ان کا ایک خاص ملازم ان کی کالی سیاہ کار کو آہستہ آہستہ چلا کر آگے کی طرف لا رہا تھا۔ کار کی روشنی میں پہاڑی علاقے کو باسانی دیکھا جاسکتا تھا۔ ہر طرف بڑے بڑے پتھر تھے۔ اس سے زیادہ رات کے وقت وہاں اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پہاڑی کے دوسری طرف ایک بڑی سے عمارت تھی۔ اس عمارت کے ایک کمرے کے نیچے سرنگ نما بہت بڑا ہال تھا۔ جس کے مختلف پورشن تھے۔

وہاں چھ سال سے لے کر پچیس سال تک کے لڑکے موجود تھے جن کے کپڑے مٹی سے اٹے ہوئے، بالوں میں گرد جھی ہوئی، چہرے اور جسم کے مختلف حصوں پر زخموں کے نشانات ان کی خوفناک جھلک دکھلا رہے تھے



کہ اس کو سوتے ہوئے مضبوطی سے پکڑ کر کچھ چھو یا گیا  
تھا اس کے بعد اس کو کچھ یاد نہیں۔  
اسے اپنی ماں یاد آنے لگی۔ ماں کی یاد آتے ہی وہ  
زور زور سے رونے لگا۔

وہاں سے آج تک کوئی بھی بھاگ کر نہیں جاسکا تھا۔  
اس کوشش میں کئی لڑکے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے  
تھے۔

وہاں کی زندگی موت سے بھی بدتر تھی اور وہاں کے  
لوگ موت کے فرشتوں جیسے۔

.....☆☆☆.....

اگلے دن مانی کو بھی باقی لڑکوں کے ساتھ کام پر لگادیا  
گیا۔ پتھر کاٹنے والا اوزار ہاتھوں میں تھام کر جب وہ  
پتھر پر مارتا تو اس کا سر خود پتھر پر لگنے کے قریب جا پہنچتا۔  
اس کے ساتھ ایک اس کا ہی ہم عمر مشقت کرتے ہوئے  
اس کو کہہ رہا تھا کہ دوست یہاں کام تو کرنا ہی پڑے گا  
اگر اس کام کی مار سے جان چھڑانے کے کوشش کرو گے تو  
کوڑوں کی مار لازمی سہنا پڑے گی اور یقین مانو وہ مار  
جان نکال لیتی ہے۔

اس کا نام شانی تھا اور وہ مانی کو کام کرنے کا کہہ کر  
اس کو سزا سے بچانا چاہتا تھا دو پہر تک مانی کے ہاتھوں  
میں چھالے بن گئے اور ان سے پانی نکل کر تیزاب کی  
طرح جلد کو جلانے لگا۔ مانی تکلیف کے باعث رونے  
لگا۔ اس کو روتا دیکھ کر ایک پٹھان چنگھاڑتا ہوا اس کے  
پاس آیا اور دوپٹھر اس کو رسید کر دیے۔ مانی کو تو دن میں  
ہی تارے نظر آنے لگے۔ ایک تو وہ تھکا ہوا تھا اور پر سے وہ  
دو بھاری پٹھر اس سے برداشت نہ ہوئے اور وہ بے ہوش  
ہو گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ اسی تہہ خانے میں لیٹا ہوا  
تھا۔ وہ زرد رنگ کا بلب ابھی تک جل رہا تھا۔ اس کے  
سر ہانے ایک برتن میں روٹی اور سالن پڑا تھا۔ اس نے  
کھانے کو دیکھا تو درد بھول کر اس کو پیٹ کا خیال آ گیا  
اور وہ بے صبروں کی طرح کھانا کھانے لگا۔ اس کو کھانسی آ  
گئی۔ تہہ خانے میں ایک بڑا تھا پانی کا کولر تھا جس میں  
شکر سے ٹھنڈا پانی ہوتا تھا۔ اس کے کھانسنے سے اس کے  
پاس سویا ہوا شانی جاگ گیا اور اٹھ کر اس کے لیے پانی کا

اس تہہ خانے میں بس اسی ایک چیز کی ہی تو آزادی  
تھی کہ کوئی جب چاہے جیسے چاہے اونچی آواز میں روسکتا  
تھا۔ ایک دوسرے سے غصے میں جھگڑ سکتا تھا کیونکہ وہ تہہ  
خانہ باہری دنیا کی نظروں سے اوجھل تھا اور اس کے کرم  
فرما بہت اونچی پستیاں تھے جن کے خلاف جانے کی کسی  
کی اوقات نہیں تھی۔ ان سب کے باوجود کسی کو کچھ نہیں  
پتہ تھا کہ اس ویرانے میں کیا کچھ ہوتا تھا۔ اس کی ایک  
اہم وجہ یہ بھی تھی وہ ویرانہ میلوں تک پھیلا ہوا تھا اور  
وہاں بس ان کی ہی حکومت تھی۔

اس تہہ خانے کا ایک اور بھی پورن تھا جس میں  
جوان لڑکیوں کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ ہر مہینے کی دس  
تاریخ کو کہیں سے ایک ہیلی کاپٹر وہاں آتا۔ لڑکیوں کو  
دیکھ کر ان کی بولی لگائی جاتی اور پھر ان کو فروخت کر کے  
اس ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر روانہ کر دیا جاتا تھا۔

کبھی کبھار لڑکوں کو بھی خرید لیا جاتا تھا۔ مگر ایسا کبھی  
کبھار ہی ہوتا تھا۔ وہاں موجود کبھی لڑکے سخت مشقت  
کرتے تھے۔ ان سے پتھروں کو کٹوانے کا کام لیا جاتا  
تھا۔ صبح سات سے لے کر دوپہر کے دو بجے تک بغیر کسی  
بریک کے ان سے غلاموں کی طرح کام لیا جاتا۔ کام  
میں سستی یا لا پرواہی دکھانے والے پر کوڑے برسائے  
جاتے۔ سزا کے معاملے میں کوئی نرمی نا برتی جاتی۔ اس  
ویرانے کے چاروں طرف بجلی کی تاروں کی دیوار بنائی  
ہوئی تھی تاکہ کوئی راہ فرار نا اختیار کر سکے۔ اس کے علاوہ  
وہاں ہر وقت تین سے چار مسلح پٹھان ان کی نگرانی پر  
تعینات ہوتے۔ ویرانے کے آخری کونے پر جنوب کی  
جانب اس بجلی والی تاروں کے پرے ایک گھنا جنگل تھا۔  
جنگل کے درمیان میں ایک گہری ندی تھی۔ ندی کے  
دوسری جانب بھی جنگل تھا جو نا جانے کتنے میل تک پھیلا

گلاس بھر لایا۔ مانی نے پانی پیا اور گلاس شانی کو پکڑا دیا۔ شانی تب تک خاموش بیٹھا مانی کو دیکھتا رہا جب تک کہ مانی نے کھانا ختم کر کے برتن سائینڈ نہ نہیں رکھ دیے۔ پیٹ میں روشنی بڑھتے ہی اسے اپنے ہاتھ پر بنے چھالوں سے اشتی ٹیسوں کا خیال آ گیا اور وہ خاموش آواز میں رونے لگا۔ یہ تو اس کی قسمت تھی۔ یہ دن تو اس کے کھیلنے کودنے کے تھے لیکن اسے یہاں جانوروں کی طرح کام کرنا پڑ رہا تھا۔

.....☆☆..... پہلے چند دن تو مانی روتا کرتا رہا مگر پھر بھی اس سے پورا کام لیا جاتا دن میں کئی بار اس کو سزا دی جاتی۔

یہ کہنا غلط نا ہو گا کہ بہت کم عرصے میں سب سے زیادہ ٹکٹفیس مانی کو ہی سہتا پڑی تھیں سبھی لڑکے اس کو پٹا دیکھ کر افسوس کرتے رہتے عجیب بات تھی کہ اب اسے مار کی عادت ہو گئی تھی وہ اب کبھی روتا بھی نہیں تھا۔

جو پٹھان اس کو مارتا تھا وہ اس کو اطمینان سے مار کھاتا دیکھ کر اور غصے سے مارنا شروع ہو جاتا۔ مانی کے پورے جسم پر زخموں کے نشان کم اور خیمے زیادہ تھے اس کا جسم اس زمین کی طرح تھا جس پر دن میں کئی بار بل چلا کر اس کا سینہ پھاڑا جاتا تھا۔

وہ مہینے کی دس تاریخ تھی۔ مہینہ کون سا تھا اس علم نہیں لیکن وہ سردیوں کے دن تھے شاید نومبر سے فروری تک کا کوئی مہینہ ہو گا۔ اچانک فضا میں کسی کی چٹکھاڑ کی آواز سنائی دینے لگی۔ مانی نے وہ آواز زندگی میں پہلی بار سنی تھی۔ اس کے ساتھ لیٹے شانی نے بتایا کہ یہ بلی کا پٹر کی آواز ہے اور آج وہ پھر سے لڑکیوں کو خریدنے آئے ہیں۔

اچانک خیمہ کا مرکزی دروازہ زور سے کھلا اور دو بچے کئے پٹھان اندر داخل ہوئے۔ مانی نے ان کو پہلی بار دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ لمبے لمبے چونچوں میں ملبوس لمبے چوڑے آدمی تھے۔ شکل صورت سے وہ یہاں کے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی ایک پٹھان جلدی سے خیمہ کی شمالی دیوار کی جانب لپکا۔ وہاں ایک چور دروازہ تھا جو مانی کی نظروں سے اب تک اونچل تھا۔ وہاں سے دس لڑکیوں کو باہر لایا گیا۔ شاید لڑکیوں کو بہت توجہ سے وہاں رکھا جاتا تھا بھی تو ان کی

”دیکھ مانی! تو چاہے جتنا بھی رو لے، جتنا مرضی کر لے یہ لوگ تجھ پر نا تو ترس کھائیں گے نا کوئی رحم کریں گے اور یہاں سے بھاگنے کی سوچنا بھی مت یہ لوگ جان نکال دیں گے تمہاری۔ بھاگنے کے چکر میں کئی لڑکے اب اگلے جہان پہنچ چکے ہیں یہاں بس ان کی ہی حکومت ہے۔ یہ جگہ لوگوں کی نظروں سے اونچل ہے۔ یہ سارا علاقہ ان کا ہے اور یہ یہاں کے بادشاہ ہیں ایسے بادشاہ جو اپنی رعایا پر کوئی ترس نہیں کھاتے۔ اگر جینا چاہتے ہو تو بس جو کہتے ہیں کرتے جاؤ جیسا دیتے ہیں کھاتے جاؤ اگر قسمت میں لکھا ہو تو ہم واپس اپنے گھر ضرور جائیں گے اگر نہیں؟ تو پھر کتے کی موت مرنے سے بہتر ہے یہاں انسانوں کی موت مرا جائے میں یہ سب تم کو اس لیے بتا رہا ہوں اس لیے سمجھا رہا ہوں کیونکہ تم ابھی نئے آئے ہو گھر بار یاد کرتے ہوں گے یاد رکھنا یہاں وہی جی سکتا ہے جو خود کو مٹا دے۔ یہاں تمہارے جذبات مٹی کے بھاء بھی نہیں بکلیں گے۔“

شانسی کسی اعلیٰ درجے کے فلاسفر کی طرح مانی کو سمجھا رہا تھا۔ مانی کا ہم عمر شانی کچی عمر میں تکالیف سہہ سہہ کر دانا انسان بن گیا تھا۔ وہ بزرگ کی طرح باتیں کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہاں موجود سبھی لڑکوں میں سے شانی سب سے کم عمر اور سب سے سمجھدار بچہ تھا۔ وہ انتہائی درجے کا صبر والا تھا۔ شاید باقی سبھی لڑکے بھی اب صبر کا کلمہ پڑھ کر مضبوط ہو گئے تھے۔



صحت اور حسن و خوبصورتی قائم تھی۔

اس کے سامنے اس کے کچھ ساتھی موت کی نیند سو کر اس دوزخ بھری زندگی سے آزاد ہو گئے تھے۔ مانی کے چہرے پر دازخی اور مونچھیں اگ آئی تھیں۔ شانی بھی جوان ہو گیا تھا۔

بہت سے پرانے لڑکے تبدیل ہو گئے تھے کچھ کوچ دیا گیا تھا تو کچھ کو کسی نئی جگہ بھیج دیا گیا تھا اب مانی اور شانی ہی دو سب سے پرانے لڑکے رہ گئے تھے پرانے پٹھان نگران ہٹا کر کچھ نئے رکھ لیے گئے تھے لیکن نئے نگرانوں میں ایک آدمی جس کی عمر چالیس کے قریب ہو گئی، پٹھان نہیں تھا وہ شاید پنجابی تھا۔

کام کے دوران بھی مانی نے نوٹ کیا کہ وہ اتنا سخت نہیں تھا۔ بس دبدبے کو برقرار رکھنے کی خاطر وہ غصہ کر لیتا تھا مگر اس نے اتنے دنوں میں کسی کو ایک تھپڑ بھی نہیں مارا تھا۔ شاید وہ کسی کو درد نہیں دینا چاہتا تھا یا وجہ کچھ اور تھی۔

نجانے کتنا ہی عرصہ گزر گیا تھا مانی کو وہاں آئے ہوئے۔ اسے مبینے سالوں کا اتنا نہیں پتہ تھا۔ بس یہ جانتا تھا کہ اس نے گیارہ سردیاں اس ویرانے میں گزار دی تھیں۔ ماضی کے اکثر لمحات اس کے ذہن سے مٹ چکے تھے۔ بس کچھ نئی چنی چیزیں ہی اس کو یاد تھیں۔ ان چیزوں میں اول نمبر پر اس کی ”ماں“ تھی۔

اپنی ماں کا چہرہ اس کو کسی خواب کی طرح یاد تھا مگر اس کی آواز اس کی آواز اس کو ہر بل اپنے اندر سے آتی سنائی دیتی رہتی تھی۔ وہ اس آواز کو نہیں بھولا تھا۔

ایک رات جب سب سو گئے تو مانی نے پہلی بار ہمت کر کے وہ لڑکیوں والے پورشن کا چور دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس دروازے پر ایک لاک لگا ہوا تھا۔ اور لاک کس طرح کھولنا ہے یہ مانی کو ابھی سے پتہ تھا۔

لڑکیوں کے کمرے میں داخل ہو کر وہ وہیں رک گیا۔ کمرے میں زمیں پر بستر لگے ہوئے تھے۔ تمام کے تمام صاف ستھرے تھے۔ ایک کونے میں پانی کا کولر اور دیوار پر مخصوص زرد رنگ کا زیرو واٹ بلب اپنی

وہ بھی ڈری ڈری سی کھڑی ہوئیں اپنی قسمت کو کوس رہی تھیں پھر کچھ دیر کے بعد ان میں سے پانچ کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ ان آدمیوں نے پٹھانوں سے خوشی سے ہاتھ ملایا اور ایک بڑا سا بریف کیس ان کے ہاتھوں میں تھما کر باہر نکل گئے۔ ان پانچ لڑکیوں کو فوراً باہر نکال کر نجانے کہاں لے جایا گیا شانی کے بقول وہ ان لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے کر جانے والے ہیں اور آج کے بعد وہ لڑکیاں یہاں دوبارہ نظر نہیں آئیں گی۔ باقی پانچ کو دوبارہ اسی چور دروازے سے اندر بھیج دیا گیا۔ مانی اس پٹھان کی ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کے ہر عمل کو ذہن نشین کر رہا تھا۔ شانی نے بتایا کہ وہ لوگ ان لڑکیوں کو تباہ کھانا وغیرہ دیتے ہیں جب ہم یہاں نہیں ہوتے اور ان لڑکیوں سے کوئی کام بھی نہیں لیا جاتا۔ بس ان کو قید میں رکھ کر ان کو اچھا کھانا دیا جاتا ہے اور ان کی صحت کا اچھے سے خیال رکھا جاتا ہے۔ شانی کو وہاں تین سال ہو گئے تھے اسی لیے وہ ہر چیز کو اچھے سے جانتا تھا یا شاید اس نے خفیہ طور پر ہر راز کو جان لیا تھا۔

مانی اکثر رات کو جب سو جاتے تو اپنی ماں اور اپنے گاؤں کو یاد کر کے روتا رہتا تھا۔ اسے اپنے سوتیلے باپ اور چچاؤں کے ظلم و ستم اچھے سے یاد تھے۔ وہ ایک کھائی سے نکل کر دوسرے کنویں میں گر گیا تھا۔ اس کھائی میں ایک سہولت تو اسے میسر تھی کہ وہ اپنی ماں سے کبھی کبھار مل لیتا تھا اس کو دیکھ لیتا تھا اس سے باتیں کر لیتا تھا مگر اس تاریک کنویں میں اس کو اگر اپنی ماں کا خواب بھی آتا تو وہ شدید تاریکی کی وجہ سے اپنی ماں کو دیکھ بھی نہیں پاتا تھا مگر اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے گا اپنی ماں سے ضرور ملے گا وہ بے چاری تو اس کی یاد میں سوتی بھی نا ہوگی۔ نیند تو مانی کو بھی اتنی نہیں آتی تھی۔ کبھی کسی خواب سے ڈرتا تو کبھی اپنی حالت کے پیش نظر درد کو سہتے ہوئے نیند سے بری ہو جاتا۔

مانی کو وہاں بہت عرصہ گزر گیا تھا۔

مخصوص سحر انگیز روشنی بکھیر رہا تھا۔

”دکرتا ہے۔ کیوں نہیں کرتا۔ بھلا یہاں کون رہنا چاہے گا۔ یہاں تو سانس بھی نہیں لیا جاتا۔ ہر بل موت مانتے مگر زور جاتا ہے مگر یہاں سے باہر جانا ایک خواب کے سوا کچھ نہیں ہے۔“

کچھ لڑکیاں جاگ رہی تھیں کمرے میں کسی مرد کو دیکھ کر فوراً سے ایک ساتھ چپک کر بیٹھ گئیں۔ مانی کمرے کے دروازے کے پاس کھڑا تھا وہاں روشنی کم تھی اسی لیے اس کا چہرہ کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا۔

”خواب کو حقیقت بنایا جاسکتا ہے۔ بس ہمت کرنی ہوگی۔ تم لوگوں کو بھی اور ہمیں بھی اگر یہاں سے نکلنا ہے تو موت کا ڈر ختم کر دو۔ میں نے بہت مہینوں سے ایک پلان بنا رکھا ہے۔ اس پلان کو حتمی شکل دینے کے لیے مجھے کئی دن رات کو جاگنا پڑا سب لوگوں کے اوقات کار کو سمجھنا پڑا۔ اب جا کر کچھ سمجھ آئی ہے میرا پلان کامیاب ہو سکتا ہے مگر اس میں رسک ہے۔ میں تو اپنی زندگی کا جوا کھیلنے والا ہوں جیسا تو پھر سے اپنوں سے مل سکوں گا اپنے بھی صرف ایک کی گنتی سے شروع ہو کر ایک پر ہی ختم ہو جاتے ہیں۔“ مانی نے ان لڑکیوں کو اپنا سارا پلان سمجھا دیا۔

مانی آہستہ سے چلتا ہوا ان کے قریب چلا گیا۔ ان لڑکیوں میں سے دو ایسی تھیں جن کو مانی نے کئی بار دیکھا تھا جب لڑکیوں کی بولی لگ رہی ہوتی۔ وہ بھی شاید مانی کے چہرے سے آشنا تھیں اسی لیے وہ تھوڑی نارمل ہو گئیں۔ اب ان کے چہرے پر ڈر کی بجائے حیرت تھی۔

کبھی کے ذہنوں میں کئی سوال گردش کر رہے تھے۔ سب سے بڑا اور اہم سوال یہ تھا کہ وہ یہاں اس کمرے میں کیسے آیا؟ خود آیا اسے بھیجا گیا تھا اگر خود آیا تھا تو اس کا مقصد کیا تھا۔

پھر مانی چپکے سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل کر اپنے بستر پر لیٹ گیا کسی کو اس بات کی کانوں کان خبر تک نہیں ہوئی۔

مانی ان کبھی کے الجھن سے بھرے چہرے دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ ان کے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔ مانی خود ہی گویا ہوا

”تہہ خانے سے باہر یعنی اوپری منزل پر گارڈز کا ایک کمرہ تھا۔ جہاں ایک گارڈ نیند میں مدھوش لیٹا ہوتا مانی جانتا تھا کہ وہ اکیلا یہ سب نہیں کر سکتا۔ اسے تہہ خانے سے باہر نکلنے اور ویرانے کی بجلی والی تاروں کو پار کرنے کے لیے کسی باہر والے آدمی کی ضرورت تھی۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم سبھی کیا سوچ رہی ہو میں یہاں بہت مشکل سے آیا ہوں اس کمرے کے اندر آنے میں مجھے کئی سال لگ گئے بہت ہمت کر کے آج یہاں آنے کا جوا کھیلا ہے میں جانتا ہوں کہ اگر پکڑا گیا تو موت کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ مگر یہاں رہنا بھی موت سے کم تھوڑی ہے۔“

کچھ دنوں تک مانی اس پنجابی گارڈ کے ارد گرد کام کرتا رہا۔ وہ گارڈ اس سے کبھی کبھار بات کر لیتا تھا۔

مانی دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا تا کہ اس کی آواز باہر نہ جاسکے۔

ایک دن مانی نے پتھر توڑتے ہوئے اس سے سوال کیا کہ ”آپ کے کتنے بچے ہیں؟“ اس نے حیرت سے مانی کو دیکھا۔ مانی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا سوائے جواب لینے کی چاہت کے۔

”مگر تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ وہاں موجود سب سے پرانی لڑکی نے سوال کیا۔

”کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو ایسا؟“ گارڈ نے حیرت سے مانی سے سوال کیا۔

”میں بس دیکھنا چاہتا تھا کہ یہاں کیا ہوتا ہے تم کو کیسے رکھا جاتا ہے۔ کیا تم لوگوں کا یہاں سے بھاگ جانے کا دل نہیں کرتا؟“ مانی سوال بدل کر دوسری طرف آگیا۔

”بس ویسے ہی پوچھا ہے۔ نہیں بتانا چاہتے تو کوئی



بات نہیں۔“

”دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔“ پنجابی نے فوراً سے بتایا۔

”کیا عمر ہے ان کی اور کیا کرتے ہیں وہ؟“

مانی نے اگلا سوال پتھر کو کوٹتے ہوئے کیا تاکہ باقی گارڈز کو ان کی گفتگو کا شک نہ ہو۔

”دونوں بیٹے جڑواں ہیں سترہ سترہ سال کے اور بیٹیاں بارہ اور دس سال کی ہیں۔“

”اگر وہ گھر کی بجائے اس دیرانے میں ہوں اور ہماری طرح یہاں مشقت کر رہے ہوں ہماری طرح ان پر چابک برس رہے ہوں ہماری طرح ان کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہوں اور ان سے رات کو سویا بھی نا جائے وہ بات بات پر رونے لگ جائیں اور اپنے گھر والوں کو یاد کریں مگر آپ لوگوں کو یہ بھی ناپتا ہو کہ وہ کہاں ہیں تو آپ کو کیا لگے گا؟“

مانی کے سوال نے اس گارڈ کو غصہ دلوا دیا تھا پہلی بار اس نے کسی کو مارا تھا اور خوب مارا تھا۔ مانی کے جسم سے خون رسنے لگا۔ لیکن مانی کی آنکھوں میں ایک بوند بھی آنسو نہیں آئے۔ کبھی لوگ مانی کی ہمت اور صبر سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مانی کے منہ سے ایک کراہ بھی نہیں نکلے گی۔

رات کو مانی سے اپنی کمر بستر پر بھی نہیں ٹکائی گئی۔ شانی بھی اس کے ساتھ جا گتا رہا۔ شانی نے پوچھا کہ اس نے ایسا کیا کیا تھا جو اس گارڈ نے تم پر اتنا تشدد کیا حالانکہ اس نے تو آج تک کسی پر ہاتھ بھی نہیں اٹھایا تھا۔ ”آئینہ دکھایا تھا اس کو شانی اپنی مکروہ شکل اس سے دیکھی نہیں گئی اسی لیے بے لگام گھوڑے کی طرح جاؤ لہ ہو گیا۔“ مانی نے ہلکے سے مسکرا کر کہا تو شانی بولا۔

”یاد تم بھی عجیب انسان ہو۔ اتنی مار کھا کر بھی ہنس رہے ہو۔“

”شانی یار یہ مار تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ مار تو اس مار کے مقابلے کچھ بھی نہیں ہے جو میری روح پر پڑی ہے۔“

یہ خون ان آنسوؤں کے مقابلے پانی سے بھی کم تر ہے جو میں نے اپنی ماں سے جدا ہونے پر بہائے تھے۔ زخم گہرے لگ جائیں تو جسم خاموش ہو جاتے ہیں اور روحیں بات کرتی ہیں۔

”یار شانی تم کو تیرے ماں باپ نہیں یاد آتے؟“ مانی نے بات کو بدلتے ہوئے سوال کیا۔

”صحرا سے یہ پوچھنا کہ اسے بارش کی طلب ہے یا نہیں؟ بالکل غلط سوال ہے پیارے۔“

”والدین کی یاد کس کو نہیں آتی؟ بہت یاد آتی ہے یار اب تو ان کی شکلیں بھی یاد نہیں سات سال سے اوپر کا تھا جب یہاں لایا گیا تھا۔ نجانے کتنے موسم گزر گئے ہیں۔ چندرہ سولہ سال تو گزر رہی گئی ہوں گے۔ نجانے وہ اب کیسے ہوں گے؟ میری جدائی انہوں نے کیسے بھی ہوگی؟ ماں نے تو بیچ بیچ کر آسمان سر ہی اٹھالیا ہوگا۔ اب تھوڑے خاموش اور بھاری طبیعت والے تھے مگر وہ بھی تنہائی میں رونے ضرور ہوں گے۔ بھائی بہن تو کوئی اور تھا نہیں۔ بس ایک دو محلے کے دوست تھے۔ اب تو ان کی شادیاں ہو گئی ہوں گی۔ بال بچے والے ہوں گے اب تو مگر یار مانی انہوں نے بھی میری کمی محسوس کی ہوگی۔“

شانی نے اپنے گالوں پہ تیرتے آنسوؤں کو قمیض کی پشت سے صاف کیا۔ ”صحیح کہتے ہو یار شانی۔ والدین کس کو یاد نہیں آتے۔ میری ماں کا میرے بغیر جو حال ہوا ہو گا وہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ بہت روئی ہوگی وہ ہر ایک سے میرے لیے جھکڑی ہوگی۔ دوپہر کو جب کسی کی فرمائش پر میٹھی روٹی بنائی ہوگی تو میری اسے کتنی یاد آتی ہوگی۔ میں جہاں سوتا تھا وہاں گھنٹوں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتی ہو گی۔ دوست تو کوئی تھا نہیں میرا۔ جو مجھے یاد کرتا۔ وہاں بھی جہنم تھی اور یہاں بھی مگر یار وہاں کی جہنم کی آگ میری ماں کے آچل کی ہو اسر دکر دیتی تھی۔ وہ میرے ہر درد کی دوا تھی۔ اب زخم تو بہت ہیں مگر ان پر رحم رکھنے والی وہ ماں نہیں نظر آتی آنکھیں نیند سے بوجھل ہیں مگر وہ

کی۔“

مانی کا دکھ آج حد سے سوا ہو گیا تھا۔ آج اس کو ماضی کسی پتنگ کی ڈور کی طرح پیچھے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس رات کوئی بھی نہیں سو سکا تھا۔ سب مانی کے ارد گرد بیٹھے رہے اور باری باری اپنی زندگی کی کہانی سناتے رہے۔ سب کی پکلیں بار بار نم ہوئیں۔ بہت سے کندھے ہجک گئے۔

.....☆☆.....

کئی دن اور بیت گئے۔

وہ پنجابی اس دن کے بعد وہاں نہیں آیا تھا شاید اس کا کہیں اور تبادلہ کر دیا گیا تھا مگر اس کا کوئی متبادل بھی تو نہیں آیا تھا۔

کون جانتا تھا کہ وہ پنجابی گاڑ مانی کی باتیں برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ مانی اور باقی قیدی لڑکوں میں اسے اپنی اولاد نظر آ رہی تھی۔ مانی کے سوالوں کے جواب وہ کس منہ سے دیتا۔

کئی دن اور گزر گئے پھر ایک دھندلی رات میں آسمان سے ایک اور پہلی کا پتہ اتر آ اور آٹھ لڑکیوں کی بولی لگا کر انہیں خرید کر اپنے ساتھ لے گیا۔

اس رات وہیں مانی نے ایک پٹھان کو دوسرے پٹھان سے اس سب سے پرانی قیدی لڑکی کے بارے میں کہتے سنا تھا کہ اب اس کا پتہ صاف کرنا پڑے گا سالی کمینہ کو کئی سال ہو گئے مفت کی روٹیاں توڑتے مگر اس کو آج تک کوئی خرید کر نہیں لے گیا۔ ایک نے کہا کہ اس کو ہم اپنے شغل کے لیے رکھ لیتے ہیں۔ ویسے نامی تو چلو ایسے ہی پیسے پورے کر لیتے ہیں۔“

دوسرے نے ہنس کر پہلے والے کے ہاتھ پر اٹھاتی تالی ماری اور وہاں سے چلے گئے۔

مانی کا دل غصے سے پھٹنے والا ہو گیا تھا۔ وہ کمینہ لوگ اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی کی عزت اچھالنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مانی کا دل تو کر رہا تھا کہ وہ نور سب کو گولی مار دے مگر وہ صرف اس وقت ویسا سوچ ہی سکتا تھا۔

گود میں لینا کر لوری سنانے والی ماں نظر نہیں آتی یہاں تم کبھی لوگ میرے اپنے ہو مگر جو سچی ہے وہ ماں نظر نہیں آتی مانی بے اختیار روئے جا رہا تھا اس کی باتیں سن کر دوسرے لڑکے بھی ان دونوں کے قریب ایسے آ کر بیٹھ گئے تھے جیسے کوئی بچہ مدرے میں مولوی صاحب کا بیان سن رہا ہو۔ مانی خود تو رو رہی رہا تھا مگر اپنی جذباتی باتوں سے باقی بھی کو بھی رلا رہا تھا۔ پہلی بار، بہت عرصے بعد پہلی بار وہ اتنا جذباتی ہوا تھا۔ آج اسے اپنی ماں بہت شدت سے یاد آ رہی تھی۔

”یار شانی، چل نا گھر چلتے ہیں ماں انتظار کر رہی ہو گی۔“

مانی شانی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گیا۔ شانی کا حال بھی مانی کے جیسا ہی تھا۔ وہاں بیٹھے بھی لڑکوں کا غم ایک سا تھا۔ اسی لیے مانی کی باتیں سب کو اندر سے جھنجھوڑ رہی تھیں۔

”شانہ یار مجھے نہیں پتہ کہ آگے کیا ہو گا نہیں جانتا کہ یہاں سے نکل بھی پائیں گے ہم یا نہیں لیکن یار میں یہاں نہیں مرنا چاہتا۔ اس مٹی میں جس میں ہم جیسے کئی بھائی مدفن ہو گئے جن کے خون سے زمین لال ہو گئی اس زمین میں میں نہیں دفن ہونا چاہتا۔ یار میں ایک بار صرف ایک بار اپنی ماں کے گلے لگنا چاہتا ہوں اس کے ہاتھ کی بنی روٹی کھانا چاہتا ہوں اپنے گاؤں کی نہر میں پھر سے تیرنا چاہتا ہوں۔ انہی پتیل کے درختوں تلے گھنٹوں بیٹھ کر پرندوں کی باتیں سننا چاہتا ہوں میں اپنے گاؤں کی گلیوں میں پھر سے دوڑنا چاہتا ہوں اور پھر اسی مٹی میں مٹی ہو جانا چاہتا ہوں یار شانی مجھے یہاں موت نہیں آئے گی۔ میرا سکون یہاں سے بہت دور ہے۔“

”جن پور گاؤں“ ہاں یہی نام تھا میرے گاؤں کا۔ وہاں میرے نانا تانی کا گھر تھا پاس ہی میرے والد کا بھی گھر تھا۔ میرا سارا بچپن میری تانی کی گود میں ہی گزرا تھا۔ مجھے اس گھر ایک بار پھر سے جانا ہے۔ وہ بھلے ہی اب نہیں ہیں مگر ان کی روحیں وہاں مجھے ملنے کے لئے ضرور آئیں گی۔



تمہارے لیے ان کینوں کے ذہنوں میں کیا فخر چل رہا ہے یہ تمہاری عزت کو داغدار کرنا چاہتے ہیں میں کل رات تک کوئی نا کوئی بندوبست ضرور کر لوں گا یہاں سے نکلنے کا۔ میں تمہیں بس یہی بتانے آیا تھا کہ تیار رہنا۔ اب یا تو آریا پھر بار.....“

”تم مجھے کیوں بچانا چاہتے ہو؟“

”میں سبھی کو بچانا چاہتا ہوں میں نہیں چاہتا کہ کوئی اور یہاں مرے۔ اس زندگی سے موت بہتر ہے مگر ہمیں اتنی جلدی خود کو مرنے نہیں دینا۔ آخری سانس تک زندگی کے لیے کوشش کرنی ہے باقی جو رب سوہنا بہتر جانے۔“

مانی اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟ مانی نے اچانک اس سے اس کا نام پوچھ لیا۔

”آیت نورین۔“

”اچھا نام ہے۔“

”میرا نام مانی ہے۔“

”جانتی ہوں۔“

”اچھا کیسے جانتی ہو؟“

اس کمرے کے دروازے کے پاس ہم لڑکیاں بیٹھ کر تم لڑکوں کی باتیں سنا کرتی ہیں۔ دل کو راحت ملتی ہے اپنے جیسوں کی آواز سن کر تمہاری آواز کئی بار سننے سے شاید سب سے زیادہ تمہاری آواز ہی سننے کو ملی ہے ہمیں باقی تمہیں ”مانی“ کہہ کر بلاتے اور تم جواب دیتے تو تمہاری آواز کی پہچان کی بدولت تمہارے نام کو جان سکتی ہوں۔

آیت نے تفصیل سے سب بتایا تو مانی صرف لباسا ”اوودو“ ہی کہہ سکا اور وہاں سے واپس اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا۔

اگلے دن صبح مانی نے سب سے پہلے شانی کو اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا۔ شانی کو ڈر تو ضرور لگا تھا مگر اس نے مانی کی بات مان لی۔

شانے نے کہا تھا کہ وہ مانی کا ساتھ آزادی کے لیے

مانی اس لڑکی کا نام تو نہیں جانتا تھا مگر وہ تب سے اسے وہاں دیکھ رہا تھا جب سے اسے قید کر کے وہاں لایا گیا تھا۔ وہ ایک معصوم سی دیکھنے والی مانی سے عمر میں کوئی پانچ سال بڑی لڑکی تھی جس کے چہرے اور وجود سے پارسائی کی جھلک نظر آتی تھی دوپٹہ ہر وقت اس کے سر پر ہی ہوتا تھا بس اس وقت اس کو کسی رقاصہ کی طرح تیار کر کے وہاں لایا جاتا جب ان لڑکیوں کی فروخت کا سلسلہ شروع ہوتا۔

مانی اس رات پھر چور دروازے سے لڑکیوں والے کمرے میں چلا گیا۔

مانی نے دیکھا کہ وہ نماز پڑھ کر سلام پھیر رہی تھی اذان کی آواز تو وہاں کسی نے سنی نہیں تھی شاید وہ وقت کے اندازے سے اپنا فرض ادا کر رہی تھی۔

دعا کے بعد اس لڑکی نے مڑ کر دیکھا۔ مانی اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھا ہوا اسے دیکھ کر شرمندگی سے گردن جھکائے رو رہا تھا۔ اس نے تو آج تک نماز نہیں پڑھی تھی۔ اسے تو حقیقتاً نماز بھول ہی گئی تھی۔ آج اس لڑکی کو دیکھ کر اسے خدایا یاد آ گیا تھا اور ایسا یاد آیا کہ زمانہ بھول گیا۔

اس نے وہیں منہ ہاتھ دھو کر فرش پر نماز کی نیت کی اور پھر سجدے میں گر گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ نماز کا کیا طریقہ کار ہے۔ اسے بس اپنے خدا کے حضور پیش ہونا تھا۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر مدد و طلب کرنا تھا تاکہ وہ یہاں سے نکل کر باقی کی زندگی سنت طریقے سے گزارے اور تمام حقوق و فرائض ادا کرے۔

اس لڑکی نے مانی کو سجدے سے اٹھایا اور سہارا دے کر بٹھایا۔ مانی کے چہرے پر آنسوؤں کا خاموش سیلاب بہہ جا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ مانی سے دھیمے لہجے میں گویا ہوئی۔

”کیوں آئے ہو یہاں؟ کسی کو پتا چل گیا تو ہم دونوں کی جان جائے گی۔“

”میں یہاں صرف تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ یہ

تہہ خانے کے دروازے کے ساتھ کان لگائے بیٹھا تھا۔  
تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہلکے سے تہہ خانے کے  
دروازے کے کھلنے کی آواز آئی۔

پنجابی گارڈ ہاتھوں میں رائفل لیے کھڑا تھا۔ اس کے  
کپڑے ہیکے ہوئے تھے شاید باہر زوروں کی بارش ہو  
رہی تھی۔ اس نے اشارے سے مانی کو باہر آنے کا کہا تو  
مانی نے اشارے سے اپنے کبھی ساتھیوں کو باہر نکلنے کا  
کہا۔ کبھی سب سے سب سے باہر آ گئے۔ سب سے آخر میں  
مانی اور شانی باہر نکلے۔ آیت اور کلثوم بڑی سی چادر میں  
خود کو سمیٹے ایک ساتھ باہر موجود کھڑی تھیں۔ مانی جب  
باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ دوسرا گارڈ چارپائی پر بے  
سددہ لیٹا ہوا تھا۔

پنجابی گارڈ نے بتایا کہ میں نے اسے کھانے میں  
نٹے کی ٹولی ملا کر دی ہے مگر اس کی کوئی گارنٹی نہیں کہ یہ  
کتنی دیر تک بے ہوش رہے گا اسی لیے تم سب یہاں  
سے جلدی سے بھاگ جاؤ۔“  
”مگر آپ یہاں رہ کر کیا کریں گے یہ لوگ آپ کو مار  
دیں گے۔“

مانی نے تفکر سے کہا۔

”میں نے اپنے بچوں اور بیوی کو دوسرے شہر بھیج دیا  
ہے۔ تم لوگوں کے جانے کے بعد میں بھی یہاں سے نکل  
جاؤں گا ان لوگوں کے درمیان میں بھی مرنا نہیں  
چاہتا۔“

”ٹھیک ہے لیکن ہم سب جائیں کس طرف؟ ہمیں  
تو باہر کی دنیا کا کچھ بھی پتہ نہیں۔“

”تم سب لوگ جنگل کی طرف مت جانا وہاں سے  
نکلنا تم لوگوں کے بس سے باہر ہے صبح ہوتے ہی یہ لوگ  
تم سب کو ڈھونڈ نکالیں گے اور جان سے مار دیں گے تم  
لوگ یہاں سے سیدھا جانا بجلی والی لائن کراس کرتے ہی  
گہری ڈھلوان آئے گی اس کے دائیں طرف ڈھلوان  
کے ساتھ ساتھ چلتے جانا آگے ایک چھوٹا سا پانی کا چشمہ  
آئے گا اس کو کراس کرنا اس کے بعد ایک گھنٹے تک

نہیں بلکہ یاری کی وجہ سے دے گا۔ شانی نے یہ خبر سچ بچا  
کر باقی لڑکوں تک بھی پہنچا دی تاکہ سب تیار رہیں اور  
ایک جٹ ہو کر کام کریں۔

مانی حسب معمول سوچوں میں گہرا پتھر توڑنے میں  
مصروف تھا جب اسے اپنے عقب سے اسی پنجابی گارڈ  
کی آواز سنائی دی۔ مانی نے مڑ کر اسے ایک نظر دیکھا پھر  
واپس اپنے کام میں لگ گیا۔

”مانی تم نے ٹھیک کہا تھا میں تم لوگوں کی جگہ اپنے  
بچوں کو نہیں دیکھ سکتا اتنے دن سے مجھے نیند بھی نہیں آئی۔  
سوچتا کہ کیا میرا گناہ معاف کرنے لائق ہے یا نہیں پھر  
دل میں یہ بات آئی کہ میرا گناہ بھلے ہی مجھے دوزخ میں  
ڈال دے مگر میں اب تم لوگوں کو اس دوزخ میں نہیں  
رہنے دوں گا میں نکالوں گا تم سب کو اس دوزخ سے۔  
شاید میری گناہوں کی معافی مل جائے مجھے۔“

اس پنجابی بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو مانی کو اپنی  
سماعت پہ یقین ہی نہیں ہوا۔  
پھر اس نے مانی کو کچھ ہدایات دیں اور پہلے کی طرح  
چوکیداری پر لگ گیا۔

شام تک موسم کی صورت حال بھی بگڑ چکی تھی۔ تیز  
ہوائیں طوفان کا روپ دھار کر ہر طرف مٹی کے مرغولے  
بنا رہی تھیں۔ گرچ چمک بھی جاری تھی۔ مگر بارش کا  
امکان کم ہی تھا۔

اس پنجابی گارڈ نے موقع دیکھ کر مانی کو سوسو کے  
بہت سارے ٹوٹ دے دیے اور کہا کہ اسے سب میں  
بانٹ دینا۔ یہاں سے نکلنے کے بعد یہ میسے کام آئیں  
گے تم سب کے مانی نے رات کو وہ میسے سب کو برابر  
بانٹ دیے اور بولا کہ سب پیٹ بھر کر کھانا کھا لیتا اور  
پرانے کپڑے اتار کر دھلے ہوئے کپڑے پہن لیتا۔  
سب نے مانی کی بات فوراً مان لی اور تیار ہو گئے۔

اس کے بعد مانی نے چور دروازے کو کھول کر آیت  
اور اس کی ساتھی کلثوم کو باہر نکالا اور اپنے کمرے میں  
ایک جگہ چھپا کر بیٹھا دیا۔ رات کافی گزر رہی تھی اور مانی



سامنے چلتے جانا تم سڑک تک پہنچ جاؤ گے اور ان شاء اللہ تم کو کوئی سواری مل جائے گی۔ یہ پیسے استعمال کرنا۔ کھانا کھالینا سواری کا کرایہ دے دینا۔“ پنجابی گارڈ نے مانی کو الٹ سے بے تک ساری بات سمجھا دی پھر اس نے سب سے پہلے بجلی کی تاروں کا کنکشن بند کیا اور مانی اور باقی بھی کو جانے کا کہا۔ مانی نے کہا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں وہیں سے آپ اپنے راستے چلے جانا اور ہم اپنے راستے چلے جائیں گے یہاں رکنا آپ کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ گارڈ نے اس کی بات مان لی اور ان کے ساتھ وہاں سے بھاگ نکلا۔ کچھ دور ایک اور خیمہ تھا وہاں موجود دو گارڈ بھی پنجابی گارڈ کی بدولت بے ہوش پڑے تھے۔ مانی نے جلدی سے ایک گارڈ کے پاس پڑے پسٹل کو اٹھالیا۔ پسٹل فل لوڈ تھا۔ بجلی کی تاروں کے پاس پہنچ کر کبھی رک گئے۔ مانی نے کہا کہ تاروں میں کرنٹ نہیں ہے اسی لیے جلدی سے اس کے نیچے سے گزر جاؤ بھی تاروں کے نیچے سے پیٹ کے بل لیٹ کر گزر گئے۔

جب مانی وہاں سے گزر گیا تو گارڈ کے گزرنے کی باری تھی گارڈ گزرنے ہی لگا تھا کہ اس کی کمر تاروں سے جا لگی اس کو بجلی کی تاروں نے کسی پاگل محبوب کی طرح پکڑ لیا مانی نے سب کو آگے کی طرف بھاگنے کا کہا کیونکہ تاروں میں کرنٹ آنے کا مطلب تھا کہ وہاں سویا گارڈ جاگ چکا تھا۔ مانی نے پنجابی کو بچانے کی کوشش کی مگر وہ تب تک مر چکا تھا۔ اسکی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور چہرہ جل کر کوئلے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

پنجابی گارڈ کو مردہ حالت میں دیکھ کر مانی کے قدم وہیں جم گئے۔ نجانے اچانک سے اس کے ذہن میں اس گارڈ کے بیوی بچوں کا خیال کیسے آ گیا تھا۔

کبھی مانی کو پکڑ کر وہاں سے لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر مانی کی آنکھیں بھیگ کر بند ہو چکی تھیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس گارڈ کی موت نے اس کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

شانی مانی کو پکڑ کر زبردستی وہاں سے آگے لے گیا باقی سبھی مانی کی ہدایت پر وہاں سے آگے کی طرف بھاگ کر بہت دور پہنچ گئے تھے وہاں بس مانی، شانی اور آیت ہی کھڑے تھے کلثوم بھی بھاگ گئی تھی۔ مگر وہ دونوں کیوں وہاں رک گئے تھے؟

شانی تو یاری کی وجہ سے رکھا تھا مگر آیت وہ کیوں نہیں بھاگ گئی تھی؟

”مانی یار چل بھاگ نکلتے ہیں وہ ظالم لوگ ابھی پہنچتے ہی ہوں گے۔“

شانی نے اتنا کہا ہی تھا کہ وہاں دور سے فائرنگ ہونے لگی۔ مانی شانی اور آیت وہاں سے بھاگ نکلتے۔ مگر انکارخ دوسری جانب تھا۔ وہ راستہ جنگل کی طرف جاتا تھا بھاگتے بھاگتے وہ جنگل میں پہنچ گئے بہت دیر وہ ایک جگہ چھپ کر بیٹھے رہے ان کا کوئی بھی پیچھا نہیں کر رہا تھا شاید وہ بھی سڑک کی طرف گئے تھے ان کا خیال تھا کہ لڑکے سڑک کی طرف ہی جائیں گے بارش کی بوندیں پتوں پر گر کر اندھیری رات میں خوفناک سی آواز پیدا کر رہی تھیں۔ شانی مانی کے ساتھ چکا ہوا تھا اس کے ساتھ آیت گھٹنوں تک گیند کی مانند لپٹی بیٹھی تھی۔ رات تک وہ وہیں رکے رہے۔

اگلے دن وہ جنگل کے راستے ندی کے پار چلے گئے۔ کیڑے مکوڑوں اور جنگلی پتوں کو انہوں نے خوراک کے طور پر استعمال کیا چار دن تک وہ وہیں بھٹکتے رہے اور آخر کار ایک صبح وہ ایک بڑی سی شاہراہ پر کھڑے تھے۔ ان کے سارے پیسے بھیگ گئے تھے مگر کچھ نوٹ صحیح حالت میں تھے انہوں نے ایک بس روکی اور اس میں سوار ہو گئے۔

کبھی نے سکھ کا سانس لیا مانی پسٹل کو جنگل میں ہی پھینک آیا تھا۔

پھر وہ ایک شہر اترے۔ وہاں انہوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور حمام جا کر نہائے ان کی شکلیں اب کچھ انسانوں جیسی لگ رہی تھیں۔

”یار شانی تیرا شہر کونسا ہے؟“  
”کوئٹہ۔“ شانی نے مختصر جواب دیا۔

پھر وہ شانی سے بولا۔

”جایا رہا جا اپنے شہر دیکھ کر پھر سے اپنے لوگ مل  
لے اپنے پیاروں سے۔“

”یار مانی تجھ سے دور جانے کا دل نہیں کر رہا میرے

گھر والے نجانے اب کدھر ہوں گے۔ وہیں رہتے بھی

ہونگے یا کہیں اور چلے گئے ہوں گے۔ زندہ بھی ہونگے یا

نہیں اگر زندہ ہوئے تو کیا پتہ مجھے پہچانتے بھی ہیں یا

نہیں۔“ شانی دکھ سے بولا تو مانی نے اس کو گلے لگا لیا۔

”مت رویا اب تو تیرے ہنسنے کے دن شروع

ہوئے ہیں مت رویا اب تو میرے یار چلا جائے لوگوں میں تو

کہتا تھا نا کہ تو اپنے والدین سے ایک بار پھر ملنا چاہتا

ہے اپنے باپ کی ڈانٹ کھانا چاہتا ہے تو جایا راجی لے

اپنی زندگی۔“ مانی نے شانی کو ہمت دلائی۔

”اگر وہ مجھے تالے تو؟“

”تو پھر اپنے گاؤں کی گلیوں میں سو جانا۔ تیری ماں

تجھے مٹی میں لینا دیکھ کر آسمان سے بھی اتر کر آجائے

گی۔“ مانی نے اتنا کہا تو شدت جذبات سے تینوں کی

آنکھیں چھمچھم برسنے لگیں۔

شرانی مانی سے ایسے ملا جیسا وہ اس سے آخری بار مل

رہا ہو۔ سچ ہی تو تھا۔ کون جانتا تھا وہ مانی سے آخری بار

گلے گل رہا تھا۔ بہت مشکل سے وہ ایک دوسرے سے

الگ ہوئے۔ اتنے سالوں کی یاری تھی ان کی جسم سے

چھری والا رشتہ تھا۔ ایسے کیسے آسانی سے الگ ہو

جاتے۔

کچھ دیر کے بعد شانی اپنے شہر کو جانے والی بس میں

بیٹھا مانی سے بہت دور جا رہا تھا۔ اپنوں سے ملنے کی خوشی

اور اپنے دوست سے بچھڑنے کا غم۔ اس کی آنکھوں کو

گرماہٹ پہنچا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ بس مانی کی آنکھوں کی

پہنچ سے دور نکل کر غائب ہو گئی۔ پھر مانی آیت کو لے کر

اس کے شہر اس کے گھر جا پہنچا۔

دو بوڑھے ماں باپ آیت کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش

کرنے لگے۔ دل کے رشتے تو دل سے پہچانے جاتے

ہیں۔ سانسوں کی آواز سے پہچان ہو جاتی ہے۔ آیت کو

پہچانتے ہی دونوں ماں باپ آیت کے گلے لگ گئے۔

ان کے رونے کی آواز اتنی شدید تھی کہ ہمسائے بھی گھر

پہنچ گئے۔ دو گھنٹوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مانی کو گلے

لگا کر ڈھیر سارا پیار اور دعائیں دی گئیں۔ سچ ہی تو تھا۔

آج آیت اپنے والدین سے مانی کی وجہ سے ہی تولی

تھی۔

اس رات مانی کو لاکھ کہنے پر بھی وہاں سے جانے

نہیں دیا گیا۔ مانی کے لیے پلان بنائے گئے۔ آیت کے

لیے نئے جوڑے سلوا کر پہنائے گئے۔ وہ رات باتوں

ہی باتوں میں کٹ گئی۔

اپنوں سے ملنے پر جو خوشی آیت کے چہرے پر نظر آ

رہی تھی وہ مانی نے پہلی بار دیکھی تھی اور شاید آخری بار

بھی۔

وہ ویسی ہی خوشی اپنے چہرے پر دیکھنے کی امید کر رہا

تھا۔

مانی کی محلے کے تائی سے کنگھ اور شیو کرائی گئی۔

نئے کپڑے پہنائے گئے۔ اور کچھ پیسے سفر کے لیے

زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیے گئے۔

نئے روپ میں مانی ایک خوبصورت جوان مرد لگ

رہا تھا۔ جانے سے پہلے وہ آخری بار آیت سے ملا تو

جذباتی ہو گیا۔

”آیت اس نئی زندگی کو اچھے سے جینا۔ شادی کرنا۔

اپنے جیسے خوبصورت اور نیک سیرت بچے پیدا کرنا اور

ان کو ایک اچھا انسان بنانا اپنے والدین کی خدمت کرنا

اور ان کو ہمیشہ خوش رکھنا۔ تمہیں یہ زندگی مبارک ہو

آیت۔ دعا ہے کہ تم ہمیشہ خوش رہو۔ گزرے وقت کو

ایک بھیا تک خواب سمجھ کر بھول جانا۔ چلتا ہوں۔ اپنا

خیال رکھنا۔ خدا حافظ۔“ مانی جانے کے لیے مڑا ہی تھا

کہ آیت کے پکارنے پر رک گیا۔

نمبر افق

نومبر ۲۰۱۸ء

140



”اگر میں ماضی کو تائبلا سکوں تو؟ اگر میں خود ہی اسے بھولنا چاہوں تو؟“

”تو پھر ایسے یاد رکھنا کہ دوسروں کو اس سے سبق ملے۔“

”مائی یہ زندگی تم نے مجھے دی ہے۔ میں نے تو اپنے گھر پھر سے واپس آنے کی امید ہی ماری تھی۔ مگر پھر تم ملے اور میری مری ہوئی امیدوں کو زندہ قبر سے نکال کر پورا کیا تم ہی ہو جس کی وجہ سے آج میں اپنے والدین سے دوبارہ ملی ہوں تم ناہوتے تو میری عزت کو داغدار کر کے کسی پہاڑی پر چٹل کوڑوں کی خوراک کے لیے پھینک دیا جاتا۔ تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گے مائی میں تم کو کبھی بھول نہیں سکتی۔ دراصل تم کو بھولنا ہی نہیں چاہتی۔ دعا ہے کہ تم ہمیشہ خوش رہو اور اپنی ماں سے ضرور ملو۔ اگر کبھی ماضی کی یاد آئے تو یہ یاد رکھنا کہ کہیں ایک لڑکی تمہارے لیے خدا کے سامنے سجدے میں پڑی تمہاری خوشیوں کی دعا کر رہی ہے۔ جاؤ مائی خدا تمہارا مددگار ہے۔“

آیت کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے وہ اپنے محسن کو دعا دے رہی تھی۔ وہ اسے جانے نہیں دینا چاہتی تھی کیونکہ وہ اس کی عزت کا محافظ بنا تھا۔ اس سے بڑھ کر کوئی اور اس کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا مگر اس نے اسے جانے دیا وہ برسوں سے اس کی طرح اپنوں سے بچھڑا ہوا انسان تھا۔ ان سے ملنا اس کا حق تھا اور وہ اس کو اس حق سے محروم نہیں رکھ سکتی تھی۔

گھر سے نکلے وقت مائی کی آنکھوں میں آیت کے لیے آنسو تھے۔ آیت وہ پہلی لڑکی تھی جس سے وہ ملا تھا۔ اس کی سادگی اسے بہت پسند تھی مگر وہ خود کو اس کے قابل نہیں سمجھتا تھا اس کی مدد کرنے کے بدلے وہ اس سے اس کو ہی نہیں مانگنا چاہتا تھا۔

اپنے شہر کی بس پکڑ کر وہ اپنے شہر آ پہنچا۔ اپنے گاؤں پہنچ کر وہ نہر کنارے خوشی سے آنسو بہاتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اپنے گاؤں کی نہر میں پاؤں لٹکا کر اس نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ اپنی مائی کے

گھر کو تلاش کرتا ہوا وہاں آ پہنچا۔ اس کے والد کا گھر بھی وہیں سامنے ہی تھا۔ مائی کے گھر پر تالہ لگا ہوا تھا۔

وہ وہیں دیوانوں کی طرح گاؤں کی گلیوں میں پھرنے لگا اور چیخ چیخ کر اپنی ماں کو آوازیں دینے لگا۔

”ماں میں گھر لوٹ آیا ہوں کدھر ہے تو مجھے بھوک لگی ہے مجھے میٹھی روٹی کھانی ہے کدھر ہے تو ماں۔ دیکھ تیرا مائی لوٹ آیا ہے۔“

مائی کی آواز سن کر محلے والے اپنے گھروں سے نکل کر باہر مائی کو دیکھنے لگے۔ سبھی اسے دیوانہ اور پاگل کہہ رہے تھے۔ مائی چلتے چلتے اپنے باپ کے گھر کے دروازے کے باہر گر گیا۔ دروازے کے کونے میں لگے دو لمبے نوکدار کیل اس کی کنپٹیوں میں اندر تک کس گئے۔ خون کی دو تیز لکیریں اس کی کنپٹیوں سے خارج ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سارے کپڑے اور زمین اس کے خون سے لال سرخ ہو گئی۔ لوگوں نے بھاگ کر مائی کی کنپٹیوں سے کیل نکالے اور زمین پر لٹا دیا۔

اجانک ایک پاگل بڑھیا کہیں سے بھاگتی ہوئی وہاں آ پہنچی۔ اس کی آنکھوں کی روشنی کمر در تھی۔

”مائی پتر..... میرا مائی پتر۔“

بڑھیا بھاگتے ہوئے گر گئی۔ ماں کی آواز کانوں میں پڑتے ہی مائی کو آسمان سے بلا دیا گیا۔ ماں زمین پہ گری ہوئی بیٹے کے پاس جانے کی کوشش کر رہی تھی مگر بیٹا اتنا لمبا سفر کرنے کے بعد منزل کے سامنے جا کر گر گیا۔ زندگی کی دوڑ ختم ہو گئی۔ موت کی ایک بار پھر جیت ہو گئی۔

ماں بھاگ کر بیٹے کے پاس آئی۔ اس کے سر کو گود میں رکھا اور اپنی پوٹلی میں سے میٹھی روٹی کا ٹکڑا نکال کر بیٹے کے منہ میں دیا۔ مگر بیٹا کڑی موت کا ذائقہ چکھ کر سیر ہو چکا تھا۔



# تاریک راہیں

مہتاب خان

بھروسہ کرنا اچھی بات ہے مگر اس سے بھی اچھی بات بھروسہ نہ کرنا ہے اس نے اپنی زندگی سے یہ ہی سبق لیا تھا۔

بھروسے کے انجام پر لکھی انوکھی تحریر

تھی مگر بے ہوش بھی بظاہر اس کے جسم پر کوئی زخم نظر نہیں آ رہا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کچرے کے ایک ڈھیر پر گر گئی تھی یوں تو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اس شہر کے لیے بدناما داغ تھے مگر اس وقت اسی ڈھیر کی وجہ سے اس کی جان بچ گئی تھی۔ ورنہ اتنی بلندی سے گر کر کچ جانا محال تھا۔

لوگوں کا مجمع اسے چاروں طرف سے گھیرے کھڑا تھا۔ پولیس بھی پہنچ گئی تھی اور سائرن بجائی ایسویٹس بھی آ گئی تھی۔ اسے شاید اندرونی چونٹیں آئی تھیں اور کچھ ہڈیاں بھی فرپکچر ہو گئی تھیں بہر حال اس بے ہوش لڑکی کو ایسویٹس میں ڈالیا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں پولیس نے تفتیش شروع کر دی تھی۔

ابتدائی تفتیش سے پتا چلا تھا کہ لڑکی کا نام حور عین تھا جو ماہنامہ بتول کے دفتر میں عرصہ تین سال سے جاب کر رہی تھی۔ یہاں وہ اسٹنٹ ایڈیٹر تھی۔ بتول ڈائجسٹ خواتین کا ایک مقبول و معروف ماہنامہ تھا۔ اس ادارے کے مالک منصور احمد صاحب اکثر بیرون ملک رہتے تھے۔ یہاں کا اسٹاف چھ افراد پر مشتمل تھا ایڈیٹر محسنہ حبیب کے علاوہ دو اسٹنٹ ایڈیٹر عمرانہ اور حور عین تھیں باقی تین مرد ملازمین بھی موجود تھے جو دفتر کے دیگر امور انجام دیتے تھے۔

تفتیش میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ گزشتہ کچھ عرصے سے وہ بہت پریشان تھی اور کئی دنوں سے آفس بھی نہیں آ رہی تھی۔ اس ماہ حور عین نے بہت چھنٹیاں کی

ماہنامہ بتول کا دفتر شہر کے اس گنجان آباد کاروباری علاقے میں واقع تھا جہاں بے حد قدیم عمارتیں تھیں۔ تنگ گلیاں اور بے پناہ ٹریفک ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں ایک برا بازار بھی تھا جس کی وجہ سے لوگوں کا جم غفیر ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ زیادہ تر عمارتوں میں مختلف دفاتر و کلاء کے آفسز اور دکانوں کے گودام واقع تھے۔ غرض یہ ایک بے حد مصروف علاقہ تھا۔

اس دن اس علاقے میں ایک بڑا افسوسناک واقعہ پیش آیا تھا۔ ماہنامہ بتول کا دفتر لب سڑک ایک قدیم عمارت کی تیسری منزل پر واقع تھا۔

اس صبح گیارہ بجے اس دفتر کی کھڑکی سے ایک جوان سال لڑکی نے چھلانگ لگا دی تھی۔ نہ جانے اس نے خودکشی کیوں کی تھی۔ اس بات سے سب لاعلم تھے۔ بہر حال وہ تیسری منزل سے نیچے گر گئی تھی۔ اسے چھلانگ لگاتے ہوئے کئی لوگوں نے دیکھا تھا کئی افراد کی تو چیخیں نکل گئی تھیں آن کی آن میں وہاں مجمع اکھٹا ہو گیا تھا تمام افراد حواس باختہ ہو کر اس جانب دوڑے لگے تھے جہاں وہ گر گئی تھی۔ کچھ افراد اپنے موبائل فون پر ویڈیو بنانے میں مصروف تھے یہ ایسویٹس تو اور کیا تھا بے حسی کی انتہا تھی کہ اس کی زندگی بچانے کے بجائے اس کی ویڈیو بنائی جا رہی تھی۔

ان میں سے کچھ درمند دل رکھنے والے افراد اس کی جانب لپکے تھے کسی نے پولیس کو بھی فون کر دیا تھا قریب جانے اور اس کا معائنہ کرنے پر ہٹا چلا کہ وہ زندہ





ہمیشہ کتابیں خرید کر رہی تھی۔

”بہت دنوں بعد آئی ہیں آپ.....“ دکاندار خوش خلقی سے مسکرایا۔

”جی.....“ شاکر بھائی آپ نے وہ ساری کتابیں نکال لیں نا جو میں نے فون پر لکھوائی تھیں۔“

”جی نکال لی ہیں..... بس ایک رضیہ بٹ کی ”عذرا“ نہیں ہے میرے پاس.....“ باجی کا بھی فون آیا تھا، انہوں نے خاص طور پر فرمائش کی ہے میں آس پاس کی دکانوں میں دیکھتا ہوں۔“

”اچھا..... باجی نے بھی فون کیا تھا۔“ حور عین نے کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا جو شا کرنے کچھ دیر قبل ہی اس کے سامنے لا کر رکھی تھیں۔

”وہ ٹھیک تو ہیں ناں.....؟ کافی عرصہ ہو گیا وہ بھی نہیں آئیں۔“

”ہاں ٹھیک ہیں..... مگر سے ذرا کم ہی نکلتی ہیں۔“ حور عین نے کہا۔

”آپ یہاں رکیں، میں ذرا ان کی عذرا ڈھونڈ لوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا اور دکان سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے..... اسی وقت ایک اسارٹ سالو جوان دکان پر آیا۔

”شاکر بھائی امجد اسلام امجد کی کتاب ”فتاویٰ“ ہے؟“ نو جوان نے آتے ہی تیزی سے کہا۔ وہ شاید جلدی میں تھا۔

بھیں۔ ایڈیٹر محسن نے اسے تنبیہ بھی کی تھی لیکن اس کی دفتر سے غیر حاضری بڑھتی گئی اور پچھلے ایک ہفتہ سے وہ آفس بھی نہیں آئی تھی۔ محسن نے ادارے کے مالک کی اجازت سے اسے فون پر اطلاع دے دی تھی کہ اسے جاب سے نکالا جا رہا ہے اور وہ اپنے بقایا جات لینے آفس آجائے۔

حور عین آج اسی سلسلے میں آفس آئی تھی محسن نے اسے انتظار کرنے کے لیے کہا تھا اس وقت آفس کے اس کمرے میں کوئی نہیں تھا جہاں وہ انتظار کر رہی تھی پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی تھی۔ دفتر میں موجود افراد کو اس حرکت کا کچھ پتا ہی نہیں چلا تھا، انہیں تو اس وقت خبر ہوئی تھی جب پولیس دیگر افراد کے ساتھ ان کے آفس میں آئی تھی۔

جواب سے نکالا جانا کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا کہ جس کی وجہ سے کوئی شخص ایسا انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے پھر اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا کہ اس نے موت کی آغوش میں پناہ ڈھونڈ لی تھی یہ اور ایسے بہت سے سوال تھے جو لوگوں کے ذہنوں میں ابھر رہے تھے مگر ان کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔



اس دن اسے کچھ کتابیں خریدنا تھیں اس مقصد کے لیے وہ اردو بازار آئی تھی۔ تپتی گرمی اور بے پناہ ہجوم میں وہ بے حال ہوتی اس مخصوص دکان تک پہنچی جہاں سے وہ





یہاں آفس میں ہی رکھی ہے۔ ایک منٹ رکیں میں لاتی ہوں۔“ حور نے کہا اور واپس مڑ گئی۔

کچھ ہی دیر میں وہ کتاب ہاتھ میں تھامے چلی آئی تھی۔ کتاب اس نے سرمد کو تھمائی۔

”ویسے کتنا عجیب اتفاق ہے..... آج کے دن یہ ہماری دوسری ملاقات ہے۔ ایسے اتفاقات کبھی کبھی کہانی کو جنم دیتے ہیں.....“ پھر کچھ دیر بٹھہر کر بولا۔ ”اچھا میں چلتا ہوں۔“ وہ اسے سوچوں میں ڈوبا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔

”یہ وہ کیا کہہ گیا تھا..... کہانی..... کیسی کہانی.....“ وہ سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

رات کے آٹھ بج گئے تھے وہ نہیں آئی تھی..... غصے میں اس کا پارہ آسان کو چھو رہا تھا..... وہ اپنے کمرے میں ادھر سے ادھر پھر لگا رہی تھی۔ بار بار کھڑکی تک جاتی اور گردن باہر نکال کر ادھر ادھر دیکھتی پھر کمرے میں واپس پلٹ آتی اور پھر لگانے لگتی تھی۔

”اتنی دیر ہو گئی..... کہاں مڑ گئی حور.....“ اس نے پھر سے موبائل پر نمبر ڈائل کیا..... تیل ہوتی رہی مگر حور عین نے فون نہیں اٹھایا۔

”اٹھا فون، کبخت اٹھا..... کہاں مڑ گئی؟“ وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

☆☆☆

وہ دفتر سے نکلے اور بس اسٹاپ پر کھڑی ہو کر اپنی مطلوبہ ویکن کا انتظار کرنے لگی..... کافی دیر انتظار کے بعد بس آئی بھی تو مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ اس میں سوار نہیں ہو سکی۔ پھر ایک لمبے انتظار کے بعد اس کی مطلوبہ ویکن آئی تھی جس میں بڑی مشکل سے اسے جگہ ملی تھی۔

موسط طبقے کی آبادی میں واقع یہ وسیع و عریض مکان خاصا قدیم تھا۔ جوان دونوں بہنوں کی ملکیت تھا۔ بڑی بہن زہرہ جمال بے حد تیز طرار اور چالاک تھی۔ جبکہ اس کی سوتیلی چھوٹی بہن حور عین بہت سیدھی سادی اور مصوم تھی۔ زہرہ بلا شرکت غیر بے اس جانیداد پر

قابل تھی اور حور کو دبا کر رکھتی تھی۔ یہ کارنر کا یہ مکان کالب سڑک واقع تھا۔ زہرہ نے اس میں کئی دکانیں نکال کر کرائے پر چڑھا دی تھیں جس سے اسے اچھی خاصی آمدنی ہوتی تھی اور دونوں بہنوں کی پاداشی گزر رہی ہو سکتی تھی مگر پھر بھی حور عین جاب کر رہی تھی۔ وہ تھکی ماندی گھر پہنچی تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ پورا مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا زہرہ کے کمرے میں سے مدھم مدھم روشنی باہر آ رہی تھی۔ وہ ہال میں داخل ہوئی اور لائٹ آن کی۔

زہرہ بھی دندنائی ہوئی ہال میں داخل ہوئی۔ ”آگئی تو..... اتنی دیر کیوں ہوئی تجھے؟“

”بہت رش تھا دیر ہو گئی۔“ اس نے مختصر کہا۔

”یہ بتا میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھی۔ کتنے فون کیے ہیں میں نے.....“

”فون پرس میں تھا..... نکالنا مشکل تھا بتایا تاکہ بہت رش تھا۔“

”جیسا ہے نا تجھے میرا بلڈ پریشر کتنا بڑھ جاتا ہے جب تو میرا فون نہیں اٹھاتی۔ اور دن میں بھی تو نے فون نہیں کیا۔“

”میلنس ختم ہو گیا تھا۔“

”ہر بات کا جواب ہے تیرے پاس..... دفتر کے فون سے تو کر سکتی تھی۔“

”جب میں وہاں ہوتی ہوں تو ان کی ملازم ہوتی ہوں ایک وہ محسنہ ہے جو چیک کرتی رہتی ہے کہ میں وقت تو ضائع نہیں کر رہی فون پر بات تو نہیں کر رہی..... میں وہاں سے لمبی لمبی باتیں نہیں کر سکتی۔“ اس نے رسائی سے کہا۔

”تو باتیں کرتی ہوگی..... جب ہی محسنہ کو شک ہوا ہوگا۔ کسی مرد کا چکر تو نہیں۔“ وہ شک آمیز لہجے میں بولی۔

”مرد..... یہ لفظ تو میری ڈکشنری میں ہی نہیں.....“ حور خچی سے بولی۔

”مجھے آج تجھ پر بہت غصہ آ رہا ہے تو نے کچھری کیوں بنائی تھی میرے دو پہر کے کھانے کے لیے؟“

تجھے کبھی ناولیں اور ڈائجسٹس پڑھنے سے نہیں روکا ورنہ کون تجھے یہ جاب دیتا۔ اوقات سے بڑی جاب مل گئی تجھے..... کسی کی وجہ سے؟ میری وجہ سے۔“

”میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے باجی..... آپ کو میری تکالیف کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔“

”اولمک جذبات..... مجھ سے اس قسم کی باتیں نہ کر منوس کہیں کی..... زیادہ زبان چلائی تو منہ توڑ کر ہاتھ میں دے دوں گی..... شکر کر کہ تجھے سر چھپانے کے لیے ٹھکانہ دیا ہوا ہے ورنہ کہیں رل رہی ہوتی۔“

حورا نکھوں میں امنڈ آئے ہوئے آنسو پیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جلدی جلدی سارے کام نمٹائے اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے الماری کھولی اور ہلکے نیلے رنگ کا لباس نکالا..... آج سرمد کو آتا تھا، اس نے اپنے سب سے اچھے لباس کا انتخاب کیا تھا۔

وہ آفس کے لیے نکل رہی تھی جب اس نے زہرہ کو آواز دی..... ”باجی دروازہ بند کر لیں میں جا رہی ہوں۔“

اس کی آواز سن کر وہ کمرے میں آ گئی تھی۔ ”ہاں ہاں بند کر لوں گی“ ایک تو معدے میں بڑی تیزابیت ہو رہی ہے۔ برابر والی خالہ کہہ رہی تھیں کہ جس پر سفلی کروائی جائے سب سے پہلے اس کا معدہ متاثر ہوتا ہے۔ اور اس سے کچھ کھایا پینا نہیں جاتا..... تو نے بال کاٹے ہیں۔“ زہرہ نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں تو باجی۔“ اس نے خوبصورت پیشانی پر آئی بالوں کی لٹ پیچھے کی اور باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

”ایک منٹ رک.....“ وہ جلدی سے بولی۔ ”یہ تو نے کیا پہنا ہے؟ یہ شریف عورتوں کا پہناوا نہیں ہے۔“ ”آپ کو تو میری ہر بات میں کیڑے نظر آتے ہیں، اچھا خاصا لباس ہے اتنا ڈھیلا ڈھالا کرتا پہنا ہے میں نے۔“

”ٹراؤزر دیکھا ہے..... قیامت کے روز درے پڑیں گے..... فحاشی کی کوئی معافی نہیں ہے۔“

’دل آزاری کی بھی معافی نہیں ہے۔“ وہ ترکی بہ

”آپ نے خود ہی تو کہا تھا باجی کہ آپ کا پیٹ راب ہے ڈاکٹر نے پرہیزی کھانا کھانے کو کہا ہے۔“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے..... میری کتابیں لائی۔“

”ہاں لے آئی ہوں۔“ اس نے ہاتھ میں تھما پیکٹ سے تھمایا اور اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

”میں نے شا کر کو ایک ناول کے لیے کہا تھا، وہ بھی اس میں ہے نا؟“ زہرہ نے کہا۔

”نہیں وہ کل مل جائے گی۔“ وہ لمحے بھر کے لیے رکی سرمد کا خیال آتے ہی ایک لطیف سا احساس اس کے دل وپے میں پھیل گیا تھا۔

صبح وہ جلدی جلدی ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ زہرہ اننگ ٹیبل پر بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ اس نے گرم گرم اٹھا اور آلیٹ ٹیبل پر رکھا اور جانے کے لیے مڑنے والی تھی جب زہرہ نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔

”یہ پراٹھا کیوں بنا لائی تو؟ پتا بھی ہے کہ ڈاکٹر نے ہماری غذا سے منع کیا ہے یہ تو جان بوجھ کر ایسی غذا میں تھے کھانی کی کوشش تو نہیں کر رہی جو مجھے نقصان دیں۔“

”آپ کے لیے دلیہ بنایا ہے ابھی لا رہی ہوں.....“

”جائے آپ یہ باتیں کیسے سوچ لیتی ہیں۔“ آخری جملہ اس نے جیسی آواز میں کہا تھا۔

”کیا بڑبڑا رہی ہے تو.....؟ بددعائیں دے رہی ہے نا مجھے۔“

وہ کوئی جواب دیئے بغیر کچن کی جانب چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرے میں انکا ناشتہ لیے آ گئی تھی۔

وران کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی۔

”دوپہر کے کھانے کے لیے کوئی ڈھنگ کا کھانا بنا کر جانا۔“ کچھ دیر بعد زہرہ نے کہا۔

”آفس کے لیے دیر ہو رہی ہے ادھر محسنہ ذرا بھی دیر ہو جائے تو سب کے سامنے ذلیل کر دیتی ہے میری عزت نفس کی دجیاں بکھیر کر رکھ دیتی ہے۔“ اس نے میز سے کہا۔

”تو بی اے فیل کو کونن وکری پر رکھتا ہے شکر کر کہ



ترکی بولی۔  
 ”کپڑے بدل اور ڈھنگ کا لباس پہن کر جا.....“  
 وہ چلائی۔  
 ”دیر ہو رہی ہے باجی پلیز۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔  
 ”جا پھر..... آئندہ اس لباس میں نہ دیکھوں تجھ کو۔“  
 اس کے جاتے ہی اس نے زوردار آواز کے ساتھ

دروازہ بند کر دیا تھا۔  
 وہ دفتر پہنچی تو باہر گیٹ پر ہی سرد کو اچھا نظر پایا تھا۔  
 ”آج تو آپ پہچانی نہیں جا رہیں.....“ رسمِ یسلا م  
 ودعا کے بعد سرد نے ستائی نظروں سے اسے دیکھتے  
 ہوئے کہا۔ ”آپ آج بہت اچھی لگ رہی ہیں۔“ اس  
 نے شرمناک گردن جھکا لی۔  
 ”یہ لیجئے آپ کی کتاب۔“ اس نے ناول اس کی  
 طرف بڑھائی جسے اس نے تمام لیا۔  
 ”شکریہ۔“

”ویسے آپ اسی وقت آفس آتی ہیں؟“  
 ”نہیں آج کچھ دیر ہو گئی۔“ اس نے کہا۔  
 ”میں کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“  
 ”اوہ..... سوری..... اندر چلیں چائے وغیرہ.....“  
 ”نہیں بس میں چلوں گا..... دیر ہو رہی ہے چائے  
 پھر کبھی۔“ کہتا ہوا وہ تیزی سے وہاں سے چلا گیا تھا۔  
 ابھی وہ اپنے کمرے میں آ کر بیٹھی ہی تھی کہ اسے کسی  
 تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ اس مختصرے کمرے میں ایک  
 اور ٹیبل کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی وقت پیون کرسی اٹھائے  
 کمرے میں آیا اور اس کے پیچھے ایک اجنبی لڑکی آندھی  
 اور طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوئی۔  
 ”اس ٹیبل کے پیچھے کرسی رکھو..... سیدھی کر کے رکھو  
 بھی.....“ لڑکی تیز آواز میں بولی تھی۔  
 پیون نے کرسی ٹیبل کے پیچھے رکھ دی۔ لڑکی نے ایک  
 نگاہ اس پر ڈالی پھر ٹیبل سیٹ کرنے لگی۔ اسی دورانِ محسنہ  
 بھی وہاں آ گئی تھی۔

”آگئیں تم.....“ انہوں نے آئے ہی متنبی نظروں  
 سے اسے دیکھا پھر بولیں۔  
 ”نئے افق۔“  
 147

”خیر..... ان سے ملو یہ عرمانہ ہیں میری پرانی جانے  
 والی ہیں اور ہماری ان کی اسٹنٹ ایڈیٹر۔“ نئے پرے  
 حیا کا کام یہ دیکھیں گی، تم سے تو ایک پرچے کا کام سنبھال  
 نہیں جاتا، اسی لیے انہیں رکھا گیا ہے ہر بار پرچہ لیٹ  
 ہو رہا ہے۔“ محسنہ تیز آواز سے بولی۔  
 ”خیر وجوہات تو بہت سی ہیں۔“ وہ دھیسے لہجے میں  
 بولی۔

”آپ مجھے الزام نہیں دے سکتیں۔“  
 ”چھوڑو میں خواہ مخواہ تم سے بحث نہیں کرنا چاہتی۔“  
 ”آپ بیٹھیے نا محسنہ آپ.....“ عرمانہ تیزی سے بولی  
 تو ہواس کے سامنے رکھی کری پر بیٹھ گئی۔  
 ”ویسے ایک بات بتاؤ آپ کو بتول میں لکھنے والی  
 اکثر رائٹرز آج کل ٹی وی چینلوں پر چھائی ہوئی ہیں۔“  
 عرمانہ نے کہا۔

”وہی تو..... نام اور شہرت ہم دیتے ہیں اور ٹی وی  
 والے جیٹنا مار لیتے ہیں پھر ان کے دماغ آسمان پر پہنچ  
 جاتے ہیں۔“

”ارے تو ہمیں چاہیے کہ نئے رائٹرز لے کر آئیں  
 نوک پٹلک ہم خود ٹھیک کر لیں گے۔ آشیانہ تو پورے  
 کا پورا میں خود لکھ لیا کرتی تھی۔“ عرمانہ نے جھٹ کہا۔  
 ”لیکن معیار کو برقرار رکھنے کے لیے پروفیشنل لکھنے  
 والوں کی ضرورت پڑتی ہے۔“ حور عین نے کہا۔  
 ”ارے آپ اور ہم کس لیے ہیں۔ جی جان سے  
 محنت کریں گی، تو کیا نہیں ہو سکتا، کیوں محسنہ آپ۔“ اس  
 نے محسنہ کو مخاطب کیا۔

”محنت سے تو یہاں سب کی جان جاتی ہے۔“ یہ  
 کہتی ہوئی محسنہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

حور نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ ترخ کر بولی۔  
 ایسے کیا دیکھ رہی ہو میں تمہیں نہیں کہہ رہی..... اور عرمانہ  
 تم میرے کمرے میں آؤ ذرا.....“ کہتی ہوئی وہاں سے  
 چلی گئی، اس کے پیچھے عرمانہ بھی لپکی..... ان دونوں کے  
 جانے کے بعد حور دیر تک سر تھماے وہاں بیٹھی رہی تھی۔



کتا بوں کے تبادلے سے شروع ہونے والی سرد

ہو جائیں گے.....“ سرمد نے ٹیبل پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے ڈھارس دی گئی۔ اس نے سرائی کر اسے دیکھا اور مسکرا دی..... اسی وقت اس کی نظر کچھ دور بیٹھی عمرانہ پر پڑی تو وہ بھونچکی رہ گئی، عمرانہ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا جو اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ وہاں بیٹھی تھی۔ وہ آج دفتر سے جلدی گھر چلی گئی تھی یقیناً اس کا فیملی کی ساتھ باہر گھومنے کا پروگرام رہا ہوگا۔

”کیا ہوا خیر تو ہے..... کوئی بھوت دیکھ لیا کیا؟“

سرمد نے مزاح انداز میں کہا۔  
 ”وہ واقعی کسی بھوت سے کم نہیں..... میری کو لیگ ہے اور بیٹھی ہے پتا نہیں آفس میں..... سب سے کیا کچھ کہے گی۔ اور عرصہ کو تو مجھے باتیں سنانے کا بہانہ چاہیے۔“ وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔

”کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کہہ دینا کہ میرا منگیتر تھا۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”چلو اٹھو تمہیں گھر چھوڑ دوں۔“ کچھ دیر بعد وہ بولا تھا۔

”نہیں تم جاؤ میں چلی جاؤں گی۔“ اس نے پریشانی سے کہا۔

”کہانا نادل رہو خواہ خواہ پریشان نہ ہو۔“ سرمد نے کہا۔

”پلیز تم جاؤ۔“ اس نے کہا۔  
 ”اوکے مرضی ہے تمہاری میں چلتا ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

اس کے جانے کے بعد وہ بھی ابھی اور باہر کی جانب بڑھی اسی وقت عمرانہ تیز قدموں سے چلتی اس کے قریب آئی اور اسے آواز دی۔

”حور عین.....“ وہ پٹی۔  
 ”اوہ..... آپ یہی ہیں عمرانہ۔“

”بھئی تم تو بڑی تیز نکلیں۔ ہم سے تو یہی کہتی رہیں کہ دفتر سے سیدھی گھر جاتی ہو جبکہ اس وقت یہاں..... اور وہ کون تھا؟“ وہ آنکھیں منکارتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولی۔

”بعد میں بتاؤں گی.....“ وہ تیزی سے بولی اور جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

یہ مختصر ملاقات جلد ہی دوستی میں بدل گئی تھی پھر یہ حلق ٹکرا ہوتا گیا تھا اور کب دوستی نے محبت کا روپ سوار کیا تھا دونوں کو پتا نہیں چلا تھا اور اب وہ اکثر باہر بھی ملنے لگے تھے، کبھی کسی پارک میں یا ریسٹورانٹ میں وہ ٹھہر دیکھے جاتے تھے۔

ایسی ہی ایک شام تھی جب سرمد نے اس سے کہا تھا۔  
 ”کیا بات ہے بڑی اداس نظر آ رہی ہو؟ کیا پھر باجی نے کچھ کہہ دیا؟“

”یہ تو روز کی باتیں ہیں تمہیں نہیں معلوم کہ میں کس طرح اس گھر میں رہ رہی ہوں، یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک کبوتر کو پر کاٹ کر جلتے فرش پر چھوڑ دیا جائے۔“  
 ”مجھے تو تمہاری باجی ذہنی مریضہ لگتی ہیں۔ تم چھوڑ کیوں نہیں دیتیں وہ گھر اپنا کمانی کھانی ہو الگ رہ سکتی ہو۔“ سرمد نے کہا۔

”اتنی کم تنخواہ میں گھر رکا کر یہ اور دیگر اخراجات ممکن نہیں ہیں۔ اور پھر ہمارے معاشرے میں تنہا لڑکی کتنی غیر محفوظ ہے تمہیں اندازہ ہوگا۔“

”کہتی تو تم ٹھیک ہو..... تمہیں اس وقت تک ہمت سے کام لینا ہوگا جب تک میں اس قابل نہ ہو جاؤں کہ تمہیں سہارا دے سکوں۔“

”تم ساتھ ہو تو میری ہمت اور ڈھارس بھی ہوگی ہے ورنہ.....“

”دیکھو گھر میں میں اکیلا کمانے والا ہوں، چار بہنیں ہیں۔ دو کی شادی ہوگئی ہے اور تیسری کی شادی مقرب ہونے والی ہے اسی کے لیے مٹی ڈالی ہوئی ہی اوپر سے مالک مکان نے گھر خالی کروانے کا نوٹس بھی دے دیا ہے مکان کے کرائے آسان سے باتیں کر رہے ہیں۔ غرض مسائل کا ایک انبار ہے جس کے بوجھ تلے میں دبا ہوا ہوں۔ ایسے میں امی کے سامنے اپنی شادی کی بات کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”ہاں مجھے احساس ہے کہ تم خود اپنے مسائل میں گھرے ہوئے ہو۔“ حور عین نے مایوسی سے کہا۔

”تم مایوس مت ہو۔ انشاء اللہ جیسے ہی حالات بدلیں گے میں تمہیں اپنالوں گا“ پھر سارا بے مسئلہ ختم



”ارے شہر و کہاں چلیں..... ہمارے پاس گاڑی

ہے تمہیں ڈراپ کر دیں گے..... گھر ہی جاری ہونا؟“  
خود نے کچھ سوچا تھا پھر اس کے ساتھ جانے پر راضی  
ہو گئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ان کی ٹیبل پر آگئی تھی۔ عمرانہ  
کا شوہر یہ کہتا ہوا اٹھ گیا۔ ”تم لوگ ٹیبلو میں گاڑی  
نکالتا ہوں۔“

”اللہ حور تمہیں کیا بتاؤں..... یہی چند لمحات ہوتے

ہیں جو ہم باہر نزارتے ہیں اور سکھ کی ساس لیتے ہیں۔  
ورنہ گھر میں تو اتنی جتن جتن ہوتی ہے کہ کیا بتاؤں میری  
ساس اتنی خوفناک عورت ہیں کہ جب بولنے پر آتی ہیں تو  
چپ ہونے کا نام نہیں لیتیں حالانکہ فالج زدہ ہیں اللہ  
انہیں معاف کرے۔“

”میں بھی ایسی ہی ایک خوفناک عورت کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہوں۔“ حور نے کہا۔  
 ”کون سے وہ.....؟“

”میری بڑی بہن..... بہ تدبیر ہوگی سے عمرانا“ وہ بہت غصے میں ہوں گی اور بہت باتیں سنائیں گی۔“ اس نے فکرمندی سے کہا۔

”ارے میں ہوں نا..... تجھیں تمہارے گھر تک  
چھوڑنے چلوں گی اور ڈرنے کی ضرورت نہیں..... وہ  
ایک سنائیں تو تم دس سناؤ، وہ اکھیں دکھائیں تو تم بھی  
دکھانا،“ اس نے تیزی سے کہا۔

پھر عمرانا اسے گھر تک چھوڑنے آئی تھی، دروازہ کھولتے ہی زہرہ چلائی تھی۔  
 ”آگئی تو..... یہ نام ہے تیرے پانے کا، کہاں مرگئی تھی.....؟“ وہ اسے برا بھلا کہہ رہی تھی، عمرانا نے اسے پیچھے دھکیلا اور خود سامنے آگئی۔ اسے دیکھتے ہی زہرہ بولی۔

”اے..... تم کون ہو بھئی؟“  
 ”باجی میں حور کی کوئیگ ہوں ہم ایک ہی آفس میں  
 ہوتی ہیں۔ آج کام میں کچھ دیر ہو گئی تھی اسی لیے اسے  
 چھوڑنے آئی ہوں۔ آپ ناراض نہ ہوں۔“ وہ تیزی  
 سے بولی تھی حور نے تشکرانہ نظروں سے دیکھا تھا۔  
 ”اوہ..... اچھا آؤ آؤ اندر آؤ۔“ اس بار انہوں نے

سے کہہ دیا تھا تمہاری بہن کو تو بالکل کسی بات کا سلیقہ نہیں ہے۔“ اس کی چچی سی چلتی زبان رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”ویسے کبھی تم ٹھیک ہو پہننے اوڑھنے کا سلیقہ ہر ایک نہیں آتا“ میں نے جب بھی یہ لباس پہنا ہے ہر شخص مرلیف کرتا ہے۔“ محسنہ نے کہا۔

”آپ لہج نہیں منگوائے گا میں حلیم اور کھیر لائی ہوں آپ کے لیے۔“ عمرانا ہنستے ہوئے بولی حور تیز و طرار مرانا کو حیران نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ اور محسنہ اس قدر ابھوری تھی۔

”ویسے عمرانا تم بہت تکلفات میں پڑ گئی ہو کل جو تم سی بڑے لائی تھیں وہ بڑے غیر معمولی تھے۔“

”دینی بڑے بنانے میں میری ہمسری کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ تو میرا چیلنج ہے محسنہ آپ اور ہاں..... اصل بات

آپ کو بتانی تھی وہ یہ ہے کہ حمیرا احمد ہمارے لیے ناول لکھنے کے لیے تیار ہو گئی ہیں مگر کہہ رہی تھیں کہ پرچہ نیا ہے مارکیٹ میں ریپوشن بنانے میں ناظم لگے گا“ اور اب

میرا شمارنی وی کی رائٹرز میں ہوتا ہے میں نے کہہ دیا آپ کو ہمارے لیے لکھنا ہے اپنے حسن اخلاق سے

اس نے انہیں ایسا شے میں اتار کہ وہ لکھنے کے لیے رضی ہو گئیں۔ اور لی کی رائٹرز ہیں میں نے انہیں

فس میں مدعو کیا ہے آپ سے پوچھے بغیر..... چائے پیش کھلائیں گے..... پھر وہیں لکھنے لکھانے کی بھی بات

جو جائے گی۔“

”واہ عمرانا تم تو بہت آگے کی سوچتی ہو..... اگر تنہاری کارکردگی ایسی ہی رہی تو بہت جلد اس نئے

پرچے کی مدیرہ بن جاؤ گی۔ اور ایک یہ حور عین ہے کتنا مرصہ ہو گیا اسے یہاں مگر وہیں کی وہیں ہے آگے

بڑھنے اور ترقی کرنے کا کوئی جذبہ ہی نہ ہیں ہے اس کے اندر.....“ محسنہ نے عمرانا کی تعریف کے ساتھ اسے

بھی لپٹ دیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئی تھی۔

”میں کام کو کام سمجھ کر نہیں کرتی آپ! بلکہ یہ تو میر جنون ہے آپ مجھ پر بھروسہ کر کے دیکھیں میں پرچے کو کہاں سے کہاں لے جاؤں گی۔“

عمرانا واقعی بہت باصلاحیت تھی اور باتوں میں تو کوئی اس سے جیت نہیں سکتا تھا۔ اس نے حور کو بھی بہت اچھے

مشورے دیے تھے۔ اس کے مشوروں کے مطابق ہی حور نے سرمہ سے صاف صاف بات کی تھی اور اس سے باہر

ملنے پر صاف انکار کر دیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ اگر وہ شادی کرنا چاہتا ہے تو اس کی باجی سے اس کا ہاتھ مانگ

لے..... سرمہ نے اپنے گھر والوں سے بات کرنے کے لیے اس سے مہلت مانگی تھی۔ یہ تمام گفتگو انہوں نے

فون پر کی تھی۔ بہر حال اس دن سرمہ کا فون آیا تھا۔

”حور میں نے ڈرتے ڈرتے اماں سے شادی کی بات کی تھی اور تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔“

’اوہ..... اچھا..... پھر.....“ حور چونکی تھی۔

”پہلے تو وہ خوب چیخی چلا میں..... پھر خاموش ہو گئیں اور اچانک انہوں نے مجھے غور سے دیکھا پھر نرمی

سے بولیں۔ تیری جوانی بھی بڑھاپے میں ڈھل رہی ہے اور تو نے اس گھر اور اپنی بہنوں کے لیے بڑی قربانیاں

دی ہیں اب تیری شادی میں دریغ نہیں ہونی چاہیے۔“

”تو وہ راضی ہو گئیں؟“ وہ خوشی سے سرشار لہجے میں بولی۔

”ہاں..... یہ بتاؤ کہ امی کو اپنی باجی سے کب ملوا سکتی ہو؟“

”مم..... میں باجی سے بات کر کے تمہیں بتا دوں گی۔“ اس نے کہنے کو سرمہ سے یہ کہہ تو دیا تھا مگر باجی

سے بات کرنے کے خیال سے ہی اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ اس نے یہ ساری باتیں جب عمرانا کو بتائی

تھیں تو اس نے کہا تھا۔

”ارے ان کی تم فکر نہ کرو میں خود سب سنبھال لوں گی..... دیکھنا وہ یوں راضی ہوں گی.....“ اس نے چٹکی

بجائی..... اور حور نے سکون کی سانس لی تھی۔

پھر زہرہ جمال سے دو تین ملاقاتوں میں ہی عمرانا نے انہیں سرمہ کے گھر والوں سے ملنے پر راضی کر لیا تھا۔

اس دن ناشتہ کرتے ہوئے زہرہ کی خلاف معمول خاموشی کو حور نے محسوس کر لیا تھا اس نے چور نظروں سے

انہیں دیکھا تھا جو ایک تک اسے ہی گھور رہی تھیں۔ وہ



خالی برتن چکن میں رکھنے کی غرض سے اٹھی تو زہرہ نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔

”یہ سرد کون ہے؟ دیکھ مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔“  
انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔

”وہ..... باجی عمرانا کے کوئی جاننے والے.....“

”میں نے کہا تا جھوٹ نہ بولنا مجھ سے۔ میں صرف سچ سننا چاہتی ہوں۔“ زہرہ نے اس کی کلائی کو جھکادیا۔

”مجھے سب ہوتا ہے حور مجھ سے کچھ نہیں چھپا، اتنی سی تھی تو جب تیری ماں مر گئی تھی، پھر میں نے ہی تجھے سنبھالا تھا۔ دیکھ حور اس عمر میں محبت ہونا ایک فطری بات ہے۔“

ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، افسوس تو صرف یہ ہے کہ تو نے یہ بات مجھ سے چھپائی، سوتیلی ہی سہی میں تیری بڑی بہن ہوں۔“ اس نے قدرے نرم لہجے میں کہا تو حور نے مجرموں کی طرح سر جھکا دیا۔

”بیٹھ اور مجھے شروع سے بتا..... میں تیری دشمن نہیں ہوں، بہن ہوں تیری۔“ زہرہ فی محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا تو حور کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا..... وہ خاموشی سے بیٹھ گئی پھر اپنا دل کھول کر اس کے سامنی رکھ دیا۔

”باجی اتنی بری تو نہیں تھیں جتنا اس نے سوچا تھا۔“  
اس نے دل میں سوچا..... وہ اس سے صرف ماچھ سال

بڑی تھیں اور صورتِ شکل کی بھی اچھی تھیں۔ صاحب  
جائیداد تھیں، دولت کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ اما بہت کچھ

چھوڑ کر مرے تھے جو سب باجی کے ہی قبضے میں تھا۔ ان کی شاہ دی کی راہ میں سپ سے بڑی رکاوٹ ان کا اپنا

مزاج تھا۔ ان کی مفتی سوچ تھی، ہر ایک پر شک و شبہ کرنے والی عیادت تھی، یہی وجہ تھی جو اب تک ان کی شادی نہیں

”تو چلی جائے گی تو میں کسے رہوں گی حور.....“

سوچی ہوں تو میرا سانس رکنے لگتا ہے۔ ”وہ برسوج انداز میں بولی تو حور نے چونک کر اس کی طرف

”خدا کی قسم آج تو سب مجھ خلاف توجہ ہو رہا تھا۔“  
میں تو کبھی تھی یہ سب سن کر تم

بولتا تھا۔

”شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کی سوتیلی بہن ہوں اور یہ مکان اور تمام دولت میرے نام ہے مگر پھر بھی میں نے اس کے ساتھ بھی انصافی نہیں کی اور کسی بہن سے بڑھ کر سلوک کیا ہے اس کی وجہ سے اب تک شادی نہیں کی، حور کی شادی کر کے میں بھی کسی نیک اور خاندانی شخص سے شادی کر لوں گی..... بلکہ وہ چاہے گا تو اپنی فیملی کے ساتھ اسی مکان میں رہے گا۔ اتنا بڑا مکان میں فروخت تو نہیں کروں گی۔“ اس نے باتوں کے دوران کن اکھیوں سے اسے دیکھا تھا۔

سرد بڑی دچھی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس دن وہ تادیر ان کے ساتھ رہا تھا پھر رات گئے وہ اپنے گھر گیا تھا..... بہر حال ہرہ کے بارے میں حور نے جو کچھ اسے بتایا تھا زہرہ کا رویہ اس سے بالکل الٹ ظاہر ہوا تھا۔ وہ الجھا ہوا تھا۔

پھر سب کچھ گڑبڑ ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ سرد کی حیثیت اس گھر کی ایک فرد کی سی ہو گئی تھی۔ وہ زہرہ کے سلیقے اور اس کے ہاتھ کے پکائے کھانوں کی تعریف کرتے نہ تھکتا تھا۔ زہرہ بھی چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے اسے بلانے لگی تھی۔ اس کی ماں اور بہنوں کی بھی گھر میں آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی۔ زہرہ کی بھی کاپی لٹ ہو گئی تھی۔ وہ اب پہلے سے بڑھ کر اپنا خیال رکھنے لگی تھی اور ہر وقت بنی سنوری نظر آتی تھی۔ سرد اور اس کے گھر والوں کے سامنے تو وہ پچھی جانی تھی۔ سرد بھی اب حور کو نظر انداز کرنے لگا تھا۔ غرض اندر ہی اندر کچھ پک رہا تھا جس کا حور کو احساس ہو گیا تھا۔ ان دنوں وہ بے حد پریشان تھی۔ ادھر دفتر میں بھی اس کے لیے حالات سازگار نہیں تھے عمر اتنے سے ایک کنارے لگا دیا تھا۔ اس ذہنی اور جسمانی مشقت نے اسے بیمار کر دیا تھا اور کئی دن وہ دفتر نہیں جاسکتی تھی۔

”چھ دن ہو گئے ہیں حور دفتر نہیں آئی کسی نے اسے فون کیا؟“ محسن نے عمر اتنے سے کہا جو کسی کام سے اس کے کمرے میں آئی تھی۔

”نہیں آپا..... مجھے اس کے حصے کا کام بھی کرنا

نے ہی کھولا تھا..... بہترین لباس اور ہیکے سے میک اپ میں وہ بہت فریش اور خوبصورت لگ رہی تھیں۔

”آپ یقیناً سرد ہیں!“ زہرہ نے سرد کو دیکھتے ہی کہا تھا۔ ”آئیے اندر آئیے۔“

کچھ ہی دیر بعد وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔

”حور..... میری جان..... جاؤ جا کر فریش ہو جاؤ“ پھر میں چائے لگائی ہوں۔ آج میں نے بڑے مزے کی چیزیں بنائی ہیں۔ ان دونوں نے چونک کر چہرہ کو دیکھا تھا۔ شہد میں گھلا لہجہ دیکھ کر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا حور کے وہاں سے جاتے ہی وہ بولی تھی۔ ”کیسی پیلی پڑتی جا رہی ہے ہر وقت پریشان حال رہتی ہے“ ذرا اپنا خیال نہیں رکھتی کتنا سمجھائی ہوں کہ جاب چھوڑ دے مگر میری سنتی ہی نہیں ہے۔“

”تو حور کیا اپنی مرضی سے جاب کر رہی ہے؟“

”ہاں تو اور کیا اس کی ضد سے مجبور ہو کر تو میں نے اجازت دی تھی ورنہ ہمیں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ اچھا سنیں آپ کھانا کھا کر چائے گا“ میں نے بڑے اہتمام سے پکایا ہے۔“

”آپ تکلف سے کام نہ لیں..... پھر کچھ دیر بیٹھ کر رہو بولا۔“ کھانا آپ پکاتی ہیں۔“

”ہاں..... بے چاری حور تو اتنی تھکی ماندی آتی ہے کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے خواہ خواہ اپنے آپ کو تھکا رہی ہے۔“

”مجھے تو یقین نہیں آ رہا.....“ وہ الجھن آمیز لہجے میں بولتا تھا۔

”مجھے لگتا ہے آپ کو بھی حور نے اپنی مظلومیت کے قصے سنائے ہوں گے وہ ایسی ہی افسانوی دنیا میں رہتی ہے جہاں خود کو مظلوم اور مجھے ظالم سمجھتی ہے وہ بچپن سے ہی ایسی ہے۔ اپنی سہیلیوں سے میرے ظلم کے ایسے ایسے فرضی قصے سناتی تھی کہ کیا بتاؤں سوچ رہی ہوں کہ اسے کسی ماہر نفسیات کو دکھا دوں۔“

”وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟“ سرد حیرانی سے



بڑا رہا ہے بہت مشکل ہو گئی ہے..... ویسے مجھے پتا ہے وہ  
گیوں نہیں آ رہی ہے۔“ محسنہ نے سوالیہ نظروں سے  
اسے دیکھا تو وہ بولی۔ ”دراصل اس کی شادی ہو رہی ہے  
..... شاید وہ جاب چھوڑ دے گی۔“

”اگر اسے جاب نہیں کرنی تو چلی جائے، ہم کوئی  
اور انتظام کر لیں گے..... اسے بتانا تو چاہیے تھا کہ  
نہیں..... بہر حال میں ابھی منصور صاحب سے بات  
کرتی ہوں..... اچھا یہ بتاؤ تمہارا سے بات ہوئی ناول  
کی۔“

”ارے پتا..... ناول کی پہلی قسط میری ٹیبل پر موجود  
ہے ابھی لاتی ہوں۔“

”ویسے عمران تم واقعی تیز کام ہو۔ مان گئی تم کو.....“  
محسنہ نے فون پر کوئی نمبر ڈائل کرتے ہوئے  
کہا..... ”ہیلو منصور صاحب.....“

پھر انہوں نے حور عین کو فون کیا تھا کہ منصور صاحب  
نے اسے جاب سے نکال دیا ہے اور وہ کسی دن بھی اپنے  
واجبات لینے آ سکتی ہے۔ بستر پر پیار پڑی حور عین کے  
لیے ایک روح فرسا خبر تھی۔

یہ دن حور عین کے لیے بہت بردارن تھا۔ وہ اپنے  
واجبات لینے دفتر جانے کی تیاری کر رہی تھی جب زہرہ  
ہنسی ٹھٹھکی ہوئی خوشی سے سرشار چہرہ لیے اس کے کمرے  
میں آئی تھی اور دھماکہ کر دیا تھا۔

”خور میں تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ میری اور سرمد  
کی شادی طے ہو گئی ہے۔ شادی کے بعد وہ اور اس کی  
فیمیلی سی گھر میں رہیں گے تمہاری اس گھر میں اب کوئی  
مجبورائش نہیں، تم اپنی رہائش کے لیے کوئی انتظام کر لو  
دیے بھی اپنے شوہر کی سابقہ محبت کو ساتھ رکھنا ٹھیک نہیں  
ہے۔ سمجھ رہی ہونا تم.....“ وہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی  
تھی مگر حور کی تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی مفقود  
ہو گئی تھیں۔

اسے سرمد سے اس بے وفائی کی توقع نہیں تھی اس کی  
تو دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ وہ انتہائی دکھ و دل اور چکراتے سر  
کے ساتھ آفس آئی تھی۔

یہ تھے وہ حالات جس میں اس نے موت کی

# میراث

طیبہ عنصر مغل

وہ شاطر عورت تھی جو ہر بازی جیت جانا چاہتی تھی مگر اس دفعہ اس نے جو کھیل کھیلا وہ آخر تک نہ جان سکی کہ اس کھیل میں اسے جیت ہوگی یا مات

اپنے ہی اعمال کی قاتل ڈور میں الجھنے والی ایک عاقبت نااندیش کی کتھا

جب بچی نے بیٹی بن کر میری طرف نہیں دیکھا بلکہ ماں کی طرح مجھے سنبھالا اور تم؟ تمہاری اور اس کی عمر میں پندرہ سال کے فرق نے تو اسے ہمیشہ سے تمہاری ماں بنادیا۔ تمہارا چھوٹے سے چھوٹا کام اس نے اپنے ذمے لیا۔ میری سولہ سالہ بیٹی، محض میٹرک ہی تو کیا تھا اس نے جب ایک باپ کی طرح گھر کی ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر آ پڑیں، پھر اس نے تو مڑ کر نہیں دیکھا، کہاں کہاں تو کر پوں کے لیے دھکے کھاتی پھری اور میری وہ باہت بچی زندگی کے کسی میدان میں نہیں ہاری۔ پڑھتی بھی رہی اور کام بھی کرتی رہی۔“ اماں نے ایک گہرا سانس لیا اور شکوہ کناس نظروں سے نایاب کو دیکھا۔

”یہ سب میں جانتی ہوں اماں، لیکن کیا میری زندگی کے فیصلے کا اختیار..... کیا یہ بھی بڑی آپاہی کریں گی؟“ اس نے تھیلی کی پشت سے بہتے آنسوؤں کو پونچھ ڈالا۔ کیا یہ سوال تم اپنے آپ سے نہیں کر سکتیں نانی! تمہارے ابا کے چلے جانے کے بعد کسے سب رشتہ داروں نے ہم سے نگاہیں پھیر لیں، کیا تمہیں نہیں پتا؟ میرا تو پہلے ہی تمہاری پیدائش کے بعد کی چیچدیگیوں نے برا حال کر دیا تھا۔ ایسے میں اس کا بچپن ٹیوشن، گھر اور نوکری کی نذر رہی ہو گیا۔ اس پر تو بے فکری کے دن آئے ہی نہیں۔ میری حرماں نصیب بیٹی نے ایک قدرواں سے شادی بھی کی تو ہماری کفالت کی شرائط جہیز میں لے کر گئی۔“ اماں نے دھلے کپڑوں کو اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ نایاب نے اداس سی نظر کمرے پر ڈالی، ہر طرف ہنگی

اس کا ذہن سوچوں کے تانے بانے میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ لیکن مسئلہ ریشم کی طرح الجھتا ہی جا رہا تھا۔ مکمل سیاہ لباس میں وہ بھی تاریک رات کا حصہ لگ رہی تھی۔ بالوں کی الجھی نہیں اس کے چہرے اور گردن کے آس پاس بکھری ہوئی تھیں۔ بالآخر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی غالباً اسے سوچوں کی اندھی بستی میں سے نکلنے کے لیے کوئی روزن مل گیا تھا۔ صبح کے سامنے رات بے دم ہو رہی تھی اور دماغ کے سامنے مسائل نے دم توڑ دیا تھا۔ حجاب نے اپنے بالوں کو جوڑے میں لپیٹ کر سمیٹا اور چھائی لیتی بستر کی طرف بڑھی۔ اب وہ دیر تک سکون سے سو سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

”اماں کوئی بہن اپنی بہن کے ساتھ ایسا بھی کر سکتی ہے کیا؟“ نایاب نے شکستہ لہجے میں ماں سے سوال کیا۔ لیکن اماں نے اس کے سوال کو یکسر نظر انداز کر دیا جیسے سنائی نہ ہو۔ ”آپ کی خاموشی کا مطلب میں کیا سمجھوں یہی ناکہ آپ کو بھی آپا کی کسی بات سے اختلاف نہیں ہے۔“ وہ پھر سے اماں کے سامنے ٹھری ہو کر بولی۔

”مت بھولو کہ وہ تمہاری بڑی بہن ہے اور اس نے جو فیصلہ تمہارے حق میں کیا ہے وہ تمہاری زندگی کے لیے مناسب ہوگا اسی لیے تو اس نے یہ طے کیا ہے۔ وہ صرف تمہاری بڑی بہن یا میری بیٹی ہی نہیں اس گھر کی میری اور تمہاری محسن بھی ہے۔ جس وقت تمہارے ابا نے یہ دنیا چھوڑی اس وقت اس کی عمر ہی کیا تھی محض سولہ سال! اور





اس کی جانب تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ کل جس طرح ان کے بچا زادان کی جائیداد پر اپنا حق جتا رہے تھے وہ مرد ہو کر بھی معمولی سی مزاحمت نہیں کر رہے تھے۔ اس وقت چاب نے کیسی بے خوفی سے ان کو کھری کھری سنا دی تھیں۔ ابھی بھی اس کے الفاظ ان کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

”خیام مرزا! ہمارے تایا نے تو جس دن تائی کو اپنی مرضی سے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا وہی دن ان کی زندگی میں محنت کی سیاہی پھیر گیا تھا۔“ جہان کی آواز میں حقارت ہی حقارت تھی۔

”میرے خیال میں آپ میں سے کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس گھر کے معاملات میں دخل اندازی کرے یا کسی کو بھی ملامت کرنے کی کوشش کرے۔ تقدیر میں جو لکھا ہے وہی ہوتا ہے۔“ چاب کی آواز میں ایک جھکمانہ سی حتمیت تھی۔ ”تقدیر.....!“ جہان کے ساتھ بیٹھے معظم نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

”تائی تو پھر بھی اس خاندان کو دو بیٹے دے مئی ہے۔“ یہ خیام کی وہ بیٹی تو کوئی بیٹی بھی نہ دے سکی اور دس سال بعد ہی دوسری دنیا کو سدھار گئی۔ اور یہ خیام صاحب ان کے سوگ میں زندگی گزار گئے۔ ہمارے خاندان میں تو ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری لے آتے ہیں اور یہ.....! خیام کے پہلے پڑتے چہرے کو دیکھ کر چاب نے غضب ناک انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے آپ لوگ اگر سلیمان کی ناکہبانی

آپا ہی نظر آ رہی تھیں۔ مہنگے بیڈ ڈریسنگ میں، سائیڈ پر پڑے خوبصورت دیوان، دیوار پر لگی ایل ای ڈی سے ہونی ہوئی اس کی نظر اپنے وجود پر ہوئی آ کے رک گئی۔ اس کے تن پہ سچا قیمتی لباس اور اس سے اتنی خوشبو بھی آپا ہی کی مرہون منت تھی۔

تو اب ان مراعات کا تاوان ادا کرنے کی ذمہ داری مجھے ادا کرنا ہوگی۔ حسن! تو مجھے تمہیں بھلانا ہوگا۔ تم جو میری روح میں سا چکے ہو اور یہ بات آپا بھی جانتی ہیں، پھر وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ اپنی ناکام حسرتوں کا انتقام وہ آخر مجھ سے ہی کیوں لے رہی ہیں۔

☆.....☆.....☆

دروازے پر ہوتی ہلکی دستک پر خیام مرزا نے چونک کر دیکھا۔ اور دھیمی آواز میں ”لیں کم آن“ کہا تو چاب نے دھیرے سے دروازہ دھکیل کر کمرے میں قدم رکھا۔ کمرے میں کسی قسم کی بے ترتیبی نہ تھی۔ چاب کو دیکھ کر خیام نے احترا مابینہ سے ٹیک لگا کر بیٹھنے کی دانستہ کوشش کی۔ ”دہن آپ! آپ نے کیوں تکلیف کی؟ کسی سہروٹ کو بھیج دیتیں۔“ انہوں نے چاب کے ہاتھ میں بیڈی دیکھ کر کہا۔

”میرا نہیں خیال بھیا جی! کہ اب میں آپ کے سلسلے میں کسی بھی نوکر پر اعتبار کر سکوں گی۔ اور آپ بھی آئندہ میرے علاوہ کسی سے لے کر کچھ کھائیں پئیں گے نہیں۔ ابھی تو پچھلے نقصانات کا ازالہ نہیں ہو سکا اور کل کا واقعہ تو آپ کے سامنے ہے۔ اس کی آواز کی مضبوطی پر خیام نے







لیجے گا۔ میں دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف ہوں۔ اس خوش فہمی میں کچھ نہ کیجیے گا کہ کوئی بچتا داما میرا فیصلہ بدلے گا۔ اپنی فیملی کی کفالت کرتے کرتے کب میں ایک مرد کی طرح پریلیٹکلی سوچنے لگی، مجھے خود بھی نہیں پتا۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور متوازن چال چلتی آفس سے نکل گئی۔

اپنے سنگل بیڈ پر کروشیں بدلتے ہوئے وہ تنگ آچکی تھی۔ سوچیں تھیں کہ بچپان ہی نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ وہ دو لقاے سلیمان مرزا کی میز پر رکھ تو آئی تھی لیکن اسے نہیں لگتا تھا کہ کوئی بھی شخص چاہے تارون کے خزانے کا مالک ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنی جاہ کو پورا کرنے کے لیے اس حد تک جاسکتا ہے کہ حجاب علی کو حاصل کرنے کے لیے نہ صرف اپنی جائیداد اس کے نام کرے بلکہ عمر بھر اس کی ماں اور بہن کی کفالت کا ذمہ بھی اٹھائے۔ یہی تو لگتا تھا اس نے ایک لقاے میں اور دوسرے میں..... دوسرے میں استغنی کی صورت میں ایک بار پھر جگہ جگہ کی تحسین، نوکریوں کی تلاش، سوچ کر ہی اس کے وجود میں دروہوں نے لگا تھا۔ تلوؤں میں جیہن کا احساس جاگ گیا تھا۔ لیکن وہ حجاب علی تھی۔ دھن کی پکی، انجام سے بے پروا۔

”جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ زندگی کو سنوارنے کے لیے سوداگر بننا ہی پڑے گا۔“ اس نے سوچ کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور ہر سوچ کو جھٹک کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆.....☆.....☆

سلیمان مرزا نے دونوں لفافوں کو جاک کر کے باری باری ان کو پڑھا۔ حجاب علی کی شرائط کو پڑھ کر کچھ بھر کے لیے اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہوگئی۔ تو مجھے اپنی وفاداری کو ثابت کرنا ہوگا حجاب علی ان مادی اشیاء سے تمہارے گھر والوں کی ذمہ داری کو اپنی ذمہ داری بناتا کر۔

وہ ذرا سا مسکرایا۔ جھک کر ایک سفید لقاے کے کاغذات کو اٹھا کر چہرے کے سامنے کیا اور پھر انہیں میز کی سطح پر رکھ کر ان دونوں کاغذات پر دستخط کر دیے اور دوسرے لقاے کے اٹکوتے کاغذ کو لقاے سمیت ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

☆.....☆.....☆

دلہن بنی بیٹی حجاب نے ذرا سا گھونگٹ سر کایا۔ بے حد قیمتی چیزوں سے سجا کرہ پھولوں کے بے شمار گلہ رتوں

سے ہمک رہا تھا۔ قیمتی پردوں اور ساز و سامان سے لے کر کارپٹ تک ہر چیز نئی اور اپورنڈ تھی۔ سلیمان نے کمرے میں داخل ہو کر حجاب پر نظر ڈالی وہ سر اٹھائے کسی بارعب ملکہ کی طرح اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے پر شوق اور حیرت زدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ ”تم حجاب علی تھیں تو مجھی با اعتماد تھیں اب تو حجاب مرزا ہو تم، یہ ملکاؤں جیسا انداز چلتا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے جیب میں سے حسین سی ڈبیہ نکال کر آگے بڑھا اور نرمی سے حجاب کا ہاتھ تھام کر اس کے پور پور سجے ہاتھ میں ایک بیضوی شکل کی ہیرے کی انگوٹھی ڈال دی۔ اس کی چمک خیرہ کن تھی لیکن حجاب کو پہلی بار سلیمان مرزا کے سامنے اس کی چمک چمکی لگی۔ اسے دھڑکنے کا احساس دلایا کہ اس کے سینے میں بھی دل موجود ہے۔ حجاب کے ویسے والے دن اماں دور سے بیٹھ کر اپنی بیٹی کے چہرے کا اطمینان اس کی شان و شوکت کو دیکھ رہی تھیں۔ سطور کرے رنگ کے ترک اشاکل کے لباس میں وہ کسی ملکہ کی مانند نظر آ رہی تھی اور سلیمان مرزا سے یکسر مختلف تھے۔ بہر حال اماں ان سے خوشدلی سے ملی تھیں۔

سلیمان کے ولیمہ میں بہت لوگ شامل تھے، کچھ قریبی عزیز بھی تھے جو عائشہ کی گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔ سلیمان کے بڑے بھائی نے ان کا تعارف کزن کہہ کر ہی کروایا تھا، لیکن وہ مرد اور عورتیں مزاج میں سلیمان اور خیام مرزا سے یکسر مختلف تھے۔ بہر حال اماں ان سے خوشدلی سے ملی تھیں۔

”خیام نے بھی یہی چاہا تھا۔ خاندان بھری لڑکیوں کو چھوڑ کر اپنی مرضی کی تھی اور اب یہ سلیمان کی بیوی بھی کسی فٹ پوٹھے خاندان سے اٹھ کر آئی ہے۔“ وہ آج شادی کے تیسرے دن فریش ہو کر لاؤنج کی طرف آئی تو لاؤنج میں بیٹھی اس خاندان کی کچھ عورتوں میں سے کسی نے گوبرا فاشنی کی۔

”ایکسکوز می! یہ گھراپ میرا ہے اور میرے ہی گھر میں بیٹھ کر جو میرے خلاف یہ گھشایا لفاظ استعمال کرے گا۔ وہ جان لے کہ میں روایتی قسم کی لڑکی بن کر آپ کی یہ سخی باتیں برداشت نہیں کروں گی اور بہتر یہ ہوگا کہ آپ اب اپنے گھروں کو سدھار لیں۔ سنا ہے گاؤں والے تو بہت



مصروف لوگ ہوتے ہیں۔“ حجاب نے اپنے ازلی پراعتماد لہجے میں ان کو کھری کھری سنا دیں۔

لاؤنج میں سناٹا چھا گیا اور پھر آہستہ آہستہ سب اٹھنے لگیں۔ حجاب نے ڈانٹنگ ٹینل کا رخ کیا۔

”مریم! جلدی سے میرا اور سلیمان کا ناشہ لگوائیں اور خیام بھائی کو بھی یہیں بلوائیں۔ اس نے استحقاق بھرے لہجے میں میڈ کو مخاطب کیا اور ”لیس میڈم“ کہتی مریم بچن کی طرف بڑھ گئی۔

شادی کو ابھی سال بھی نہ گزرا تھا کہ سلیمان کو ڈیپنٹی کے عفریت نے آنا فانا دبوچ لیا علاج کی مہلت بھی نہ ملی اور اہل نے حجاب کے ہاتھ سے اس کا ہاتھ جدا کر دیا۔ اس صدمے سے ابھی مستحلی بھی نہیں تھی کہ ایک روز سڑکیوں سے اترتے ہوئے پھسل گئی اور سلیمان کی جس نشانی کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے پھل رہی تھی اسے دیکھ بھی نہ سکی۔ ہوش میں آنے پر حجاب تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اماں اپنی حرام نصیب بیٹی کو کھلے جانا چاہتی تھیں لیکن وہ حجاب بھی اتنی جلدی کہاں ٹوٹ سکتی تھی؟ اب وہ سلیمان کے گھر، آفس اور بھائی کی ذمہ داری کو بھی اپنی زندگی کا حصہ بنا چکی تھی۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو حجاب میری بیٹی؟ اماں نے حیرت سے سراپا ہو کر اسے دیکھا۔

”میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ دولت نے مجھے ترسایا ہے۔ بہت تھکا یا ہے لیکن اب نہیں۔ یہ درست ہے کہ سلیمان کا اور ان کے پیار کا نعم البدل نہیں ہے میری زندگی میں، لیکن یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے، نایاب اگر میری بات مان جاتی اور خیام مرزا سے نکاح پر رضامند ہو جاتی تو شاید میں سلیمان کے نام پر عمر تمام کر دیتی لیکن افسوس نایاب نے میری خواہش کو رد کر دیا۔ لیکن اس کی ایک خواہش تو میں نے پوری کرنے کا وعدہ کیا ہے مگر اپنی شرط کے ساتھ اس سے پوچھ لیجئے گا۔ اگر وہ میری شرط پر راضی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ حسن کو بھول جائے۔“

اماں ہم صدمہ اس کو دیکھتی رہیں اور وہ اپنا فیصلہ سنا کر ہمیشہ کی طرح مضبوط قدم اٹھاتی دلیبر پار کر گئی۔

دروازے سے کان لگائے کھڑی نایاب دھیرے سے

اپنے کمرے کی طرف پلٹ گئی۔

مختصر سے افراد کی موجودگی میں حجاب کا نکاح انتہائی سادگی سے خیام مرزا سے ہو گیا تھا۔ کبھی بھی سنگھار کے بغیر سادہ سفید کپڑوں میں بیٹھی حجاب نے مستثنیٰ انداز میں نکاح نامے پر دستخط کیے۔

خیام مرزا کے کمرے میں منتقل ہوتے ہوئے اور سلیمان کے کمرے کو چھوڑتے ہوئے وہ کن کڑے مراحل سے گزری یہ صرف دو دیوار جان پائے۔ کوئی انسان نہیں۔

خیام کمرے میں داخل ہوئے تو حجاب بند کے بجائے کرسی پر ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ خیام نے اس کے سر پر ہاتھ پڑھائے۔

”آپ کو نہیں لگتا حجاب! کسا آپ نے ایک غلط فیصلہ کیا ہے۔ صرف ضد میں آ کسا آپ نے مجھے اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیا ایسا نہ ہوتو کے ساتھ آپ کو چھتاؤں کے ناگ ڈنٹے لگیں۔“ وہ دھیرے دھیرے بولتے ہوئے قریب رکھی بیڈروم چنبر پر بیٹھ گئے۔

”میں نے بھی کوئی فیصلہ سوچے سمجھے بغیر نہیں کیا۔ خیام صاحب! اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بغیر کسی رشتے کے ہمارا کتنے ایک چھت تلہ رہنا ہی شریکوں کے لیے ایک بڑا ہتھیار تھا۔ اوپر سے وہ اپنی دانست میں مجھے بانجھ کہہ کر آپ کے خاندان کا اختتام طے کر چکے ہیں۔ تو کیا ہم ان کے کہے کو بچ ثابت کر دیں؟ گر نہیں۔“

”حجاب! وہ کچھ غلط بھی نہیں کہہ کر گئے ہیں۔ آپ اس سے لاعلم تو نہیں ہیں کہ آپ کے ساتھ ہونے والے حادثے نے..... اس بچے کو ہی نہیں چھینا بلکہ آئندہ کے لیے بھی اس خوشی سے محرومی کا غم دے دیا ہے۔“

”ایک منٹ خیام صاحب! یہ بات صرف میرے، آپ کے اور اماں کے درمیان ہے اور یہیں تک رہنی چاہیے۔ مجھے مارنے کی عادت نہیں ہے۔ آپ بھی آرام کریں اور مجھے بھی اب نیندا رہی ہے۔“

☆☆☆

پور پور جی نایاب سطر کا قفسہ حسن کے دل و جان کو معطر کر رہی تھی۔ حسن نے دھیرے سے اس کا گھونگھٹ ہٹایا تو زرتار دوپٹے کے ہالے میں جگمگا تا روپ دیکھ کر اپنی ہی



قسمت پر رشک کرنے لگا۔ بچپن کی محبت کو پالینے کے بعد دونوں ہی سرشار تھے۔

محسن ان کے خاندان کا واحد مرد تھا، جو اس گھرانے سے منسلک رہا تو اس لیے کہ نایاب سے بچپن کی محبت تھی۔ وہ نایاب کے ابو کے چچا زاد بھائی کا اکلوتا بیٹا تھا اس کے والدین فوت ہو چکے تھے معمولی سی تعلیم اور معمولی سے کام کاج والے محسن کو حجاب نے امریکہ بھوانے کا وعدہ کیا تھا تا کہ وہ اسے مستقبل کو مضبوط بناسکے اور ترقی کے اچھی نہیں لگتی۔ محسن کو بھی نایاب کے ساتھ یہ وعدہ بہت بھلا لگا۔ شریکوں نے دانتوں تلے اگلیاں تو اسی وقت داب لی تھیں جب حجاب اور خیام مرزا کا عقد ہوا تھا۔ پر اب جب مٹھائی اور بھلوں کے ٹوکروں کی سوغات ان کے در پہ پہنچی تو وہ سب ہک دک رہ گئے۔ حجاب مرزا امید سے تھی۔ خیام مرزا اب اپنے بننے والے تھے۔ حیرت سے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے اور جہاں نے ہاتھ مار مار کر سارے ٹوکریں نکھیر دیے تھے۔

تنی ہوئی صراحی دار گردن کے ساتھ حجاب کا حسن آج بھی بالکل دیا ہی تھا۔ وقت تو گویا اس کو چھو کر گزر گیا تھا۔ حجاب نے کچھ اسانس لیا اور قریب پرڈی رانگ جینز پر بیٹھ کر سوچ میں مگ ہو گئی۔ اسے ایک بار پھر سوچنا تھا۔ ہارنا نہیں تھا۔

☆☆☆

”پاپا آخر برائی کیا ہے، مٹی میں۔ آخر مام کیوں ضد میں آ گئی ہیں۔ وہ تو ہمیشہ میرے منہ سے نکلی بات کو پورا کرنے کی عادی ہیں۔“ شارب نے سوالیہ انداز میں خیام مرزا کو دیکھا۔

”تم اپنی مام کو اچھی طرح جانتے ہو۔ شابی! وہ جو ٹھان لیتی ہیں پھر اس میں رد و بدل ہرگز برداشت نہیں کرتی ہیں۔ بہتر ہے کہ تم اپنی ضد چھوڑ دو۔ اگر حجاب نے انکار کیا ہے تو یقیناً اس کے پیچھے کوئی بڑا ریزن (وجہ) ہوگا۔“ خیام مرزا نے نگاہ چراتے ہوئے شارب کو جواب دیا۔

”لیکن پاپا! میں بھی ان ہی کا بیٹا ہوں۔ دھن کا پکا، اگر انہوں نے ہارنا نہیں سیکھا تو میں بھی جیتنے کا عادی ہوں۔ یہ بات آپ انہیں بتادیں۔“ فیصلہ کن انداز میں کہہ کر شارب رکنا نہیں لاؤنچ سے نکل گیا۔

”حجاب بیگم آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کے اس راز داری سے کیسے گئے فیصلے نے آج ہمیں کس موڑ پر لاکھڑا کیا ہے۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ آپ پوری سچائی شارب کو بتادیں۔ ورنہ کل وہ جس سچ کا سامنا کرے گا وہ سچ ایسے اپنی ہی نظر میں گراوے گا۔“ خیام مرزا کے لہجے میں کئی کھلی ہوئی تھی۔

”کیا بتا دوں مرزا صاحب؟ یہ کہ وہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ یہ کہ وہ جس لڑکی کو پسند کر بیٹھا ہے وہ اس کی خالہ نایاب کی بیٹی ہی نہیں اس کی مکی بہن بھی ہے۔ نہیں ہوگا مجھ سے یہ؟ مجھے کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈنا ہوگا۔ آپ جانتے ہیں تاکہ یہ سب بتانے کا رد عمل کیا ہوگا شارب کی طرف سے؟“

”کون سا دوسرا راستہ حجاب! ساری زندگی آپ کے بنائے دوسرے راستوں پر چلتے گزاری میں نے۔ کاش میں نے اس وقت سختی سے آپ کو اس ڈرامے سے روکا ہوتا جب آپ نے اپنے امید سے ہونے کا نایاب کیا اور نایاب کی پہلی اولاد کی شرط پر اس کی شادی محسن سے کرائی کہ وہ پہلی اولاد آپ کو دے گی۔ پوری راز داری سے آپ کا کھلیا یہ ڈراما آج خود آپ کی زندگی کی سب سے بڑی مشکل بن گیا ہے، کس قدر خوفناک انجام ہونے والا نکلا ہے آپ کے اس اقدام کا.....!“

”خیام آپ کو ریست کی ضرورت ہے آپ سو جائیں۔ میں خود اس مسئلے کا حل نکال لوں گی۔ حجاب نے اپنے سائیڈ پر رکھے لیپ کفاف کیا اور کروٹ بدل لی۔

وہ اپنے گال پر ہاتھ رکھے حیران نظروں سے سامنے کھڑی محبتوں سے گندمی خالہ کو دیکھ رہا تھا۔ خرابیا کیا کہہ دیا تھا اس نے کہ نایاب خالہ نے اس پر ہاتھ اٹھالیا۔

”شارب! پہلی ایسا نے تمہیں اندھیرے میں رکھا تو میں نے بھی خاموشی اختیار کرنے کا جرم کیا۔ لیکن ہم اپنی اپنی خود غرضی میں بھول گئیں کہ وقت ہم دونوں کی خود غرضی کی سزا اتنی بد صورتی سے ہمارے سامنے رکھے گی لیکن اب نہیں! کم از کم میں اب چپ نہیں رہوں گی۔ اگر تم صرف حجاب کے بیٹے ہوتے میرے بھانجے ہوتے تو شاید میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی اور تمہاری خواہش پوری کرنے کے لیے حجاب آپا کی خواہش کو بھی بالائے طاق رکھ دیتی۔ ایک اور خود غرضی کر بیٹھتی، لیکن..... لیکن شارب

جذبوں سے آگاہ تھی اور نہ ہی یہ جان پائی تھی کہ شارب اس کا بھائی ہے۔ وہ محض اس کے لیے اس کا خالہ زاد تھا۔ البتہ وہ بیمار ہے یہ اسے پتا تھا اور وہ بدستور دعاؤں میں مشغول تھی۔ لاعلمی بھی ایک نعمت ہے اور صحتی کو اس نعمت سے اللہ تعالیٰ نے مالا مال رکھا تھا۔

”میں کب بچکی سے حجاب بنی اور کب حجاب بھی نہیں رہی۔ بس ایک ایسی عورت بن گئی جس کا بچپن، جس کی گڑیا، دال روٹی کی ٹکڑوں کی نذر ہوئی۔ جس کی الطمر عمر کے سینے تلکے کے نیچے بے موت مر گئے۔ سلیمان کے ساتھ شادی نے حجاب کو واپس لوٹا دیا تھا لیکن اس کی موت نے ایک بار پھر اسی کھائی میں لا پھینکا۔ کیا قصور تھا میرا؟ وہ آئینے میں نظر آتے عکس پر چلائی۔

”تمہارا قصور تھا تمہاری انا، تمہارا غرور، تمہاری ضد و خود غرضی۔ حجاب تم بے قصور نہیں ہو۔ تم نے تاوان مانگا ہر ایک سے اپنی قربانیوں کا تمہارا قصور تھا وہ جھوٹ وہ ڈراما جو تم نے جائیداد کی حرص میں کھلیا۔ وہ جائیداد جو تمہاری تھی بھی نہیں، تم بے قصور نہیں ہو تم ظالم ہو، خود غرض ہو، کسی کی ممتا سے کھینے والی۔ آج دیکھو اس کا انجام..... تمہارا لاڈ لاگنی چنی سانس لے رہا ہے تو تمہاری وجہ سے۔ اب کس کو سونپو گی یہ میراث جس کے لیے یہ سب کیا۔

تم نے سوچا کہ شارب اگر بچ گیا تو کیا وہ اپنے آپ سے آنکھ ملایا ہے گا تم نے مقدس رشتوں میں ملاوٹ کا زہر گھولا۔ تم گناہگار ہو حجاب!“ عکس نے اسے ہر بات کا جواب دیا۔ وہ لٹے ہوئے مسافر اور ہارے ہوئے جواری کی طرح خالی ہاتھ رہ گئی تھی۔

تم میرے بیٹے ہو..... میرے بچے بیٹے..... مٹی کے گئے بھائی۔ نایاب نے روتے ہوئے اپنے سینے پہ ہاتھ مارا۔ شارب کو لگا ٹکڑے کی چھت اس پر آگری ہو۔ اس کے اعصاب تن گئے۔ اس کے کانوں میں سننا نہ ہو رہی تھی اور دماغ کچھ بھی سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہو رہا تھا۔

”یہی شرط رہی تھی میری بڑی بہن نے کہ خیام مرزا سے شادی کروں ورنہ محسن سے شادی کی صورت میں اپنی پہلی اولاد پوری رازداری سے ان کے نام لکھوں۔ وہ اپنی محرومیوں کا بدلہ عمر بھر دنیا سے لیتی رہیں اور میں نے محسن کو ماننے کے لیے تمہارا سودا کر دیا اپنے جگر گوشے کا سودا۔ لیکن تقدیر نے ہمیں ایسی کڑی سزا دی کہ ہم اپنے آپ سے بھی آنکھ نہیں ملا سکتے..... اب.....“ نایاب کی بات ابھی ادھوری تھی کہ شارب کھڑے قد سے وہیں گر پڑا۔ نایاب کے منہ سے دل دوزخ نکلی۔

”تو حجاب مرزا تم جو ہمیشہ جیتنے کے نشے میں سرشار ساری زندگی کو شطرنج کی بساط بنائے رہیں، ہر مہرہ اپنی مرضی سے چلتے، اپنی محرومیوں کو تسکین دینے میں من ہو کر ہر رشتے کے ظرف کو آزماتی رہیں۔ ہر آنے والے دن کی کامیابی سے تمہیں آس پاس نظر آتا بند ہو گیا۔ زندگی کے فریم میں تمہیں صرف اپنی ”میں“ نظر آئی اور کچھ نہیں۔“ کرسی پر اضطرابی انداز میں آگے پیچھے جھولتی کاپی لباس میں ملبوس حجاب آج سالوں بعد اپنا چہرہ کر رہی تھی۔ اس کے دوپٹے کا پلو زین کو چھو رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے آنکھیں سرخ لیکن خشک تھیں۔

اٹنی بڑی ہیں ریت پر میری ساری کشتیاں وہ لے گیا میری آنکھ سے سمندر نکال کر اسپتال کی بج پوار سے ٹیک لگائے نایاب زمین پر بیٹھی تھی۔ محسن وقتاً فوقتاً اس پر پریشانی بھری نظر ڈال رہا تھا۔

خیام مرزا نے آئی سی یو کے ششے سے آنکھ چپکا رکھی تھی۔ جہاں شارب مشینوں کے درمیان مصنوعی سانس لے رہا تھا۔ نروس بریک ڈاؤن انتہا ترین تھا کہ وہ کو سے میں چلا گیا تھا۔

بس بے خبر تھے تو صحتی اور عزم..... نایاب کے دونوں چھوٹے بچے۔ یہ مقام شکر تھا کہ صحتی نہ تو شارب کے



# فن پارے

دیس بدلیں نئے اور پرانے لکھاریوں کی  
رنگارنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھولیں گے

اقصیٰ سحر	محبت، مجسم نور
حسن تحریر	ضمیر
عنبرین اختر	مہمان
حنا اشرف	معانی
فہمیدہ غوری	اب پچھتاوے کیا ہوت
موم جٹ	سلسلہ

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم شیا ہوش میں ہوناں تم؟“  
 ”نت ..... تم ایسا کیسے کر سکتی ہو؟ تم نے اپنے جذبات پر قابو کیوں نہیں پایا؟ تمہیں اچھی طرح سے اندازہ ہے کہ اگر کوئی تمہاری یہ بے وقوفانہ کواس سن لے تو تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔“  
 شیا کی بات نے پوجا کے اوسان خطا کر دیے تھے اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنے غصے کا اظہار کرے بس ایک ہی سانس میں جودل میں آیا پلوتی چلی گئی تھی۔

”کیا تم نہیں جانتی تمہارا تعلق کس مذہب سے ہے؟“ پوجا نے اس کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا تھا۔  
 ”میرے نزدیک ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے دیدی۔“ شیا نے پوجا کے دونوں ہاتھوں کو جھکنے ہوئے کہا۔  
 ”مذہب کا فرق اور یہ تمام باتیں جو آپ مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہی ہیں دی اس شخص کے سامنے ان سب چیزوں کی کوئی وقعت نہیں ہے۔“

”اور میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ایک بار آپ اسے دیکھ لیں گی تو آپ بھی سب باتوں کو فراموش کر کے اس کے حرم میں بری طرح سے گرفتار ہو جائیں گی جس طرح سے میں ہو گئی ہوں۔“

”ہاں وہ ایسا ہی ہے جسے صرف اور صرف چاہا جاسکتا ہے۔“ شیا آنکھیں بند کئے ایک جذب کے عالم میں کہہ رہی تھی۔  
 اور پوجا اس کی لرزئی پلکوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں آنے والے طوفان کے ٹل جانے کی دعا مانگ رہی تھی۔  
 ”اسے تو خود ذرا بھی اندازہ نہیں ہوگا کہ کوئی اس کو ایک نظر دیکھ کر کیسے بے خود ہو جاتا ہے اپنی سدھ بدھ کھودتا ہے وہ تو بس اپنے آپ میں ہی مگن رہتا ہے۔“

شیا کپکپی اور ہی کیفیت میں ڈوبی ہوئی تھی۔  
 ”ہوش کے ناخن لو شیا تم اس وقت بالکل پاگلوں والی باتیں کر رہی ہو۔“

وہ جو اپنے خیالوں کی دنیا میں اپنے من پسند ہم سفر کے سنگ محو سفر تھی پوجا کی تیز آواز اسے واپس حال میں لے آئی تھی اور اس نے آنکھیں کھول دیں تھیں۔ لمحے بھر کو وہ اپنا آپ ہی بھول گئی تھی۔

”یہ دیوانگی بھی اسی محبت کی عطا ہے میں خود کو اسے سوچنے پر مجبور پاتی ہوں۔“  
 ”میں کیا کروں دیدی؟ میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔“ شیا نے اپنے لہجے میں انتہائی بے چارگی سموتے ہوئے کہا۔

پوجا تو اس کی حالت دیکھ کر ہی دنگ رہ گئی تھی شیا کی باتیں سن کر وہ اچھی طرح سے جان گئی تھی کہ اب اسے سمجھنا فضول ہوگا لیکن وہ یہ بات کہے بغیر انداز کر سکتی تھی کہ جس کے عشق میں شیا سر تا پیر ڈوب چکی ہے وہ ایک مسلمان تھا اور مذہب کا فرق کوئی معمولی بات نہیں تھی کہیں ایسا نہ ہو کہ شیا اس کے عشق میں اپنا مذہب ہی بدل دے پوجا اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی پاداش میں شیا کے ساتھ کتنا برا ہو سکتا تھا لیکن فی الوقت وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھی یا پھر جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی۔

اس کی آنکھوں پر محبت نامی پٹی بندھی ہوئی تھی اور یہ بات پوجا کے لئے انتہائی تشویشناک تھی۔

☆☆☆☆

شیا اپنا لکچر لے کر اسٹاف روم میں آئی تو اس کی نظریں از خود اس مخصوص گوشے کا جائزہ لینے لگیں جہاں وہ پایا جاسکتا تھا۔



اس شخص کی ایک جھلک اس کی بے قرار آنکھوں کو راحت بخشنے کا ذریعہ بنتی تھی وہ نہ نظر آئے تو آنکھوں کی بے چینی اپنے عروج پر ہوتی تھی۔

اور اب جب شیا کی نگاہوں نے پورے اسٹاف روم کا طواف کر لیا اور اسے کہیں نہ پایا تو تھک ہار کر واپس پلٹ آئیں اور وہ بھی اپنا بوجھل وجود لئے کھڑی ہو گئی۔

شیبا جانتی تھی کہ اسٹاف روم کے علاوہ وہ کہاں پایا جاسکتا ہے سو خاموشی سے اٹھی اور لائبریری کی طرف چل دی۔ اس کا اندازہ درست نکلا تھا وہ جوں ہی لائبریری میں داخل ہوئی اس کی سماعتوں سے رخ موڑے حظلہ کی دھیمی مگر مانوس سی آواز نکل کر آئی وہ بلاشبہ سورہ رمن کی تلاوت کر رہا تھا اس کی آواز میں بلا کا سوز اور محاسن تھی وہ دوسری سورتوں کی بھی تلاوت کرتا تھا لیکن زیادہ تر سورہ رمن کی تلاوت کرتا تھا۔ شیا اس زبان سے نا آشنا تھی لیکن اسکول میں ٹیچنگ کے دوران اس کو اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ عربی زبان ہے اور اللہ کا کلام بھی عربی زبان میں ہے۔ وہ بغیر کسی تردید کے اس بات کا اعتراف کرتی تھی کہ یہ بہت خوب صورت اور دل گداز کلام ہے پھر حظلہ کی آواز میں ہی کوئی ایسا عرصہ تھا جس میں وہ ڈوب ڈوب جاتی تھی۔ وہ لاکھ کوشش کرتی خود کو اس بحر سے نکالنے کی لیکن اس کی ہر کوشش بے سود جاتی تھا ختمک ہار کر اس نے اپنی ہر کوشش ترک کر لی تھی اگرچہ ابھی تو وہ اس کے معنوں سے بھی ناواقف تھی۔

☆☆☆

حظلہ کو ان کا اسکول جوائن کئے کم و بیش تین مہینے ہی گزرے تھے وہ دینیات اور ریاضی کا استاد تھا اول تو وہ خود بے تکلف نہیں ہوتا تھا اور دوسرا اسے اسکول جوائن کیے بہت ہی کم عرصہ گزرا تھا۔ اس لیے کوئی بھی اس کے بارے میں تفصیل سے نہیں جانتا تھا۔

”ایکسپوزیٹس آپ کو کوئی کام تھا؟“ شیا کب سے لائبریری کے دروازے کے پتھوں بچ کھڑی اپنے خیالوں میں مگن تھی۔ ”حظلہ کو مجبوراً اسے مخاطب کرنا پڑا۔

”نہیں..... نہیں تو.....“ شیا کو احساس ہوا کہ وہ راستے روکے کھڑی ہے تو فوراً جواب دیتے ہی سائیڈ پر ہو گئی اور اسے گزرنے کا راستہ دیا۔

حظلہ دھیمی آواز میں شکریہ کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ شیا کی نظروں نے حظلہ کی پشت کا دور تک چھپا کیا تھا۔ اس نے آج تک حظلہ جیسا شخص نہیں دیکھا تھا بات کرتے ہوئے اس کی نگاہیں زمین میں ہی گڑی رہتی تھیں کبھی اس نے نظر نہ اٹھا کر تو کیا نظر اٹھا کر بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی وہ باقی سب لوگوں سے کس قدر مختلف تھا شیا کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا۔

پریڈنٹل جی تو وہ ایک بار پھر خیالوں سے چوکی اور سر جھٹکتے ہوئے جماعت ششم کی طرف بڑھی۔

☆☆☆

”کیا بات ہے شیا تم آج کل کہاں کھوٹی کھوٹی رہتی ہو؟“ عائشہ نے دھپ سے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا اور چائے کا کپ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

شیبا جو اپنی سوچوں میں مگن تھی چوکتے ہوئے سر اٹھایا اور دم صم سے انداز میں عائشہ کی طرف دیکھنے لگی۔

”اے کہاں کھوٹی ہو تم؟“ عائشہ نے اس کے آنکھوں کے سامنے چٹکی بجا لی۔

”کہیں نہیں۔“ شیا نے کھوئے کھوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے سر ہلا دیا۔

”عائشہ تمہیں یاد ہے تم نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ سر حظلہ تمہارے محلے میں رہتے ہیں۔“ شیا نے کپ کے اندر مقید

سیال مادے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بتایا ہوگا میں نے۔“ عائشہ نے چائے کاسپ لیتے ہوئے کہا۔ اس کا سارا دھیان چائے پر تھا۔

”تم ان کے بارے میں جو بھی جانتی ہو مجھے بتا سکتی ہو؟“ شیبانے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”لیکن کیوں تم ان میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہو؟“ عائشہ نے اجنبی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

جہاں تک وہ شیبہ کو جانتی تھی وہ مذہباً ہندو تھی مگر آج تک اس نے شیبہ کے منہ سے کبھی کسی لڑکے کا نام نہیں سنا تھا اور

اب یوں اچانک وہ سر حظلہ میں دلچسپی لے رہی تھی تو یہ کافی تشویشناک بات تھی۔

”میں زیادہ کچھ نہیں جانتی ان کے بارے میں لیکن میں معلوم کر سکتی ہوں۔“

شیبانے اس کے سوال کے جواب میں خاموش رہی تو عائشہ نے بھی مزید پوچھنا مناسب نہیں سمجھا دیسے بھی شیبہ کچھ

دن سے کافی پریشان نظر آ رہی تھی شاید اس پریشانی کا تعلق بھی حظلہ سے جڑا تھا۔

”مجھے ان کے بارے میں تمام ضروری معلومات جانتی ہے عائشہ اور تمہاری مدد کے بغیر یہ مشکل ہے۔“ شیبانے اس

کے دونوں ہاتھوں کو تھامتے ہوئے انتہائی لجاجت سے کہا تھا۔

عائشہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس پر کیا رد عمل ظاہر کرے تاہم شیبہ کی آس بھری نگاہوں کو دیکھتے ہوئے عائشہ نے اس

کے ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے حامی بھر لی تھی۔

☆☆☆

شیبا جانتی تھی کہ وہ آگ میں کود رہی ہے پوچھا تو اسے سمجھا سمجھا کر تھک ہی گئی تھی عائشہ نے بھی اسے متعدد بار سمجھایا

اسے آگ کے نتائج سے ڈرانے کی کوشش کی لیکن سب بے سود شیبہ کوئی بچی نہیں تھی وہ ہر بات سمجھتی تھی لیکن وہ بے بس تھی

اپنی محبت کے ہاتھوں بالکل بے بس اور اسی وجہ سے اس نے ایک انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

عائشہ نے جو کچھ حظلہ کے بارے میں بتایا اس کا لب لباب یہ تھا حظلہ کے والد جواب تاحیات نہیں ہیں مسجد کے

پیش امام تھے۔ حظلہ گھر میں سب سے بڑا اور دو بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے والد کے گزر جانے کے بعد تمام ذمہ داری حظلہ

پر آگئی تھی۔ اس نے ابھی حال ہی میں ایم اے اسلامیات کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اسکول کالج اور ٹیوشن وغیرہ میں اپنی

خدمات دے کر کسی طرح وہ اپنی گزر بسر کرتا ہے اور اس کے علاوہ عائشہ نے بتایا کہ حظلہ کی ماں آج کل اس کے لئے

لوہی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

شیبا خاموشی سے نیچے سر جھکائے کاغذ پر بے مقصد لکیریں ڈالتے سب سن رہی تھی یہاں تک کہ عائشہ اپنی بات پوری

کیے چند ثانیے گزر گئے تو شیبانے اپنا جھکا سر اٹھایا۔

”عائشہ..... تم..... میں..... اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں میں دائرہ اسلام میں داخل ہونا چاہتی ہوں۔“

شیبانے کپکپاتے ہونٹوں سے عائشہ کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے دھماکا کیا تھا۔

عائشہ کو تو گویا سانپ ہی سونگھ گیا تھا وہ یک نیک شیبہ کی طرف دیکھتی اپنی سماعتوں پر یقین کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ

شیبا کی آواز پھر سنائی دی۔

”تم میری مدد کرو گی تا عائشہ مجھے کسی مولوی کے پاس لے جاؤ میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں۔“

عائشہ جو اس کے منہ سے ایسی بات سن کر دم بخود رہ گئی تھی اس کے دوبارہ دہرائے جانے پر چونکی ایک ناقابل بیان

خوشی کا احساس اس کی رگ و پے میں دوڑ گیا تھا اس نے بے خود ہو کر شیبہ کو گلے سے لگا لیا تھا۔

وہ شیبہ کو کافی عرصے سے جانتی تھی اس کے رکھ رکھاؤ اور کردار سے متاثر تھی اس کے کردار میں عائشہ نے آج تک کوئی



قابل اعتراض بات نہیں دیکھی تھی کئی بار اس کے دل میں یہ ہوک اٹھتی تھی کہ کاش شیا مسلمان ہوتی عائشہ کے دل میں جانے کب سے شیا کو مسلمان دیکھنے کی خواہش تھی اور آج اس کی وہی خواہش حقیقت کا روپ لیتی نظر آرہی تھی۔

لیکن شاید شیا نے یہ فیصلہ حظلہ کی محبت میں کیا تھا اگر ایسا تھا تو اسے سمجھانا ضروری تھا۔  
”دیکھو شیا تم کوئی بچی تو ہو نہیں جسے میں اس کے انجام سے ڈرانے کی کوشش کروں لیکن تم ایک بار پھر سوچ لو بلکہ میں کہوں گی کہ تم حظلہ سے بات کرو پہلے۔“ عائشہ نے اسے اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کی۔

مگر شیا کے فیصلے پر کوئی فرق نہیں پڑا وہ جانتی تھی کہ اب جب وہ حظلہ کے سامنے جائے تو اس کے رنگ میں رنگ کرتا کر وہ اس کے سامنے خود کو چھوٹا اور کم تر محسوس نہ کر سکے وہ حظلہ کے کردار سے متاثر تھی۔ وہ حظلہ کے اسلام سے متاثر تھی جس کی تعلیم حظلہ کے کردار سے روشنی کی صورت پھوٹی تھی۔ وہ اس حد تک متاثر ہو گئی تھی کہ اس کے سامنے اب اسے اپنا مذہب اور اپنا وجود انتہائی سچ گلنے لگا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنی زندگی تمام گزرے سال ایک تاریک سرنگ میں گزرا دیے تھے اور اب حظلہ کی صورت اسے سرنگ سے نکلنے کا راستہ روشنی کی ایک کرن دیکھائی دی تھی وہ اپنے فیصلے پر انتہائی مسرور تھی۔  
عائشہ نے پھر بھی اسے سوچنے کے لیے دو دن کا وقت دیا تھا۔ لیکن دو دن بعد بھی شیا کے فیصلے پر کوئی فرق نہیں پڑا۔

☆☆☆☆

عائشہ اپنی بھائی کے ساتھ کچھ ضرورت کی چیزیں لینے مارکیٹ آئی ہوئی تھی۔  
واپسی میں روڈ کراس کرنے لگی تو بے دھیانی میں اس کا کسی سے ٹکراؤ ہو گیا بڑی مشکل سے اس نے خود کو گرنے سے بچایا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں موجود شارپرز زمین پر ڈھیر ہو گئے تھے۔  
مارے کو فٹ کے اسے بے تحاشا غصہ آ گیا۔

”اندھی ہو کیا دیکھ کر نہیں چل..... مریم؟“ وہ ٹکرانے والی کی صحیح سے کلاس لینا چاہتی تھی مگر مریم کو دیکھ کر حیران رہ گئی اس کی زبان یک دم کو بریک لگ گیا تھا۔

”مریم تم یہاں اس حلیے میں مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟“ دو دن پہلے عائشہ شیا کو ایک عالم کے پاس لے گئی تھی جہاں اس نے اسلام قبول کیا اور اس کا نام مریم رکھ دیا گیا تھا۔

مریم نے طے کیا تھا کہ اب وہ گھر والوں کو حظلہ کے بارے میں بتا دے گی کیونکہ اب تو وہ ان کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتی تھی اور پھر حظلہ کے پاس چلی جائے گی اسے بے حد یقین تھا اپنی محبت پر اور اب مریم کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی تھی وہ تو حال سے بے حال تھی۔

بالکل اجڑی ہوئی حالت بکھرے پال۔

”میرا نام مریم نہیں ہے..... نہیں ہوں مریم میں تم جانے دو مجھے چھوڑ دو مجھے میرے حال پر۔“ شیا نے ہڈیانی انداز میں چلاتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو جھٹکتے ہو وہاں سے جانے کی کوشش کی۔

”مریم تم میرے ساتھ چلو آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ عائشہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسے گاڑی میں بٹھایا تھا۔

وہ گھر پہنچ گئے تو عائشہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔

”اب مجھے بتاؤ کہ ہوا کیا ہے تم حظلہ کے پاس گئی تھیں ناں پھر؟“  
پانی کا گلاس مریم کو دے کر عائشہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆☆

شیبا اسلام قبول کر کے گھر گئی تو وہاں سب اس کے ہی منتظر تھے پوچھا کہ اس سے ڈر لگنے لگا تھا اس لیے اس نے مام ڈیڈ کو بتا دیا تھا تا کہ وہ اسے سمجھا سکیں۔

ڈیڈ نے گھر میں داخل ہوتے ہی اس کو کٹھنرے میں کھڑا کر کے پوچھا کہ پوچھا جو بتاتا رہی ہے کیا وہ صحیح ہے تم کسی مسلمان سے محبت کرتی ہو؟ اس نے اثبات میں سر ہلادیا کیونکہ اب انکار کرنے کا کوئی جواز نہیں بننا تھا وہ تو اب خود مسلمان ہو چکی تھی۔

اس کی حامی بھرنے کی دیر تھی گالیوں اور برے کلمات کا ایک طوفان اس کے ماں اور باپ کے منہ سے جاری ہو گیا تھا جسے وہ سر جھکائے خاموشی سے سنتی تھی۔ پوچھا بھی ایک طرف کھڑی تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی جب اس کے مام ڈیڈ کا دل کچھ ہلکا ہوا تو انہوں نے اس کے اسکول جانے پر پابندی لگا دی اور وہ جانتی تھی کہ ان کا اگلا قدم یہ ہوگا کہ وہ اسے جلد از جلد کسی کے ساتھ رخصت کر دیں گے۔ جواب وہ کسی صورت بھی قبول نہیں کر سکتی تھی۔

شیبا گھر والوں کے لیے ایک خط جس میں اس نے اسلام قبول کرنے کا اعتراف کیا تھا لکھ کر گھر چھوڑ آئی تھی اس نے حظلہ کو ایک کافی کارز میں بلایا تھا۔ حظلہ آتو گیا تھا مگر وہ خاصا اچنبھے کا شکار تھا۔

☆☆☆.....

”یہ نہیں ہو سکتا آپ کو ایسا قدم اٹھانے سے پہلے ایک بار تو پوچھنا چاہیے تھا۔“ حظلہ نے اس کی بات سنتے ہی قطعی انداز میں شبا کو سارے گمانوں کو پانی میں بہا دیا تھا۔

”لیکن کیوں نہیں ہو سکتا؟ جہاں تک میری معلومات ہیں آپ کسی کو پسند بھی نہیں کرتے تو پھر کیا اعتراض ہے جبکہ میں آپ کا مذہب بھی قبول کر چکی ہوں۔“ شبا نے اپنے پیروی زدہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا تھا اسے حظلہ کا حصول اب بہت مشکل لگنے لگا تھا۔

”اصل اعتراض ہی یہی ہے آپ نے آج میری وجہ سے اسلام قبول کر لیا ہے اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کل آپ کسی اور کی وجہ سے اسکا مزہب قبول نہیں کر سکتی ہیں۔“ حظلہ سے شبا کو اس سفاکانہ اور گری ہوئی بات کی قطعاً امید نہیں تھی وہ ششدری اس کی طرف نکلتی رہی۔

”اور اگر میں ان تمام شکوک و شبہات کو نظر انداز کر بھی دوں تو بھی میں اپنی نسل آگے بڑھانے کے لیے ایسی عورت کا انتخاب نہیں کر سکتا جو خود بے دین رہ چکی ہے اور دین کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تو بھلا وہ میری اولاد کو کیا بتائے گی۔“ دیکھیں آپ نے اسلام قبول کیا بہت اچھی بات ہے لیکن میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آپ نے اپنی مرضی سے اس راستے کا انتخاب کیا ہے لیکن پھر بھی میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ میرا خیال دل سے نکال دیں اور اپنے آپ کو مزید مشکلات میں مت ڈالیں گھر واپس چلی جائیں۔“

اپنی بات ختم کرتے ہی حظلہ نے بانیک کی چابیاں اور والٹ اٹھایا اور ایک نظر اس کے دھواں دھواں چہرے پر ڈال کر چلتا ہوا۔ مریم اپنے خالی وجود لیے نجائشی دیر مزید بیٹھی رہتی اگر ویٹر کی آواز اسے واپس حال میں نہ لے آئی اور پھر وہاں سے نکل آئی وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں جائے گی اور نہ ہی وہ اس وقت اپنے ہوش و حواس میں تھی کہ کوئی فیصلہ کر پاتی اس کے وجود میں حظلہ کی کاٹ دار باتوں کے بستر چھ رہے تھے اور وہ زخم زخم ہوتی چلتی جا رہی تھی۔

”یہ ٹھیک ہے کہ اس نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ حظلہ کی وجہ سے کیا تھا مگر سوال یہ تھا کہ حظلہ ہی کیوں کیوں وہ آج تک کسی اور سے اس طرح سے متاثر نہیں ہو سکی جیسے حظلہ سے ہوئی ہے۔ اس کا جواب بہت ڈھونڈنے پر اسے ادراک ہوا کہ دراصل وہ حظلہ سے متاثر ہی دین اسلام کی وجہ سے ہوئی۔ اس کی شرافت، اس کی آواز کے سوز و گداز جس کے ساتھ وہ



حلاوت کرتا تھا، مریم کو حظلہ کی سورہ رحمان کی تلاوت یاد آئی اور اس کی نگاہوں کی حیا۔ مریم کو اس کی جھکی نگاہیں یاد آئیں جس نے اسے اپنا اسیر کیا تھا کہ جس دین کی پیروی کرنے والے لوگ ایسے ہیں وہ دین کیسا ہوگا اور اب حظلہ کی سوچ نے نہ صرف اس کے بت کو پاش پاش کیا تھا بلکہ اس کا خود کا وجود بھی ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ اس نے مریم کو اپنے آپ سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کیا یہ ہے دین اسلام؟ اور اس کے لیے اس نے اپنے گھر والوں کو چھوڑ دیا وہ تو کہیں کی بھی نہیں رہتی تھی۔

.....☆☆.....

عائشہ نے مریم کو نیند کی گولی دے کر سلا دیا تھا۔ وہ حظلہ کے ساتھ ساتھ اسلام سے بھی بدظن ہو گئی تھی اب اسلام میں اس کے لیے کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ وہ دونوں بہن بھائی دوسرے کمرے میں بیٹھے آپس میں اس سارے معاملے کو دسکس کر رہے تھے۔

حظلہ کے جواب سے عائشہ کو بھی بے حد افسوس پہنچا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کچھ مسلمان بے حد سطحی سوچ کے حامل ہیں ان کے لیے اسلام صرف فرض نمازوں تک محدود ہوتا ہے اور یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو بظاہر نماز روزے کے پابند ہوتے ہیں مگر جب کوئی قربانی دینے کی بات آتی ہے تو ان کے ظرف کا پیالہ انتہائی چھوٹا پڑ جاتا ہے اسی وجہ سے اس نے مریم کو سمجھایا تھا کہ اسے پہلے حظلہ سے بات کرنی چاہیے مگر ان سب باتوں کو سمجھنے کے باوجود اسے حظلہ کے جواب نے بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ اس کی وجہ سے ہی اسلام کا ایک ایجینا تھا مریم کی نظر میں جس وہ متاثر ہوئی تھی اور اب اس کی وجہ سے ہی وہ اسلام سے بدظن ہو گئی تھی۔

عائشہ اور عباد نے طے کیا کہ وہ سب سے پہلے مریم کو بدرے میں داخل کراتے ہیں تاکہ وہ اسلام کو ٹھیک طرح سے سمجھے اور اس کے بعد فیصلہ کرے کہ کیا وہ اب بھی پلٹنا چاہتی ہے اور تب تک وہ ان کے ساتھ ان کے گھر پر رہے گی کیونکہ اب تو اس کے گھر والے بھی اس کی جان کے در پر ہوں گے۔ تمام باتیں طے کرنے کے بعد جب عباد سونے کے لیے اپنے کمرے میں جانے لگا تو عائشہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

عباد نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے عائشہ میں بھی وہی چاہتا ہوں جو تم چاہتی ہو۔ میں دوسرا حظلہ نہیں بننا چاہتا اس کی نظر میں اور نہ ہی میرے دین نے مجھے یہ تعلیمات دی ہیں۔ اگر مریم اسلام پر قائم رہتی ہے تو میں اس سے اس کی رضامندی کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے تیار ہوں بطور مسلمان اس کی حفاظت کرنا اب ہماری ذمہ داری ہے۔“

دروازے میں کھڑی مریم جو عائشہ کو بتانے آئی تھی کہ کل وہ دارالایمان جانا چاہتی ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے عائشہ کے لیے مشکلات کھڑی ہوں ان کی باتیں سن کر اسے اپنے اسلام قبول کرنے کے فیصلے پر فخر ہوا اور اپنے ارد گرد روشنی کا ایک ان دیکھا ہالہ محسوس ہونے لگا جس کی برکات سے اس کے وجود پر جمائے تمام اندھیرے چھٹ گئے یہ وہی روشنی تھی جسے محسوس کرتے ہوئے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئی تھی محبت اور کشش کا وہ احساس اسی نور سے جڑا تھا حظلہ تو بس ایک وسیلہ بنا تھا۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ دین اسلام وہ نہیں جو حظلہ نے اسے دکھایا بلکہ یہ ہے جو ان بہن بھائی کے اثار میں نظر آ رہا تھا وہ جانتے تھے کہ وہ اس کی وجہ سے کتنا بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں لیکن پھر بھی وہ ہر قدم پر اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھے۔

.....☆☆.....

تیز رفتار دین اس سنان رات میں ایک پرانے فارم ہاؤس کی جانب مڑی اور اس میں داخل ہو گئی۔ وین سے تین لڑکے نکلے، ناصر، وین کے اندر سے کسی کو نکالتے ہوئے بولا۔

”چلو نکلو جلدی کرو۔“

”یہ ایسے نہیں نکلے گی اس کو تحسیت کر اندر لے کے جانا ہوگا۔“ اسد بولا۔

آریان کھڑا دیکھتا رہا ناصر اور اسد نے لڑکی کو زبردستی گاڑی سے نکالا اس کے منہ اور آنکھوں پر کالی پٹی لگائی گئی تھی تاکہ وہ نا تو کچھ دیکھ پائے اور نا ہی کچھ بول پائے یا چیخ پائے۔ لڑکی خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ ناصر آریان کی طرف دیکھ کر بولا ”جا جا کر دروازہ کھول جلدی کرو۔“ آریان دوڑا دوڑا گیا اور اس نے کمرے کے دروازے کی کنڈی کھولی اسد اور ناصر کھینچتے ہوئے لڑکی کو کمرے میں لے گئے اور سامنے پڑے بیڈ پر گر دیا۔ ناصر نے رسی اٹھائی اور لڑکی کے دونوں ہاتھ باندھ دیئے۔ آریان کی طرف دیکھ کر بولا چل پہلے تو پھر ہم یہ کہہ کر اسد اور ناصر کو کمرے کا دروازہ بند کر کے چلے گئے۔

آریان بہت گھبرا ہوا تھا پھر خود کو سنبھالنے کے بعد اس نے پہلے اس لڑکی کی عزت لوٹی اور پھر اس کے دونوں ساتھیوں نے اس کے بعد جب تینوں کمرے سے باہر آئے تو آریان بولا ”اب اس کا کیا کرنا ہے؟“

”کرنا کیا ہے اس کو کہیں بھی گرا دیجئے۔“ ناصر بولا۔

”لیکن اس کی حالت تو دیکھ۔“ آریان نے کہا۔

”تو اس کی حالت کی فکر چھوڑ اور جیسا میں نے کہا ویسا ہی کریں گے۔“ ناصر نے کہا۔

”آج اس کی پہلی بار تھی نا اس لیے۔“ یہ کہہ کر ناصر اور اسد دونوں نے زور کا ہتھ لگایا۔

”اچھا چلو جو بھی کرنا ہے جلدی جلدی کرو۔“ آریان بولا۔

تینوں نے لڑکی کو گاڑی میں ڈالا اور اس کے ہاتھ کھول کر اسے ایک سنان سڑک پر بھیج دیا۔

لڑکی وہاں پڑی رہی پھر ہمت کر کے ابھی اور اپنی آنکھوں اور منہ سے پٹی ہٹائی وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے وہ رو رہی تھی اور روتی ہوئی ایک طرف کو چلی کافی دور پہنچ کر اسے ایک پولیس اسٹیشن نظر آیا وہ وہاں گئی تھانیدار نے جب لڑکی کو دیکھا تو پوچھا ”جی لی بی کیا کام ہے۔“ لڑکی خاموشی سے جا کر کرسی پر بیٹھی اور بولی ”کیا میں ایک فون کر سکتی ہوں۔“

”آپ یہاں فون کرنے آئی ہیں۔“ تھانیدار نے پوچھا۔ لڑکی خاموش رہی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔

”لگتا ہے آپ کسی مشکل میں ہیں چلیں کر لیں فون۔“ تھانیدار نے ہمدردی جتائی۔

لڑکی نے فون ملایا اور روتے ہوئے بولی ”امی میں آنیہ بول رہی ہوں۔“

”میری بیٹی کہاں رہ گئی ہے تو میں اور تیرے ابو کب سے پریشان ہو رہے ہیں۔“ آسیہ خاتون نے فکر مندی سے کہا۔

”امی بس میں آپ کو ایڈرس بتاتی ہوں پلیز مجھے لینے آ جائیں۔“ آسیہ نے تھانیدار سے ایڈریس پوچھا اور اپنی ماں کو بتایا۔

”لیکن بیٹا تو رو کیوں رہی ہے اور پولیس اسٹیشن کیسے پہنچی؟“ آسیہ نے بغیر کوئی جواب دیئے فون کاٹ دیا۔

”دیکھو میں بتاؤ کیا ہوا ہے تم تمہاری مدد کریں گے۔“ تھانیدار نے آسیہ سے پوچھا۔

آسیہ روتے ہوئے بولی۔ ”اب آپ کیا مدد کر سکتے ہیں میری عزت لٹی تھی لٹ گئی میری برباد ہو گئی۔“

”عزت..... کیا آپ کا رپ ہوا ہے؟“ تھانیدار حیرت سے کیا۔



”جی بالکل۔“ آنیہ نے کہا۔

”لیکن کس نے کیا؟ کیا آپ جانتی ہیں اسے ہمیں بتا سکتی ہیں۔“

”میں نہیں جانتی انہیں کہ وہ کون تھے میں گھر سے ایک ضروری کام کے لیے نکل تھی واپسی پر مجھے شام کے وقت کسی نے دین میں کھینچ کر ڈالا اور فوراً میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی میرا منہ بھی پٹی سے بند کر دیا گیا تاکہ میں جی ناسکوں بس صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ تین تھے اور تینوں نے میرا رپ کیا وہ ایک دوسرے کا نام تک نہیں لے رہے تھے مجھے کہاں لے کر گئے تھے مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ آنیہ نے روتے ہوئے تھانیدار کو تفصیل بتائی۔

”پھر ہم ان کا پتا کیسے لگائیں گے نا گاڑی کا نمبر معلوم ہے نا جگہ نا کسی کے نام آپ کو چھوڑا انہوں نے کہاں وہ بتا دیں۔“ آنیہ نے اس جگہ کا بتایا جہاں اسے گرایا گیا تھا۔

”ہم پوری کوشش کریں گے کہ انہیں گرفتار کر سکیں۔“ تھانیدار نے آنیہ کی تسلی کرانی چاہی۔

اسی لمحے آنیہ کے والدین اندر داخل ہوئے ان کے اندر آتے ہی آنیہ کھڑی ہوئی اور اپنی ماں کے گلے لگ کر رونے لگی۔

”کیا ہوا میری بچی؟“ آسیہ بیگم از حد پریشان تھیں۔

”آنیہ بیٹی کچھ بتاؤ تو۔“ آنیہ کے والد حامد صاحب بولے۔

”آپ کی بیٹی کا رپ ہوا ہے۔“ تھانیدار اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔

یہ سنتے ہی حامد اور آسیہ کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ حامد کی تو یہ سن کر حالت ہی خراب ہو گئی۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا آنیہ کہہ دے یہ سب جھوٹ ہے۔“ آسیہ نے روتے ہوئے کہا۔

”امی یہ سچ ہے ایک کرواچ۔“ آنیہ نے ماں کے گلے لگے لگے کہا۔

”یہ کیا ہو گیا اے میرے اللہ یہ سب کیا ہو گیا ہم تو برباد ہو گئے۔“ آسیہ بیگم نے دہائی دی۔

”ہماری تو عزت لٹ گئی ساری عمر اتنی عزت سے جیسے آج ایک پل میں عمر بھر کی عزت خاک میں مل گئی۔“ حامد

صاحب بھی رونے لگے۔

”ہم جلد ہی مجرموں کو گرفتار کر لیں گے آپ لوگ فکر نا کریں۔“ تھانیدار سب کو حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔

”کیسے نا کریں فکر ان کمینوں کو گرفتار کرنے سے کیا ہماری عزت لوٹ آئے گی بلکہ اور بھی عزت کا تماشہ بنے گا آپ

مزید ہمیں بدنام نا کریں ہمیں نہیں چاہیے مجرم۔“ حامد صاحب بولے۔

”کیوں بتایا انہیں یہ سب اور کوئی کسر نہیں چھوڑنی منہ کالا کرانے میں۔“ حامد آنیہ کا بازو پکڑ کر بولا۔

آنیہ کو باپ کی بات سن کر ایک دھچکا سا لگا وہ بولی ”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ابو میں نے کچھ جان بوجھ کے تو نہیں کیا اور

مجرموں کو ان کے کیسے کی کم از کم سزا تو ملے۔“

”بالکل نہیں تم ابھی ہمارے ساتھ گھر چلو گی اور ایسا سمجھو کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔“ حامد صاحب بولے۔

”یہ آپ ٹھیک نہیں کر رہے اپنی بیٹی کے ساتھ۔“ تھانیدار دخل اندازی کرتے ہوئے فوراً بولا۔

”بالکل ٹھیک کر رہا ہوں آخر اس کا باپ ہوں۔“ حامد صاحب بولے۔

آنیہ اس حادثے کے بعد ٹوٹ سی گئی تھی وہ سارا دن اسے کمرے میں پڑی رہتی اسے خود سے گمن آنی تھی۔ کبھی اس کا دل کرتا کہ وہ خودکشی کر لے لیکن اللہ کے ڈر سے وہ یہ بھی نا کر پاتی آنیہ کے باپ نے اس کی ماں سے کہا کہ جو بچی کوئی رشتہ آئے ہاں کر دو اب کسی کو متع نا کرنا اب لڑکا جیسا بھی ہو بس ہاں کر دو۔

”ہماری اکلوتی اولاد ہے ایسے کیسے؟“ آسیہ نے مزاحمت کی۔

”اب یہ عزت کا معاملہ ہے اگر کسی کو کچھ پتا چل گیا تو وہ ساری عمر یہیں اس گھر میں گزارے گی یہی اس کے حق میں بہتر ہے شادی ہونے سے اس میں بھی کوئی مثبت تبدیلی آئے گی ابھی تو اس کا دماغ صرف اسی حادثے پر ٹکا ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہیں آپ میں آج ہی ثروت رشتے والی سے بات کرتی ہوں۔“ آسیہ بیگم نے شوہر کے سامنے ہار مانی۔ آسیہ نے ثروت سے کہا کہ اس کی بیٹی کے لیے کوئی بھی رشتہ ڈھونڈ دے۔ ثروت نے بتایا کہ ایک خاتون کو اپنے بیٹے کے لیے آسیہ جیسی ہی نیک اور خوب صورت لڑکی کی تلاش ہے وہ خود کل اس خاتون کو آسیہ کے گھر لے کر آئے والی تھی اس بات کو سنتے ہی آسیہ خوش ہو گئی اس نے حامد کو یہ خوشخبری سنائی آسیہ نے سب سن لیا اور اپنے والدین سے کہا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی وہ کسی کو دھوکا نہیں دینا چاہتی۔

”شادی تو کرنی پڑے گی اور یہ کوئی دھوکا نہیں اگر ہم نے سچ بتا دیا تو تم سے کوئی بھی شادی نہیں کرے گا۔“ حامد غصے سے بولے۔

”نہیں کرنا تو نا کرے میں ساری عموں گزرا سکتی ہوں۔“ آسیہ نے بے بسی سے کہا۔

”تم گزرا سکتی ہو لیکن ہم نہیں یہی میرا آخری فیصلہ ہے کہ کل جو رشتہ آ رہا ہے اسی لڑکے سے تمہاری شادی ہوگی۔“ حامد صاحب نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

آسیہ مجبور تھی اپنے باپ کے فیصلے کے آگے۔

اگلے دن رشتہ آیا اور نجمہ خاتون لڑکے کی ماں نے آسیہ کو دیکھتے ہی پسند کر لیا۔

”لڑکا نہیں آیا آپ کے ساتھ اس کا فیصلہ بھی تو ضروری ہے۔“ آسیہ بیگم نے لڑکے والوں سے پوچھا۔

”میرا بیٹا بہت تعہیدار ہے میرا اس نے کہا کہ جو لڑکی آپ میرے لیے پسند کریں گی مجھے دل و جان سے قبول ہوگی۔“

”ماشا اللہ کافی نیک بچہ ہے۔“ آسیہ بیگم نے کہا۔

نجمہ آسیہ کی طرف تصویر بڑھاتے ہوئے بولی ”یہ ہے میرا بیٹا دیکھ لیں اور آسیہ کو بھی دکھا دیں۔“

”بہت پیارا بیٹا ہے آپ کا۔“ آسیہ نے تصویر دیکھ کر بولا۔

آسیہ آسیہ کو تصویر دیتے ہوئے بولی ”دیکھ لو بیٹا۔“ آسیہ نے ایک نظر تصویر دیکھی اور بغیر کچھ کہے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی وہ بہت اداس تھی۔

”شرما گئی میری بیٹی بہت شرمیلی ہے۔“ آسیہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”ہمیں لڑکا پسند ہے ہماری طرف سے ہاں سمجھیں۔“

”ارے پھر اس بات پر منہ بیٹھا ہو جائے۔“ ثروت نے کہا۔

سب نے بیٹھائی کھائی۔

جلد ہی آسیہ کی شادی ہو گئی آسیہ کے دل پر ایک بہت بڑا بوجھ تھا اسے اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ اس نے دھوکا دیا ہے کسی کو سچ بتا کر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے شوہر کو سب کچھ سچ بتا دے گی۔

آسیہ دہن کے لباس میں بیڈ پر بیٹھی تھی اتنے میں کوئی کمرے میں داخل ہوا وہ آسیہ کا شوہر تھا آسیہ جو کہ گھونگٹ کئے ہوئے تھی کافی ڈری ہوئی تھی کہ اس کا شوہر سچ جان کر بتا جانے کیا کرے گا اس کا شوہر اس کے قریب آ کر بیٹھا اور اس نے اس کا گھونگٹ آہستہ سے اٹھایا آسیہ نے اپنے شوہر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔



اس کا شوہر اسے دیکھتے ہی پریشان ہو گیا اس کے پسینے چھوٹ گئے۔

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“

”ہمہ..... ہاں ہاں میں ٹھیک ہوں“

”آپ کو اتنا پسینہ کیوں آرہا ہے پھر؟“

”وہ گرمی ہے اس لیے۔“

یہ پریشان شخص اور کوئی نہیں بلکہ آریان تھا وہی آریان جس نے آنیہ کا ریپ کیا تھا اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر وہ شدید ڈر گیا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ جس لڑکی کا اس نے بے دردی سے ریپ کیا تھا وہی اس کی بیوی ہے اسے یہ سب دیکھ کر بالکل یقین نہیں آرہا تھا۔

”میرا نام آنیہ ہے اور آپ کا؟“

”میرا نام آریان ہے۔“

”بہت پیارا نام ہے آریان اس سے پہلے کہ آپ کچھ کہیں میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“

”کیا؟“ آریان پریشانی سے بولا۔

”مجھے غلط مت سمجھیے گا لیکن یہی سچ ہے میرے والدین نے میری شادی زبردستی کروادی میں کسی کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی مجھے میرا ضمیر ملامت کرتا ہے میرا ریپ ہوا ہے تنن کینے لڑکوں نے کچھ عرصہ پہلے میرا بری طرح سے ریپ کیا انہوں نے میری زندگی برباد کر دی میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ اللہ انہیں پوچھے گا ضرور وہ سب دیکھنے والا اور سب کے ساتھ انصاف کرنے والا ہے میں نفرت کرتی ہوں ان تینوں سے خیر آپ چاہیں تو مجھے ابھی اور اپنی وقت طلاق دے سکتے ہیں میرے ماں باپ نے مجھے نا اپنا یا تو کہیں بھی چلی جاؤں گی کہیں پر بھی جا کر ڈوب مروں کہیں اس بوجھ کے ساتھ آپ کی ہمسر نہیں بن سکتی۔“ آریان بالکل خاموش تھا۔

”پلیز کچھ بولیں نا۔“ آنیہ رورہی تھی۔

”ابھی سوئے ہیں میں کل بتاؤں گا سوچ کر۔“

یہ کہہ کر آریان نے جیب سے منہ دکھائی کی انگوٹھی نکال کر آنیہ کو پہنائی اور سو گیا آنیہ دل ہی دل میں بولی کتنا اچھا ہے یہ اس نے تو کچھ کہا ہی نہیں بلکہ ٹھنڈے دماغ سے سوچ کر بتائے گا۔ آنیہ مسکرائی اسے کافی حیرت بھی تھی کیونکہ یہ بات کوئی بھی مرد برداشت نہیں کرتا چاہے لڑکی کا قصور نا بھی ہو آنیہ کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا اور وہ سو گیا آنیہ کے دل کا بوجھ تو ہلکا ہو گیا لیکن آریان کے دل پر کافی بڑا بوجھ پڑا تھا اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا اس قدر کہ وہ سو بھی نہیں پارہا تھا۔ اسے اپنے کیے پر پچھتاوا تھا اور اسے اپنے گناہ کا احساس ہو گیا تھا وہ جان گیا تھا کہ اللہ انصاف کرنے والا ہے آنیہ کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ انہوں نے اللہ کی آنکھوں پر بھی پٹی باندھ لی ہے خدا تو سب کچھ دیکھتا ہے اور سب کا انصاف کرتا ہے آریان ریپ کرتے وقت اللہ کی ذات کو بھول گیا تھا یا تو نظر انداز کر گیا تھا لیکن آج اللہ کے اس انصاف پر اس کے دل میں خوف خدا جاگ اٹھا تھا اگلے دن اس نے اپنے دوستوں کو پوری بات بتائی اور یہ بھی کہا کہ وہ آنیہ کو طلاق نہیں دے گا بلکہ سب کچھ سچ سچ بتائے گا ناصر اور اسد ڈر گئے تھے انہیں اپنا ڈر تھا وہ بولے کہ جب وہ خود طلاق مانگ رہی ہے تو دے دے بہت آسان ہے ویسے بھی اسے حقیقت نہیں معلوم اور اسے اپنا آپ گناہ گار لگتا ہے وہ خود کو غلط سمجھتی ہے طلاق دے کر دوسری لڑکی سے شادی کر لے کبھی بھی کسی کو پتا نہیں چلے گا اگر اسے بتا دیا تو وہ تینوں کو پولیس کے حوالے کر دے گی خود تو پھنسے گا ہمیں بھی پھنسائے گا۔

”میں میں ایسا نہیں کر سکتا کل میری آنکھیں کل گئیں مجھے اب کوئی ڈر نہیں میں اسے سب سچ سچ بتاؤں گا کیونکہ اس کا احساس ابھی بھی تم لوگوں کو نہیں ہوا کہ خدا دیکھ رہا ہے لیکن مجھے ہو چکا ہے آئیہ نہیں جانتی میری اصلیت لیکن اللہ تو جانتا ہے میں اور میرا ضمیر اس گناہ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے میں اسے طلاق تو نہیں دینا چاہتا کیونکہ وہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے لیکن میں اس کے قابل نہیں یہ سب جاننے کے بعد وہ ویسے بھی میرے ساتھ رہنا پسند نہیں کرے گی وہ تو مجھ سے نفرت ہے گی جب اسے پتا چلے گا سچائی کا تو۔“ ناصر اور اسد نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی کیونکہ انہیں اپنا ڈر تھا لیکن ریان ناما نا اور فوراً گھر گیا اس نے آئیہ کو سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا وہ گھر پہنچا آئیہ کرے کی سیٹنگ کر رہی تھی آریان کو دیکھ کر اس نے سلام کیا آریان نے سلام کا جواب دیا اور بولا ”آئیہ تم نے سچ بتا کر اپنے دل کا بوجھ تو ہلکا کر دیا لیکن میرے ضمیر پر بھی ایک بہت بڑا بوجھ پڑا ہے۔“

”بات کیا ہے؟ کیسا بوجھ؟“ آئیہ نے کہا۔

”وہ دراصل بات یہ ہے کہ تمہارا رپ کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ میں اور میرے دو دوست تھے۔“ آریان نے سچائی آئیہ کو بتادی۔

یہ سنتے ہی آئیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ بولی۔

”یہ سچ ہے میں چاہتا تو تمہیں کبھی ناپتا شاید تمہیں پتا بھی ناچلتا لیکن میں بھی دھوکا دے کر زندگی نہیں گزار سکتا اب اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتی تو میں اسے شاید کبھی ناپتا لیکن اللہ نے تمہارے ساتھ انصاف کر کے میری آنکھیں کھول دیں اب میں تمہیں طلاق دینا تو نہیں چاہتا تم بہت اچھی لڑکی ہو لیکن میں جانتا ہوں یہ سب جاننے کے بعد تم مجھ سے نفرت ہی کرو گی اس لیے میں تمہیں طلاق دینے کے لیے بھی تیار ہوں اور خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے لیے بھی تیار ہوں اپنے دوستوں کا بھی میں پولیس کو بتا دوں گا میں جان گیا ہوں کہ دوسروں کی بہن بیٹی بیوی ماں پر غلط نظر نہیں رکھنی چاہیے کیونکہ جیسے ہماری اپنی ماں بہن بیٹیاں ہیں اسی طرح دوسروں کی بھی ہیں مجھ بد بخت نے تو اپنی ہی بیوی پر بری نظر رکھی اور اس کا رپ کیا اور پھر اپنے دوستوں سے بھی کروایا۔“ آریان رو دانا ہوا تھا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا؟ اور کتنے لوگوں کی زندگی تم نے اور تمہارے کینے دوستوں نے میری طرح برباد کی؟“ آئیہ نے غصے سے پوچھا۔

”میں سچ کہتا ہوں میرے دوستوں نے آج تک بہت ساری لڑکیوں کا رپ کیا ہے لیکن میں نے صرف تمہارا رپ کیا وہ بھی میرے دوستوں نے مجھے برباد یا تھا نا اس سے پہلے میں نے کچھ ایسا کیا اور نا ہی اس کے بعد وہ پہلی اور آخری مرتبہ تھی اس لیے اس رات انہوں نے مجھے تمہارا رپ کرنے کے لیے پہلے کہا اس کے بعد میں نے طے کر لیا تھا کہ آئندہ کبھی اپنے دوستوں کے بہکا دے میں آکر ایسا نہیں کروں گا۔“ آریان نے سب سچ کہا تھا۔

”یہ تم اب کہہ رہے ہو یہ سب تو مرد کے لیے ایک نشے کی مانند ہے تم جیسے خراب مردوں کی وجہ سے ہم ہر مرد کو خراب سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں مجھے ابھی اور اسی وقت طلاق دو۔“ آئیہ کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

آریان نے آئیہ کو طلاق دے دی آئیہ نے آریان اور اس کے دوستوں کو پولیس کے حوالے کیا انہیں کڑی سزا ملی آئیہ کے ماں باپ دونوں کو آئیہ کے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نا تھا انہوں نے کہا کہ اگر اب کوئی بھی اس سے شادی نہیں کرتا تو نا کرے ان پر ان کی بیٹی بوجھ نہیں انہیں پر فخر تھا انہیں بھی سب اور غلط کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ بھی آئیہ کو انصاف نا دلا کر اس کے ساتھ ظلم کر رہے تھے لیکن اللہ نے آئیہ کے ساتھ انصاف کیا کچھ عرصے بعد آئیہ کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ آیا لڑکے نے آئیہ کو پسند کر لیا اور اس کے گھر والوں نے بھی تو آئیہ کے والدین نے انہیں سب اس بار سچ بتا دیا کہ ان کی



جیٹی کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا اور ان کی بیٹی طلاق یافتہ ہے انہوں نے یہ بھی بتایا کہ آریان ہی وہ شخص تھا لیکن لڑکے نے شادی سے انکار کیا کیونکہ جہاں آریان جیسے لڑکے اس دنیا میں موجود ہیں وہاں علی جیسے نیک لڑکے بھی ہیں جو سبکی اور غلط میں فرق سمجھتے ہیں علی کے والدین کو سچائی جاننے کے بعد اعتراض ہوا لیکن علی نے پھر بھی شادی کے لیے حامی بھری اور اپنے ماں باپ کو سمجھایا زندگی علی نے گزاری تھی اس لیے اس کے ماں باپ خاموش ہو گئے علی اور آنیہ کی دھوم دھام سے شادی ہوئی اور کچھ ہی عرصے میں آنیہ نے سب گھر والوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا آنیہ اور علی خوشی خوشی رہنے لگے۔ اللہ سب دیکھتا ہے اس سے بڑا گواہ اور انصاف کرنے والا کوئی نہیں اللہ پر بھروسہ رکھو کیونکہ جو اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے اللہ اس کا بھروسہ بھی نہیں توڑتا اور دوسروں کی ماؤں بہنوں بیویوں اور بیٹیوں کی عزت اپنی ماؤں بہنوں بیٹیوں اور بیویوں کی طرح کر دے تو اللہ تمہاری عزت بھی ہمیشہ محفوظ رکھے گا۔

☆☆☆☆

### مہمان ..... عنبرین اختر

راتوں کو چلنے والے تیز چلا کرتے ہیں مگر وہ آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا جیسے چھل قدمی کے لیے نکلا ہو چند قدم چل کر وہ رکتا تھا پیچھے دیکھتا تھا آگے دیکھتا اور ایک بار پھر رکنے کے لیے چل پڑتا تھا۔ وہ سیر کے لیے نہیں نکلا تھا وہ وقت سیر کا نہیں تھا اور وہ جگہ بھی سیر کے لیے نہیں تھی۔ دیہات کی ایک گھنٹڑی تھی جس کے دلوں اطراف کہیں کہیں روخت خاموش کھڑے تھے جیسے گہری نیند سو رہے ہوں وہ وقت گہری نیند کا ہی تھا۔ آدھی رات ہونے کا آئی تھی وہاں سے قریبی گاؤں کم و بیش دو میل دور تھا۔

چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ وہ خراباں خراباں چلتے ہوئے لکیر کے بیڑ کے نیچے رک گیا۔ اس کی نظریں گھنٹڑی پر دوڑا گئے چلی گئیں اور اس جگہ سے واپس آ گئیں جہاں سے گھنٹڑی نشیب میں اتر جاتی تھی اچانک لکیر سے ایک شورا اٹھا۔ اس نے بدک کر اوپر دیکھا ایک چکور چنچن چلاتا چاند کی طرف اڑا جا رہا تھا۔

اسے چکور کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی چکور نظر نہیں آ رہا تھا۔ چکور کے واہیلے نے گیدڑوں کو بیدار کر دیا بہت سے گیدڑا کھٹے بول پڑے اور کچھ دیر بولتے ہی رہے۔ ”گیدڑ“ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ ”بزدل..... دن کو کہیں نظر نہیں آتے“ رات کو نہ جانے کسے لکار رہے ہیں؟ مگر

میں بھی تو رات کو ہی شیر ہوتا ہوں۔“

اس نے سوچا مگر اس سوچ کو اس نے یوں اپنے ذہن میں دبایا جیسے پاؤں تلے جلتا ہوا سگریٹ مسل رہا ہو۔ ”نہیں میں دن کو بھی شیر ہوتا ہوں۔ میں گیدڑ نہیں میری لکار پر سب سہم جاتے ہیں“ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کلہاڑی اور پراٹھائی اور لکیر کی خاردار ٹہنیوں میں سے چھن چھن کر آئی چاندنی میں کلہاڑی کے پھل کو دیکھا۔ نو ہانچک رہا تھا اس نے محسوس کیا جیسے اپنے ہاتھ میں کلہاڑی دیکھ کر اس کا سینہ پھیل گیا ہو۔ ”کیا آج کوئی نہیں آئے گا؟“

اسے خیال آیا اور مایوسی سے اس کا سینہ سکڑنے لگا اس نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا تھوڑی دیر اور رک جاؤ شاید کوئی

بدقسمت آ ہی نکلے۔ اس نے اس نشیب کی طرف دیکھا جس میں پگڈنڈی اتر جاتی تھی۔ اسے ایک آدمی نشیب میں سے بھرتا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر وہ کیکر کے تنے کی اوٹ میں ہو گیا اور دونوں آنکھیں گاڑھ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ آدمی تیز تیز چلا آ رہا تھا۔ وہ جب کیکر کے ہیڑے کے قریب سے گزرنے لگا تو دہلی دہلی لکارتے ہوئے اسے روک لیا۔  
”تھمہر جاوے۔“ کیکر سے ہٹ کر وہ رات کے مسافر کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بولا۔ ”اپنی جیب خالی کر دو اور اپنی جان سلامت لے کر چلے جاؤ ورنہ یہ کپھاڑی دیکھ لو۔“

اس آدمی نے کپھاڑی والے کوسر سے پاؤں تک دیکھا اور یوں سکون سے آہ بھری جیسے وہ بہت بڑے خطرے سے نکل آیا ہو۔

”جلدی کرو۔“ اس نے اجنبی سے کہا۔ ”میں نے کسی کو اتنی مہلت نہیں دی۔ وہ آدمی جس کی عمر پچاس برس سے خاصی آگے نکل گئی تھی۔ یوں زمین پر بیٹھ گیا جیسے تھکا ماندہ مسافر منزل پر آ کر گر جائے۔  
”تم مجھ سے ڈرتے نہیں؟ میں رہزن ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میرے ہاتھ میں کپھاڑی ہے اپنی جیب خالی نہیں کرو گے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔“

اس آدمی نے ڈرے بغیر اوپر دیکھا۔ اپنے سر پر کھڑے نو جوان رہزن کا ہاتھ پکڑا اور نیچے کو کھینچا۔  
”بیٹھ جا کا کا۔“ اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”میری ایک ہی جیب ہے خود ہی خالی کر لینا۔ میں خالی ہاتھ ہوں تمہارا مقابلہ نہیں کروں گا۔“

”تم خالی ہاتھ نہ ہوتے تب بھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔“ نو جوان رہزن نے کہا۔ ”تم بوڑھے ہو میں تمہیں کپھاڑی دے دیتا ہوں، میں خالی ہاتھ تمہارا مقابلہ کروں گا۔ لیکن میں تمہیں قتل کرنا نہیں چاہتا تمہاری جیب میں قارون کا خزانہ تو نہیں ہوگا، تھوڑے سے پیسوں کے لیے اپنی جان کیوں گنواتے ہو۔“  
وہ آدمی ہلکی سی ہلکی ہنسا اور ہزن کو اس کا بازو کھینچ کر بٹھالیا۔

”یہ کام کب سے شروع کیا ہے؟“ اس نے رہزن سے پوچھا۔ ”تم ابھی بچے ہو میں کہتا ہوں تم.....“  
”ہر کام میں عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔“ اس آدمی نے نو جوان رہزن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”رہزنی میں تو عقل کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ کسی کی شاگردی ہے؟“

”نہیں.....“ رہزن کے منہ سے بے اختیار نہیں نکل گیا۔ لیکن وہ سنبھل گیا۔ اور تنک کر بولا۔ ”لیکن میرے ہمدردین کر تم مجھ سے بچ نہیں سکتے۔ ابھی تم وعظ شروع کر دو گے کہ دوسروں کو لوٹا گناہ ہے، میں تمہیں چھوڑ دوں گا نہیں، شیر اپنے شکار کو چھوڑا نہیں کرتا۔“

”نہیں میرے عزیز!“ رہزن کے شکار نے کہا۔ ”میں تو کہہ رہا ہوں کہ تھوڑا عرصہ کسی کی شاگردی کرو۔ تم ابھی مٹاڑی ہو ابھی مٹی عمر میں ہو اور تم دیہاتی ہو اگر کوئی استاد نہیں ملتا تو مجھے استاد بنالو۔ میں تمہیں اپنا بیٹا سمجھ کر ایسے داؤ سکھاؤں گا اور ایسی جگہ بتا دوں گا کہ تم اس علاقے کے بادشاہ بن جاؤ گے۔“

”مجھے دیسے بھی کوئی نہیں پکڑ سکتا۔“ نو جوان نے تکبر سے کہا۔ تمہاری لاش یہی پڑی رہنے دوں گا اور.....“  
”میں نے بھی اپنے شکار سے ایسے ہی کہا تھا، بوڑھے نے کہا اور اس کی لاش یہیں پڑی رہنے دی تھی رات کا یہی وقت تھا، میں نے کہا تھا مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا، لیکن میں اگلی رات حوالات میں بند تھا آج سترہ اٹھارہ برس بعد نکلا ہوں، میں بارہ تیرہ برس بعد ہی آ جاتا لیکن میں نے جیل خانے میں ایک داروؤں کوڑھی کر دیا تھا۔ میری سزائے قید پانچ برس بڑھ گئی تھی۔“  
”تم نے اسے کیوں قتل کیا تھا؟“ رہزن نے پوچھا۔



”تم مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟“ رہزن کے شکار نے پوچھا۔  
 ”کیونکہ میں رہزن ہوں۔“

”میں بھی رہزن تھا۔“ شکار نے جواب دیا۔ ”نوجوان رہزن نے کلبھاڑی اپنے اوڑھے اور بوڑھے رہزن کے درمیان دکھادی اور بوڑھے کے چہرے کو اشتیاق سے دیکھنے لگا۔  
 ”تم تو پھر استاد ہو گے۔“

”پہلے استاد نہیں تھا۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”نیل خانے میں استادوں نے بڑے قیمتی کرکھا دیے ہیں۔“ بوڑھے نے اسے گرتا نہ شروع کر دیئے۔ نوجوان رہزن کے لیے نئے اور دلچسپ تھے۔ بوڑھے کے بولنے کا انداز نوجوان رہزن کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”تمہارا باپ ہے؟“

”مر گیا ہے۔“

”اور ماں.....؟“

”زندہ ہے۔“ نوجوان رہزن نے جواب دیا۔

”بیٹا تم یہ کام چھوڑ دو۔“ بوڑھے نے کہا۔

”میری ماں مجھے اس کام سے نہیں روکتی..... اس نے ذرا دیر خاموش رہ کر کہا۔“ میں نے اپنی پہلی واردات کے اسے پیسے دیے تھے تو وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ میں اسے خوش رکھنا چاہتا ہوں۔ میں یہ کام نہیں چھوڑوں گا۔ ویسے اس وقت تم کہاں جا رہے ہو؟“

”اپنے گاؤں۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔

”آج رات میرے گاؤں میں نہیں گزارو گے؟“ نوجوان رہزن نے کہا۔ ”میں نے تمہیں استاد مان لیا ہے چلو میرے ساتھ۔“ اور بوڑھا رہزن جواٹھارہ برس قید کاٹ کر آ رہا تھا، نوجوان رہزن کے ساتھ اس کے گاؤں چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

نوجوان رہزن نے اپنے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ایک عورت نے کھولا..... اس کے ہاتھ میں لائیں تھی۔ اپنے بیٹے کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔

”یہ میرا مہمان ہے۔“ بیٹے نے اپنی ماں سے کہا۔ ”اسے میرا استاد سمجھو صبح چلا جائے گا۔“

نوجوان رہزن بولتا رہا اور بوڑھا رہزن چپ چاپ منتظر رہا۔ نوجوان رہزن کی ماں کی عمر پچاس سال سے خاصی کم لگتی تھی اس عمر میں بھی اس کے چہرے کی دلکشی پائی تھی اس کا ذیل ڈول جوان عورتوں کا تھا۔ بوڑھا رہزن اسے دیکھتا تھا تو اس کی نظریں اس عورت پر چپک کر رہ جاتی تھیں۔

نوجوان رہزن اس وقت بھی کچھ نہ کچھ بول رہا تھا جب اس کی ماں نے مہمان کے آگے دودھ کا گلاس اور پراٹھے رکھے۔ ماں نے مہمان کو نظر بھر کر دیکھا تھا۔ ماں نے مہمان اور اپنے بیٹے کی چار پائیاں کمرے میں اور اپنی چار پائی باورچی خانے میں بچھائی اور تھوڑی دیر میں تینوں گہری نیند سو گئے۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ مہمان آہستہ آہستہ چار پائی سے اٹھا۔ اس نے تھوڑی دیر نوجوان رہزن کے خرائے سے جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ جوانی کی گہری نیند سو یا ہوا ہے تو مہمان دبے پاؤں چلتا کمرے سے نکل گیا۔ اس نے باورچی خانے کے دروازے پر ہاتھ رکھا تو کواڑ کھل گیا۔

وہ اندر چلا گیا، رسوئی کے کھلے ہوئے در پہچ سے چاند جھانک رہا تھا۔ اس کی روشنی میں نوجوان رہزن کی ماں سوئی ہوئی نظر آرہی تھی۔ مہمان رہزن نے اس عورت کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر ہلایا۔ عورت اٹھ بیٹھی۔  
 ”میں نے اسی لیے یہاں اپنی چار پائی بچھائی تھی کہ تم آؤ گے۔“ نوجوان رہزن کی ماں نے کہا۔ ”آ جاؤ۔“ اور وہ پرے سرک گئی۔

مہمان پابنتی بیٹھ گیا۔  
 ”تم نے میرے بیٹے کو بھی رہزن بنادیا ہے۔“ مہمان نے کہا۔ ”میں جیل خانے میں اٹھارہ برس تمہاری اور بیٹے کی صورت دیکھنے کو ترستار ہا ہوں، میں نے تم سے کہا تھا کہ بچے کو بتانا کہ تمہارا باپ مر گیا ہے، نہ تو خود مجھ سے ملنے جیل خانے آتا، نہ بچے کو لانا، اور اس کی پرورش اس طرح کرنا کہ یہ عزت اور غیرت والا بنے لیکن تم نے اسے بھی رہزن بنادیا ہے مجھے بھی تم نے رہزن اور ڈکیت بنایا تھا۔ تمہاری محبت نے مجھے اندھا کر دیا تھا، میں جان کی بازی لگا کر تمہارے گاؤں سے تمہیں بھگلا یا تھا اور اپنی برادری اور ساری دنیا کو اپنا دشمن بنالیا تھا۔

تم شہزادی بننا چاہتی تھی تمہاری خواہشوں اور فرمائشوں کو پورا کرنے کے لیے میں نے رہزنی شروع کر دی اور ایک آدمی کو جان سے مار ڈالا۔ آج سالوں بعد میں قید کاٹ کر خوشی خوشی گھر آ رہا تھا..... کہ میرا بیٹا جوان ہو چکا ہوگا، وہ باعزت زندگی گزار رہا ہوگا..... لیکن تم نے.....“ اس نے سردی آہ بھری اور اٹھ کھڑا ہوا۔

عورت نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن وہ باورچی خانے سے نکل گیا۔

صبح بیٹا دیر سے اٹھا اور ماں سے پوچھا کہ مہمان کہاں ہے؟

”وہ چلا گیا ہے۔“ ماں نے جواب دیا اور منہ پھیر لیا۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ بیٹا اس کے آنسو دیکھ لے۔

☆☆☆.....

www.urdufiles.com

معافی..... حنا اشرف

جھینگروں اور مینڈکوں کی آواز ماحول میں چھائی خاموشی کی وجہ سے عجیب پر اسرار سی لگ رہی تھی۔ ندیم ار در گرد بے پرواہ خاموشی سے چھوٹی سی گڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ گھر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ گاؤں کے کچھ ہی گھر ایسے تھے جہاں سے ہلکی سی روشنی نظر آرہی تھی۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بج چکے تھے اور سب ہی لوگ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔

”اتنی دیر کہاں لگا دی ندیم؟ تجھے پتا ہے میں کتنی پریشان ہو جاتی ہوں تیرے دیر تک باہر رہنے سے۔“ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا زینت بی بی نے تم آواز میں بولیں۔ وہ خاموشی سے چلتا ہوا برآمدے میں رکھی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ نیکیے کو سیدھا کر کے رکھا اور لیٹ گیا۔

”ندیم میں تجھ سے کچھ پوچھ رہی ہوں کہاں تھا تو؟“

ماں کی بھیگی آواز پر اس کا دل کانپ اٹھا، جلدی سے آنکھوں پر سے بازو ہٹایا اور اٹھ بیٹھا۔

”تو کبھی تو میں گیا تھا کنویں کے پاس۔“ ان کی آواز میں عجیب سی بے چینی اور بے بسی تھی۔ ”ندیم نے آنکھیں بند کر کے اثبات میں سر ہلایا۔

Google



”دیکھ پترا! میری بات مان لے انہ جا کر وہاں، ایک بیٹے کو کھو چکی ہوں، بڑی مشکل سے صبر آیا ہے۔ اب تجھے کچھ نہیں ہونے دوں گی، کیوں جاتا ہے تو وہاں، کتنی بار منع کر چکی ہوں، کچھ نہیں ملنے والا تجھے، حقیقت مان لے تو!“

”میں وہاں اس وقت تک جاتا رہوں گا جب تک مجھے کوئی ثبوت نہیں مل جاتا۔ آپ صبر کر سکتی ہیں اماں، میں نہیں، اپنا بھائی کھویا ہے میں نے، وہ بھائی جسے میں نے ہمیشہ خود سے بڑھ کر چاہا، جس نے کبھی مجھے باپ کی کی محسوس نہیں ہونے دی۔ کیسے خاموش بیٹھ جاؤں؟ کیسے لوگوں کی باتوں پر یقین کر لوں، میں اپنے بھائی کے قاتل کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ اس کا وہ حال کروں گا کہ اس کا انجام ساری دنیا یاد رکھے گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ بازی کیوں نہ ہارنی پڑے۔“ وہ پرسوج انداز میں بولا۔

”تو آخر مان کیوں نہیں لیتا، تیرے بھائی کو کسی نے قتل نہیں کیا، بلکہ وہاں آ سیب تھا سارا گاؤں جانتا ہے۔“

”کہاں کا آ سیب اماں؟ کتنی بار سمجھایا ہے ان باتوں پر یقین نہ کیا کر۔“

”تیرا قصور نہیں پترا، چار جماعتیں پڑھ چکا تو جب ہی ان باتوں کو نہیں مانتا۔“ زینت بی بی پر غم آواز میں گویا ہوئیں۔

”اماں! میں جانتا ہوں ایسی چیزیں دنیا میں موجود ہیں، تعداد میں شاید ہم سے بھی زیادہ ہوں، یہ بھی ممکن ہے مگر قاسم پر کسی جن بھوت نے حملہ نہیں کیا تھا، اسے کسی نے بے دردی سے مار ڈالا اور کنوئیں میں پھینک دیا، ظالموں نے جس انارزی پن سے میرے بھائی پر وار کیے، میں آپ کو نہیں بتا سکتا اماں!“ وہ سسک پڑا۔

وہ بے انتہا صبر والی تھیں، جوانی میں بیوی کی چادر اوڑھ لی اور بچوں کی اکیسے پرورش کی اور اب ایک کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا، مگر دوسرے کو کھونے کا حوصلہ ان میں نہ تھا۔ اسی لیے پولیس کو بیان دیتے ہوئے اسے ایک حادثہ قرار دیا تھا، وہ ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ پوسٹ مارٹم کے لیے ان کے بیٹے کی لاش جگہ جگہ دلتی رہے جو پہلے ہی اس لائق نہ تھی کہ اسے مزید رکھا جاتا۔

”ندیم پترا! میں تیری بات مان لیتی ہوں، پر میں نے اپنے بیٹے کے قاتل کو معاف کر دیا تو بھی معاف کر دے اور خاموشی اختیار کر، اوپر والا بہتر انصاف کرنے والا ہے۔“

بیٹے کی خاموشی کوئی سنگین صورت حال اختیار نہ کر لے اس لیے انہوں نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے بیٹے کے کاغذ پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا جو کسی غیر مرئی نقطے کو گھورے جا رہا تھا۔

وہ بے بسی سے اثبات میں سر ہلا گیا، مگر انتقام کا جذبہ ختم ہونے کا تاثر نہیں لے رہا تھا بار بار دوسری طرف بھائی کا چہرہ سامنے آ جاتا۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا اور ماں کو گلے سے لگاتے ہوئے سسک اٹھا۔

☆.....☆.....☆

اس نے مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی اب وہ رات کو بھی جلدی گھرا جاتا تھا۔ دو تین روز سے وہ قبرستان بھی نہیں گیا تھا، آج اس نے قدموں کا رخ قبرستان کی طرف موڑ لیا، دوپہر کا وقت تھا، سورج کی تپش سے ہر شے جھلکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ قبرستان کے قریب اس کے قدم بو جھل سے ہو گئے۔ اسے ایسے لگا جیسے صدیوں کی مسافت طے کر کے آیا ہو۔

موت کس قدر ظالم ہوتی ہے..... ہمارے پیاروں کو ہم سے جدا کر دیتی ہے۔ کس قدر مشکل ہوتا ہے ناں جان سے پیارے لوگوں کو منوں مٹی تلے دفن کرنا.....

وہ جیسے ہی قبرستان کے اندر داخل ہوا حیران رہ گیا، کوئی تھا۔ جو اس کڑی دھوپ سے بے نیاز قاسم کی قبر پر سر رکھے رو رہا تھا، بچکیوں سے اس کا وجود زبرہا تھا، وہ تیزی سے وہاں گیا اور بازوؤں سے پکڑ کر اسے سیدھا کیا۔ وہ آفتاب تھا، اس کا اور قاسم کا مشترکہ دوست۔

”صبر کرو یا ر! شاید قسمت میں ایسا لکھا تھا اب تو ہم بس دعا ہی کر سکتے ہیں۔“ وہ گہری سانس لیتا ہوا بولا، آفتاب ان

کے لیے بھائیوں کی طرح تھا۔ وہ اس کا دکھ کچھ سکتا تھا۔

فاتح بڑھنے کے بعد وہ آفتاب کو لیے گھر چلا آیا، اماں شاید ہمسائیوں کے ہاں گئی تھیں۔ ندیم کافی دیر اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا جس کا جواب وہ ہوں، ہاں میں دیتا رہا۔

”تابی تم ٹھیک ہو؟“ ندیم کا فکرمندانہ انداز اس کے دل کو لگا تھا۔ اس نے بمشکل سر اثبات میں ہلایا۔

”تابی! تمہیں کیا لگتا ہے۔ یہ واقعی کسی آسیب وغیرہ کا چکر تھا، قاسم کے ساتھ جو سب ہوا؟“

”میری کچھ میں کچھ نہیں آ رہا ندیم! یہ سب آخر کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟“..... قاسم کے چمچڑنے کا دکھ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا، میں ساری ساری رات جاگتا رہتا ہوں۔ نیند مجھ سے بالکل قاسم کی طرح روٹھ گئی ہے۔“ وہ بے بسی سے بولا اور تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ ندیم اسے پکارتا رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

”تابی تجھے آخر ہو کیا گیا ہے جو یوں اچانک سے گاؤں چھوڑنے کی رٹ پکڑ لی۔ اماں نے خالو سے پھر تیرے اور سارے رشتے کی بات کی ہے۔ خالو تو راضی ہی تھیں، اب تو خالو نے بھی اپنی رضامندی دے دی۔ ہم دھوم دھام سے تیری شادی کریں گے۔ سارا گاؤں دیکھے گا۔“ آنکھوں میں چمک لیے شہلا مسکراتے ہوئے بولی تو آفتاب خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا..... اماں چونکہ خالہ کے ہاں گئی ہوئی تھی، ان کی غیر موجودگی میں ہی وہ گھر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ اپنا سامان سمیٹ رہا تھا۔

”نہیں کرنی مجھے کسی سارے شادی، مجھے یہاں سے ہمیشہ کے لیے جانا ہے۔“ وہ زور سے چیخا..... شہلا جلدی سے پیچھے ہوئی مبادہ کچھ اٹھا کر ہی ندے مارے اسے۔

آفتاب کے جنونی غصے سے وہ بخوبی واقف تھی۔ تب ہی اسے اس کے حال پر چھوڑ کر وہاں سے اٹھ گئی اور اماں کے کمرے کی صفائی کرنے لگی، اماں کو مجھے چونکہ کافی دیر ہوئی تھی۔ وہ واپس آنے والی تھیں، اپنے لاڈ لے کو وہ خود ہی سمجھا سکتی تھیں ماں کے منہ سے نکلی بات وہ کبھی نہیں ٹال سکتا تھا۔

کچھ ہی دیر میں الجھا، بکھر اس آفتاب دروازے میں آ کھڑا ہوا، آنکھیں بھیگی ہوئی اور بے پناہ سرخ تھیں۔ شدت ضبط سے چہرہ بھی سرخ ہو چکا تھا۔ بھائی کے نڈھال انداز پر اس کے دل کو کچھ ہوا، وہ کچھ دیر پہلے کے اس کے غصے کو بھلا کر اس کی قریب چلی آئی۔

”تم ٹھیک تو ہونا؟“ اس نے فکرمندی سے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا، کہیں اسے بخار تو نہیں!!

”شہلا مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی!! مجھے لگتا ہے اب بھی میں نے اپنا جرم قبول نہ کیا تو میرا دل پھٹ جائے گا.....“

وہ بدحواسی سے بولا۔

شہلانے اسے بازو سے تھام کر اماں کی چار پائی پر بیٹھایا تو وہ چونک کر بہن کو دیکھنے لگا۔

”میں نے قاسم کو مار ڈالا شہلا۔“ اس قاسم کو جو میرا جگری یا ر تھا، جس کو دیکھے بغیر میرا دل نہیں گزرتا تھا، اب وہ روتے ہوئے اسے بتا رہا تھا۔ یہ سن کر وہ تو جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔

”کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیا بگاڑا تھا اس نے تمہارا۔“ جب وہ ہوش میں آئی تو بڑے بھائی کو جھنجھوڑ ڈالا، جو بچوں کی طرح بیٹھا رو رہا تھا۔

”مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی، پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا، مجھ پر ایک جنون سا طاری ہو گیا تھا، میری غیرت جاگ اٹھی تھی، میں نے بے غیرتی کی حد کر دی، میرا مقصد اسے جان سے مارنا نہیں تھا، مگر مجھ سے یہ سب ہو گیا۔“ اپنے سر کے



بال دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں دبوچے وہ چیخا تھا۔ ”اس نے مجھے بتایا، وہ سارا کو پسند کرتا ہے، وہ سارا جو میری محبت تھی اور غریب میری بیوی بننے والی تھی اور اسی کا ذکر میرے سامنے میرا دوست کر رہا تھا۔ جب مجھے سارا کے ذکر پر بے انتہا غصہ آیا مگر میں ضبط کر گیا۔ اس کے سامنے یہ تک ظاہر نہ کر سکا کہ وہ تو میری منگ ہے۔ کاش میں اسی دن اسے روک دیتا ہر بات اس کے سامنے واضح کر دیتا تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“

شہلا کو اس لمحے اپنے گئے بھائی کا چہرہ بے پناہ مکر وہ دکھائی دیا اور شدت سے اس سے نفرت محسوس ہوئی، جس نے اپنے جگر کی دوست کا قتل اس بے دردی سے کیا تھا کہ اس کی ماں تک اس کا چہرہ دیکھنے سے قاصر رہی۔

میں اس وقت شدید غصے میں آ گیا تھا، جب دوسرے دن ہم نہر کنارے بیٹھے تھے اور سارا وہاں سے گزری تھی۔ سارا کو دیکھ کر جو چمک قاسم کی آنکھوں میں ابھری تھی میرا جی چاہا میں اس کی آنکھیں نکال دوں..... مگر میں بے بس تھا۔

وہ اپنی یکطرفہ محبت کے قصبے مجھے سنانے لگا..... ہم تب کنویں کے قریب بیٹھے تھے۔ مجھے بچانے کیا ہوا کہ میں نے بھرپور قوت سے اسے دھکا دے دیا، میرا مقصد محض اسے خاموش کروانا تھا، مگر شاید قدرت کو کچھ اور منظور تھا، کنویں کے پاس ہی کوئی بڑا سواں لکڑی کا پتھر پڑا تھا جو قاسم کے سر پر لگا، چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ موقع پر دم توڑ گیا۔ میں مارا نہیں چاہتا تھا مجھے جیل جانے سے ڈر لگتا ہے اسی لیے میں نے بے دردی سے اس پر چاقو سے وار کیے اور اس کا چہرہ سرخ کر ڈالا اور پھر اسے کنویں میں پھینک دیا۔ گاؤں کے لوگ ان پڑھ ہیں۔ وہ ویسے بھی اس جگہ کو آسب زدہ کہتے ہیں۔ میں کتنا خود غرض بن گیا تھا۔ اس وقت ہر حال میں مجھے اپنی جان پیاری تھی۔ توقع کے عین مطابق گاؤں والوں نے جب لاش کی حالت دیکھی تو سب نے اسے کسی آسب کا کارنامہ کہا۔

آخری وقت میں نے اور ندیم نے اس کا چہرہ دیکھا تھا اور پھر تب ہی مجھے احساس ہوا میں کتنی بڑی غلطی کر چکا جو ناقابل معافی تھی۔“

شہلا دوا دھوے وہیں گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ آفتاب اب خاموش ہو چکا تھا۔  
دروازے کے پتھوں بچ کھڑی برکت خاتون کا وجود زخموں کی زد میں تھا..... کھٹکے کی آواز پر دونوں نے مڑ کر دیکھا۔

☆.....☆.....☆

انصاف کا جو تقاضا تھا اس پر عمل کرتے ہوئے برکت خاتون اپنے بیٹے کو لیے ان کی درپہ حاضر تھیں۔  
”زینت بی بی یہ خبر سنتے جیسے ڈھسے گئی تھیں..... آفتاب ان کے پیروں میں گرا زار و قطار رو رہا تھا اور اپنے جرم کا قہر کر رہا تھا اور ندیم..... اس کی زبان تو تالو سے چپک کر رہ گئی تھی اور قدم گویا زمین نے جکڑ لیے تھے۔

”جا آفتاب! چلا جا یہاں سے، مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ تیری صورت دیکھ سکوں، میں نے اپنے پتر کے صدقے تجھے معاف کیا۔ میرا اللہ بھی تجھے معاف کرے۔“ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں خشک کرتی وہ بولی تھیں۔

”اماں یہ کیا کہہ رہی ہو، میں اسے ایسے نہیں جانے دوں گا یہاں سے۔“ ندیم بالآخر ہوش میں آیا..... زینت بی بی نے اسے آگے بڑھ کر تھا.....

”ایک ماں کے آنسوؤں نے مجھے ہارنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ندیم..... میں نوجوان بیٹے کو کھونے کا دکھ برداشت کر چکی..... مگر برکت خاتون کا تو کوئی ولی وارث بھی نہیں، میرے پاس تو ہے، ہم اپنی نئی زندگی شروع کریں گے۔ جانے والے چلے جاتے ہیں، پیچھے رہ جانے والوں کا خرمبر اتنی جاتا ہے..... تیرے انتقام سے ہمارا قاسم واپس تو نہیں آجائے گا۔“

نرم دل مرد ہمیشہ آنسوؤں سے ہار جاتا ہے، چاہے وہ آنسو ماں کے ہوں، بہن کے بیوی کے یا پھر بیٹی کے وہ بھی ماں کے آنسوؤں کے آگے ہار گیا اور اگلے ہی روز ماں کو اس گاؤں سے لے کر چلا گیا تھا۔

انسان جو یوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ ندیم کی ماں نے معاف کر کے اسے ہمیشہ کی سزا دے دی تھی، احساس شرمندگی کے ساتھ جینے کی اذیت نے زندگی کو بہنم بنا دیا تھا۔ آفتاب نذرندوں میں تھا نہ مردوں میں، پورا دن کمرہ بند کیے پڑا رہتا، کبھی زور زور سے ہنستا، قہقہے لگاتا تو کبھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا..... اب تو اسے باقاعدگی سے دورے بھی پڑنے لگے تھے..... کوئی علاج اثر نہ دکھاتا..... برکت خاتون اور شہلا اس کی حالت دیکھ دیکھ کر سسکتیں۔

”بے شک یہ دنیا مکافات عمل ہے۔“

☆☆☆

### اب بچھٹانے کیا ہووٹ..... فہمیدہ غوری

یہ اکبر قریشی کا گھر ہے جہاں وہ اپنی اماں اور چھ بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ کاشف قریشی ان کے سب سے بڑے بیٹے اور پانچ بہن بھائیوں کے بڑے لاڈلے بھائی تھے۔ وہ بس نام کے بڑے تھے باقی کوئی بات ان میں سوائے قد کے بڑی نہیں تھی، کبھی کبھی تو ان کی امی کو اتنا غصہ آتا کہ چھوٹ سے زیادہ قد اور عقل میں سب سے کم دوسرے بھائی بھی کچھ ایسے خاص سمجھدا نہیں تھے مگر کاشف کے مقابلے میں تو بڑا درجہ بہتر تھے۔

عارف، فرزانہ، رضوانہ، کاشان اور چھوٹی شاہانہ سب ہی ان سے بہتر تھے۔ یہ تعلیم میں بھی پچھڑی تھے روپیٹ کر بی اے کر لیا۔ جب بقول ان کے تعلیم سے فارغ ہو گئے تو نوکری ڈھونڈنے ایسے نکلے جیسے ہر محکمہ ہاتھ باندھے ان کے انتظار میں کھڑا ہے۔ جب نکلے تو لگ پتا گیا کہ بی اے کی ڈگری تھرڈ ڈویژن کو کیا نوکری ملتی۔ جو تیاں کیسے چٹختے ہیں آج ان کی سمجھ میں آیا۔ ورنہ تو ہمیشہ دادی کے منہ سے ہی سنا تھا یہ محاورہ۔

آج بھی رات کھانے پر سب جمع تھے اور دادی امی سے کہہ رہی تھیں۔

”ارے اسے کاشف سے کہہ کوئی ڈھنگ کی نوکری ڈھونڈے کب تک ایسے پھرتا رہے گا، موٹی فائل لیے میرا بیٹا پتھارا کما کما کے بڑھا ہو گیا، اور اسے دیکھو ذرا احساس نہیں۔“

”ارے مجھے تو پہلے سے ہی پتا تھا، پوتے کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آتے تھے، جب یہ اسکول جاتے ہوئے نگرے دکھاتا تھا۔“

”ہاں اماں کہتی ہوں کہ اب جو بھی ملے جاب کر لے اور کیا، کب تک ایسے پھرے گا لنڈورا۔“

”اور اس سے کہو مجب جلدی اٹھے پڑا رہتا ہے گلہ گلہ گھوڑے بیچ کر۔ جیسے اس کے باپ کی ملیں چل رہی ہیں۔“

”جی اماں،“ سلیٹی برتن اٹھاتی ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

”عارف بھی تعلیم سے فارغ ہو گیا۔ اسے اس کے دوست کے آفس میں فیجر کی جاب مل گئی، اور آگے ترقی کے امکانات بھی تھے۔ چھوٹے بھائی کو دیکھ کر بھی کاشف کو نہ حیا آئی نہ شرم، ویر تک سو نا دیر تک جا گنا، آخر عارف نے ہی کوشش کر کے کسی گارمنٹ فیکٹری میں سپروائزر کی جاب ڈھونڈ لی ان کے لیے فیکٹری بھی معقول تھی۔

”چلو جی کچھ تو ہو۔“ بھانجے چور کی لنگوٹی ہی کبھی یہ دادی کا سب سے پہلا تبصرہ تھا ان کی جاب کی خبر سن کر فرزانہ کو بھی ان کی خالہ نے مانگ لیا اور جلد ہی شادی پر زور دیا۔ آخر دادی اور ابانے مشورہ کر کے ہاں کر دی کہ اب گھر کے حالات بھی بہتر تھے اور دادی کے دل میں تو کی شادی کے ساتھ کاشف کے سہرے کے پھول کھلانے کے ارمان بھی جاگ اٹھے۔

”ارے میرے سانسے شادی ہو جائے اس کے بچے کھالوں شاہانہ کہتی۔“



”دادی ہمیں تو آپ نے کبھی کھلایا نہیں، کاشف بھائی کے بچے کھلانے کا شوق ہے۔“

”ہاں ہاں تمہیں تو کبھی نہیں کھلایا۔ سب تمہاری ماں نے کیا ہے ہائے ہائے۔ یہ دن بھی دیکھنا تھا، میرے نصیب میں۔“ سسلی بیٹی کو ڈانٹنے لگیں۔

”ارے بس کرو، کس نے ان کو سکھایا ہے یہ سب ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ ارے ساس کب اپنی ہوئی ہے۔“

سسلی سر ہچکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ان کے روز روز کے جذباتی بیانات سے آخراً بھی اپنی اماں کی باتوں میں آگئے اور کہہ دیا۔ کاشف کے لیے لڑکی دیکھنے کا، لوجی، بہنو کو تو ایک نیا مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ آس پڑوس رشتے داروں، سہیلیوں، حتیٰ کہ کالج تک کی لڑکیاں کھنگالی جانے لگیں۔ آخراً قاعدہ دیکھنے دکھانے کا سلسلہ شروع ہوا، آج سسلی اپنی بہن کی بتائی لڑکی دیکھنے جاری تھیں۔ فرزانہ اور ان کی بہن ستارہ ساتھ تھیں۔ ابھی یہ لوگ نکلنے ہی والے تھے کہ دادی اپنا نیا چکن کا انگری سوٹ پہنے عطر لگائے بال جمائے آ گئیں۔

”چلو بھی لڑکی والے منتظر ہوں گے۔ وہ کہتے ہیں نہ میزبان کو کبھی انتظار نہ کرواؤ۔“

”جی اماں۔“ سسلی کھڑی ہو گئیں۔

لڑکی والوں نے اچھا خاصا انتظام کیا ہوا تھا اور دادی انتظام سے بھرپور انصاف کر رہی تھیں، بنا کسی شوگر بلڈ پریشی پر واہ کئے لڑکی بہت ہی پیاری تھی، مندی رنگت، لمبے بال اور چمکے تین نقش۔

سسلی اور ان کی بہن کو تو بہت پسند آئی، فرزانہ بھی خوش تھی کہ اتنی پیاری بھابی مل گئیں، گھر آ کر یہ لوگ اسی کی بات کر رہے تھے۔ کاشف صاحب بھی بڑے شوق سے داستان امیر حمزہ سن رہے تھے کہ دادی نے پان منہ میں رکھا اور بولیں۔

”مجھے تو لڑکی پسند آئی نہ اس کی اماں!“

”مگر اماں اچھی پیاری لڑکی تھی اور اس کی والدہ بھی بہت خوش اخلاق معقول خاتون تھیں۔“

”نہیں بھئی، لڑکی کا رنگ کم ہے اور اس کی اماں کو دیکھوں کتنی موٹی ہے یہ لڑکی بھی موٹی ہو جائے گی، میرے شہزادے کے ساتھ ہمیشہ لگے گی نہ بھائی نا۔“

”لوجی ہو گیا، انکار۔“ اور فرزانہ بہن بھائیوں کو بتا رہی تھی، دادی کیسے پلٹیں صاف کر کے آئی ہیں وہاں سے، ابھی یہ مہم شروع ہوئی تھی کہ کاشف صاحب نوکری چھوڑ کر بیٹھ گئے کہ یہ نوکری ان کو پسند نہیں آ رہی تھی اور ان کی جاب جاتے ہی رشتے ڈھونڈنے کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

پھر سے وہی دیر تک سونا رات رات بھر انٹرنیٹ پر لگے رہنا، پھر سے جاب کی تلاش، آخر مل ہی گئی ان کو ایک فیکٹری میں جاب کماؤں کے خواب دیکھنے تو چھوڑ دیے تھے۔

کاشف صاحب کے لیے آج پھر سے رشتہ دیکھنے گئے تھے۔ مگر اماں کو وہ لوگ تو اچھے لگے مگر لڑکی سانولی لگی، حالانکہ بڑی پیاری سی طرح رنگت تھی مگر ناجی، میرے اتنے گورے پوتے کی نسل خراب کرنی ہے کیا، یہ لڑکی لاکر۔“

☆☆☆☆

فرزانہ کی شادی خیریت سے ہوئی، اب عارف صاحب نے بھی شادی کے لیے کہنا شروع کیا۔ وہ اپنے کسی کو لیگ کی بہن کو پسند کرتا تھا اور اس نے امی سے صاف کہہ دیا وہ صدف سے ہی شادی کرے گا اور جائیں تو لڑکی دیکھنے نہیں بلکہ رشتہ لے کر جائیں۔ سسلی اور اکبر صاحب کی کماؤ سپوت کے سامنے کیسے زبان چلتی آخراً عارف کی بھی شادی ہو گئی اور دادی ساری شادی میں منہ پھلائے شریک ہوئیں کہ یہ لڑکی اور اس کا خاندان ان کو ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ صدف بہت

اچھی اور ملن سار بھوجا بت ہوئی۔ سلمیٰ کی تو اتنی خدمت کرتی، اتنا خیال رکھتی کہ وہ دونوں ساس بھو کے بجائے دوست بن سکیں۔ شاہانہ سے بھی دوستی ہو گئی، فرزند آتی تو اس کی اور اس کے میاں کی اچھی طرح خاطر مدارات کرتی اور فرزند بھی بھائی کی منون ہوتی۔ دادی سے بھی قریب ہونے کی کوشش کی مگر دادی نے ان چاہی پوت بھو کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ بے چاری اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔ اب بھی کاشف کا جاب چھوڑنے اور رشتے ڈھونڈنے کا سلسلہ چل رہا تھا مگر دادی کو نہ کوئی لڑکی پسند آئی نہ ان کے پوتے کو نوکری۔ آخر اکبر صاحب نے ہی اس کا نوٹس لیا اور کان سے پکڑ کے کاشف کو اپنے دوست کے آفس میں جاب دلا دی، اور آئندہ محنت سے کام کرنے کی تاکید کے ساتھ جاب چھوڑنے پر گھر سے نکلنے کی دھمکی بھی دے دی اور اماں کی لڑکیاں مسٹر دکنے والی عادت بھی ان کو پسند نہیں تھی مگر ماں کی خاطر اب تک خاموش تھے۔ عارف کے دو بیٹے احمد اور مصطفیٰ تھے اور فرزند کی دو پیاری بیٹیاں اور کاشف صاحب ابھی تک چھڑے چھٹا تک محوم رہے تھے اب تو کاشان بھی انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ اس کا مستقبل بہت روشن تھا۔ ابھی سے اسے جاب کی آفر آ رہی تھیں کہ یونیورسٹی کا بہت ہونہار طالب علم تھا۔

آج بھی کسی نے لڑکی دکھانے کا کہا تھا اور سلمیٰ اماں کے ساتھ جا کر دیکھ آئی تھیں مگر اماں کو اس کی عمر پر اعتراض تھا کہ ایم اے کر کے جاب کر رہی ہے تو کتنی بڑی ہوگی۔ اچھی خاصی معقول لڑکی کو اماں نے کئی عمر کی عورت بنا دیا تھا اکبر صاحب نے تو کہہ دیا۔  
”بس ہاں کر دو ہیں۔“

اماں منہ پر دوپٹا ڈال کر پچپک کر روئے لگیں اور اماں کے آگے کون بولتا یہ رشتہ بھی نہ ہوا۔  
آج اماں کو کچھ بخار سا محسوس ہو رہا تھا۔ بڑا مدے میں لیٹی ہوئی تھیں۔ شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے کہ اماں نے بھوکا واز دی۔

”سلمیٰ ذرا ایک کپ چائے تو بنا دے۔“ کہہ دو واڑے پر دستک ہوئی۔ کاشف اندر داخل ہوا۔  
”ارے کاشف تیری اسکوڑ کہاں ہے آج آواز نہیں آئی اور یہ حیرے ساتھ کون ہے۔“  
عمایا میں کوئی کاشف کے ساتھ تھا۔ سلمیٰ بھی کچن سے باہر آ گئیں۔ صدف بھی کمرے سے نکلی۔  
”دادی یہ میرے دوست کی بہن ہے عظمیٰ اس کے ماں باپ نہیں ہیں میرا دوست جاب کے لیے باہر جا رہا تھا وہ بہن کے لیے پریشان تھا تو میں نے اس سے نکاح کر لیا۔“

دادی کے ہاتھ سے سروتا گر گیا۔  
”عظمیٰ دادی کو ای کو سلام کرو۔“ عظمیٰ نے نقاب اٹھایا، دلی پتلی کمرے سانو لے رنگ کی عام سی لڑکی تھی۔ سلمیٰ کو بھی سکتہ ہو گیا، صدف گم سم کھڑی تھی۔

”دادی کسی گلی بھو۔“ کاشف دادی کے پاس بیٹھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔  
”یہ عظمیٰ ہے۔ ڈبل ایم اے کیا ہے اسکول میں پڑھاتی ہے سرکاری نوکری ہے دادی اسے تو نوکری جانے کی ٹینشن بھی نہیں ہوتی۔ بہار کالونی میں اس کا گھر ہے بھائی تو باہر جا رہا ہے اب وہ گھر بھی اس کے نام ہے۔ کاشف نہ جانے کیا بول چلا جا رہا تھا اور دادی! اپنے گورے چنے خو برو پوتے کو دیکھتی کبھی اس بہار کالونی کی رہنے والی عظمیٰ کو۔ اور ہاں دادی اس نکاح میں ایسا اور عارف بھی شریک تھے ابھی آتے ہی ہوں گے۔ وہ راستے میں مشائی لینے رکے ہیں۔“ کاشف خوشی خوشی بتا رہا تھا اور دادی کے منہ میں تو کوٹکے کا گڑ تھا۔ شاید دادی کی خاموشی میں سوال بھی تھے جواب بھی اور شاید چھپتا دے بھی۔

☆☆☆



”مما! دیکھیں میری باربی ڈول کی آنکھیں بلیورنگ کی ہیں۔“ حیرا کی بیٹی اس کو اپنی گڑیا دکھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

گڑیا کو بغور دیکھتے ہوئے حیرا کے اندر انتشار کی کیفیت پھا ہو گئی۔ اس کے ذہن کے پردہ پر وہ منظر لہرا گیا جب اس کی ماں کبھی سالوں بعد بازار جاتی تھیں اور وہ گڑیا کی فرمائش کرتی تھی تو بار بار کہنے پر ایک پلاسٹک کی گڑیا لاکر تھما دیتی، جسے وہ دلوں سنجال کر رکھتی تھی۔ گویا کوئی بہت قیمتی شے ہو۔

☆.....☆.....☆

غربت کی وجہ سے حیرا کے گھر دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے پکتی۔ گھر کا حال ایسا جیسے کوئی کھاڑ خانہ ہو۔ ہوش سنجالتے ہی چھ بہنوں میں خود کو گھرا پایا۔ بہنوں کا نزلہ عموماً اس پر ہی گرتا۔ رئیسوں کی طرح غریب گھرانوں میں سب سے چھوٹا ہونے پر پیار کرنا ایک خواب ہوتا ہے۔ گزرتے وقت میں جوانی کی دلہیز پار کرتے ہی لوگوں کے کہنے پر اسے ادراک ہوا، وہ تو اتنی بہت خوب صورت ہے۔

کبھی عید پر منتوں سے لی ٹی کریم چہرے پر گڑتی تو گویا خود کو شہزادی سمجھتی۔ وہ تھی ہی بہت خوب صورت۔ یکے بعد دیگرے بہت خاموشی کے ساتھ بڑی بہنوں کی شادیاں ہوئیں۔ کسی کو رنڈ والما تو کسی کو عمر رسیدہ بوڑھا۔ غریب گھروں پر قسمت کبھی بھی مہربان نہیں ہوتی۔ لوگ مجبور یوں کایوں ہی فائدہ اٹھایا کرتے ہیں۔ ماں نے گویا بوجھ سمجھ کر سب کو نٹھایا۔ باپ کے نہ ہونے اور کوئی ٹکڑا بچھوڑا نہ رکھنے والی بیٹیوں کے ساتھ یونہی ہوتا ہے۔ یہی رسم زمانہ ہے۔

حیرا اپنی ہی ذہن میں مست تھی۔ پڑھی لکھی تو تھی نہیں، مگر کام کاج بنیاتی اور خیالوں میں کھوئی رہتی۔ اپنے بہنوئوں کو وہ پسند نہیں کرتی تھی بقول اس کے یہ تو ”خور کے پہلو میں لنگور“ والی مثال پر پورا اترتے ہیں۔ میں تو کسی شہزادے کے سنگ رخصت ہوں گی۔ وہ خود ہی سوچ کر شرما جاتی۔ اس کے اس بچپن پر نہیں ڈور کھڑی نقدیر مسکرا رہی ہوتی۔ ایک شام آن کی آن اماں نے حکم صادر کیا ”جامنہ دھوا“۔ کچھ لوگ بھی ساتھ تھے۔ ”مگر کیوں اماں؟“ وہ سوال کر رہی تھی۔

”جادفغ ہو۔ جو کہا، وہ کر۔ میں تیری ماں ہوں کہ تو میری؟“ اماں نے آنکھیں دکھائیں تو وہ چپ ہو گئی۔ اسے قیمتی جوا پہنا دیا گیا۔ وہ تھیرا لکھا گیا اچھی آنکھیں پھٹ جائیں۔ کوشش کے باوجود ایک لفظ منہ سے نہ نکلا۔ نہ جانے کیا نام لیا گیا، کس کے ساتھ نکاح پڑھا یا گیا، کب سب خواب ٹوٹ گئے، وہ عالم بے ہوشی میں تھی جیسے۔

سسرال پہنچ کر رسمیں ادا کی گئیں۔ بہت امیر کبیر لوگ تھے۔ دلہے کو ساتھ بٹھایا گیا۔ دلہے کی بہوئیں، بیٹے، پوتے، سب محفل سجائے بیٹھے تھے۔ دلہن کو تختے دیے گئے۔ بات بات پر ”ای جی“ کہہ کر مخاطب کیا گیا۔

آج چار سال بعد جب حیرا کی بیٹی اس کو گڑیا دکھا رہی تھی تو حیرا کے دل سے شدت کے ساتھ دعا نکلی۔ ”اے اللہ! میری بیٹی کے نصیب اس کی خوب صورت گڑیا جیسے خوب صورت اور رنگوں سے بھرپور بنانا ایسے نہیں جیسے میری پلاسٹک کی بوسیدہ اکڑی ہوئی گڑیا تھی۔ وہ آج اپنی بچپن کی گڑیا جیسی ہی تو ہو چکی تھی اس عرصہ میں مگر کون جانے؟



بھول کر پڑھا ہے۔“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امام صاحب کے اس جواب کو پسند فرمایا۔  
(ماخوذ البحر الرائق صفحہ نمبر ۱۰۵۔ جلد نمبر ۲)  
مرسلہ: زیرِ اختر..... کراچی

### روزے کے دس فائدے

- (۱) اللہ تعالیٰ کا جلوہ نصیب ہوگا۔
- (۲) روزہ دوزخ کی آگ سے ڈھال ہوگا۔
- (۳) روزہ بخشش کا سبب ہوگا۔
- (۴) روزے دار کو جنت کے دروازے ریان سے داخلہ ملے گا۔
- (۵) روزہ قیامت کے دن شفاعت کرے گا۔
- (۶) روزہ دار کو عرش کے نیچے کھانا ملے گا۔
- (۷) قبر کے حساب سے نجات ملے گی۔
- (۸) روزہ دار اللہ کی خاص جزا کا مستحق ہوگا۔
- (۹) قیامت کے دن روزہ شفاعت کا ذریعہ بنے گا۔
- (۱۰) روزہ بہشت کا ضامن ہوگا۔

مرسلہ: عدیلِ تنویر..... فیصل آباد

### خوفِ خدا

ایک دفعہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کسی جنگل سے گزر رہے تھے۔ اچانک انہیں ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ تلاش کرنے پر دیکھا کہ ایک چھوٹا بچہ جدے کی حالت میں رو رہا ہے۔ تب آپ نے پوچھا تو کون ہے؟ وہ بچہ بولا، تم کون ہو، میری عبادت میں خلل ڈالنے والے۔ آپ نے کوئی جواب نہ دیا اور پھر پوچھا، تیرا استاد کون ہے، جس نے تیری اتنی اچھی تربیت کی ہے؟ بچے نے جواب دیا، میری ماں ہے۔ وہ چولہے میں لکڑیاں جلارہی تھی مگر جب میری ماں نے چھوٹی لکڑیاں لگا دیں تو ان کو جلدی آگ لگ گئی جس کی وجہ سے بڑی لکڑیاں بھی جلنے لگیں جسے دیکھ کر میں نے سوچا کہ قیامت کے دن فرعون و نمرود جیسے بڑے بڑے گنہگاروں کو جہنم کی آگ ہم جیسے چھوٹوں سے لگائی جائے گی۔ بس تب سے میں خدائے بزرگ و برتر سے معافی مانگ رہا ہوں۔

مرسلہ: علی رضا..... میاں چنوں

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر

حق

## ذوقِ آگہی

سب اس گل

### جمعہ سے غفلت

طارق بن شہاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جمعہ کی نماز شفاعت کے ساتھ ادا کرنا ہر مسلمان پر لازم اور واجب ہے۔ اس سے چار قسم کے آدمی مستثنیٰ ہیں۔ ایک غلام جو بے چارہ کسی کا مملوک ہو، دوسرے عورت، تیسرے لڑکا جو ابھی بالغ نہ ہوا ہو، چوتھے بیمار۔“

(سنن ابی داؤد)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں سے روایت ہے کہ ہم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) برسرِ منبر فرما رہے تھے۔ ”جمعہ چھوڑنے والے لوگ یا تو اپنی اس حرکت سے باز آ جائیں یا یہ ہوگا کہ ان کے اس گناہ کی سزائیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا، پھر وہ غفلوں ہی میں سے ہو جائیں گے (اور اصلاح کی توفیق سے محروم کر دیئے جائیں گے)“

(صحیح مسلم)

مرسلہ: انجم نذیر..... پشاور

### عجیب جواب

چار رکعت فرض یا سنت مؤکدہ نماز میں جب دوسری رکعت پڑھتے ہیں تو صرف التحیات پڑھی جاتی ہے، درود شریف نہیں پڑھا جاتا، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص غلطی سے دوسری رکعت کے قعدہ میں التحیات کے بعد اللہم صلی علی محمد پڑھ لے تو اس پر تجدد سہو واجب ہو جاتا ہے، اس کے متعلق امام صاحب کا ایک واقعہ منقول ہے اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ امام صاحب نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔ ”جو شخص مجھ پر درود پڑھے تو اس پر تجدد سہو کو کیسے واجب کہتے ہو؟“ امام صاحب نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ اس نے آپ پر درود



حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ جنت میں داخلے کا زیادہ تر سبب کیا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خوف خدا اور حسن خلق! اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سی چیز زیادہ تر جہنم میں داخلے کا موجب ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”منہ اور شرم گاہ۔“

(ترمذی)

مرسلہ: زین الدین..... کراچی

### اصل حیا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا۔ ”اللہ سے ایسے حیا کر جیسا اس سے حیا کرنے کا حق ہے۔“ ہم نے عرض کیا۔ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم اللہ سے حیا تو کرتے ہیں۔“ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا۔ ”یہ اصل حیا نہیں بلکہ اصل حیا یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے شرماتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے سر کی اور اس میں آنے والے خیالات کی حفاظت کرے، اسے چاہیے کہ اپنے پیٹ اور اس میں جانے والی اشیا کی حفاظت کرے اور موت اور اس کے بعد مصائب و بلا کو پیش نظر رکھے، جو آخرت کا ارادہ کرے اسے لازم ہے کہ دنیا کی زینت چھوڑ دے۔ جس نے یہ سب مراحل طے کر لیے سمجھو کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے شرمانے کا حق ادا کر دیا۔“

(ترمذی واحمد)

مرسلہ: آصف جیل..... ساکنہ

### سنت الہی

پوری کائنات کا نظام کچھ اٹل قوانین اور غیر متبدل اصولوں پر مبنی ہے۔ انہی اصول و قوانین کو سنن الہیہ کہا جاتا ہے۔ انسانی معاشرہ بھی کائنات کے نظام و مزاج سے ہم آہنگ قوانین پر چل رہا ہے۔ انسانی سوسائٹی کے یہ قوانین بھی ابدی اور دائمی ہیں۔ ان ابدی قوانین میں سے بعض کو نکوئی کہا جاتا ہے اور بعض کو تشریحی نکوئی قوانین میں انسانی ادارے اور اختیار کو کوئی دخل حاصل نہیں لیکن تشریحی قوانین انسان کو اپنے ارادے سے اختیار کرنا ہوتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق ہیں، سلام کا جواب دینا، بیمار کی عیادت کرنا، جنازوں میں شرکت کرنا، دعوت قبول کرنا اور چھینکے والے کو چھینک کا جواب دینا۔“ (بخاری و صحیح مسلم ایک روایت میں ہے) ”ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق ہیں، جب ملاقات ہو تو سلام کر، جب وہ دعوت کرے تو قبول کر، جب وہ تجھ سے نصیحت چاہے تو اس کو بہتر نصیحت کر، جب اسے چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اسے جواب میں (یرحمک اللہ) کہہ جب وہ بیمار ہو تو اس کی بیمار پرسی کر اور جب وہ مرجائے تو اس کے پیچھے چل (یعنی اس کے جنازے میں شریک ہو)

مرسلہ: مغیث..... پشاور

### اللہ دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے

حضرت ابو ہریرہ عبدالرحمن بن صخر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔“

(مسلم)

مرسلہ: پرویز اختر..... میرپور خاص

### لا الہ الا اللہ

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ ”اے پروردگار! مجھے ایسی چیز بتا جس سے تیری یاد کروں اور تجھ سے دعا کیا کروں۔“ فرمایا۔ ”اے موسیٰ! لا الہ الا اللہ پڑھا کر۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ ”اے پروردگار! یہ تو تیرے سب بندے پڑھتے ہیں۔“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”اے موسیٰ! اگر میرے سوا ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں اور ان کی تمام آبادی ایک پلڑے میں رکھ دی جائے اور دوسرے پلڑے میں لا الہ الا اللہ ہو تو کلمہ طیبہ والا پلڑا ان سے بھاری ہوگا۔“

ابن حبان اور حاکم

مرسلہ: نظام الدین..... نواب شاہ

### جنت میں داخلے کا سبب

Digitized by Google

آیت چوں کہ خصوصی حکم بیان کر رہی ہے اس لیے انہی افراد کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیے جن کی صراحت کی گئی ہے۔ ویسے اس بحث کا عصر حاضر میں کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ جہاں اجازت بھی دی گئی ہے، وہاں اگر خرابی پیدا ہوتی ہو اور ”تقویٰ“ کی حدود پامال ہونے کا اندیشہ ہو یا کوئی اور اجتماعی حکمت مقتضی ہو، وہاں اجازت ختم ہو جاتی ہے اور ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر چیز ہمہ وقت اللہ کے حضور میں ہے۔ وہ حاضر و ناظر اور شاہد و شہید ہے۔

(تشریح: سورۃ احزاب (۶) آیت: ۵۵)

انتخاب: امجد حسین..... سرگودھا

### باقیوں و اصف علی و اصف کی

+ ایک انسان کو زندگی میں با اعتماد ہونے کے لیے یہ حقیقت ہی کافی ہے کہ اس سے پہلے نہ تو کوئی اس جیسا انسان دنیا میں آیا نہ اس کے بعد ہی کوئی اس جیسا آئے گا۔ یہ عظیم انفرادیت ہی بہت بڑا انصیب ہے۔

+ سب سے پیارا انسان وہ ہوتا ہے جس کو پہلی ہی بار دیکھنے سے دل یہ کہے میں نے اسے پہلے بھی دیکھا ہوا ہے۔

+ آسمان پر نگاہ ضرور رکھو لیکن یہ نہ بھولو کہ پاؤں زمین پر ہی رکھے جاتے ہیں۔

+ دو انسانوں کے مابین ایسے الفاظ جو سننے والا سمجھے کہ سچ ہے اور کہنے والا جانتا ہو کہ جھوٹ ہے خوشامد کہلاتے ہیں۔

+ انسان جتنی محنت خامی چھپانے میں صرف کرتا ہے اتنی محنت اور کرے تو وہ خامی دور کی جاسکتی ہے۔

فائدہ سکندر حیات..... لکڑیال، مہجرات

### ایک بات

کوئی بھی انسان بے وقاد دھوکے باز نہیں ہوتا بلکہ ہمیں دھوکہ دوسروں سے وابستہ کی گئی ضرورت سے زیادہ توقعات دیتی ہیں۔ ہو سکتا وہ انسان اس وقت مجبوری میں ہو اور آپ اسے آزمائشیں اور وہ آزمائش پر پورا نہ اتر سکے وہ تو مجبور ہوگا مگر دل آپ کا چکنا چور ہوگا بے خبری میں سہی۔

سار یہ چوہدری..... ڈوگہ مہجرات

اللہ تعالیٰ سے ارتباط رکھنے والے بندے انسانوں کو انہی دلائل کی پیروی کی دعوت دیتے رہے ہیں اور جب انہیں معاشرے پر اقتدار حاصل ہوا تو معاشرے کو اعتدال، اذن اور کمال کی راہوں پر ڈالنے اور برقرار رکھنے کے لیے ان قوانین کے نفاذ کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اس سبب میں انہی معاشرتی قوانین میں سے ایک ہی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ معاشرے کے ناپاک عناصر اور ہرج مرج پیدا کرنے والے جن عناصر کا گزشتہ آیت میں ذکر ہے انہیں پہلے تو دعوت اصلاح دی جاتی ہے، پھر تنبیہ کی جاتی ہے اور اگر پھر بھی وہ باز نہ آئیں تو معاشرے کو ان کے وجود کا سد سے پاک کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ جیسے جسم کا وہ حصہ جو باقی سارے جسم کو فاسد کر رہا ہو اسے کاٹ دیا جاتا ہے یا پودوں کی سبج ٹشوٹ کے لیے ان کی کانٹ عانت کی جاتی ہے، اسی طرح گاہے چمٹکار زدہ افراد انجام بھی ان کا استیصال کامل ہی ہوتا ہے۔

(تشریح: سورۃ احزاب (۶) آیت: ۶۲)

انتخاب: خرم الغفار..... ملتان

### حجاب، استئذان اور تقویٰ

اس میں کوئی شک نہیں کہ روح مطلب ”واللہین اللہ“ اس مضمون سے اور ہر برائی سے پرہیز کرتے ہوئے اللہ کی قربانی کے لئے نتائج سے بچنے کا یہ حکم سب کے لیے ہے۔ تاہم گزشتہ آیات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عائلی زندگی کے بارے میں بعض حکمتوں کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے خصوصی احکام بھی دیے ہیں۔ آیت ۵۳ میں ایمان والوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ازواج بنی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز مانگتے ہوئے حجاب کی اوٹ میں رہیں۔ اس سے سوال پیدا ہوتا ہے اور بعض روایات کے مطابق کیا بھی گیا کہ کیا جوان کے بے حجابی میں وہ بھی اس میں شامل ہیں، تو اس آیت میں سب سے پہلے یہ واضح کیا گیا ہے کہ بعض رشتے دار اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہاں پر مفسرین نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ بیٹے اور سوتیلے کا ذکر تو آیت میں موجود ہے لیکن چچا اور ماموں کا ذکر نہیں ہے۔ اس پر بعض کے نزدیک وہ اس مفہوم میں داخل ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ انہیں مستثنیٰ نہیں کیا گیا اور وہ مفہوم میں بھی داخل نہیں۔ ہماری رائے میں



## میان مٹھو

ایک صاحب نے طوطا پال رکھا تھا، لاکھ جتن کرنے کے باوجود بھی وہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ اسے اس کے دوست نے کہا ”اسے مرچیں کھاؤ۔“

ان صاحب نے طوطے کو مرچیں کھانی شروع کر دی مگر طوطا پھر بھی نہیں بولا۔ عید کے دن ان صاحب نے طوطے سے پوچھا۔ ”میاں مٹھو! چوری کھانی ہے۔“  
میاں مٹھو نے جل کر کہا۔ ”کم بخت یارے! مرچیں ختم ہو گئی ہیں کیا؟ تمہیں چوری نصیب ہوتی ہے جو مجھ سے پوچھ رہے ہو۔“

پروین افضل شاہین..... بہاولنگر

## معلومات دنیا

۱۰ بلجیم واحد ملک ہے جہاں ننگے پاؤں چلنا جرم ہے۔

۱۱ پارسی ایک ایسا مذہب ہے جس میں مردے کو چھوٹا حرام ہے وہ لوگ اسے اپنے مخصوص قبرستان میں ڈال دیتے ہیں جہاں گدھ اور چھیلیں مردے کا گوشت کھا جاتی ہیں۔

۱۲ ایک ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا ایک لفظ لکھنے سے 125 آدمی مارے گئے اور اس کا ایک باب لکھنے سے 12 لاکھ افراد کی جانیں گئیں وہ کتاب ہے خطر کی کتاب ”میری سوانح عمری“۔

۱۳ کتا ایک ایسا جانور ہے جس کی زبان پر پسینہ آتا ہے۔

۱۴ دنیا کی سب سے بڑی کتاب برٹش میوزیم (لندن) میں ہے یہ کتاب چارلس دوم کے عہد میں لکھی گئی اس کے اوراق کی لمبائی تقریباً 6 فٹ اور چوڑائی سواتین فٹ ہے اس کی جلد آٹھ بکریوں کی کھال سے تیار کی گئی ہے۔

۱۵ مراکش کا ایک ایسا حکمران تھا جو 888 بچوں کا باپ تھا اس کا نام شاہ مولائے اسماعیل تھا اس کے دور حکومت میں ایک ایسی رجسٹر تھی جس میں 540 سپاہی تھے اور یہ تمام اس کے اپنے بیٹے تھے۔

۱۶ دنیا میں سب سے لمبا درخت امریکہ میں پایا جاتا ہے جس کی اونچائی 673 فٹ ہے اور گہرائی 101 فٹ ہے

اگر اس درخت کو کاٹ کر دیاسلائی بنائی جائے تو دنیا کے ہر شخص کو ایک ڈیالکتی ہے۔

۱۷ سعودی عرب وہ واحد ملک ہے جس کا پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہوتا۔

۱۸ بردنائی ایک ایسا ملک ہے جہاں عورت مرد کی نسبت زیادہ رہائش پذیر ہیں۔

۱۹ دنیا کا سب سے خوب صورت پرندہ مرغ فردوس ہے۔

۲۰ انسانی جسم سے 6 جج تنک ایک پیالہ چینی اور دس مکین پانی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

۲۱ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مہندی کے پھول اور ریحان کی خوشبو پسند تھی۔

۲۲ امریکی صدر ابراہم لنکن ایک غریب کسان کا بیٹا تھا۔

راشدہ تہجا..... ملتان

## میری زندگی

خوشیوں سے ناراض ہے

میری زندگی

پیاری محتاج ہے

میری زندگی

مسکراتی ہوں

اور دل کو دکھانے کے لیے

ورنہ رو کی

کتاب ہے میری زندگی.....

عقلمند شائل..... فیصل آباد

## کام کی بات

☆ میری چالوٹی کرو گے تو میں تم پر یقین نہیں کروں گا۔

☆ مجھ پر تنقید کرو گے تو میں تمہیں پسند نہیں کروں گا۔

☆ مجھے نظر انداز کرو گے تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔

☆ میری حوصلہ افزائی کرو گے تو میں تمہیں فراموش نہیں کروں گا۔

☆ میری حوصلہ افزائی کرو گے تو میں تمہیں فراموش نہیں کروں گا۔

☆ میری حوصلہ افزائی کرو گے تو میں تمہیں فراموش نہیں کروں گا۔

☆ میری حوصلہ افزائی کرو گے تو میں تمہیں فراموش نہیں کروں گا۔

☆ میری حوصلہ افزائی کرو گے تو میں تمہیں فراموش نہیں کروں گا۔

☆ میری حوصلہ افزائی کرو گے تو میں تمہیں فراموش نہیں کروں گا۔

☆ میری حوصلہ افزائی کرو گے تو میں تمہیں فراموش نہیں کروں گا۔



وادی کشمیر

خون میں ڈوبی ہوئی ہے وادی کشمیر پھر  
جنت ارضی مری کیوں عرصہ محشر میں ہے  
ظلم کی کیا اور ہوگی اس سے بڑھ کر انتہا  
نوحہ غم کی صدا کشمیر کے ہر گھر میں ہے  
راؤ تہذیب حسین تہذیب

محبوبوں کے موسموں کا کیا ڈر

بارشوں کے موسم میں  
بجلیوں کے خوف سے  
مکان گر جاتے ہیں  
دریا بھر جاتے ہیں  
بارشوں کے موسم  
پرندے آشیانوں میں لوٹ جاتے ہیں  
درندے راہ بدلتے ہیں  
بجلیوں کے خوف سے  
بارشوں کے موسم میں  
ٹیلیوں کے رنگ اڑتے ہیں  
پھول پھرجاتے ہیں  
پر محبوبوں کی عجب ہی کہانی ہے  
بارشوں کے موسم میں  
بجلیوں کے خوف سے

بھڑے ہوئے دریا میں

سونیاں اترتی ہیں  
نہ بارشوں کا خوف نہ بجلیوں کا ڈر  
محبتیں تو بالاتر ہیں  
خطروں سے بے نیاز  
یہ موسم کہاں روک پائے ہیں  
پتھروں کی بارش ہو  
صحرا نور دی ہو  
محبتیں کب ڈرتی ہیں  
نہ تخت و تاج کی فکر  
نہ کبدوں کا کوئی ڈر  
یہ تو محبتیں ہیں  
موسموں سے بے نیاز  
خطروں سے بے پروا

## خوش بوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

حمد باری تعالیٰ

ایک مٹی سے بنایا ایک مٹی میں سمایا  
یہ سب کرم میرے چچے رب نے فرمایا  
گوہِ شاہ ہو گدا ہو حقیقت سب کی یہی  
جو نظر گھمائے تو ایک ہی آسمان بنایا  
آسمان کو سروں پر چھتری نما بنایا  
آسمان کو سورج، چاند، ستاروں سے سجایا  
مٹی کا پتلا بنا کر کہیں دل کہیں دماغ بنایا  
حوا کو بنا کر آدم کی پہلی میں سمایا  
پھر اسی سے آدم کی نسل کو چلایا  
بھی نورج بھی ابراہیم بھی موسیٰ کو بنایا  
انسانوں کی بھلائی کے لیے کیا کیا اپنایا  
ابراہیم کو آگ اور عیسیٰ کو سولی چڑھایا  
بھی دے کر آنکھیں اس میں جہاں بسایا  
کبھی نکال کر جان اس کو موت کا مزہ چکھایا  
صغریٰ کوثر.....

سلام

حادثوں کا امتحان ہے کربلا  
اشک و خوں کی داستان ہے کربلا  
خاک پر بکھرے ہوئے لاشوں کو دیکھ  
سرزمینِ خونچکاں ہے کربلا  
بے بسی اور شرم سے نمبر فرات  
آج تک نوحہ کنناں ہے کربلا  
ہے غمِ شبیر میں ہر آنکھ نم  
رو پڑا دیکھ آسمان ہے کربلا  
خاک و خوں میں ہے بسی یہ سرزمین  
موت کا اک آستان ہے کربلا  
دس محرم کو جلائے تھے جو، گل  
ان ہی خیموں کا دھواں ہے کربلا

سباس گل..... رحیم یار خان



یہ کب کسی سے ڈرتی ہیں  
یہ کب کسی ڈرتی ہیں

ریحانہ سعیدہ..... لاہور

غزل

زندگی یہ در بدر ہے اور میں  
ایک صحرا کا سفر ہے اور میں  
ایک تنہائی کا عالم ہر طرف  
گھر کوئی جیسے کھنڈر ہے اور میں  
رات مجھ سے کر رہی ہے دوستی  
چاند میرا ہم سفر ہے اور میں  
دے رہے ہیں دھم میرے روشنی  
مجھ پر دنیا کی نظر ہے اور میں  
درو ہے نمایاں آنکھ میں  
شام کا پچھلا پہر ہے اور میں  
قدیرانا..... راولپنڈی

غزل

زندگی میں کیا کیا یار نے آئے تھے  
بے مروت لوگ بن کر دیوانے آئے تھے  
دل کی ویرانیاں اکثر پوچھا کرتی ہیں  
وہ لوگ کہاں گئے جو دل کو بسائے آئے تھے  
خود جام پینا انہیں بھی نہ آتا تھا  
پینے جو آنکھوں میں پلانے آئے تھے  
ہمیں دیکھ کر محفل میں چپ سے ہو گئے  
جو وفا کا مطلب سمجھانے آئے تھے  
الچہ کر رہ گئے زمانے کی تک و دو میں  
جو لوگ زمانے کو سلجھانے آئے تھے  
انہوں نے ہی بجھایا ہماری زندگی کا چراغ فاروق  
جو لوگ روشنیاں پھیلانے آئے تھے  
عمر فاروق ارشد..... فورٹ عباس

غزل

نفرت کے یہ چراغ بجھائے نہ جائیں گے  
کیا جاہتوں کے گیت سنائے نہ جائیں گے  
اس کے خطوط میں ہے محبت کی چاشنی  
اس کے خطوط مجھ سے جلائے نہ جائیں گے  
اس دور ارتقاء کی حقیقت نہ پوچھیے

جو بار غم دیے وہ اٹھائے نہ جائیں گے  
ہوگی نہ کامیاب یہ کوشش میری کبھی  
فرقت کے داغ دل سے مٹائے نہ جائیں گے  
تم پھول بھیجتے ہو تو بھیجو مگر جمال  
گل دان میں یہ پھول سجائے نہ جائیں گے  
سبح جمال..... کراچی

غزل

کچھ بھی باقی بچا نہیں سنانے کو  
مہرباں آئے تھے پھر مٹانے کو  
ایک ہی پل میں بدل گیا سب کچھ  
جانے اب کیا ہو گیا زمانے کو  
جن سے اپنا رشتہ تھا کوئی  
آئے تھے وہ بھی ہمدردیاں جتانے کو  
تجھ سے کسی نے کہا پلٹ آنے کو  
رہ گئیں دل میں پھر یادیں ستانے کو  
دل کو جل کے راکھ ہو چکا جاوید  
اور کیا رہ گیا بتا جانے کو

محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد

تشویش

رات عجیب کی بات ہوئی  
برسوں بعد میں گزری تھی  
ان رستوں سے ان گلیوں سے  
جن رستوں پہ، جن گلیوں سے  
جن رستوں پہ، جن گلیوں میں  
ہم وقت گزرا کرتے تھے  
وہ دلیں تمہارا اپنا ہے  
پر رات عجیب کی بات ہوئی  
اس دلیں کی سر و فضاؤں نے  
مجھے روک لیا اور پوچھا  
جو بن تیرے مرجانے کی باتیں کرتا تھا  
کہاں ہے وہ اس کے دعوے کہاں گئے  
تم سے پچھڑ کر کیسے زندہ ہے؟

نیم کینہ صدف.....

غزل

قیمتیں ہیں خرید سے باہر

بات گفت و شنید سے باہر  
دیکھو مفلس غریب بیٹھا ہے  
محفل جشن عید سے باہر  
بہر جی ہو گیا کالا بکرا  
دسترس مرید سے باہر  
آج جو ہو رہا ہے دنیا میں  
نہ تھا باضی بعید سے باہر  
ہو نہ جائیں خلوص و پیار و وفا  
میرے دور جدید سے باہر  
دے گواہی اگرچہ ہو، منصف  
ڈر، دل چشم دید سے باہر  
کفر، نیر ہے دل کی مایوسی  
کچھ نہیں ہے امید سے باہر

نیر رضاوی..... لیاقت آباد  
ابھی عمراتی ہے

ابھی اک عمراتی ہے  
پچھلے موسم میں اترنے والی  
گلاب رُت کا ہر اک دل رہا منظر  
میری آنکھوں میں تازہ ہے  
ابھی ہیں میری پلکوں پہ  
دیے چاہت کے روشن  
ابھی اس روزن دل پہ چاند کا کس  
کئی باتیں کیا کرتا ہے  
ہے ابھی خوابوں کی فصل شاداب بہت  
ابھی تو

میرے دل میں خواہشیں رقصاں ہیں  
ابھی اس پہل  
کسی انہونی کا خدشہ نہیں مجھ کو  
ابھی  
ان بوجھل پلکوں کی منڈیروں پر  
روشن چراغوں کو

کسی طوفان کا اندیشہ نہیں  
میرے چاروں طرف  
میرے خوابوں کا بیرا ہے  
سنو جاناں!

ابھی مجھ کو  
اس خواب سے بیدار نہ کرنا  
کسی خواہش کو بھی  
اس طلسم بے خودی سے  
آزاد نہ کرنا  
ابھی کچھ دیر بس کچھ اور پہل  
یہ کھیل چلے دو  
ذرا مجھ کو پچھلے دو  
کہ  
ابھی اک عمراتی ہے  
سکھنے کو آنسو بہانے کو  
مکے موسم کی گل رُت کے  
حسین لمحوں کی راکھ  
جتنے کو

گزرتے وقت کے ہر پہلو کو  
عذاب جان کہنے کو  
ابھی اک عمراتی

زرین صدیقی امیر.....

غزل  
اشک گزرتے ہیں میری سانس سنہل جاتی ہے  
دے کر ایک درد نیا شام نکل جاتی ہے  
اس کو دیکھوں تو میرے درد کو ملتا ہے سکون  
اس سے مجھڑوں تو میری جان نکل جاتی ہے  
عشق کچھ ایسے مٹاتا ہے نشان ہستی  
جیسے ہر رات اجالوں کو نکل جاتی ہے  
دُغم بھرتا ہی نہیں اس کی جدائی کا مگر  
پھر اس کی یاد نیا درد اگل جاتی ہے  
وہ اگر دل پر میرے ہاتھ ہی رکھ دے  
ٹوٹی سانس بھی کچھ دیر سنہل جاتی ہے  
فریحہ شبیر..... شاہ کلڈر

غزل  
یہ عید تیرے شہر میں بھی آئی ہوگی  
تو نے بڑی خوشی سے منائی ہوگی  
وہ گرم گرم سونیاں بنائی ہوں گی  
اپنے نازک ہاتھوں پر چوڑیاں کھٹکھٹائی ہوں گی



یوں تو ہر ایرے غیرے کو دوست بنایا نہیں کرتے  
اگرین جائے دوست کوئی تو اسے بار بار آزمایا نہیں کرتے  
آتی ہو جن سے ذرا بھر دوستی کی خوشبو  
ایسے دوستوں کو جھٹلایا نہیں کرتے  
جو رکھتے ہیں دوستی کا بھرم عمر بھر نیلیم  
ایسے دوستوں کو بھٹلایا نہیں کرتے  
نیلیم آرزو..... گو جرانوالہ

غزل

دور افتادہ رہے دل پھر برس برس جو ہے عشق  
آپ دیکھیں سبھی درتے ہم بھی ماہتاب رو ہے عشق  
اک لکھنے کی تبسم ہے تجھ سے دوری کا نراس  
اجلی چاندنی میں ہوں گرفتار خوش ادا من و تو ہے عشق  
تھم گیا ہے روئے وقت یوں رک جائے بھی سانس  
دم نظار کی کیا ہے نظروں کا بین، غم و آنسو ہے عشق  
ترے خوب صورت چہرے سے کفر بھلا کیسے فصیح کرے  
سہاگا نگاہوں کا رہے خونِ بک سے متالہ خور و ہے عشق  
نہیں ہے تیری محبت کا طفیل پھر تاز اک توفیق لے  
سبک گام ہیں شوریدہ سردیوانے کارگاہ سو ہے عشق  
سید عبداللہ توفیق..... حیدر آباد



مجھے تو عید کا کچھ معلوم نہیں ہوتا  
میں تو اس دن عید مناؤں گا  
جس دن یہ تیری میری ختم جدائی ہوگی  
نامہ رحمان..... کراچی

غزل

زمانے کے عجب رنگ دیکھے زمانے کی قسم  
تیری محبت میں بہت کچھ گنویا تیرے یارانے کی قسم  
اک پری چہرہ رات بھر سونے نہیں دیتا  
اس معصوم سے چہرے انجانے کی قسم  
جاہنے والے اور بھی ہوں گے مگر ہم سا کہاں  
جس نے ہمیں برباد کیا اس کے دوستانے کی قسم  
جو تو نے ملائی تھی آج تک نہیں اتڑی  
تیرے تقدس کی قسم تیرے میخانے کی قسم  
جو پہلوئے یار میں گزرے، وہ لمحے مقام رکھتے ہیں  
جو گزرا وقت اس کے گزر جانے کی قسم  
ساگر اس شخص کی کچھ مجبوریاں ٹھہری ہوں گی  
وہ ایسا تو نہ تھا، اس کے وعدہ بھانے کی قسم  
ساگر نین آبادی..... مٹین آباد

غزل

ناگھر ہے، نا جمونیزا پاکل ہی نہتے ہیں  
پھر بھی ریش ہیں ہم کہ ترے دل میں رہتے ہیں  
سننے نہیں وہ حیرانگی ہے کہ بہرے بھی نہیں  
برسوں سے دو بول پیار کے جو کہتے ہیں  
پیوستہ ہے تیر دل میں جو لکنا ہی نہیں  
دن رات تو کیا ہر لمحہ عذاب سہتے ہیں  
دکھتے نہیں ہیں دکھ مجھ کو کہ نیم بیٹا ہو گیا میں  
بد پرہیزی بھی غضب کی کہ ہر دم اشک بہتے ہیں  
اس کی طلب میں جدے کیسے جو سب رائیگاں  
سجدہ کرو تو طلب خدا میں یہی سب سے کہتے ہیں  
ہماری تو نا ہی پوچھو کہ ہم مقید ہیں راز  
ہر ایک دل میں چپکے سے قید رہتے ہیں  
مومن راز..... اسلام آباد

دوستوں کی خوشبو

حال دل دوستوں سے چھپایا نہیں کرتے  
جو دیتے ہیں دغا وہ دوست کہلایا نہیں کرتے

# بینا نائینا

زردین قمر

D for daisy یہ ناول Nick Aaron نے لکھا ہے۔

1943-44ء کے دوران دوسری جنگ عظیم میں جب برطانیہ، برلن، پرتابڑ توڑ حملے کر رہا تھا اور شمالی یورپ پر جرمن دارالحکومت پر قبضہ کر لیا تھا تو اس دوران ایک سچے پیار کی داستان بھی پنپ رہی تھی۔ برطانوی ہوائی فائر پائلٹ رالف بریڈر اور نائینا ڈیزی کی داستان، وہ دونوں ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے اور جنگ کے دوران ہی ان کی شادی ہوئی تھی، پھر رالف کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے قتل کی تحقیقات کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا کیونکہ کوئی اسے قتل ماننے کو راضی نہیں تھا، تب اس کی نائینا بیوی خود یہ بیڑہ اٹھاتی ہے اور اس معے کو حل کرتی ہے۔ پل پل نئے انکشافات کرتی، یہ ناول آپ کو یقیناً پسند آئے گا۔“

URDU TUBE

A HUB OF ENTERTAINMENT





”اچھا اچھا..... غصہ مت کرو۔“

”جہاز کی حالت کیسی ہے؟“ زمینی اسٹیشن سے پوچھا گیا۔  
 ”بالکل ٹھیک، ایندھن بھی کافی ہے..... جہاز لینڈ کر سکتا ہے۔“ کیپٹن نے جواب دیا۔

”میں نہیں جانتا، میں نے پہلے کبھی یہ نہیں کہا۔۔۔۔۔ یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ تم ایئر پورٹ کو اطلاع دے دو کہ ایک فوجی سٹر انچارج ہے۔۔۔۔۔ بالٹ مرچ کا ہے اور انجینئر ہی جہاز تار رہا ہے، ایئر جیسی لینڈنگ ہے اور۔۔۔۔۔ کیپٹن نے کہا۔۔۔۔۔ ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں اطلاع دیتا ہوں۔“

”ایئر پورٹ انتظامیہ کے لیے یہ ایک معمول کی بات تھی، ایسے واقعات جنگ کے دوران ہوتے رہتے تھے کہ کوئی پائلٹ کسی حادثے کا شکار ہو گیا اور اس کی جگہ کسی دوسرے نے سنبھالی۔ لیکن ان دونوں جہاز پر کوئی کو پائلٹ نہیں ہوتا تھا چنانچہ فلائیٹ انجینئر ہی کو جہاز اتارنا پڑا تھا۔ چنانچہ اس جنگی جہاز ڈی-ڈیزری کو بھی اسی طرح ہنگامی لینڈنگ کرنا پڑی تھی۔ اس جہاز کا یہ نام اس کے پائلٹ نے رکھا تھا یہ اس کی بیوی کا نام تھا جسے وہ بہت چاہتا تھا، جہاز کی لینڈنگ کے ساتھ ہی طبی امدادی عملہ وہاں پہنچ گیا تھا اور پائلٹ کی ہاڈی کو ایک اسٹریچر پر ڈال کر قریب کھڑی میمورینس میں رکھ دیا تھا، جنورائی وہاں سے روانہ ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ڈیزی اپنے لونگ روم میں اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ  
 موجود تھی وہ ان کے ساتھ مل کر اسٹڈی کرتی تھی اور خود بھی  
 مائنس کی اسٹوڈنٹ تھی اس وقت اس کے سامنے ایک

”شاہبازو..... تم کیا کہتے ہو؟ کیا نیچے سے بم پھینکنے والوں نے اے مورچے جھوڑ دئے ہیں؟“

”ہاں..... ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے لیکن ہم اب یعنی ان کی پہنچ میں ہیں، مگر اب وہ ہم مار سکیں گے تو ہمیں پیچھے سے نشانہ بنائیں گے، تم جہاز کو اور اونچائی پر لے جاؤ اور انہیں ہم پر چھوڑ دو ہم انہیں دیکھ لیں گے۔“

”ٹھیک ہے لیکن تم یہاں آ کر میری سیٹ سنبھالو۔“  
فلاحیٹ انجینئر نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

”رائٹ، میں آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا اسے چند لمحے لگے تھے اپنے آسجین ماسک کو آسجین سپلائی سے الگ کرنے میں، اس کا فلائیٹ ہیلٹ انٹرکام لائن سے جڑا تھا، وہ بھی اس نے اتارا تھا اور اپنی وھیملی وڈھالی فوجی وردی کے ساتھ فلائیٹ انجینئر کی سیٹ کی طرف بڑھ گیا تھا، اتنی دیر میں زمینی اسٹیشن سے رابطہ ہوا تھا اور پائلٹ ڈریک کو مخاطب کیا گیا تھا جو بے جان اپنی سیٹ کے قریب پڑا تھا۔ فلائیٹ انجینئر نے مخاطب کرنے والے کو جہاز کی صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔

”اوہ، اس کی حالت کیسی ہے؟ کیا اس کی بعض محسوس ہو رہی ہے؟“

”کچھ دیر پہلے تک تو محسوس ہو رہی تھی لیکن اب نہیں..... میں اب بھی اس کے ماتک کے ذریعے اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”اچھا اگر تمہارے پاس جیسی آئینہ ہے تو اس کے منہ کے قریب کر کے دکھا لو وہ سانس لے رہا ہے؟“

”میرے پاس کوئی جیبی آئینہ نہیں ہے۔ بھلا جنگی جہاز میں اس کا کیا کام، ہم برلن کی طرف جا رہے ہیں، یہاں میں شیو کرنے کی ضرورت نہیں جو آئینہ ساتھ رکھتے۔“



ہیں اور تم احق ہو۔“ اس دوسری لڑکی نے پہلی کو چھیڑا اور اسی وقت فلیٹ کے دروازے پر دستک ہوئی۔  
 ”بھلا اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“ ڈیزی کی ایک دوست بولی۔

”مجھے کچھ اندازہ ہے۔“ ڈیزی نے اٹھتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔  
 ”ہیلو! میجر منٹگو۔“ ڈیزی نے کہا اور آنے والے کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔

”اور خدا یا! مسز بریڈر، تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟“  
 ”تمہارا یونیفارم اسی فیز نے دھویا ہے جو رالف کا دھوتا تھا میں اس کی خوشبو محسوس کر سکتی ہوں۔“ ڈیزی نے اطمینان سے جواب دیا۔ جب رالف نے جنگی پروازیں شروع کیں میں تب سے ہی اس وقت کے بارے میں سوچتی تھی۔“ اس نے ادا کی ہے۔

”فلیٹ کے دروازے میں کھڑا میجر منٹگو جانتا تھا کہ ڈیزی اندھی ہے لیکن جس چیز نے اسے حیران کر دیا وہ ڈیزی کی خوب صورتی اور اعتماد تھا وہ بلاشبہ بہت خوب صورت، ہلکی، متناسب جسم کی مالک اور پر وقار تھی، اس کے منہ پر ہلکے ہلکے بال اس کے چہرے کے گرد بالابٹائے ہوئے تھے۔  
 ”آپ اندھا جانتے میجر، میں اپنی دوستوں کو واپس بھیج دیتی ہوں تاکہ ہم بات کر سکیں۔“

کچھ ہی دیر بعد اس کی سہیلیاں چلی گئی تھیں اور وہ میجر کے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔  
 ”آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری مدد کی۔“ ڈیزی نے کہا۔

”یہ تو میرا فرض تھا مسز بریڈر۔“ میجر منٹگو نے کہا۔  
 ”آپ مجھے صرف ڈیزی کہہ سکتے ہیں مجھے بتائیے کیا ہوا تھا۔“

”کل رات ڈی۔ ڈیزی“ بخیریت لینڈ کر گیا تھا اور رالف کی باڈی میڈیکل عملے کو بھیج دی گئی تھی۔ جہاں سے اس کی موت کفرم ہونے کی اطلاع آئی ہم کچھ نہیں کر سکے۔“  
 میجر نے کہا چند لمحوں تک ڈیزی خاموش بیٹھی رہی، میجر بنور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح ڈیزی کو دیکھنے سے اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا، کیونکہ وہ اندھی ہے لیکن وہ اس کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانا چاہتا

انسانی ڈھانچہ موجود تھا، جس کا وہ ایک ایک پارٹ الگ کرتی جا رہی تھی اور اس کا نام بتاتی جا رہی تھی اس کی سہیلیاں اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

”حیرت انگیز..... ڈیزی یہ تم کیسے کر لیتی ہو؟“ اس کی ایک دوست نے کہا۔ ”تم نے ایک ایک عضو کا درست نام لیا ہے۔“  
 ”ہاں..... میں نے اپنے ذہن میں ان چیزوں کا ایک نقشہ

بنالیا ہے، چنانچہ مجھ کے نام نہر تیب سے یاد رہے ہیں۔“  
 ”میں سوچتی ہوں تمہیں ہماری مدد کی ضرورت نہیں تم تو خود اچھی معلومات رکھتی ہو۔“ اس کی دوسری دوست نے ہنستے ہوئے کہا۔

”لیکن جیسا کہ تم لوگ جانتی ہو یہاں ”بریلے“ میں انٹرویو کی کس نہیں ملتی ہیں اس طرح میں خود کو بھی چپک کر لیتی ہوں کہ میں نے درست نام یاد کئے ہیں یا نہیں اور تمہاری بھی مدد ہو جاتی ہے۔“ ڈیزی نے کہا۔

”خیر تمہیں تو امتحان کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں سب یاد ہے۔“ تیسری لڑکی نے کہا۔ پھر وہ یہ مشق کرتی رہی تھیں، ڈیزی نے دوبارہ عضوعات کے نام لیتا شروع کئے تھے اور ہر عضو باری باری اس کی جگہ پر فٹ کرتی چلی گئی تھی، یہاں تک کہ وہ انسانی ڈھانچہ مکمل ہو گیا تھا، اس کی سہیلیوں کو اس کی صلاحیتوں پر حیرت تھی ڈیزی آنکھوں سے اندھی تھی لیکن ہر کام بہت پرفیکٹ کرتی تھی، اسی لئے وہ اس کو بہت پسند کرتی تھیں وہ ان کے ساتھ سینٹ میری ہاسپٹل میں کام کرتی تھی، جوں جوں یونیورسٹی سے منسلک تھا، ڈیزی فزیکل تھراپسٹ بننا چاہتی تھی وہ اکثر کبھی تھریسز دی کرتی ہیں جو ڈاکٹر کہتے ہیں لیکن فزیکل تھراپسٹ اپنے کام کے لیے اپنے فیصلے خود کرتے ہیں۔

”ڈیزی نے اپنی پسند سے ایک فائٹر پائلٹ سے شادی کی تھی، سرکاری کاغذات میں اس کا نام رالف بریڈر تھا اس کے پاس اس کا اپنا فلیٹ تھا جہاں وہ رالف کے ساتھ رہتی تھی، وہ اکثر چٹھیوں پر آتا تو اپنا سارا وقت اس کے ساتھ ہی گزارتا تھا۔“

”تمہیں کتنا عجیب لگتا ہوگا ڈیزی کہ اتنی ذہین ہو، لیکن اندھی ہو؟“ اس کی ایک دوست نے کہا، لیکن ڈیزی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”ہاں، اور تمہیں کتنا عجیب لگتا ہوگا کہ تمہاری آنکھیں



”کیا تم نے رالف کی باڈی دیکھی ہے؟ کیا وہ بہت ڈنچی ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتا..... میں نے اسے نہیں دیکھا۔“ میجر نے جواب دیا۔

”حیرت کی بات ہے۔“ ڈیزی نے ناگواری سے کہا۔  
”تم جانتی ہو..... میڈیکل آفیسر کی رپورٹ آخری ہوتی ہے اور اس پر ہی ہمیں کام کرنا ہوتا ہے میں نے ضروری نہیں سمجھا کہ خود جا کر باڈی دیکھوں۔“

”لیکن اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو ضرور جا کر دیکھتی بلکہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر محسوس بھی کرتی۔“

”ہاں ہاں..... اگر تم چاہو گی تو تمہیں سرد خانے میں بھی بھیج دیں گے۔“ میجر نے کہا۔ ”ویسے آج رات ہمیں ایک اور آپریشن کر جانا ہے میں بہت مصروف ہوں گا کیا تم اسے طور پر واپس جاسکتی ہو؟ تم ٹرین کے ذریعے لندن واپس جاسکتی ہو یا اگر چاہو تو میرا کوئی آفیسر تمہیں کار میں چھوڑ آئے گا۔“

”یہ نہیں..... اس کی ضرورت نہیں میں خود ٹرین میں چلی جاؤں گی..... میں اپنے کام خود کرنے کی عادی ہوں۔ پھر مجھے بہت سے اچھے لوگ مل جاتے ہیں جو میری مدد کر دیتے ہیں اور کسی بھی بھری ہوئی ٹرین میں مجھے سیٹ بھی با آسانی مل جاتی ہے۔“

”اوہ..... بہت خوب۔“

”کچھ دیر بعد ڈیزی ایک قصبہ ڈن مو میں ایک سرد خانے میں کرسی پر بیٹھی تھی، یہ جگہ اس کے شوہر کے آری میں کے قریب ہی واقع تھی۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہارے لیے یہ بہت مشکل کام ہو گا، لیکن تم ٹائیڈا ہو تم اپنے شوہر کی شناخت کیسے کرو گی؟“ ڈیوٹی پر موجود آفیسر نے اس سے پوچھا۔

”میں جانتی ہوں..... میں قانونی طور پر اسے شناخت کرنے کے قابل نہیں ہوں، لیکن میں اسے پہچان سکتی ہوں، صرف اس کا چہرہ چھو کر، میں اس کی موجودگی اور غیر موجودگی کو صرف سن کر یا سونگھ کر محسوس کر سکتی ہوں..... میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں..... پلیز.....“ ڈیزی نے کہا۔ آفیسر حیرت اور افسوس سے اسے دیکھ رہا تھا کچھ ہی دیر بعد وہ رالف کی لاش کے قریب بیٹھی تھی اس کی آنکھوں پر اب بھی سیاہ چشمہ تھا اور ہاتھ میں سفید چمچری اس کا پرس اب بھی اس کی گود میں

تھا۔ ڈیزی کا نچلا ہونٹ کانپ رہا تھا۔ اس کی تیریاں چڑھ گئی تھیں اور بالکل تیزی سے حرکت کر رہی تھیں، شاید وہ آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تم ٹھیک تو ہونا؟“ چند لمحوں بعد میجر نے پوچھا۔

”ہاں..... ہاں..... میں ٹھیک ہوں..... کیا تم مجھے ایئر پورٹ لے جاسکتے ہو؟ میں..... میں اس کی باڈی دیکھنا چاہتی ہوں۔“ ڈیزی نے کانپتی آواز میں۔

”ہاں..... ضرور.....“ میجر نے مختصر سا جواب دیا۔

پھر میجر مینگو، ڈیزی کو اپنی بڑی کالے رنگ کی سیلون کار میں بٹھا کر لندن لے گیا تھا اس کے لیے یوں کسی لڑکی کو بٹھا کر ایئر پورٹ لے جانا عجیب سا تھا وہ انیس آری اسٹیشن میں کمانڈنگ آفیسر تھا اور ستر جنگی جہازوں کا انچارج تھا اور اس کے کاندھوں پر بڑی ذمہ داریاں تھیں اسے اس پوزیشن کو حاصل کرنے میں بہت محنت اور وقت لگا تھا اور وہ سوچتا تھا کہ جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد اس کا کیریئر کیا ہو گا اس کے بہت سے پائلٹ اور فوجی مارے جاتے تھے، برکن پر وہ رات حملہ کرتے تھے اور بہت سے جنگی جہازیں تک واپس نہیں آسکے تھے۔ پچھلی رات کا آپریشن ٹھیک رہا تھا، لیکن اس میں رالف مارا گیا تھا اور میجر مینگو جو ایئر پورٹ کا سی او بھی تھا خود یہ خبر دینے ڈیزی کے پاس گیا تھا وہ خود بھی چاہتا تھا کہ اگر اس کا کوئی ماتحت فوجی ہلاک ہو تو وہ اس کی اطلاع اس کے اہل خانہ کو خود دے۔

ڈیزی کی کار میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی، اس نے سیاہ چشمہ پہنا ہوا تھا اور اس کے قریب ہانس کی بنی سفید چمچری رکھی تھی اس کا براؤن پرس اس کی گود میں بڑا تھا، اس کے چہرے پر غم کے آثار تھے، لیکن اس نے کوئی آنسو نہیں بہایا تھا جب کہ میجر کا خیال تھا کہ جب وہ بیوہ سے ملے گا تو وہ اپنے شوہر کی موت کا ماتم کرے گی، روئے گی، فریاد کرے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، ڈیزی نے بڑے کل سے اپنے شوہر کی موت کی خبر سنی تھی اور اس کے ساتھ ایئر بیس جانے کی درخواست کی تھی۔

”میرا خیال ہے تم کافی مضبوط دل کی مالک ہو؟“ میجر نے پوچھا۔

”ہاں..... لیکن یقین کرو اگر میں رو سکتی تو خود روتی۔“ ڈیزی نے کہا پھر کچھ دیر وہ خاموش بیٹھی رہی۔



”اوہ..... میں نے اس وقت ایسا کچھ نہیں سوچا تھا..... شاید میں سمجھ رہا تھا کہ یہ ایک عام شہری کی لاش ہے..... آج کل بہت لاشیں آتی ہیں جنگ کا زمانہ ہے۔“  
 ”نہیں۔ شہری نہیں رالف ہے، پائلٹ آفیسر رالف بریڈر، وہ ایک جنگی جہاز پر تھا اور بہترین نشانہ باز تھا۔“  
 ڈیزی نے کہا۔

”ہاں.....“ رالف بریڈر..... D-Daisy، اس کے انگوٹھے پر پہنی پرچی لگی ہے، لیکن کوئی فوجی ریک نہیں لکھا ہوا۔ جب کہ عام طور پر یہاں ریک بھی لکھا ہوتا ہے۔“  
 ”میں تمہاری شکر گزار ہوں..... تم نے میری خاصی مدد کی ہے۔“ کچھ دیر بعد ڈیزی نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ وہ واپس سرد خانے کے آفس میں گئی اور وہاں موجود آفیسر کو ساری صورت حال بتائی تھی، پھر اس سے درخواست کی تھی کہ رالف کا پوسٹ مارٹم کروایا جائے تاکہ اس کی موت کا اصل سبب پتہ چل سکے۔

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ آفیسر نے جواب دیا۔  
 جنگ میں مرنے والوں کی موت کنفرم ہوتی ہے اس لیے عام طور پر ان کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوتا۔“  
 ”لیکن رالف کا معاملہ مختلف ہے..... اس کے جسم پر کوئی زخم نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے..... لیکن اصل میں تو ابھی اس کی آفیشل شناخت نہیں ہوئی ہے کہ وہ تمہارا شوہر ہے۔“  
 ”اچھا..... میں اپنی ساس کو فون کرتی ہوں، میرا خیال ہے ماں ہونے کی حیثیت سے وہ تو اپنے بچے کو پہچان لیں گی اور وہ میری طرح ناپید بھی نہیں ہیں۔“ ڈیزی نے جلدی سے کہا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے لیکن ہمیں آج کل بہت سی لاشیں بھیجی جاتی ہیں اس میں پائلٹ بھی ہوتے ہیں۔“  
 ”لیکن ان میں سے کتنے ہوتے ہیں جن کے جسم پر زخم نہیں ہوتے؟“ ڈیزی نے پوچھا۔

”لیکن تم اندھی ہوتی یہ بات یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟“  
 ”تو تم خود جا کر دیکھو..... اس کے جسم پر کوئی زخم نہیں ہے اور ایک بیوہ ہونے کے ناتے کیا میں یہ حق نہیں رکھتی کہ یہ جان سکوں کہ میرے شوہر کی موت کیسے واقع ہوئی؟“  
 ”میں معافی چاہتا ہوں میڈم لیکن آپ غم کی شدت سے

بڑا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی سوٹ کہیں اس کی کرسی کے قریب زمین پر رکھا تھا، وہ بہت کم عمر کی کم از کم ایک جنگی فوجی کی بیوہ ہونے کے ناتے وہ بہت کم عمر اور جوان تھی لیکن جنگ کے دنوں میں ایسا ہونا ایک عام بات تھی، اس جنگ عظیم کے دوران بھی بہت سے فوجی مارے جا رہے تھے اور ایسی نو جوان بیوئیں ان کی لاشیں وصول کر رہی تھیں، وہ سولہ سال کی تھی تب سے رالف سے محبت کرتی تھی اور اس کی شادی کو بیسٹھ سال ہوئے تھے، وہ دیر تک اپنے ہاتھ اس کے چہرے کو سہلاتی رہی اور پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی، لیکن آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے، کچھ دیر بعد اس نے وہاں موجود شخص کو مخاطب کیا۔

”معافی چاہتی ہوں..... کیا میں اس کے زخموں کو چھو سکتی ہوں؟..... تم مجھ سکتے ہو میں اندھی ہوں اور صرف چھو کر جانتا چاہتی ہوں کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟ کیا تم میرے ہاتھ کو زخموں تک لے جانے میں میری مدد کرو گے؟“ ڈیزی نے دگمی لہجے میں کہا۔

”جی ہاں میڈم..... میں باڈی سے چادر ہٹاتا ہوں۔“  
 وہاں موجود شخص نے کہا پھر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی، ڈیزی نے محسوس کیا وہ شخص زخم تلاش کر رہا تھا، کچھ دیر بعد اس نے باڈی کو کروٹ دلائی تھی، کچھ دیر خاموشی رہی تھی، پھر اس نے باڈی کو واپس اسی حالت میں رکھ دیا تھا۔

”میڈم..... مجھے کوئی زخم نظر نہیں آیا..... مجھے افسوس ہے.....“

”یہ تو بہت حیرت کی بات ہے..... ہے نا؟“ ڈیزی نے کہا۔

”ہاں..... آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“  
 ”ڈیزی بھی کچھ دیر اپنی آنکھوں سے رالف کے جسم کو سہلاتی رہی، محسوس کرتی رہی۔

”کیا تم نے ہی اسے غسل دیا تھا؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”کیا تم نے بھی کوئی ایسا فوجی دیکھا ہے جو کسی آپریشن کے دوران مارا گیا ہو اور اس کے جسم پر زخم نہ ہوں؟“

”نہیں..... کبھی نہیں میڈم۔“  
 ”تو جب تم رالف کی باڈی کو غسل دے رہے تھے تو تمہیں یہ بات عجیب نہیں لگی کہ اس کے جسم پر کوئی زخم نہیں ہے؟“



ساتھ اپنے ہاتھ میں پکڑی بینسل کے پچھلے حصے کو میز پر بار مار رہا تھا جس سے ٹک ٹک کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔

”میں جہاں تک تمہاری بات سمجھ سکا ہوں تمہارے شوہر کو جرموں نے نہیں مارا ہے، بلکہ ہماری ہی فوج کے کسی فوجی نے اسے مارا ہے؟“ انپکٹرنے مسکھاڑاٹانے والے انداز میں کہا۔

”میں خاص طور سے کسی پر الزام نہیں لگا رہی ہوں، میں صرف یہ جانتا چاہتی ہوں کہ میرے شوہر کی موت کیسے واقع ہوئی میں چاہتی ہوں کہ میرے شوہر کی باڈی کا لاسٹ مارٹم کیا جائے۔“

”اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو مجھے یہ یقین ہی نہیں ہوتا کہ کوئی میری بات پر توجہ دے گا کیونکہ تم ایسے جرم کے بارے میں بتا رہی ہو جو سر زد ہی نہیں ہوا..... یہ تو مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس کیس پر کام کرنا چاہتا ہوں یا نہیں، ممکن ہے تمہارا شوہر دل کے دورے سے مرا ہو؟“

”نہیں، اس کے دل کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں تھا وہ صحت مند تھا اور وہ جرمی پر ایک درجن سے زیادہ حملوں میں حصہ لے چکا تھا وہ ایک بہادر اور تجربہ کار بمبار پائلٹ تھا۔“

”ٹھیک ہے، لیکن کچھ بھی ہو میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں شخص تمہارے کہنے پر ایک ایسے جرم کی رپورٹ لکھ لوں جس میں مجرم کا نام ہی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو بھی گیا تو تمہاری فائل ایک دراز میں پڑی رہے گی، جب تک کہ جنگ ختم نہیں ہو جاتی ہم بہت مصروف ہیں اور ہمارے پاس زیادہ اسٹاف بھی نہیں ہے۔ تمہارے سارے نوجوان مرد ہٹلر سے لڑنے میں مصروف ہیں چاہو تو تم باہر بیٹھے ہوئے کانستبل کے پاس رپورٹ درج کروا سکتی ہو وہ جانتا ہے اسے کیا کرنا ہے.....“

”ڈیزنی جب اس کے کمرے سے نکل رہی تھی تو اس نے پشیمے ہوئے ایک اور جملہ کہا تھا۔“

”اگر تمہارا شوہر جنگ میں حملے کے دوران مارا گیا تو وہ پولیس کا مسئلہ نہیں ہے۔“ ڈیزنی اس کی بات سن کر مڑی اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”سوری،“ انپکٹرنے اپنی ہانسی پر قابو پاتے ہوئے کہا اور ڈیزنی زور سے اس کے آفس کا دروازہ بند کر کے کمرے سے نکل گئی تھی۔

پریشان ہوئی ہیں اور صرف اندازے پر ہی باتیں کر رہی ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم میری بات نہیں سمجھ رہے ہو۔“ ڈیزنی نے کہا اور سرد خانے کے آفس سے نکل گئی، پھر وہ ایک ٹیکسی لے کر ایئر بیس کے فوجی اسٹیشن پہنچ گئی جہاں ایک آفسر سے ملنے کی درخواست کی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ میجر مینگو کے آفس میں اس کے سامنے کھڑی اسے صورت حال سے آگاہ کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا تھا۔

”تم اس سلسلے میں مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ کچھ دیر بعد میجر نے پوچھا۔

”میں چاہتی ہوں تم اس کی باڈی کا پوسٹ مارٹم کرواؤ تاکہ اس کی موت کا سبب معلوم ہو سکے۔“

”میرے خیال میں مجھے اس کا اختیار نہیں ہے اور اگر میں ایسا کروں بھی تو ذرا تصور کرو کہ جنگ کی حالت ہے کتنے زیادہ پائلٹ مر رہے ہیں، پھر سب پوسٹ مارٹم کا مطالبہ کریں گے اور ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا۔“

”تمہیں اپنی پریشانی کا خیال ہے میری تکلیف کا نہیں؟“

”پوسٹ مارٹم کروانے سے رالف واپس تو نہیں آ سکتا۔“

”وہ واپس نہیں آ سکتا لیکن مجھے اس کی موت کا سبب تو معلوم ہو جائے گا۔ مجھے یہ تو پتہ چل جائے گا کہ اسے تل کیا گیا ہے۔“

”تو؟“ تمہارا خیال ہے ڈیزنی کو میرے فوجی اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کر سکتے ہیں جب کہ وہ جرمی پر حملے کی حالت میں ہو؟“

ڈیزنی جب میجر مینگو کے آفس سے نکلی تو بہت دل برداشتہ تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس کی تائید ہونے کی وجہ سے میجر نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی پھر وہ دل میں ایک امید لیے شہر کے پولیس اسٹیشن پہنچی اور وہاں ایک بوڑھے کانستبل سے کافی دیر بحث کرنے کے بعد اس کی رسائی چیف انپکٹر تک ہوئی۔

”میں ایک جرم کی رپورٹ لکھواتا چاہتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”میرا خیال ہے میرے شوہر کو قتل کیا گیا ہے۔“ ڈیزنی نے کہا سامنے میٹھا چیف انپکٹر اس کی بات سننے کے ساتھ



لندن واپس جاتے ہوئے ٹرین میں وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کس طرح پتہ لگائے کہ رالف کی موت کیسے واقع ہوئی پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا تھا اور وہ تیزی سے اپنے براؤن سوٹ کیس میں کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے عام لوگوں کی طرح اس کا چہرہ جھکا ہوا نہیں تھا بلکہ وہ اوپر سرکے ہوئے تھی اور سوٹ کیس میں رکھی چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے محسوس کر رہی تھی۔ اس انہی کیس میں رالف کے استعمال کا کچھ سامان تھا جو اسے منیجر نے دیا تھا سامان میں سے ڈیزلی نے ڈھونڈ کر ایک قمراس نکالا تھا جس میں رالف سفر کے دوران اپنی کافی رکھنے کا عادی تھا اور ڈیزلی کے خیال میں یہ قمراس اس وقت بھی رالف کے پاس موجود ہوگا، جب جہاز میں اس کی موت واقع ہوئی، ڈیزلی سوچ رہی تھی کہ رالف کو کسی نے زہر دے کر مارا ہوگا اس کی تصدیق کے لیے اسے ایسا ثبوت چاہیے تھا جس سے یہ خیال سچ ثابت ہو سکے اور وہ ثبوت اسے رالف کے قمراس میں پچی کافی سے مل سکتا تھا۔ اس نے کان کے قریب قمراس لے جا کر اسے ہلایا اور اس کی آواز سے اسے اندازہ ہو گیا کہ اس میں کچھ کافی پچی ہوئی ہے۔

لندن میں اپنے گھر نقل پارک پہنچنے کے بعد پہلی فرصت میں ڈیزلی اپنے کیسٹ کے اسٹور گئی تھی اور اسے سارا سامان ملے بٹا کر قمراس اس کے حوالے کر دیا تھا اور اس میں موجود کافی کی باقیات کا ٹیسٹ کروانے کی درخواست کی تھی۔ دوسرے دن شام کے وقت کیسٹ نے اسے اس ٹیسٹ کی رپورٹ دے دی تھی اور اس کے ساتھ ڈیزلی کے کہنے پر رپورٹ کی دو کاپیاں بھی بنادی گئیں۔

”تمہارا شک درست تھا، اس کافی میں مجھے آرسنک کے ٹریس ملے ہیں یہ خاصا تیز زہر ہوتا ہے۔“ مسٹر ڈوبلی نے اسے بتایا۔

”میں اس رپورٹ کو چیف انسپکٹر کو بھیجنا چاہتی ہوں، جو میرا مذاق اڑا رہا تھا۔“ ڈیزلی نے کچھ چپے ہوئے کہا۔

”اگر تم چاہتی تو میں تمہارے لیے یہ کام کر سکتا ہوں، جب میں اپنا اسٹور بند کر کے جاؤں گا تو تمہارے میل بکس میں چیف انسپکٹر کی رپورٹ کا لفافہ ڈالتا چلا جاؤں گا۔“ مسٹر ڈوبلی نے کہا۔

”اوہ..... مسٹر ڈوبلی تم کتنے فرشتہ صفت ہو..... میں

☆.....☆.....☆

ناہینا ہونے کے ناطے ڈیزلی جانتی تھی ایسے افراد کے لیے نئی جگہوں پر جانا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے وہ کسی نئی دنیا میں داخل ہو گئے ہوں، پھر انہیں تنہا ہی اس نئے ماحول کا عادی ہونا ہوتا ہے اس نے بچپن ہی سے خود کو ایسے موقعوں کے لیے تیار کیا تھا، لیکن خاص طور سے سولہ سال کی عمر میں جب پہلی بار اسے کسی انجینی فیلٹی کے ساتھ کچھ دن گزارنے کا موقع ملا تو اسے کچھ نئے تجربات بھی ہوئے۔ وہ 1939ء کا زمانہ تھا جب وہ اپنے والد کے دوست مسٹر پریڈرگسٹ کے گھر اپنی والدہ کے ساتھ گئی تھی، جہاں اس کی ملاقات ولیم، سیزڈرک، مارگریٹ، جان اور رالف سے ہوئی تھی رالف اپنے بہن بھائیوں سے بالکل مختلف تھا، اس نے پہلی ہی ملاقات میں ڈیزلی کو پسند کر لیا تھا اسے ڈیزلی کی خوبصورتی نے بہت متاثر کیا تھا، اس کے علاوہ وہ اس کی ذہانت کا بھی قائل ہو گیا تھا، وہ ناہینا ہونے کے باوجود کسی احساس کسری کا شکار نہیں تھی اور ناہینا ہونے کو اپنی کمزوری نہیں مانتے دیتی تھی، رالف کی بڑی بہن مارگریٹ بھی اس کی مدد تھی وہ رالف کے گھر دو ہفتے ٹھہری تھی اور اس عرصے میں اس نے رالف کے بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر بہت اچھا وقت گزارا تھا اس نے مختلف کمپلیوں میں ان سب کے ساتھ حصہ لیا تھا، رالف نے اسے سائیکل چلانا سکھائی تھی، وہ رالف سے بہت باتوں ہو گئی تھی اور جب رالف نے اسے شادی کی پیش کش کی تھی تو وہ انکار نہیں کر سکی تھی، لیکن اس کی شادی سے پہلے ہی ستمبر 1939ء کا زویوں اور روسیوں نے پولینڈ پر حملہ کر دیا تھا، ڈیزلی اپنی عمر کے سترھویں سال میں داخل ہو گئی تھی اور دنیا بچپس سالوں کے دوران دوسری بار ایک جنگ عظیم سے دوچار ہو گئی تھی۔

اسی دوران ڈیزلی کی شادی رالف سے ہو گئی تھی اور وہ



”میں اسے بوس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم نے میرے سامنے ایک بالکل نئی دنیا اجاگر کر دی ہے؟“  
 ”ہاں..... لیکن میرا خیال ہے کہ ہر لڑکی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کی زندگی میں کوئی اچھی تبدیلی لائے گی۔“ ڈیزی نے کہا۔

”لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔“  
 ”تمہارے ساتھ اس فلیٹ میں مستقل ہونا میرے لیے بہت خوشی کا باعث ہے۔“ ڈیزی نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”لیکن کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ جب میں سوچتی ہوں کہ میں ایک ایسے شخص سے محبت کرتی ہوں جس کی زندگی شاید چند ماہ ہی کی ہے تو مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔“ ڈیزی نے دکھ سے کہا۔

”تم ایسا اس لیے کہہ رہی ہونا کہ میں ایک بمبار یا پائلٹ ہوں اور جنگ کے دوران کبھی بھی میں کسی بم یا گولی کا نشانہ بن سکتا ہوں، لیکن ہمارے پاس جو بھی وقت ہے ہم اسے تو بھرپور طریقے سے گزار سکتے ہیں، اپنے دل کی گہرائیوں سے ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کر سکتے ہیں ایسا اظہار جو ہمیشہ یادوں میں زندہ رہے۔“ رالف نے کہا۔

”1941ء کے شروع ہی میں لوگ مان گئے تھے کہ آر اے ایف پائلٹ کی زندگی مختصر ہوتی ہے اور انہی دنوں رالف نے اپنے پہلے جنگی مشن کا آغاز کیا اور دشمن کے علاقوں میں پروازیں شروع کیں اور ڈیزی کی کادل پریشان رہنے لگا۔  
 ”تم کیسے یہ سب برداشت کر لیتے ہو جب کہ تم بھی جانتے ہو کہ تمہارا کوئی بھی مشن آخری ہو سکتا ہے۔“

”ڈیزی! میں نے اپنی خوشی سے اس کام کو پسند کیا ہے اور میرے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں اور میں اس زندگی کے ایک ایک لمحے کو انجوائے کرتا ہوں، یوں لگتا ہے جیسے میں شیطان کا مقابلہ کر رہا ہوں، بدی کی قوت سے لڑ رہا ہوں اور مجھے یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اس وقت کا سب سے طاقتور اور بڑا جہاز اڑاتا ہوں اور اس کے بدلے میں مجھے اپنی زندگی داؤ پر لگانا ہوتی ہے۔“ رالف نے اسے سمجھایا۔

”رالف کے سمجھانے پر ڈیزی خاموش ہو گئی تھی، لیکن اسے جو خدشہ تھا وہی ہوا تھا، رالف کے ایک بمبار حملے کے دوران ہلاک ہونے کی اطلاع آ گئی تھی اور اب اس پر آشکار ہوا تھا کہ اس کی موت ہوئی حملے سے نہیں بلکہ زہر سے واقع

اس کے ساتھ لیفلٹن پارک کے علاقے میں ایک فلیٹ میں رہائش اختیار کر چکی تھی۔ وقفے وقفے سے سان پر جرمن جنگی جہاز نمودار ہوتے اور علاقے میں بمباری کر کے غائب ہو جاتے اس کے فلیٹ کی ساری کھڑکیوں کے شیشوں پر رالف نے کالے پردے ڈال دیے تھے تاہم ہونے کی وجہ سے ڈیزی کو تو اندازہ میرے سے کوئی فرق نہیں پرتا تھا، لیکن سارے برطانیہ میں اعلان کر دیا گیا تھا کہ ہر گھر ایک آؤٹ کی پابندی کرے گا یہ اعلان ستمبر 1939ء کے ابتداء ہی میں کر دیا گیا تھا اس وقت تک دوسری جنگ عظیم کا قاعدہ اعلان نہیں ہوا تھا، اسٹریٹ لائٹس بند کر دی گئی تھیں، دکانوں پر بھی گہرے رنگوں کے ڈبل پردے ڈال دیے گئے تھے تاکہ گاؤں کے آنے جانے کی وجہ سے لائٹ باہر نہ جاسکے، اس کے علاوہ لائٹوں کو بھی مدھم کر دیا گیا تھا، کہیں بھی بم گرنے کی صورت میں جو تباہی ہوتی تھی اس نے لوگوں کے روزمرہ کی زندگی کو تباہ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ہر کسی کو ہدایت کی کہ وہ ہر وقت اپنے کاندھے پر ایک بیگ لٹکائے رکھے گا۔ جس میں اس کا گیس ماسک ہوگا جو ضرورت پڑنے پر استعمال کیا جائے گا لوگوں کو ان ہدایات پر سوال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

”ڈیزی کو ان سب باتوں سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ وہ تو اپنی پیدائش ہی سے ٹائپا تھی اور اندھیروں کی عادی تھی۔ وہ اکثر اپنا گیس ماسک ساتھ رکھنا بھول جاتی تھی اور کوئی پولیس مین یا سیکورٹی وارڈن ایک ٹائپا لڑکی کو اس کے لیے تنبیہ نہیں کرتا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ تکی بنی شادی ہو کر رالف کے ساتھ اس فلیٹ میں آئی تھی تو رالف کتنا خوش تھا۔

”تمہیں پتہ ہے میں اکثر لندن میں ایسے ایک فلیٹ کے خواب دیکھتا تھا جیسا یہ فلیٹ ہے اور میں سوچتا تھا کہ ایک نہ ایک دن شادی کے بعد میں لندن میں ایسے فلیٹ میں رہائش اختیار کروں گا اور خدا نے میری دعا سن لی..... میں بہت خوش ہوں۔“

”اور کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا تھا کہ تم جس لڑکی سے شادی کرو گے وہ ٹائپا ہوگی؟“ ڈیزی نے اس سے پوچھا۔  
 ”نہیں..... میں نے یہ تو نہیں سوچا تھا، لیکن یہ تو ایک غیر متوقع بوس خدا نے مجھے دے دیا ہے۔“  
 ”بوس؟“ ڈیزی نے حیرت سے پوچھا۔



ہوئی تھی وہ اس راز سے ہر حال میں پردہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اسے ایئر میں سے واپس آنے ہوئے دوسرا روز تھا جب اس کی والدہ رالف کی موت کی خبر سن کر اس سے ملنے آئیں، دروازے پر دستک ہوئی تو ڈیزیزی ہی نے دروازہ کھولا تھا۔ ”اودہ میری بچی ڈیزیزی تم کیسی ہو۔“ اس کی والدہ نے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا، دوسرے ہی لمحے ان کی توجہ کمرے کے ماحول کی طرف ہو گئی۔

”ارے دیکھو تم نے کمرے کا کیا حال کیا ہوا ہے، کتنا اندھیرا ہے، اب تو دن کا وقت ہے ان کڑکیوں کے کالے پردے تو ہٹا دینا تھے۔“ انہوں نے پردے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”ممی، آپ جانتی ہیں مجھے اندھیرے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں اس کی عادی ہوں، پھر بھلا روز صبح پردوں کو ہٹانے اور شام کو ڈالنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، میرے لیے تو ہر وقت ہر طرف اندھیرا ہی ہے۔“ ڈیزیزی نے دکھ سے کہا۔

”میں کہتی ہوں تم میرے ساتھ واپس چلو اب یہاں اکیلے رہ کر کیا کرو گی، رالف بھی ہوائی حملے میں مارا گیا ہے اس کے بغیر یہاں اکیلے رہنا بے کار ہے۔“ اس کی والدہ نے سمجھایا۔

”وہ حملے میں نہیں مارا گیا ممی..... اسے قتل کیا گیا ہے۔“ ڈیزیزی نے انکشاف کیا۔

”کیا کہا؟..... قتل کیا کیا ہے؟ یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“ شاید غم کی شدت نے جنہیں پاگل کر دیا ہے تم فوراً اپنے دماغ سے یہ بات نکال دو۔“

”مجھے اس بات کا ثبوت مل گیا ہے کہ رالف کو آرسنک زہر سے مارا گیا ہے۔“

”نہیں..... نہیں..... تم یہ کیا فضول بات کر رہی ہو..... کیا اس کی موت کے بارے میں اس کے والدین کو پتہ چل گیا؟“

”ہاں، آج ان کا فون آیا تھا وہ کل اس کی تدفین میں آ رہے ہیں۔“ ڈیزیزی نے بتایا۔ ”انہوں نے ایئر میں جا کر رالف کی لاش کو بھی شناخت کر لیا ہے۔“

”تدفین کے بعد تم میرے ساتھ چلو گی اور میرے ساتھ ہی رہو گی۔“ اس کی والدہ نے کہا۔

”نہیں..... رالف نے مجھے آگے پڑھنے کی اجازت

دے دی تھی، میں فزیکل تھریپسٹ کے طور پر کام کرنا چاہتی ہوں۔“ یہ باؤرن میڈیسن کی ایک بہت نئی اور دلچسپ شاخ ہے اور خواتین کے لیے بہت اچھا پیشہ ہے اور اس شعبہ میں نائینا لوگوں کو بھی شامل ہونے کی اجازت ہے اور میں اپنی عمر کی نائرل لڑکیوں کے ساتھ اس کی کلاس لیتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے تم جیسا مناسب سمجھو کرو، کیا تم نے رالف کا سامان چیک کیا جو ہم ایئر میں سے لائی ہو؟“ اس کی والدہ نے پوچھا۔

”نہیں ابھی تو نہیں۔“ ڈیزیزی نے جواب دیا۔

”چلو، میں چیک کر کے بتاتی ہوں، اس میں کیا کیا ہے۔“ اس کی والدہ نے کمرے میں رکھی براؤن اپنی کھولتے ہوئے کہا۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ ایک بچی رالف ہی کی ہے، پھر وہ اس میں سے چیزیں دیکھ دیکھ کر ڈیزیزی کو بتاتی رہی تھیں۔

”اس میں چند جوڑے کپڑوں کے ہیں، کچھ کتابیں اور اس کا قمیص، اور یہ ایک بھاری سا لفافہ بھی ہے۔“ انہوں نے لفافہ کھولتے ہوئے کہا۔

”اودہ یہ تو رالف کی وصیت کی کاربن کاپی ہے۔“ اس کی والدہ نے حیرت سے کہا۔ ”یہ اس کے ٹیکل ایڈوکیٹ نے تیار کی ہے، اس نے تمہیں اپنی ساری جائداد کا مالک قرار دیا ہے۔“

”جائداد؟ لیکن مجھے تو کچھ پتہ نہیں کہ رالف کے پاس کوئی جائداد ہے۔“

”جب رالف اٹھارہ سال کا ہوا تو اس کے آباء میں ایک ایسے مالدار شخص کی موت ہوئی جس کا وارث کوئی لڑکا نہیں تھا، وہ جائداد اس نے رالف کے لیے چھوڑ دی۔ وہ اسے پسند کرتا تھا اور اس کے انتقال کے بعد رالف نے وہ جائداد اپنے نام کروالی کہ کہیں اس کا کوئی کزن اس جائداد پر ہاتھ صاف نہ کر لے وہی جائداد اور یہ فلیٹ جس میں تم رہتی ہو وہ تمہارے نام کر دیا ہے۔“ اس کی والدہ نے بتایا۔

”اودہ..... مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“ ڈیزیزی نے کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیزیزی کہ رالف اپنے مرنے کے بعد بھی تمہارا پورا خیال رکھنا چاہتا تھا۔“

”ہاں..... مجھے اس کا اندازہ تو ہے کہ وہ مجھے کتنا چاہتا تھا..... اچھا اس کے علاوہ یہ دیکھیں کہ اس سوٹ کیس میں



”بہت سی باتیں وہ سب اس کی پیشہ ورانہ تفصیلات ہیں  
تم کہو تو یہ بھی پڑھوں؟“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے وہ یہ سب مجھے پڑھ کر  
بتاتا رہتا تھا میں صرف ابھی کی باتیں جانتا چاہتی ہوں۔“  
ڈیزی نے کہا۔

”اگلے روز رالف کی تدفین میں اس کے دوست، رشتہ  
دار اور جاننے والے سبھی موجود تھے، ڈیزی اس کی سہیلیاں  
بھی اس کی والدہ کے ساتھ موجود تھیں، تمام رسومات ادا  
ہونے کے بعد ڈیزی نے عین تدفین کے وقت ایک سوال  
اٹھایا تھا۔

”خواتین و حضرات! ہم نے اکثر ایسے اچھے الفاظ سنے  
ہیں کہ ایک فوجی نے اپنے ملک اور بادشاہ کے لیے جان  
دے دی اس نے بہادری سے دشمن کا مقابلہ کیا، رالف بھی  
یہی کرنا چاہتا تھا لیکن اسے اس کا موقع نہیں ملا، مجھے افسوس  
کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ رالف کی موت زہر سے واقع ہوئی  
ہے۔ اسے زہر دے کر مارا گیا ہے اور میں اس کی بیوی ہونے  
کے ناتے چاہتی ہوں کہ اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جائے،  
یہ میرا حق ہے، میرے پاس اس وقت بھی ایک رپورٹ موجود  
ہے، جو ایک رجسٹرڈ فارماسٹ ماسٹر نے لکھی ہے، جس میں  
لکھا ہے کہ رالف کی موت آرسنک زہر سے واقع ہوئی ہے  
اور اس کے اثرات اس کے قہر پاس میں موجود کافی کے نمونے  
سے ملے ہیں، میں خود اس کی گواہ ہوں کہ رالف کی پاؤں پر  
کوئی بھی زخم نہیں تھا۔ یہ بات مجھے سرد خانے کے منتظم نے  
بھی بتائی میں مطالبہ کرتی ہوں کہ میرے شوہر کی لاش کا  
پوسٹ مارٹم کروایا جائے۔“ ڈیزی نے کہا۔

”اوہ..... یہ تو بہت افسوسناک ہے۔“ اچانک مجھے آواز  
آئی اور ڈیزی اس آواز کو پہچان گئی، یہ رالف کے کزن  
سینڈرک کی آواز تھی۔

”سینڈرک؟“ ڈیزی نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔  
”ہاں، میں..... میرا خیال ہے یہ کوئی ایسا مطالبہ نہیں  
ہے جس پر عمل نہ کیا جاسکے..... ڈاکٹر مور میں آپ سے  
گزارش کرتا ہوں کہ سرجری کے لیے جو نمونہ لینا ضروری ہو  
وہ آپ لاش سے لے لیں، باقی لوگ چرچ میں انتظار  
کریں۔“

سینڈرک نے کہا اور اس کی بات پر لوگ ایک ایک کر کے

کوئی نوٹ بک ہے یا کوئی ڈائری جس میں رالف نے کچھ  
لکھا ہو..... کسی سے ملنے کے بارے میں وہ موت سے پہلے  
کن لوگوں سے ملا۔“

”اس میں ایک فوجی مشن کے بارے میں لکھا ہے یہ  
مشقیں اس کا گروپ ہر ہفتے کرتے تھے یہ کتنا لازمی ہوئی  
تھیں۔“

”تمہارا مطلب ہے جیسے فائر ڈول وغیرہ۔“  
”ہاں لیکن اس مشق میں پائلٹ سب سے آخر میں باہر  
جاتا تھا۔“ اس کی والدہ نے کہا وہ ہاتھ میں ڈائری لیے پڑھ  
رہی تھیں۔

”کیا اس موقع پر وہ اپنے پیراشوٹ بھی پہنے ہوئے  
ہوتے تھے۔“ اس کی والدہ نے پوچھا۔

”نہیں، ان مشقوں کے دوران جہاز پرواز نہیں کرتا تھا  
بلکہ اپنی جگہ کھڑا رہتا تھا، لیکن ان کا گروپ اپنا پورا آؤٹ فٹ  
پہنے ہوتا تھا۔ پیراشوٹ بھی اور وہ ایک کے بعد ایک جہاز  
سے زمین پر چلا گیا لگاتے تھے۔ ان کی آنکھوں پر پٹیوں  
بندھی ہوئی تھیں اور وہ یہ مشق چندرہ سے تیس سیکنڈ میں مکمل  
کرتے تھے۔ رالف نے مجھے یہی بتایا تھا۔ اس کے علاوہ اور  
کیا کیا ہے؟“ ڈیزی نے پوچھا۔

”ایک چیزوں کی لسٹ ہے جس میں شراب، چائے،  
بسکٹ وغیرہ لکھے ہیں۔“

”ہاں، کام کی زیادتی سے بور ہو کر وہ اکثر کافی یا شراب  
پیتا تھا، بستر پر جانے سے پہلے۔“ ڈیزی نے بتایا۔  
”کیا وہ یہ سامان خود خرید کر لاتا تھا؟“

”میرا خیال ہے اس کا بیٹ مین اس کے لیے شاپنگ  
کرتا تھا۔“

”اس میں ایک گیلن پیٹرول بھی لکھا ہے۔“  
”رالف اپنے دوستوں کے ساتھ ایک کار استعمال کرتا  
تھا۔ اس کے لیے ہی یہ پیٹرول کا گیلن لیتا تھا۔“

”ایک اور بات..... اس ڈائری میں ولیم اور سینڈرک  
کے نام بھی لکھے ہیں اور لکھا ہے کہ وہ دونوں کوئی بہت اہم  
فہم داریاں انجام دے رہے ہیں اور قاہرہ میں ہیں، لیکن وہ  
کیا اہم کام کر رہے ہیں اس کی تفصیل اس نے نہیں لکھی  
ہے۔“ ڈیزی کی والدہ نے بتایا۔

”اس کے علاوہ اور..... اور کیا لکھا ہے؟“

کے درمیان چلتی ہے اور مالٹا اور جبرائیل کے راستے سے گزرتی ہے۔

”اور ولیم کے بارے میں کیا خبر ہے؟ کیا وہ بچ لے پارک سے باہر نکلے گا؟“

”اوہ..... مجھے پارک کے بارے میں بھی معلوم ہے؟ میرا خیال ہے اسے رالف کی موت کی خبر نہیں میں اس لیے وہ یہاں نہیں ہے، وہ ایک بہت اہم پروجیکٹ پر کام کر رہا ہے، یہ کام بچ لے پارک ہی میں ہو رہا ہے اور برطانیہ کے ذہین نوجوان ایک الیکٹرونک برین بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، جسے وہ کمپیوٹر کہتے ہیں وہ ایک ایسی ڈیوائس ہوگی جو حساب کے مشکل ترین سوالات انسانی دماغ سے زیادہ تیزی سے حل کر سکے گی۔“

”اوہ..... واؤ میں تو اندازہ بھی نہیں لگا سکتی کہ وہ کیسی چیز ہوگی شاید یں پر جنت کی طرح ہو۔“

”ہاں یہی بات ہے..... مصر میں میری ملازمت بھی بہت اہمیت کی حامل ہے، لیکن وہ اتنی دلچسپ نہیں۔“

”مجھے اندازہ ہے جس طرح تم نے ڈاکٹر ویسٹ مور کو پوسٹ مارٹم کے نمونے لینے کے لیے کہا..... لیکن اب آگے کیا ہوگا؟ کیا انہیں اس کے جسم میں زہر کے اثرات مل جائیں گے اور اگر مل گئے تو کیا اس کیس کٹا گے بڑھایا جائے گا؟“

بالکل ایسا ہی ہونا چاہیے، کیا تمہارے ذہن میں کچھ اور بھی ہے؟“ سینڈرک نے پوچھا۔

”ہاں، میں چاہتی ہوں کہ مجھے ایک بار آراء ایف اسٹیشن جانے کی اجازت مل جائے تاکہ میں اس کے گروپ کے ساتھیوں اور اس کے بیٹ مین سے بات کر سکوں۔“

”لیکن یہ تو بہت مشکل ہوگا، تمہیں اندازہ بھی ہے کہ تم کس چیز کے لیے کہہ رہی ہو؟“

”ہاں مجھے اندازہ ہے، ہمیں اس کیس کی گہرائی میں اتنا ہوگا تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ اس کی کافی میں زہر کس نے ملایا؟ یہ ایک آدمی کا کام ہے یا زیادہ کا اور اسے زہریوں دیا گیا ہے یا نہیں پر موجود کسی شخص ہی کا کام ہے اور جیسا کہ میں جانتی ہوں کہ تم کس طرح اتنے کم وقت میں آراء ایف کے ٹرانسپورٹر جہاز میں سیٹ حاصل کر کے یہاں تک پہنچ گئے ہو، تم مجھے بھی نہیں پر جانے کی اجازت دلا سکتے ہو..... ہے نا؟“

بکھرنے لگے، ڈیزیز کی سہیلی مارگریٹ بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر چرچ کی طرف چل دی وہ رالف کی بڑی بہن بھی تھی اور ڈیزیز کے خیالات سے پوری طرح متفق تھی اچانک ڈیزیز کو اپنے قریب سینڈرک کی موجودگی کا احساس ہوا۔

”سینڈرک کیا یہ تم ہو؟“

”ہاں..... میں انہی بیٹیا ہوں..... مجھے انکسوس ہے میں وقت پر نہ آ سکا۔“

”کیا تم عراق سے سیدھے یہاں آ رہے ہو؟“ ڈیزیز نے پوچھا۔

”اوہ خدایا..... تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں عراق میں ہوں؟ یہ بات تو راز رکھی گئی تھی؟“ سینڈرک کے لہجے میں حیرت تھی۔

”سینڈرک میں تم سے بہت متاثر ہوں تم میں قائدانہ صلاحیتیں ہیں تمہارے پاس سے مجھے ملٹری ڈرائنگ کی بوجھ آ رہی ہے، تم نے یقیناً یونیفارم پہنا ہوا ہے تم نے ابھی میرے لیے جو کہا میں اس کے لیے تمہاری شکر گزار ہوں۔“

”ارے نہیں ڈیزیز شکر یہ کی کوئی بات نہیں رالف کا کزن ہونے کے ناطے میرا بھی یہ فرض تھا کہ میں تمہارا ساتھ دوں۔“ سینڈرک نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ اسی طرح چلتے ہوئے وہ چرچ میں داخل ہو گئے۔

جہاں دوسرے افراد بھی موجود تھے، لیکن سینڈرک ڈیزیز کو ایک کونے میں لے گیا جہاں ان کی باتیں کوئی اور نہیں سن سکتا تھا۔

”تمہیں عراق کے بارے میں کس نے بتایا..... کیا رالف نے.....“ سینڈرک نے پوچھا۔

”نہیں، مجھے رالف نے کچھ نہیں بتایا، دراصل تمہارا اور ولیم کا ایڈریس مجھے اس کی ڈائری سے ملا تھا جب میرے ساتھ میری والدہ بھی تھیں۔“

”رالف کو وہ ایڈریس میرے پاس سے نہیں ملے تھے نہ ہی ولیم سے ملے تھے تم بھی ان کو راز ہی رکھنا، کیونکہ یہ بہت اونچے درجے کا سرکاری راز ہے۔“ سینڈرک نے آہستہ سے کہا۔

”لیکن تم اچانک قاہرہ سے یہاں کیسے پہنچ گئے؟“

”میں نے جیسے ہی خبر سنی میں آراء ایف کے ایک جہاز کے ذریعے یہاں آ گیا، ان کی یہ پرواز مصر اور برطانیہ



”ہاں..... میں کسی حد تک مدد کر سکتا ہوں، لیکن اس کے لیے کیا تم مجھے اس خط کی کاپی دے سکتی ہو جس کا ذکر تم اپنی رالف کی تدفین کے موقع پر کر رہی تھیں، شاید مجھے متعلقہ عملے کو وہ دکھانا پڑے۔“

”ہاں بالکل..... کیوں نہیں؟“ ڈیزی نے کہا اور اپنے بیگ سے ٹیسٹ رپورٹ کی ایک کاپی نکال کر اسے پکڑا دی، اسی وقت ڈاکٹر مورچرچ میں داخل ہوئے اور تمام افراد کو دوبارہ تدفین کی جگہ پہنچنے کے لیے کہا گیا، کیونکہ رالف کی باڈی سے نمونے لینے کا کام مکمل ہو چکا تھا۔

”جب تمام افراد ایک بار پھر قبر کے گرو جمع ہو گئے تو ڈیزی نے ایک بار پھر ان سے خطاب کیا۔“

”لیڈیز اینڈ جینٹلمین!“

رالف کتا خری سلام کے طور پر میں اس کی ایک پسندیدہ نظم پڑھنا چاہوں گی۔

میں نہیں جانتا کہ میری خواہش کیا ہے۔

”جب کہ گرمیوں کی راتیں تاریک اور ٹھہری ہوئی ہیں۔“

اور ہوا آس سیٹیاں بجا رہی ہیں۔

شاخیں جھکی ہوئی ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔

جب کہ زندگی کی کہیں کوئی رفق نہیں ہے

وقت سیاہ اور آہستہ چل رہا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“

☆.....☆.....☆

چیف انسپکٹر نیگل بہت اچھے موڈ میں تھا، اس نے پہلی جنگ عظیم میں حصہ لیا تھا، لیکن اب دوسری جنگ عظیم کے دوران ریٹائرڈ ہونے کے باوجود چیف انسپکٹری ڈیوڈ راباں جو اسے سوئی گئی تھیں انہیں نباہ رہا تھا، اس کی تنخواہ پر کشش تھی، اسے ایک کار بھی ملی ہوئی تھی، اسے اور کیا چاہیے تھا، لیکن تازہ ڈیزی نے اس کی پرسکون زندگی میں کچل چمادی تھی اور ایک بار پھر اسے محبوب شوہر کے مل کی تحقیقات کروانے کے لیے اس کے آفس میں آدمی بھیجی، اس کے پاس آنے سے پہلے اس نے انسپکٹر کو لندن کے ایک فارماسسٹ کالینز بھیجی تھا، جس میں لکھا تھا کہ رالف کی موت زہر سے واقع ہوئی تھی، اس کے علاوہ اسے فوجی کمانڈ سے آرڈر بھی آچکے تھے کہ وہ اس کیس کی تحقیقات کرے،

انسپکٹر نے کبھی کسی کی موت کے کیس کی تحقیقات نہیں کی تھی۔ اس کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کام کہاں سے اشارت کرے پھر اس نے اپنی کار کی چابیاں اٹھائی تھیں، اپنا اور کوٹ پہنا تھا اور اپنا بیٹ سر پر رکھ کر راکش آ بیٹھا تھا۔

”چلو، آ رہے ایف اسٹیشن چلتے ہیں ذرا سی او سے ملاقات کرتے ہیں۔“ اس نے کار اشارت کرتے ہوئے کہا۔

”جب چیف انسپکٹر کا کمانڈ میٹ آفیسر کے آفس پہنچا تو وہ بھی اسے دیکھ کر خوش نہیں ہوا تھا اور اسے کیس کی تحقیقات کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی جگہ بیٹھنے کو دی تھی۔ جسے وہ عارضی آفس کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔

”میجر، میں چاہتا ہوں مجھے رالف کی موت کی تحقیقات کرنے کے لیے اس کے گروپ اور بیٹ مین سے ملوایا جائے تاکہ میں ان سے سوالات کر سکوں۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔

”ہاں..... ضرور..... تم ان سے مل سکتے ہو۔“ وہ لوگ اس وقت آفیسر میس میں بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ ڈیزی موجود تھی اس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ پہنا ہوا تھا، وہ ان کے درمیان بیٹھی تھی، اس کے قریب اس کی وائٹ اسٹک رکھی تھی اور اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا جھلی جہاز کا ماڈل تھا اور اس کے قریب بیٹھے لوگ اسے اس جہاز کے بارے میں بتا رہے تھے۔

”یہ..... یو..... سب یہاں موجود ہیں، ان سے مل لو۔“

میجر نے کہا۔

”مجھے کچھ کام ہے۔“ وہ انسپکٹر کو چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا، چیف انسپکٹر نے ایک ہی نظر میں ڈیزی کو پہچان لیا تھا اور سوچا تھا کہ وہ وہاں کیا کر رہی ہے، اسے لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔

”جینٹل مین، میڈم۔“ اس نے آگے بڑھ کر کہا۔

”چیف انسپکٹر۔“ میں جرم کی تحقیق کے لیے پندرہ دن بعد یہاں آنے پر آپ کو دوا دیتی ہوں۔“ ڈیزی نے انہیں ہوئے لمحے میں کہا تو انسپکٹر کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور وہاں موجود لوگ ہنس پڑے۔

”بھلا تم نے کیسے جان لیا کہ یہ میں ہوں؟“ انسپکٹر نے حیرت سے کہا۔

”میں تمہاری آواز کو کہیں بھی آسانی سے پہچان سکتی ہوں..... تم نے ہی کہا تھا نا کہ یہ کیس برلن کی پولیس کا ہے؟“

ڈویزی کے لہجے میں ناگواری تھی۔  
 ”اوہ..... میں اس کے لیے تم سے معافی چاہتا ہوں.....“  
 بہر حال حضرات میں چیف انسپکٹر نیگل کا کٹ ہوں اور میں یہاں فلائنگ آفسر رالف پر نڈر کے قتل کی تحقیقات کرنے آیا ہوں..... چنانچہ ہنسا بند کرو۔ یہ کوئی مزاحیہ بات نہیں ہے۔“ انسپکٹر نے کہا اور وہاں موجود لوگوں کو تیز نظروں سے دیکھتا ہوا ان کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سارے فوجی اسے دیکھ رہے تھے اور ڈویزی اپنے ہاتھ میں پکڑے جہاز کے ماڈل سے کھیل رہی تھی۔

”یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے میڈم؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”یہ ڈی ڈی کی مادل ہے جسے انجینئر ڈیرک نے لکڑی سے بنایا ہے اس میں چھوٹے کھلونوں والے پسے بھی لگے ہیں یہ خوب صورت ہے نا؟“ ڈویزی نے پوچھا لیکن انسپکٹر اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے فوجیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں جنٹلمین حادثے کے وقت آپ سب موجود تھے اور آپ میں سے کوئی بھی یہ قتل کرنے کے مواقع رکھتا تھا۔“

”میں تمہاری بات سے اتفاق نہیں کرتی میرے شوہر کو کسی ہتھیار سے قتل نہیں کیا گیا بلکہ اسے زہر دیا گیا ہے۔“ ڈویزی نے تیزی سے کہا۔ ”اور میں سمجھتی ہوں یہ کام ان میں سے کسی کا نہیں۔“

”کیا میں نے تم سے یہ سوال کیا تھا میڈم؟“  
 ”کچھ بھی ہو لیکن تم تمام افراد کو اہوں کی لائن میں سب سے پہلے ہواؤ تم پر شبہ بھی کیا جاسکتا ہے اس گروپ میں کس شخص کو رالف کے بعد اس کی جگہ ملی ہے؟ اس کی جگہ نیا جنٹی پائلٹ کون بننا ہے؟ کس کو ترتی دے کر رالف کے عہدے پر لایا گیا ہے؟“ جنٹی لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ ”میں جانتا چاہتا ہوں کہ رالف کی موت کے بعد اس کی ذمہ داریاں کس نے سنبھالیں..... بولو..... تم میں سے کون ہے؟“

”وہ میں ہوں۔“ اس کے سامنے بیٹھے شخص نے کہا۔  
 ”میں تمہارے سوال کی وجہ سمجھ گیا ہوں، لیکن مجھے افسوس ہے تمہارا خیال قابل قبول نہیں ہے چیف انسپکٹر جس بات رالف

کی موت واقع ہوئی میں اس گروپ کے ساتھ نہیں تھا، کیونکہ جب بھی کوئی پائلٹ مرتا ہے تو اس کی جگہ اس کے گروپ میں سے کسی کو نہیں دی جاتی کیونکہ ان میں سے کوئی بھی پائلٹ نہیں ہوتا ان کی دوسری ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور میں جس پوزیشن میں تھا کہ ضرورت پڑنے پر مجھے کہیں بھی کسی بھی بمبار جہاز کی کمانڈ دی جاسکتی تھی۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ انسپکٹر نے اپنی جیب سے ایک نوٹ بک اور پین نکالتے ہوئے پوچھا۔  
 ”فلائٹ سارجنٹ رچرڈ کلنک۔“

”شکریہ۔“ انسپکٹر نے اپنی نوٹ بک میں لکھتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر تم لوگوں میں سے کس نے رالف کی موت کے بعد فوراً ہی جہاز کا کنٹرول سنبھالا تھا۔“

”یہ میں نے سنبھالا تھا..... میرا نام فلائٹ انجینئر ڈیرک ویک فیلڈ ہے لیکن اس سے تم جاننا کیا چاہتے ہو؟“

”میں تمہاری بات کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں، میں تحقیقات تم سے ہی شروع کروں گا تم میرے ساتھ میرے آفس میں آؤ۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”چیف انسپکٹر! اس کی ضرورت نہیں ہے رالف کو ڈیرک نے نہیں مارا ہے اسے یقیناً ایسا کرنے کا حکم دیا گیا ہوگا کیونکہ کسی بھی لمبی پرواز کے دوران کوئی فلائٹ انجینئر ہی پائلٹ کی جگہ سنبھالتا ہے۔“ ڈویزی نے پھر مداخلت کی۔

”لیکن انسپکٹر کا کہنا بھی ٹھیک ہے کیونکہ مجھے اجازت نہیں کہ پائلٹ کی جگہ میں جہاز کو آڑا سکوں یا اتار سکوں تو یہ مجھ پر شک کر رہا ہے لیکن میں نے کبھی کسی پائلٹ کے کام میں خود سے مداخلت نہیں کی۔“

”کیا یہاں میری کوئی اہمیت نہیں ہے؟ تم لوگ خود ہی تبصرے کر رہے ہو؟ تم..... لیڈی تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے..... تم یہاں کر کیا رہی ہو؟ کیا تم اس کیس کو خود ہی حل کرنا چاہتی ہو؟“ انسپکٹر کے لہجے میں غصہ تھا۔

”ہرگز نہیں، میں یہاں صرف اپنے شوہر کے دوستوں سے ملنے آئی ہوں اور ایک بات کا خیال رکھوں کہ جب تم کسی ٹاپیٹا لڑکی سے بات کرو تو بوجہ نرم رکھو اور خاص طور سے ایک جنٹی فوجی کی بیوہ سے۔“

”مسٹر ویک فیلڈ..... میرے آفس میں چلو۔“ انسپکٹر



نے ڈیزی کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”یہ بڑا ہی وقیانوسی انپکٹر ہے۔“ چیف انپکٹر کے جانے

کے بعد نئے پائلٹ ریک نے کہا۔

”نرس“ ڈیزی یہ بتاؤ کہ تمہیں رالف کی موت کی اطلاع

کب ملی، کیا اس وقت تمہیں ہم پر شک نہیں ہوا تھا؟“ نشانہ

باز کین نے ڈیزی سے پوچھا۔

”میں نے اس وقت اس انداز سے سوچا تو تھا لیکن تم

لوگوں پر شک کرنا مشکل تھا کیونکہ تم سب ایک ہی گروپ میں

کام کرتے ہو۔“

”کیا مطلب؟“ کین نے پوچھا۔

”مجھے رالف نے بتایا تھا کہ کسی بھی فلائیٹ پر جانے

سے پہلے پورے کریو کی ٹریننگ ہونی ہے وہ ہر موقع پر ساتھ

رہتے ہیں ٹریننگ میں جو جہاز وہ استعمال کرتے ہیں وہی

انہیں ٹریننگ کے بعد بھی دیا جاتا ہے۔ اور پہلی پرواز پر جانے

سے پہلے وہ ایک بڑے ہال میں جمع ہوتے ہیں اس وقت ان

کی حاضری لگتی ہے۔ اس وقت کمرے میں کوئی کرسی نہیں

ہوتی وہ سب ایک دوسرے سے آزادی سے ملتے ہیں، انہیں

یہ ہدایت بھی دی جاتی ہیں۔“ ڈیزی نے کہا۔

”ہاں..... میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا۔“ ایک فوجی

نے کہا۔

”میرا نام سینڈی ہے میں اس روز پہلی بار رالف سے ملا

تھا وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔“ سینڈی نے کہا۔ پھر سب نے

ڈیزی سے اپنا تعارف کروایا تھا۔ ڈیزی بڑے غور سے ان کی

باتیں سن رہی تھی اور انہیں اپنے ذہن کے گوشے میں محفوظ

کرتی جا رہی تھی۔ وہ بہت پریشان اور خوفزدہ تھی، لیکن اپنی

پریشانی اور خوف چھپانے کے لیے مسلسل جہاز کے ماڈل

سے تحصیل رہی تھی، کچھ ہی دیر میں ڈیرک، انپکٹر کے سوالات

کے جوابات دینے کے بعد واپس آ گیا تھا۔

”اوہ خدایا، وہ تو بہت چڑچڑا آدمی ہے، بہر حال میں

نے تو اس کے سوالات کے جوابات دے دیئے ہیں۔ اس

وقت وہ بیٹ مین سے مل رہا ہے اور اس کا پورا شک بیٹ مین

پر ہی ہے۔“ ڈیرک نے بتایا۔

”ہاں..... بیٹ مین کے ساتھ ایسا کرنے کے مواقع

بھی زیادہ تھے۔“ سینڈی نے کہا۔

”لیکن میرا خیال ہے بیٹ مین نے ایسا نہیں کیا۔“

ڈیزی نے کہا۔

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“ کین نے پوچھا۔

”میں اس سے مل چکی ہوں۔“

”پھر تمہارا شک کس پر ہے؟“

”یہ ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن یہ کام میں پر

موجود کسی شخص ہی کا ہے۔“

”بہر حال، آج رات ہمارا ایک آپریشن بھی ہے اور

ہمارے پاس انپکٹر کو بیٹ مین کے لیے مزید وقت نہیں۔“

نئے پائلٹ رچرڈ نے کہا۔

”کیا؟ آپریشن ہے؟ تم لوگ برلن جا رہے ہو؟“ ڈیزی

نے پوچھا۔

”ہاں، لیکن ہمیں کسی کوتاہی کی اجازت نہیں..... ہمیں

بریفنگ بھی دی جا چکی ہے، چنانچہ میں جا کر اس سے بات

کرتا ہوں۔“

”اوہ کاش میں بھی تم لوگوں کے ساتھ جاسکتی۔“ ڈیزی

نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”ہم کسی مداخلت کے بغیر کسی

گھنٹوں تک بات کر سکتے ہیں رالف کے بارے میں۔“

”ڈیزی کیا تم سنجیدہ ہو؟ رک نے پوچھا۔ ”کیا تم اپنا

زندگی کو خطرے میں ڈال کر ہمارے ساتھ چلنا چاہتی ہو؟“

”ہاں..... بالکل..... کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے خطروں کا

احساس نہیں ہے؟..... تو بتاؤ تم کیا کہتے ہو؟ کیا میں آج

رات تمہیں جوائن کر سکتی ہوں؟“

”ہاں کیوں نہیں۔“ گروپ کے باقی لوگوں نے ایک

ساتھ کہا۔

”رچرڈ تم کیا کہتے ہو؟“ ڈیزی نے نئے پائلٹ سے

پوچھا۔

”ٹھیک ہے..... ویسے ایک بات بتاؤ جب ہم لوگ

رات میں پرواز کرتے ہیں تو ہم بھی تینا لوگوں کی طرح

محسوس کرتے ہیں، کیونکہ ہم اپنا سفر مکمل اندھیرے میں کر

رہے ہوتے ہیں۔“

”اور فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم تینا لوگ اس

اندھیرے کے عادی ہوتے ہیں اور تم لوگ نہیں، یہی بات

میں رالف سے بھی کہتی تھی۔“

”ہمیں اس اندھیرے میں کس طرح کام کرنا ہے اس کی

ہمیں تربیت دی جاتی ہے۔“ رچرڈ نے کہا۔ ”اب چونکہ

نے جواب دیا اور اسی وقت جہاز کی لائٹیں آف ہو گئیں۔  
 ”ہم ڈسکن کے نشانے پر آ چکے ہیں۔“ رچرڈ کی آواز گونجی  
 وہ اپنے ساتھیوں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا اور وہ ان پر عمل کر  
 رہے تھے درمیان میں پائلٹ کی گفتگو وائرس کے ذریعے  
 زمینی اسٹیشن سے بھی ہو رہی تھی۔ ڈی۔ ڈیزی کو آپریشن کی  
 اجازت دے دی گئی تھی، ڈیزی کی سمجھ میں اس گفتگو کا ایک  
 لفظ بھی نہیں آ رہا تھا، لیکن وہ ان سب کو بالکل کیئر سن سکتی تھی  
 کچھ ہی دیر میں خطرہ ٹل گیا تھا، وہ سب اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے  
 تھے اور ڈریک نے اسے پھر مخاطب کیا تھا۔

”یہ ڈیزی، تم نے بتایا تھا کہ تمہاری ملاقات بیٹ مین  
 سے ہوئی تھی جو رالف کا ملازم تھا۔“

”ہاں، اس نے مجھے بہت سی باتیں بتائی تھیں، اس کا نام  
 ڈکٹر ہیڈل تھا اس نے مجھے بتایا تھا کہ ہمیشہ وہی رالف کے  
 لیے کافی بناتا تھا اور اسے پہلے سے پری پیٹ کئے ہوئے  
 قہر اس میں رکھتا تھا اور پھر رالف کے اس بیک میں رکھ دیتا  
 تھا جو وہ جہاز میں اپنے ساتھ لے جاتا تھا، وہ خود یہ سمجھنے سے  
 قاصر تھا کہ اس دن کافی میں زہر کس نے ملایا ہوگا۔ اسے خود  
 بہت دکھا تھا میں اس پر الزام نہیں لگا سکتی تھی، مجھے لگ رہا تھا  
 کہ وہ بے گناہ ہے میں نے اسے سمجھایا تھا کہ اسے پریشان  
 ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں جلد ہی حقیقت پتہ چل  
 جائے گی۔“

”پھر تمہارا کیا خیال ہے؟“ کین نے پوچھا۔  
 ”میں جب لباس تبدیل کر رہی تھی تو مجھے خیال آیا کہ تم  
 لوگ بھی جب فلائنگ سوٹ پہننے میں مصروف ہوتے ہو اور  
 ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہوتے ہو تو کوئی بھی تمہاری  
 نظر بچا کر کام کر سکتا ہے۔“ ڈیزی نے کہا۔  
 ”یہ تو ٹھیک ہے لیکن پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم میں  
 سے کسی نے یہ کام کیا ہوگا۔“ سینڈرک نے کہا۔  
 ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”ہمارا دلچسپی کا سفر شروع ہو گیا ہے..... ہم اپنا مشن پورا  
 کر کے واپس جا رہے ہیں۔“ پائلٹ نے اعلان کیا اور جہاز  
 میں موجود عملہ پوری دلچسپی سے ڈیزی کے ساتھ باتوں میں  
 مصروف ہو گیا۔

”اگر رالف کو اسی رات زہر دیا گیا تھا تو کیا اس کی کچھ  
 طبیعت خراب نہیں ہوئی ہوگی میرا مطلب ہے دل گھبراتا،

کثرت کی رائے تمہارے حق میں ہے اس لیے میں تمہیں  
 ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہوں اب سمجھا یا کہ رالف نے  
 اپنے جہاز کا نام ڈی۔ ڈیزی کیوں رکھا تھا میں سی او سے  
 نہیں ساتھ لے جانے کی اجازت لے لوں گا۔“ رچرڈ نے  
 سے کئی دلائی۔

کچھ ہی دیر بعد ڈیزی جنگی ہوائی فوجیوں والی وردی میں  
 ن کے ساتھ جہاز میں موجود تھی۔ ڈریک نے اسے اس کی  
 سیٹ پر بیٹھنے اور اس کی سیٹ باندھنے میں مدد کی تھی اور پھر  
 بند ہی محلوں میں وہ اپنے وقت کا سب سے بڑا جنگی جہاز  
 ٹیکنیکل سٹر جس میں چار روٹر اس مارلن دی بارہ کے سپر چارجر  
 فٹنگ لگے تھے، ایک چمکاڑ کے ساتھ ہوا میں بلند ہوا تھا،  
 لانگ انجینئر، پائلٹ کی مدد کر رہا تھا، جیسے جیسے جہاز کی رفتار  
 بڑھ رہی تھی اس کی کپکپاہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا جیسے ہی وہ  
 دشمن کے علاقے میں داخل ہوئے تھے انہیں زمینی اسٹیشن کی  
 وائسنائی دی گئی۔

”ڈریم آف..... وائرس ڈریم آف.....“  
 ”ایکسٹرا ایم کرانے کا وقت آ گیا ہے پائلٹ..... ڈریم  
 ان۔“ وائرس نے کہا گیا۔

”یہ ایکسٹرا ایم کیا ہے؟“ ڈیزی نے حیرت سے پوچھا۔  
 اس کے منہ پر آنکھیں مامک لگا ہوا تھا اور وہ اس میں لگے  
 فال ٹرین کو دبا کر بات کر رہی تھی۔

”ویل..... برلن پر حملہ کرنے کے لیے ہمارے کمانڈر  
 نے ہمیں دو ایکسٹرا ایم دیئے تھے جو دو ہزار پاؤنڈ کے تھے اور  
 دشمن کے علاقے میں چار گھنٹے تک پرواز کرنے کے لیے  
 ایکسٹرا وزن ہی ہے چنانچہ انہیں جلدی ہی گرا دیا جاتا ہے۔“  
 ٹلٹ نے بتایا۔

”کیا کبھی رالف نے بھی ایسا کیا؟“  
 ”نہیں..... وہ حکم ماننے میں اتنا اچھا نہیں تھا، اپنی مرضی  
 ہی چلاتا تھا۔“

”کیا یہ کوئی غلط بات ہے؟“  
 ”نہیں، میرا خیال ہے کہ موقع کی مناسبت سے فیصلہ  
 کرنے کا اعتماد ہونا چاہیے یہ بھی بات ہے۔“

”مجھے رالف نے بتایا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے تم سب جنگی  
 پیری جٹا جاتے تھے ایسا کیوں تھا؟“ ڈیزی نے پوچھا۔  
 ”ناکہ جنگ سے ہماری جان چھوٹ جائے۔“ رچرڈ



پیٹ باسٹر میں درد وغیرہ وغیرہ.....“ ڈیزی نے پوچھا۔

”ممکن ہے ایسا ہوا ہو اور رالف نے اس ڈری وجہ سے نہ بتایا ہو کہ میں اس کو فلائٹ سے نکال نہ دیا جائے۔“ کین نے خیال ظاہر کیا۔

”لیکن رالف بار بار ٹو اٹلٹ جابا تھا۔“ ڈیرک نے کہا۔  
”یہ بات کسی نے پہلے کیوں نہیں بتائی؟“ ڈیزی نے کہا۔ ”یہ تو بہت اہم بات ہے۔“

”کسی نے یہ ابھی تک پوچھا ہی نہیں..... آج جب انکسپرنڈنگل آیا تو پہلی بار ہم سے سوالات کئے گئے ہیں۔“  
”اچھا تم بتاؤ ڈیرک اس کے علاوہ کوئی خاص بات؟“

ڈیزی نے ڈیرک سے پوچھا۔

”نہیں کوئی اور خاص بات تو نہیں سوائے اس کے کہ رالف بہت خاموش تھا اور شاید اس بھی لیکن اس سب کے باوجود اس رات ہمارا آپریشن کامیاب رہا تھا۔“

”اور کچھ؟ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ جہاز نہیں اڑا پا رہا ہے؟“

”وہ ایک طرف کو لڑھک گیا تھا..... میں جلدی سے اس کی طرف بڑھا وہ ٹھیک اسی جگہ گرا تھا جہاں تمہاری سیٹ ہے۔“ ڈیرک نے کہا۔

”کیا وہ اس وقت زندہ تھا؟ کیا وہ کچھ حرکت کر رہا تھا؟“  
ڈیزی نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ہاں، شروع میں تو وہ سانس لے رہا تھا اور میں نے اسے کہتے سنا تھا (میں محضرت چاہتا ہوں دوستو..... میں کچھ نہیں سمجھ سکا کہ میں کیا چاہتا ہوں) یہی اس کے آخری الفاظ تھے کیا تم سمجھ سکتی ہو ڈیزی کہ اس کا کیا مطلب تھا؟“

”ہاں، میرا خیال ہے یہ ایک نظم کے الفاظ ہیں جو اسے بہت پسند تھی، اور کچھ؟“ ڈیزی نے پوچھا۔

”ہاں، پھر وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور میں نے اسے فرسٹ ایڈ بیڈ پر ڈال دیا تھا جو ٹھیک تمہارے پیچھے موجود ہے، میں نے اسے اسپینر لگا دی تھی۔“

”پھر؟“

”پھر، جیسے ہی ہم زمین پر آئے تھے رالف کو ایبولینس میں لے جایا گیا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“  
”پھر؟..... پھر کیا ہوا؟“ ڈیزی کے لہجے کی چٹنی

بڑھتی جا رہی تھی۔

”پھر ہم ہسپتالنگ کے بعد اپنے کمروں میں چلے گئے تھے اور جب سوکر اٹھے تھے تو ہمیں پتہ چلا تھا کہ رالف انتقال ہو گیا ہے۔“ رچرڈ نے دکھ سے کہا۔

”ہمارے لیے یہ ایک راز ہی رہا کہ اس رات رالف کے ساتھ کیا ہوا۔“ ڈیرک نے کہا۔

”اور کسی نے اسے جاننے کی کوشش نہیں کی؟“

”ہمارا خیال تھا کہ طبی عملے نے اپنا اطمینان کر لیا ہوگا لیکن یہ بات تم سے پتہ چلی کہ اسے زہر دیا گیا۔“

”حیرت انگیز ہے کہ ایک ٹائیٹا ہستی نے اس کا ادراک کیا۔“ رچرڈ نے تاسف سے کہا۔

”کیا فلائٹ میں سب کے قمر اس الگ الگ ہوتے ہیں؟“ ڈیزی نے پوچھا۔

”ہاں، ہم اپنی ضرورت کے حساب سے کافی لینے

ہیں۔“ رچرڈ نے کہا۔

”بہر حال تم لوگوں سے یوں تفصیلی ملاقات کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ رالف کے مرنے میں گروپ کے کسی فرد کا ہاتھ نہیں ہے۔“ ڈیزی نے کہا۔

”بھلا ہم میں سے کوئی ایسا کیوں کرتا؟“ ڈیرک نے حیرت سے کہا۔

”ایسا صرف اس صورت میں ممکن ہو سکتا تھا جب رالف کسی کے راستے کی دیوار بننا مثال کے طور پر گروہ تمہاری ترقی کے راستے میں آتا تو تم اسے راستے سے ہٹا دیتے۔“ ڈیزی نے ڈیرک سے کہا۔

”اور میرے بارے میں کیا خیال ہے؟“ نئے پائلٹ رچرڈ نے پوچھا۔ ”میں تو اس وقت اس گروپ میں تھا تو نہیں۔“

”ہاں، لیکن اب ہے۔“ اور تمہارا تعلق اس گروپ سے بن گیا ہے۔“ ڈیزی نے جواب دیا۔

”اور میں کسی کے راستے میں آیا تو مجھے بھی ختم کیا جاسکتا ہے؟“ رچرڈ نے کہا۔

”بالکل..... اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک گروپ کو اس کی مرضی کا پائلٹ نہ مل جائے۔“

”ڈیزی اگر تمہاری جگہ ہوتا تو میں اپنے اس شک کا ذکر پولیس سے ضرور کرتا۔“ کین نے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن اس کیس میں پولیس کا مطلب

نہیں۔“

”پھر؟“

”پھر، جیسے ہی ہم زمین پر آئے تھے رالف کو ایبولینس میں لے جایا گیا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”پھر؟..... پھر کیا ہوا؟“ ڈیزی کے لہجے کی چٹنی

بڑھتی جا رہی تھی۔

”پھر؟“

”پھر، جیسے ہی ہم زمین پر آئے تھے رالف کو ایبولینس میں لے جایا گیا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”پھر؟..... پھر کیا ہوا؟“ ڈیزی کے لہجے کی چٹنی

بڑھتی جا رہی تھی۔

”پھر؟“

”پھر، جیسے ہی ہم زمین پر آئے تھے رالف کو ایبولینس میں لے جایا گیا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”لیکن اگر قاتل زہر دیتا رہا ہے تو وہ جانتا ہوگا کہ رالف کے پاس دو تھرماس ہیں۔“

”لیکن ہمیں دوسرے تھرماس کے بارے میں بھی معلوم ہونا چاہئے۔ میں وکٹر سے اس بارے میں ضرور پوچھوں گی۔ ممکن ہے اس سے ابھی تک یہ سوال کسی نے نہ کیا ہو اور وہ جانتا ہو کہ دوسرا تھرماس کہاں ہے۔“

”ہاں، یہ ممکن ہے۔“ کین نے جواب دیا۔ ”میں ایک اور بات سوچ رہا ہوں ڈیزی، وہ یہ کہ رالف کو کافی عرصے سے زہر دیا جا رہا ہوگا کیونکہ میں نے وائلیس پر کسی کو نیو لین کے بارے میں بات کرتے سنا تھا کہ اس کو سینٹ ہمیلینڈ میں آرسنک دیا گیا تھا۔ اسے چھوٹی چھوٹی خوراک دی جاتی تھی جو اس کے جسم پر اثر کرتی رہی اور آخر کار اس کی موت کا باعث بنی۔“

”میں نے بھی یہ اسٹوری کہیں سنی تھی۔“ ڈیرک نے کہا۔ ”ہاں یہ ممکن تو ہے۔“ ڈیزی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”رالف کے پاس ایک ڈائری تھی، جب وہ گھر آتا تھا تو اسے پڑھ کر مجھے سنا تھا اور مجھے پتہ چلا ہے کہ اس نے مجھ سے اپنی آخری ملاقات سے کئی ہفتے پہلے سے وہ ڈائری نہیں لکھی تھی جبکہ ایسا پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔ اچانک وہ ڈائری لکھنے سے کیوں رُک گیا تھا؟“

ڈیزی کے اس سوال کے جواب میں سب خاموش رہے تھے۔

”اس بات سے تمہارا مطلب ہے کہ وہ کئی ہفتوں سے بیمار تھا؟“ کین نے پوچھا۔

”ہاں، مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔“

”ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن رالف نے اس بارے میں ہمیں کبھی کچھ نہیں بتایا۔“ ڈیرک نے کہا۔

”کیا وہ بھی وکٹر سے ملنے گیا؟“ ڈیزی نے پوچھا۔

”ممکن تھا لیکن شاید اس نے اس بارے میں کوئی شکایت نہ کی ہو کہ اس کی اتنی طبیعت خراب ہے کیونکہ وہ ڈرتا ہوگا کہ کہیں اس سے اس کا عہدہ نہ چھین لیا جائے اور اسے میڈیکل ایسٹرنٹ قرار نہ دے دیا جائے۔“

”اوہ، وہ اپنے آپ کو کتنا اکیلا محسوس کرتا ہوگا۔“ ڈیزی نے دکھ سے کہا۔

فلانٹ کے اختتام پر جب وہ لوگ ویننگ مشل کی طرف

نپسٹر میگل ہے جو پہلے ہی بہت پریشان ہے اور شاید یہ معاملہ اس کی استطاعت سے باہر ہے اسے تو رہنے ہی دو۔“

ڈیزی نے جواب دیا۔

☆.....☆.....☆

فی الحال میری ساری توجہ اسی تھرماس پر ہے جس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔“ ڈیزی نے کچھ دیر بعد کہا۔

”تم سمجھتی ہو کہ رالف کے استعمال میں صرف ایک تھرماس تھا؟“ کین نے پوچھا۔ ”لیکن اس کے پاس دو تھے۔“

”اوہ!“

”جب ہماری پروازیں برلن کے لئے شروع ہوئیں تو آٹھ گھنٹے کا سفر ہونے کی وجہ سے ہم دو تھرماس میں کافی رکھتے تھے۔ ایک جاتے وقت کے لئے اور دوسرا آتے وقت کے لئے۔“ کین نے وضاحت کی۔

”اس کا مطلب ہے کہ رالف کے پاس بھی دو تھرماس تھے؟“ ڈیزی نے پوچھا۔

”بالکل۔ لیکن مجھے یاد ہے اس رات جب یہ حادثہ ہوا رالف کے پاس ایک ہی تھرماس تھا کیونکہ اس کا پیٹ خراب تھا۔“ کین نے کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن عام طور پر اس کے پاس دو تھرماس ہوتے تھے؟“ ڈیزی نے پوچھا۔

”ہاں..... جب سے زیادہ فاصلے کے آپریشن شروع ہوئے تھے۔“

”لیکن جب میں ایئر میس سے رالف کا سامان لے کر گئی تو مجھے ایک تھرماس ہی دیا گیا تھا، پھر دوسرا کہاں تھا؟“

ڈیزی نے پوچھا۔

”کیا یہ جانا ضروری ہے؟“

”ہاں! ممکن ہے یہی معصوم کا وہ حصہ ہو جو اب تک حل نہیں ہوا۔“ ڈیزی نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے اس سے ہی ہمیں کوئی جواب مل سکے۔“

”وہ کیسے؟“

”سوچو، اگر کسی نے وہ تھرماس چرایا ہے یعنی قاتل نے اور وہ نہیں جانتا کہ اسے دو تھرماس غائب کرنے ہیں، وہ صرف ثبوت منانا چاہتا ہے تو؟“ ڈیزی نے کہا۔



نہیں ہوتے۔“

”ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں تمہارے بارے میں اکثر سوچتا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”اس اسحق اسپیکر کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اور میں خود بھی جانتا ہوں کہ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو وکٹر۔“ ڈیزی نے کہا اور اس کی کال کٹ گئی کیونکہ اس وقت تین منٹ سے زیادہ کی کال نہیں ہو سکتی تھی، تاہم پورا ہونے پر کال خود ہی کٹ جاتی تھی۔

”تمہارا وقت ختم ہو گیا ہے۔“ اسے آپریٹر کی آواز سنائی دی۔

دو روز بعد ڈیزی نے پھر وکٹر کو کال کی اور اس سے قہر اس کے بارے میں دریافت کیا۔

”ہاں، رالف دو قہر اس استعمال کرتا تھا لیکن حادثے والے دن وہ ایک قہر اس ہی لے گیا تھا۔“ وکٹر نے اسے بتایا۔

”تو تم نے مجھے کون سا قہر اس دیا تھا؟“

”جو وہ چھوڑ گیا تھا، میں نے وہ چھپیں الماری سے نکال کر دیا تھا جہاں ایک دن پہلے رکھا تھا۔“

”اور دوسرا قہر اس کہاں گیا؟“

”وہ مجھے بعد میں ملا جب رالف کی چیزیں جہاز سے آئی تھیں۔ میں نے وہ سب سامان اس کے بیڈ پر رکھ دیا تھا لیکن جب تم اس کا سامان لینے آئی تھیں تو ان میں سے قہر اس غائب تھا۔ تب مجھے دوسرا قہر اس یاد آیا اور میں نے الماری سے نکال کر چھپیں دے دیا۔“

”کچھ بتا سکتے ہو کہ پہلے والے قہر اس کے ساتھ کیا ہوا؟“

”نہیں، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ وکٹر نے جواب دیا اور کال پھر کٹ گئی۔ دوسرے دن پھر وکٹر کا فون آیا تھا۔

”ڈیزی، میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ مجھے ابھی یاد آیا ہے کہ رالف کے مرنے کے بعد ایک دوسرا آفیسر اس کے کمرے میں آیا تھا۔ میں نے اسے پہلے بھی نہیں دیکھا۔ مجھے لگا کہ میرا بیٹا اس ہو گا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ پھر دوبارہ کسی نظر نہیں آیا۔“

”اوہ! وکٹر یہ بہت اہم بات ہے۔ ہو سکتا ہے وہ شخص

خود ہے جسے تو رچرڈ ڈیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔“

”ڈیزی، تم اس فلائنگ سوٹ میں بہت اچھی لگ رہی ہو۔“

”لیکن مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں۔“ ڈیزی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”دراصل میں خود کو دیکھ نہیں سکتی کیونکہ میں ٹائیٹا ہوں۔“

”تاہم ضرور ہو لیکن کمزور نہیں، تمہاری ہمت اور بہادری دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے آج رات تم نے جو کئی معلومات جمع کی ہیں، وہ تمہیں یہ کیس حل کرنے میں بہت مدد دیں گی۔“

”شکریہ رچرڈ۔“ ڈیزی نے آہستہ سے کہا۔

اس روز جب وہ ایئر بیس پر چیف کمانڈر میٹک سے ملی تو اس نے ڈیزی کو سمجھایا کہ اب مزید اس کے وہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ رالف کے گروپ اور بیٹ مین سے مل چکی ہے، اس لئے دوبارہ زحمت نہ کرے۔ رالف کے کیس کی انکوائری چیف اسپیکر کے سپرد کر دی گئی ہے۔ اسی روز جب ڈیزی نے رالف کے گروپ سے الوداعی ملاقات کی تو اس نے ان سے پیٹ مین وکٹر کا فون نمبر لے لیا تاکہ ضرورت پڑنے پر اس سے بات کر سکے۔

لندن واپس پہنچنے کے چند روز بعد ہی ڈیزی نے وکٹر سے فون پر رابطہ کیا تھا۔

”وکٹر! تم کیسے ہو؟ کیا تم اسپیکر کے بچے سے پہنچے میں کامیاب ہو گئے ہو؟“ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ڈیزی میں ٹھیک ہوں، تمہاری آواز سن کر خوشی ہوئی۔“

”مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہوا؟“ ڈیزی نے پوچھا۔

”اوہ، میں مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اسپیکر کا شک مجھ پر تھا اور وہ مجھے ہی قاتل سمجھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے میرے بارے میں بہت سوالات کئے، مجھ پر چنچا، غصہ نکالا، مجھے ڈرانے کی کوشش کی اور کہا کہ میرے انکار سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس کے پاس میرے خلاف بہت ثبوت ہیں اور یہ بھی کہا کہ میرے لئے بہتر ہے کہ میں جرم کا اقرار کر لوں۔“

”اوہ، یہ بہت افسوس کی بات ہے۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ تمہیں صرف اس لئے قصور وار قرار دینا کہ تم اپنا کام پابندی سے کرتے تھے، غلط ہے، اس سے تم مجرم ثابت

”ہوں“ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے لئے مزید کیا کر سکتا ہوں میڈم؟“ اس کے لہجے میں طنز چھپا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس صورت حال میں کیا بات کرے، ابھی تو اس نے کچھ کہا بھی نہیں تھا تو انسپکٹر برہمی کا اظہار کر رہا تھا۔

”چیف انسپکٹر، میں تمہارے ساتھ ایک خاص انفارمیشن شیئر کرنا چاہتی ہوں۔“

”اوہ، واقعی؟ تو گویا تم اب بھی اپنے طور پر کیس کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟“

”نہیں، نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں نے رالف کے کریو کے ساتھ کچھ باتیں کیں، تم نے سنا تو ہو گا وہ مجھے اپنے ساتھ جنگی فلائٹ پر لے گئے تھے اور برلن تک آتے جاتے ہیں راستے میں باتیں کرنے کا کافی موقع ملا۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے، بتاؤ تمہیں انفارمیشن کا ایسا کون سا قیمتی خزانہ مل گیا، میں بھی تو سنوں۔“

”ہوسکتا ہے اس میں سے کچھ باتیں تمہیں معلوم بھی ہوں، پھر بھی میں تمہیں بتاتی ہوں۔“ ڈیزی نے کہا اور پھر

تقریباً اس کے بارے میں پوری کہانی سنادی۔ اس نے اس پر اسرار شخصیت کے بارے میں بھی بتایا، جس کا ذکر وکٹر نے ڈیزی سے کیا تھا۔

”اوہ، میرا خیال ہے کہ وہ شخص رالف کا دوسرا تقریباً

ایسے وہاں آیا تھا جو کہ اس کے قتل کا ایک ثبوت تھا اور شاید وہ یہ بات نہیں جانتا تھا کہ تقریباً اس دراصل دو ہیں۔۔۔۔۔ کیا اس سے

تمہاری سمجھ میں کوئی بات آئی؟“

”نہیں، میں کچھ نہیں سمجھا، اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی تمہارا کہنا یہ ہے کہ تم پولیس کے معاملات میں مداخلت نہیں

کر رہی ہو۔۔۔۔۔ واہ! کیا بات ہے۔“

”لیکن انسپکٹر یہ تو دیکھو کہ میں تمہیں جو انفارمیشن دے

رہی ہوں وہ اہم ہیں اور تمہارے لئے یہ بہت آسان ہے کہ تم میجر میتنگ سے اس گروپ کیپٹن کے بارے میں پوچھ سکو جو

رالف کے مرنے کے بعد سب سے پہلے اس کے کمرے میں پہنچا۔ ہم دونوں ایک ہی مقصد پر کام کر رہے ہیں، کیا تم اتنا

نہیں کر سکتے؟“

”سوری، میں یہ سب نہیں کر سکتا۔“

”اس کا مطلب ہے تم کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہو لیکن مجھے

بتانا نہیں چاہیے۔“

وہاں دوسرے قمراس کے لئے ہی آیا ہو۔ وہ رالف کا قاتل بھی ہوسکتا ہے۔ کیا تم اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟“ ڈیزی نے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ وہ قد میں لمبا، ڈبلا پتلا، اس کے بال سفید تھے اور آنکھیں سرمئی تھیں، جو پیلا ہٹ مائل تھیں لیکن بے جان لگتی تھیں، دیکھنے میں اس کی شخصیت پر کشش لگتی تھی۔“

”اگر تم اسے دوبارہ دیکھو گے تو پہچان لو گے؟“

”ہاں، بالکل پہچان لوں گا۔۔۔۔۔ میں ہزاروں کے مجمعے میں بھی اسے پہچان لوں گا۔“

”اور کوئی خاص بات؟“

”ہاں اس کے لباس پر ایسی اسٹریپس لگی تھیں جیسی گروپ کیپٹن کے لگی ہوتی ہیں۔ یہ عہدہ ایک عام پائلٹ کے

عہدے سے بڑا ہوتا ہے اور مجھ لگا تھا کہ گروپ کیپٹن کے حساب سے وہ خاصا کم عمر تھا۔“

”گویا تمہیں حیرت ہوئی تھی کہ ایک بہت کم عمر شخص بہت اہم عہدے کا حامل ہے؟“

”ہاں، وہ جنرل ایئر اسٹاف کا ایک اعلیٰ عہدہ دار تھا۔۔۔۔۔ کسی میجر جنرل کا پرنسپل سیکرٹری۔“

”ٹھیک ہے۔ بہت اہم بات پتہ چلی ہے۔“ ڈیزی نے

کہا اور کال پھر کٹ گئی۔ ڈیزی کا دل چاہا کہ وہ ایک بار پھر

کسی طرح ایئر بیس پہنچ جائے اور لوگوں سے مل کر اس بارے میں معلومات جمع کرے لیکن میجر میتنگ اسے پہلے ہی منع

کر چکا تھا اور وہ اس سلسلے میں دوبارہ سیدرک کی خدمات بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ واپس مصر چکا تھا۔ ویسے

ڈیزی نے وکٹر کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اس سلسلے میں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے اور جیسے ہی کوئی اہم اطلاع ملے،

اس کو بتائے۔ پھر وکٹر نے اسے بتایا تھا کہ ڈی ڈیزی کریش ہو گیا ہے اور ڈیزی نے ایک بار پھر چیف انسپکٹر میتنگ کے

پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے کوئی بھی نئی انفارمیشن اس سے مل سکتی تھی۔

ایک بار پھر انسپکٹر اپنی پہل سے اپنی میز بجار رہا تھا، ٹک، ٹک کی آوازیں ڈیزی کے کانوں سے گھرا رہی تھیں اور

اسے انسپکٹر کے غصے کا احساس دلانا ہی تھیں۔

”ہوں ں، تو تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو؟“ انسپکٹر نے



”پولیس کا ایک کانفیڈنشل کیس ہے۔“  
 ”لیکن کیا رالف کی بیوہ ہونے کے ناتے مجھے قاتل کے بارے میں جاننے کا حق نہیں؟“

”ہے اطمینان رکھو میڈم، یہ کیس کورٹ میں نہیں جا رہا ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”کیا کہا؟“ ڈیزی کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”لیکن آخر کیوں؟“

”کیونکہ یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ اس کیس میں جان نہیں ہے، اس کی فائل بند کر دی گئی ہے۔ یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ رالف نے حادثاتی طور پر زہر کھا لیا تھا۔“  
 ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”ایک اور بات بتا دوں، یہ بھی امکان ہے کہ اس نے خودکشی کی ہو۔“

”خودکشی؟“ نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔“

”اس کے علاوہ ایک اور بات، اگر یہ بات ثابت ہو گئی کہ تمہارے شوہر کو قتل کیا گیا ہے تو تمہیں ایک جنگلی پائلٹ کی بیوہ ہونے کے فوائد کو بھی خیر باد کہنا ہوگا اور تمام الاؤنسز چھوڑنا ہوں گے، کیا تم نے اس بارے میں سوچا ہے؟“

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو انسپکٹر..... میں اس کی پروا نہیں کرتی۔ میں نے ملازمت کر لی ہے اور میں فزیکل تھراپسٹ کے طور پر کام کرتی ہوں، مجھے کسی الاؤنس کی پروا نہیں۔“

”چلو اچھا ہے..... اب بات ختم کیونکہ بات کرنے کے لئے اب کچھ رہ نہیں گیا۔“

”میں خود میجر میتنگ کو کال کروں گی۔“ ڈیزی نے غصے سے کہا۔

”میں اپنے کام میں مزید تمہاری مداخلت برداشت نہیں کروں گا۔ تم خود جاؤ گی یا تمہیں کسی کی مدد کی ضرورت ہوگی؟“ انسپکٹر نے بھی غصے کے لہجے میں کہا۔

”نہیں، مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں..... تم اتحق ہو۔“

”اپنے الفاظ کو لگام دو، تم ایک پولیس آفیسر کی انسلٹ کر رہی ہو۔ تمہارے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے۔“ انسپکٹر نے اسے دھمکی دی اور وہ ہیر خنثی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

چند ماہ بعد ڈیزی اپنے فلیٹ میں بیٹھی اپنے ماضی کو یاد کر رہی تھی۔ رالف کے کیس کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی جبکہ وہ ہر قیمت پر اس تھی کو سلجھانا چاہتی تھی، شاید اس طرح وہ رالف کی ان خجوتوں کا جواب دینا چاہتی تھی جو اسے ڈیزی سے تھیں۔ اس نے شادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی ڈیزی کا جتنا خیال کیا تھا، اتنا شاید کسی نے نہیں کیا تھا۔ اسے تنہائی میں اکثر رالف کے کہے ہوئے الفاظ یاد آتے تھے۔

”ڈیزی، میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے جنگلی جہاز کا نام بھی تمہارے نام پر ڈی۔ ڈیزی رکھا ہے۔“  
 ”کیا واقعی؟ تمہارے کمانڈر کو اس پر اعتراض نہیں ہوا کہ تم اپنی بیوی کے نام پر.....؟“

”نہیں..... میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے پسندیدہ پھول ڈیزی کے نام پر جہاز کا یہ نام رکھ رہا ہوں۔ اس نے دوسرے فائٹر پائلٹ سے بھی ان کی پسند کے نام مانگے تھے۔“

”تو گویا تمہاری مجھ سے محبت کا اظہار ہے؟“  
 ”ہاں، بالکل۔“ رالف نے کہا اور ڈیزی محبت بھرے انداز میں اس کے سینے سے لگ گئی۔ وہ اپنے خیالوں کی دنیا میں گمن بھی کہ اچانک فلیٹ کے دروازے پر دستک ہوئی اور وہ چونک کر اٹھی۔

ڈیزی نے دروازہ کھولا تو اسے احساس ہوا، اس کے سامنے یقیناً ایک مرد کھڑا تھا، وہی تازہ استری کرے یونیفارم کی خوشبو اسے محسوس ہوئی۔

”سینڈرک؟ کیا یہ تم ہو؟“  
 ”سو فیصدی..... تم حیرت انگیز ہو۔“ سینڈرک نے کہا اور ڈیزی اپنی جگہ بیہوش کھڑی رہ گئی۔

”کیا میں اندازاً سکتا ہوں؟“  
 ”ہاں بالکل۔“

”میں تمہارے لئے ایک تحفہ اور ایک پیغام لایا ہوں۔“  
 سینڈرک نے اندازتے ہوئے کہا۔

”تم وہ آخری فرد ہو جس کے کمانے کی مجھے امید تھی۔“  
 ”یہ سن کر خوشی ہوئی کہ کسی کو میرا بھی انتظار تھا۔“  
 سینڈرک نے اندازتہ کر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ڈیزی کے ہاتھ میں ایک خوب صورت چھوٹی سی ٹوئیسٹر

سینڈرک نے اس کے برابر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے کہا اور کاتا گئے بڑھا دی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ بوٹم لے ہاؤس کی طرف جانے والے سرسبز اور کشادہ راستے پر ہوائی رفتار سے سفر کر رہے تھے۔ ”تمہیں کیسا لگ رہا ہے ڈیزی؟“ سینڈرک نے پوچھا۔

”بہت اچھا، بالکل ایسے جیسے دس سال پہلے رالف کے ساتھ سائیکلنگ کرتے ہوئے لگتا تھا۔“

”میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنے جا رہا ہوں، چنانچہ نئی کار بھی ضروری تھی۔“ سینڈرک نے کہا۔

”نئی زندگی؟ کیا مطلب؟ کیا تم شادی کر رہے ہو؟“

”نہیں، میں شادی نہیں کر رہا ہوں بلکہ رالف اور اس کے والد کے مرنے کے بعد اس خاندان میں وارث میں ہی ہوں۔۔۔۔۔ تم سمجھ رہی ہو؟“

”اچھا، مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ پھر تو تمہیں چاہئے تھا کہ تم مجھے اپنے گھر مدعو کرتے۔“ ڈیزی نے کہا۔

”بھئی اب وہ گھر میرا ہی ہے۔“

”حیرت ہے، جب رالف کا انتقال ہوا، میں سوچتی رہی کہ اس کی موت سے کس کو فائدہ ہو سکتا ہے لیکن تمہارے بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں۔“

”تم کیا کہہ رہی ہو ڈیزی۔۔۔۔۔ یہ تو سچ لیکن کیا تم اس کی موت کا مجھ پر شبہ کر رہی ہو؟ تمہیں معلوم ہے تاکہ جب رالف کی موت واقع ہوئی تو میں مصر میں تھا۔“

”ہاں ہاں مجھے معلوم ہے۔۔۔۔۔ میں تو بس ایک بات کہہ رہی تھی۔“

”اور میں نے رالف کے کیس کے سلسلے میں تمہاری مدد بھی کی تھی۔“

”ہاں، میں معافی چاہتی ہوں بس یہ بات یونہی میرے منہ سے نکل گئی۔ اب میں کچھ نہیں بولوں گی۔“ ڈیزی نے ہنسنے ہوئے جواب دیا۔

اس شام بوٹم لے ہاؤس میں تمام بچھلے بچھڑے ہوئے مل بیٹھے تھے اور سب نے اپنی اپنی داستان سنا لی تھی لیکن ڈیزی نے محسوس کیا تھا کہ وہاں سب کچھ بدل گیا تھا۔ نہ رالف کے والد تھے، نہ بچھلے ملازم تھے، نہ پہلے والا ماحول تھا، ولیم بھی اس موقع پر موجود تھا اور اس نے بتایا تھا کہ اس کا کمپیوٹر

گاڑی کا ماڈل پکڑا دیا۔  
”اوہ۔۔۔۔۔ تمہیں کیسے پتہ کہ مجھے چھوٹے ماڈل کھلونے پسند ہیں؟“

”مجھے یہ بات پتہ نہیں۔۔۔۔۔ میں نے خود ہی تمہارے لئے اسے پسند کیا ہے۔“

”اور وہ پیغام جو تم میرے لئے لائے ہو؟“ ڈیزی نے فرخ سے اس کے لئے کوئلہ ڈرنک نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”وہ میں تمہیں پڑھ کر سنا تا ہوں۔“ سینڈرک نے کہا اور اپنی جیب سے پرچہ نکال کر عبارت پڑھنے لگا۔

”ڈیزیز ڈیزی ڈارلنگ!“

تمہیں بوٹم لے ہاؤس آئے ہوئے دس سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ میں تمہاری بہت یاد آ رہی ہے اور رالف کے بعد تو بہت ہی زیادہ، کیا تم اس سال گرمیوں کی چھٹیوں کا زمانہ

ہمارے ساتھ گزار سکتی ہو، چاہے چند ہفتے ہی سہی، تاکہ کچھ پچھلی اچھی یادیں ساتھ شیئر کر سکیں۔“

دستخط  
مارگریٹ، میگزک، جان، ولیم اور سینڈرک۔

”بہت خوب۔“ ڈیزی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیا دوسرے لوگ بھی اس پیغام سے باخبر ہیں؟ کیونکہ کچھ عرصہ پہلے ہی میں مارگریٹ سے ملی تھی، اس نے تو اس بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔“

”نہیں، لیکن یہ میرا ہی آئیڈیا ہے۔ سب اس کے بارے میں جانتے ہیں اور اگر تم نہیں جاؤ گی تو انہیں افسوس ہوگا۔“

پھر کچھ ہی دیر میں سینڈرک نے ڈیزی کو اپنے ساتھ رالف کے آبائی گھر چلنے کے لئے تیار کر لیا تھا اور اس کا سامان پیک کر دیا کہ اس کے ساتھ اپنی نئی کار میں آ بیٹھا تھا، جس کا ماڈل اس نے ڈیزی کو تجھے میں دیا تھا۔

”کیا تمہاری کار نئی ہے؟“ ڈیزی نے اپنے ہاتھ کار پر پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، اس کا بھی ماڈل میں نے تمہیں دیا ہے اور میری خواہش تھی کہ اس میں میرے ساتھ سب سے پہلے تم بیٹھو۔“

سینڈرک نے کہا تو ڈیزی مسکرا دی۔

”تم دیکھو گی ہمارا ادین ٹویٹر کار کا یہ سفر کتنا دلکش ہوگا۔“



پروجنٹ مکمل ہو چکا تھا لیکن اس نے اس بارے میں زیادہ بات کرنے سے پرہیز کیا تھا۔ ڈیزی نے اس موقع پر اپنے اور رالف کے بارے میں اور اس کی موت کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کو یقین ہے کہ رالف کو کوئی کیا گیا تھا اور جب اس نے یہ بتایا کہ رالف کی موت کے بعد دوسری صبح ہی کوئی گروپ کیپٹن اس کے کمرے میں آیا تھا تو رالف کے لیے تو مارگریٹ چوگی تھی۔

”ارے سیڈرک بھی تو رالف کی تدفین کے وقت جو پوچھا رہے تھے، اس کے بازو پر تین اسٹریپ لگی تھیں جو گروپ کیپٹن کی نشانی ہوتی ہیں۔“

”ہاں، میں اس وقت نارتھ افریقہ میں جنرل ایئر اسٹاف میں گروپ کیپٹن تھا۔“ سیڈرک نے کہا۔

”میں جانتی ہوں، لیکن رالف کی موت مجھے چین نہیں لینے دیتی۔ وہ مرنے سے پہلے کتنی تکلف سے گزرا ہوگا، کئی ہفتوں تک پیٹ میں درد، انگلیاں، دل گھبراتا، ہوشو، کمزوری، یہ سب وہ برداشت کرتا رہا اور اس خوف سے کسی کو نہیں بتایا کہ اس کی ملازمت پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ اسے مرتے وقت یہی احساس تھا، اس نے آخری پار "Sorry" کہا تھا، گویا اپنی وجہ سے ہونے والی پریشانی کی معافی مانگ رہا ہو۔“

”مجھے بتاؤ ڈیزی کہ رالف کے گروپ کے ساتھ بعد میں کیا ہوا؟“

”ان کا ڈی۔ ڈیزی کریش ہو گیا، وہ جرمی میں گرفتار ہو گئے اور پھر رہا ہونے کے بعد الگ الگ چلے گئے۔“

”میں نے اپنی زندگی میں کیا کیا دیکھ لیا۔“ قریب بیٹھی رالف کی والدہ نے کہا۔ ”پہلے میرا بیٹا رالف مر گیا، پھر اس کے والد اور ان کی جائداد ایک بالکل نوجوان کے ہاتھ میں چلی گئی..... میں اسے زیادہ پسند نہیں کرتی..... وہ ہماری قدروں کی عزت نہیں کرتا۔“

”ایسا نہیں ہے آئی۔“ ڈیزی نے کہا۔ ”ایک بات بتائیں، جب رالف کے والد کا انتقال ہوا تو ان کی عمر کیا تھی؟“ ڈیزی نے پوچھا۔

”وہ بیتر سال کے تھے لیکن میرا بڑا بیٹا جیرالڈ، رالف کا بھائی ستائیس سال کی عمر میں فوت ہو گیا تھا۔“ آئی نے کہا اور ڈیزی نے اثبات میں سر ہلایا۔

اگلی شام سیڈرک، ڈیزی کے ساتھ پوٹم لے کے ایک اعلیٰ درجے کے ریسٹوران میں گیا اور میز پر بیٹھے ہی ڈیزی کی تقریض شروع کر دیں۔ ڈیزی حیران تھی کہ اس کا مقصد کیا ہے، پھر اچانک اس نے جیب سے ایک ڈبیہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دی تھی۔

”دیکھو ڈیزی، میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں۔“ اس نے ڈبیہ ڈیزی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ڈیزی نے چھو کر اسے محسوس کیا اور ڈبیہ کھول کر اس میں انگلیاں پھیریں۔ اس ڈبیہ میں ایک ڈائننگ کی انگوٹھی موجود تھی۔

”تم جانتے ہو سیڈرک، میں سونے کے رنگ اور ہیرے کی چمک سے ناواقف ہوں لیکن میں یہ سمجھ سکتی ہوں کہ تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ میرے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔“

”میں کہتا یہ چاہتا ہوں ڈیزی کہ میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے، تمہارا دیوانہ ہوں، رالف سے تمہاری شادی سے پہلے بھی میں تمہیں چاہتا تھا اور اب بھی چاہتا ہوں۔“

”سیڈرک، مجھے یقین ہے لوگ ہمیں دیکھ رہے ہوں گے اور میں نہیں چاہتی کہ یہاں تمہیں شرمندہ ہونا پڑے۔“

”میں جانتا ہوں اس لیے تم سے درخواست ہے کہ تم سکون سے یہ انگوٹھی اپنے ہاتھ میں پہن لو۔“ سیڈرک نے ڈبیہ سے انگوٹھی نکال کر اس کی انگلی میں پہناتے ہوئے کہا اور ڈیزی نے بادل خواستہ انگوٹھی پہن لی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن آنکھوں سے غصہ جھلک رہا تھا۔ قریب بیٹھے ہوئے کچھ جوڑوں نے ہلکی ہلکی تالیاں بجا کر انہیں داد دی تھی۔

”ڈیزی میں تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔“ سیڈرک نے یوں کہا کہ کئی لوگوں نے اس کا جملہ سنا۔

ڈیزی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور اپنا پرس، اسٹیک اور ہیٹ اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”ارے خیریت؟“ سیڈرک نے حیرت سے پوچھا۔ ”میں گاڑی میں بات کروں گی۔“ اس نے کہا اور

ریستوران کے دروازے کی طرف بڑھی۔ سیڈرک بھی تیز قدم اٹھاتا اس کے ساتھ باہر آیا تھا اور اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر واپسی کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔



”جہیں پتہ ہے کل جب تم کسی کام کے سلسلے میں باہر گئے تھے جب وہ تم نے بھی مجھے شادی کی انگوٹھی پیش کی تھی اور شادی کی درخواست بھی کی تھی لیکن میں نے اسے بھی منع کر دیا..... میں کسی اور سے شادی نہیں کرنا چاہتی، اب رالف کے بعد میری زندگی میں کوئی اور مرد نہیں آئے گا۔“

”لیکن رالف کی موت کو پانچ سال گزر گئے ہیں۔“

سنیڈرک نے کہا۔

”کچھ بھی ہو، میں رالف کو بھلا نہیں سکتی۔ مجھے امید ہے جہیں مجھ سے بہتر لڑکی مل جائے گی۔“ ڈیزی نے کہا۔

”ہاں، لڑکیاں بہت ہیں لیکن تم جیسی نہیں..... تم میری محبت ہو۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہے۔ تم صرف اس کے طلب گار ہو جس کا مالک رالف تھا۔“

”ڈیزی، تم سمجھتی ہو کہ تم بہت چالاک ہو اور تم ناپید ہونے کے باوجود کسی کی مدد نہیں لیتا چاہتیں، کیا تم اس دنیا میں اکیلی جی سکتی ہو؟“ سنیڈرک نے کہا۔ ”جہیں بہر حال میری یادیں کم کی مدد لینا ہوگی۔“

”کیوں؟ کیا یہ ضروری ہے؟“

”ہاں، تم اسے یوں سمجھو کہ رالف نے جہیں جو جائداد دی ہے، اس کی تھوڑی سی آمدنی جو تمہیں ملتی ہے، اگر میں اس جائداد پر دعویٰ کروں تو وہ بھی تم سے چھین جائے گی، بس مجھے اپنے وکیل کو ایک کال کرنا ہوگی۔“

”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہاری عطا کی ہوئی امداد پر جی رہی ہوں؟“

”کیا یہ ایک سچ حقیقت نہیں ہے؟“

”لیکن یہ رالف کی آخری خواہش تھی اور اس نے ہی یہ جائداد میرے نام کی تھی۔ وہ تمہارا کزن ہونے کے ساتھ ساتھ تمہارا دوست بھی تھا۔ کیا تم اپنے مردہ دوست کی وصیت کا بھی خیال نہیں کرو گے؟ تم جب چاہو اپنے وکیل کو کال کر سکتے ہو سنیڈرک، میں کسی پر انحصار نہیں کرتی۔ میں فزیکل تھراپسٹ کے طور پر ملازمت کرتی ہوں، زیادہ ضرورت ہوئی تو اپنے اوقات کار بڑھوا لوں گی۔“ ڈیزی نے غصے سے کہا۔

دوسرے ہی دن وہ واپس اپنے گھر جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ وہاں اس کی آخری شام تھی اور وہ سب کے ساتھ

لان میں بیٹھی اپنا پندیدہ کھیل کھیل رہی تھی، جس میں سب ایک دوسرے کے چہروں کی شناخت اور خدوخال بیان کرتے تھے تاکہ ڈیزی سب کو جان سکے۔ اس کھیل کا آغاز مارگریٹ نے کیا تھا۔

”میں دیم کے قریب بیٹھی ہوں تو اس کا حلیہ بیان کرتی ہوں۔ یہ مردانہ حسن کا شاہکار ہے۔ اس کے بال کالے ہیں، آنکھوں سے ذہانت چلتی ہے، اس کی پلکیں لڑکیوں کی طرح لمبی اور خمی ہیں۔“

”میں سنیڈرک کے قریب بیٹھی ہوں۔“ جان نے کہا۔

”میں اس کا حلیہ بیان کرتی ہوں، اس کے بال سفید ہیں، قد لمبا اور جسم ڈبلا پتلا ہے، اس کی آنکھیں زردی مائل سرخی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ پرکشش ہے۔“ جان نے کہا اور اس کی بات پر ڈیزی چوکی گئی۔ اسے برسوں پہلے دکنز کی بات یاد آئی تھی، جب اس نے رالف کے کمرے میں آنے والے گروپ کیپشن کا یہی حلیہ بتایا تھا۔ ڈیزی اچانک خاموش ہو گئی اور وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ڈیزی تقریباً چار سال سے یہ بات جانتی تھی کہ رالف قاتل سنیڈرک ہے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا وہ آٹھ مئی 1945ء کا دن تھا، جب جرمنی نے ہتھیار ڈالے تھے اور برطانیہ میں لوگ خوشیاں منانے میں مصروف تھے۔ ڈیزی نے رالف کے کانڈنگ آفیسر میجر میتنگ کو کال کی تھی۔

”میجر میتنگ! میں ڈیزی پریڈر ہول رہی ہوں، کیا تم مجھے پہچان گئے؟“

”بالکل، ڈیئر ڈیزی، بھلا میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں؟“

”کیا تم نے خبر سنی؟“

”ہاں، جرمنز نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔“ میجر نے کہا۔ اس کی آواز سے خوشی جھلک رہی تھی۔

”میں تمہیں مبارک باد دیتی ہوں۔ میرا شوہر بھی ایک برطانوی فوجی ہونے کے ناتے اس جنگ کا حصہ رہا ہے اور جنگ کے دوران ہی مارا گیا ہے۔“ ڈیزی نے کہا۔

”یہ درست ہے، ہم اسے بھی نہیں بھولیں گے۔“ میجر میتنگ نے کہا۔

”میجر، کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ وہ گروپ کیپشن کون تھا،



برنارڈ نے اسے بتایا۔ ”میں اور سنیڈرک ساتھ ہی اسکول جاتے تھے۔“

”اور تم نے اس کیس کے بارے میں سبطرون کو بتایا تھا۔“

”ہاں، یہ درست ہے۔“  
”کیا سنیڈرک نے تمہیں کوئی ٹیٹ رپورٹ دی تھی رالف کی؟“

”نہیں، اس نے نہیں دی تھی۔ کیا کوئی خاص بات ہے؟“

”نہیں کوئی خاص بات نہیں، شکریہ۔“ ڈیزی نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ کافی دیر تک ان فونز کا کڑے بارے میں سوچتی رہی اور پھر اس پر ایک حقیقت آشکار ہوئی اور اس نے آخری کال کو کمزور ملائی جو ریٹائر ہونے کے بعد اس علاقے میں رہائش پذیر تھا اور ایک موقع پر کال کر کے اسے اپنا نیا فون نمبر لکھوا چکا تھا۔

”ہیلو کٹر، کیا تم میرے پاس آ سکتے ہو؟ میں تم سے فوراً بات کرنا چاہتی ہوں۔“ ڈیزی نے کہا۔

”ہاں بالکل۔“ وکٹر نے جواب دیا اور ڈیزی نے اسے اپنے فلیٹ کا پتہ سمجھایا۔ تمام لوگوں سے اسے جو معلومات ملی تھیں، ان کے مطابق سنیڈرک کا کردار مشکوک نظر آ رہا تھا اور اب وہ وکٹر سے بھی گواہی لینا چاہتی تھی کیونکہ اس نے ایک بار دعویٰ کیا تھا کہ وہ کہیں بھی دیکھ کر اس گروپ کیپٹن کو پہچان سکتا ہے جو رالف کی موت کی صبح اس کے کمرے میں آیا تھا۔ ڈیزی کے پاس ایک گروپ فون تھی جس میں بائیں ہاتھ سے دوسرے نمبر پر سنیڈرک بیٹھا تھا اور اس سے پہلے نمبر پر رالف تھا، باقی لوگ سنیڈرک کے بعد بیٹھے تھے۔ یہ ان دنوں کی تصویر تھی جب وہ پہلی بار رالف کے گھر دوڑنے کی چھٹیاں گزارنے گئی تھی۔ اس تصویر میں وہ خود بھی درمیان میں موجود تھی۔ تصویر میں موجود لوگوں کی تفصیل اسے رالف ہی نے بتائی تھی۔

وکٹر جلد ہی اس سے ملنے پہنچ گیا تھا اور ڈیزی نے اس کا استقبال بہت تپاک سے کیا تھا۔ اب تک وکٹر ہی نے رالف کے کیس کے سلسلے میں اس کے ساتھ تعاون کیا تھا۔

”تم نہیں جانتی ڈیزی کہ میں تمہارا کتنا شکر گزار ہوں کہ تم نے رالف کے قتل کے سلسلے میں کبھی مجھ پر شک نہیں

جس نے رالف کی موت کے فوراً بعد اس کے کمرے کا وزٹ کیا تھا؟“

”وہ سنیڈرک کلنٹن تھا، وائس مارشل رپورٹ کلنٹن کا بیٹا۔ وہ مجھ سے میرے مائیز میں بھی ملا تھا۔“

”شکریہ میجر۔“ ڈیزی نے کہا اور کال کٹ گئی۔ ڈیزی کو سنیڈرک کا نام سن کر حیرت ہوئی تھی کیونکہ سنیڈرک نے رالف کی تدفین کے وقت اسے بتایا تھا کہ وہ قاہرہ سے سیدھا تدفین میں آیا ہے جبکہ وہ رالف کی موت کے بعد پہلی ہی صبح اس کے بیس کیمپ میں موجود تھا، جس کا مطلب تھا اس نے جھوٹ بولا تھا لیکن پھر اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا کیونکہ بہر حال سنیڈرک نے اس کیس کو حل کروانے میں اس کی مدد کی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے تدفین کے دن سنیڈرک کو رالف کی ٹیٹ رپورٹ بھی دی تھی جو سنیڈرک نے اس سے مانگی تھی کہ اگر کسی کو دکھانا پڑے تو وہ دکھا سکے۔ اس خیال کے آتے ہی ڈیزی نے ایک بار پھر ایک کال کی تھی۔ یہ کال اس نے سبطرون ویلڈن کو کی تھی جو رالف کی موت کی تحقیقات کروا رہا تھا اور اس نے ایک رپورٹ بھی مرتب دی تھی۔

”جی سز بریڈر، آپ مجھے یاد ہیں۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا اور ڈیزی نے انتظار کئے بغیر اسے دو گھر ماسوں کی کہانی سنائی۔

”میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ کو رالف کی موت کی تحقیقات کا حکم کس نے دیا تھا؟“

”ایف بی آئی کے ایک بہت نوجوان لیکن سینئر انوسٹیگیٹر برنارڈ ڈھنسل نے۔“

”کیا آپ مجھے ان کا نمبر دے سکتے ہیں؟ اور کیا اس نے رالف کی ٹیٹ رپورٹ بھی آپ کو دی تھی؟“

”نہیں مجھے وہ رپورٹ انپیکٹر ٹیمل کا کٹ نے دی تھی اور وہ رپورٹ.....“

”ٹھیک، وہ میں نے ہی چیف انپیکٹر کو دی تھی۔ آپ مجھے برنارڈ کا فون نمبر دے دیں۔“ ڈیزی نے کہا اور پھر برنارڈ کا نمبر اسے مل گیا۔ اگلا فون ڈیزی، برنارڈ کو کیا تھا، جس سے اسے پتہ چلا تھا کہ سنیڈرک اس سے ملا تھا اور اسے

ڈیزی کے بارے میں بتایا تھا۔

”ہاں، ہم اسکول کے زمانے کے پرانے دوست ہیں۔“

کیا، حالانکہ زہر دینے کے سلسلے میں سب سے پہلے اس کا بیٹ میں ہونے کی وجہ سے مجھ پر ہی شک کیا جاسکتا تھا اور اس سلسلے میں چیف انسپکٹر نے مجھے چند دن جیل میں بھی رکھا تھا لیکن تمہارے ہی کہنے پر مجھے رہائی ملی تھی۔“ وکٹر نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے خوشی ہے کہ میں نے ایک درست فیصلہ کیا تھا۔ میں نے تمہیں ایک اہم بات بتانے کے لئے بلایا ہے۔ وہ یہ کہ اب یہ بات یقینی ہوگئی ہے کہ رالف کو اس کے کزن نے مارا ہے لیکن میں تمہاری گواہی بھی چاہتی ہوں۔“ ڈیزی نے کہا۔

”میری گواہی؟“

”ہاں، رالف کے کیس کی تحقیقات کے بعد اس کی قابل بند کردی گئی ہے کیونکہ تحقیقات کرنے والا شخص سنیڈرک کے بچپن کا دوست ہے اور سنیڈرک ایک بڑا آفیسر..... لیکن میں مجرم کو چھوڑ نہیں سکتی۔ رالف کی موت کا پتہ لگانا میرے اوپر قرض ہے۔“

”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں ڈیزی، رالف میرا دوست بھی تھا اور انسر بھی اور وہ بے گناہ مارا گیا، مجھ پر یقین رکھو میں جو کچھ کر سکا، کروں گا۔“

”یہ تصویر دیکھو اور بتاؤ کہ وہ شخص جو رالف کے کمرے میں آیا تھا، کیا اس تصویر میں موجود ہے؟“ ڈیزی نے الماری سے تصویر نکال کر وکٹر کو دکھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں، بالکل ہے۔ ہائیں ہاتھ سے دوسرے نمبر پر..... وہ ججی ہے..... سفید بال..... پیلا ہٹ مائل سرخی آنکھیں، لمبا اور بڑا پتلا..... یہی ہے۔“ وکٹر نے کہا تو ڈیزی نے تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی اور رالف کی ڈائری کھول کر اس کے سامنے رکھ دی جس کا ایک صفحہ مڑا ہوا تھا۔

”اس صفحہ کو پڑھو۔“ ڈیزی نے کہا۔

”اس پر ایک شخص ولیم کا نام اور پتہ لکھا ہے اور ایک شخص سنیڈرک کا بھی نام اور پتہ موجود ہے اور نیچے لکھا ہے کہ ”سنیڈرک کے پتے پر شکریہ کا خط بھیج دو۔“ وکٹر نے پڑھا۔

”اوہ مجھے یاد آیا یہ لوٹ میرے لئے رالف نے لکھا تھا، سنیڈرک نے ان کے لئے قاہرہ سے بہت اعلیٰ درجے کی کافی بھیجی تھی۔“ وکٹر نے کہا۔

”اور رالف کی موت زہر ملی کافی ہی سے واقع ہوئی

تھی۔“ ڈیزی نے بات کا آگے بڑھایا۔

”اوہ، میرے خدا..... تو سنیڈرک نے زہر ملی کافی بھیجی تھی؟“ وکٹر نے کہا۔

”میں سوچتی ہوں کہ یہ کیس دوبارہ کھلوادوں۔“ ڈیزی نے کہا۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں..... بہت لوگ بدل چکے ہیں، رالف کے گروپ کے لوگ جرمن کی قید سے آزاد ہو کر اپنے اپنے وطن چلے گئے ہیں..... اور شاید اب اس کیس کو دوبارہ کھولنے کے لئے کوئی دلچسپی نہ لے۔“ وکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اگر تم چاہو تو میں تمہارا یہ کام فوری کر سکتا ہوں۔“

”وہ کیسے؟“

”میں بہت لوگوں کو جانتا ہوں جو میرے کہنے پر یہ کام کر دیں گے۔ وہ سنیڈرک کو ایسے ٹھکانے لگائیں گے کہ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔“ وکٹر نے کہا۔

”مگر تم..... تم تو ایک ریٹائرڈ ڈیوٹ مین ہو۔“

”ہاں..... لیکن اب میں اپنا بزنس کرتا ہوں۔ میری پہنچ میں بڑے بڑے سیاستدان، مجرم، وکیل، تاجر، بہت لوگ ہیں۔ تم میری بروا مت کرو۔ بس ہاں کرو۔ پھر دیکھو کہ رالف کا قاتل کیسے اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔“ وکٹر نے کہا۔

”ابھی نہیں، میں چاہتی ہوں تم فی الحال کچھ مت کرو۔ میں جب مناسب سمجھوں گی تمہیں کال کروں گی۔“

”ٹھیک ہے لیکن ایک بات کا دھیان رکھنا، جب بھی مجھے کال کرو تمہاری گفتگو نیم ہونا چاہئے جسے صرف میں سمجھ جاؤں اور کوئی نہ سمجھے۔“

”میں سمجھتی گی۔ تم فکر مت کرو۔“

☆.....☆.....☆

پھر چار سال گزر گئے۔ ڈیزی، سنیڈرک سے بدلہ لینے کا ارادہ ترک کر چکی تھی کہ وہ اچانک اس کے قلیٹ پہنچ گیا اور اسے بوٹم مل آنے کی دعوت دی اور پھر ساتھ ہی اسے وہاں لے بھی آیا، جہاں رالف کے علاوہ اس کے سارے پرانے ساتھی موجود تھے۔ اس نے ڈیزی کو شادی کا پیغام دیا اور انکار کی صورت میں ڈیزی کو قانونی چارہ جوئی کر کے اس کا تہاد سے بھی محروم کرنے کی دھمکی دے دی جو رالف نے اسے دی تھی۔ وہ رالف کی زندگی لینے کے بعد اب ڈیزی کی زندگی



بھی اچرن بنانا چاہتا تھا اور ڈیزی اس معاملے کو مزید التوا میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ اس نے بوٹ مل میں اپنی آخری رات کے قیام میں اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دیا اور اس منصوبے پر کام کرنے کے لئے دوسری صبح بوٹ مل سے واپس اپنے فلیٹ آگئی اور وہاں آتے ہی سب سے پہلے اس نے وکٹر سے رابطہ کیا اور اسے ساری تفصیل بتائی۔

دو روز بعد اسے ڈاک سے ایک لفافہ ملا اور اس نے فون کر کے وکٹر کو اپنے فلیٹ پر بلا لیا۔ وہ اس لفافے میں موجود کاغذات اس سے پڑھوانا چاہتی تھی۔

”لو وکٹر یہ دیکھو..... یہ سنڈرک کی طرف سے مجھے بھیجا گیا ہے۔“

”اوہ، اس میں لکھا ہے کہ یہ فلیٹ اب سنڈرک کی ملکیت ہے اور انہیں رالف کی دی ہوئی جائداد کے ساتھ ساتھ اس سے بھی دست بردار ہونا پڑے گا ورنہ وہ تمہارے خلاف قانونی کارروائی کرے گا۔“ وکٹر نے اسے بتایا۔

”وہ مجھے میرے فلیٹ سے کیسے نکال سکتا ہے؟“ ڈیزی نے غصے سے کہا۔

”تم نے اسے نظر انداز کر کے غلطی کی تھی ڈیزی..... میں تو کہتا ہوں اب بھی اسے ٹھکانے لگوا دو ورنہ وہ ہمیشہ پر اہلیم کرتا رہے گا۔“ وکٹر نے کہا۔

”ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب مجھے تمہاری مدد لینا ہی ہوگی۔“ ڈیزی نے کہا۔

☆.....☆.....☆

وہ بہت سردرات تھی۔ ڈیزی نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا۔ آسمان پر چاند بھی نہیں تھا۔ رات بہت گہری تھی لیکن ڈیزی کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ ان راستوں سے بہت بار رالف کے ساتھ گزر چکی تھی، چنانچہ بچے تلے قدم رکھتی ہوئی بوٹ مل ہاؤس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دو بج کر دس منٹ ہوئے تھے اور رات، صبح کی طرف سفر کر رہی تھی۔ اس سفر میں ڈیزی بھی اپنی زندگی کے اندھیرے دھندلے دینا چاہتی تھی۔ گھر کے بیرونی دروازے سے کچھ فاصلے پر ہی وہ بائیں جانب مڑ گئی تھی اور اپنے قدم گنتی ہوئی تہ خانے کی کھڑکی کے قریب آئی تھی، پھر رک کر اس نے دستاں پہنے تھے اور گرن کر چوکی کھڑکی پر جھک گئی تھی اور کھڑکی بغیر شور کے کھل گئی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے اکثر وہ رالف کے ساتھ راتوں کو گھر میں

داخل ہوتی تھی، جب وہ باہر کافی دیر گزارنے کے بعد واپس آتے تھے اور گھر والے خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے تھے۔ تہ خانے میں پہنچنے کے بعد اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھا تھا اور اوپری منزل میں پہنچ گئی تھی۔ پھر اس نے احتیاط سے ایک ایک کمرے کو چیک کیا تھا سوائے سنڈرک کے کمرے کے پوری عمارت میں کوئی موجود نہیں تھا۔ گویا وکٹر کی معلومات درست تھیں۔ وہ کافی عرصہ گزرنے کے باوجود ان راہداریوں میں یوں چل رہی تھی جیسے دن کی روشنی میں کوئی آنکھوں والا شخص بلا جھجک چلتا ہے۔ اسے یہ راستے اچھی طرح یاد تھے۔ وہ مشربٹر کے اسٹڈی روم میں پہنچی تھی۔ اس کمرے کا جج کل سنڈرک اپنے آفس کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس کا فرش تختوں کا بنا ہوا تھا اور چلنے پر ہلکی سی کریک کی آواز آتی تھی۔ اس نے کمرے کا سوچ بورڈ بند کر دیا تھا۔ یہ کام اس نے تہ خانے میں لگے الیکٹرک بورڈ میں ہی کیا تھا، پھر اس نے الماری سے ہتھیاروں کے خانے کی چابی نکالی تھی اور اس چابی سے ہتھیاروں کا خانہ کھول کر اس میں رکھی سنڈرک کی پستول نکال لی تھی اور اس کی گولیاں خالی کر کے اپنے بیگ میں رکھ لی تھیں اور گولیوں کا دوسرا سیٹ اس میں ڈال دیا تھا، پھر اس نے سنڈرک کی خواب گاہ کا رخ کیا تھا اور خواب گاہ کا دروازہ آہستہ سے کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔ سنڈرک اپنے بیڈ پر بے خبر سو رہا تھا۔ اس کی دھیمی دھیمی سانسوں کی آواز وہ بخوبی سن سکتی تھی۔ اچانک وہ اس پر جھکی تھی۔

”پیارے سنڈرک۔“ اس نے خواب ناک سرگوشی کی تھی۔ ”تم اس بڑے گھر میں کتنے تنہا ہو۔“ اس نے آہستہ آواز میں کہا اور سنڈرک نے گروٹ بدلی۔

”اٹھو..... اٹھو..... بے خبر سنڈرک..... صبح کے تین بج رہے ہیں۔“ اس نے ایک بار پھر سرگوشی کی اور آہستہ سے سنڈرک کا کاندھا تھپتھپایا اور تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔ سنڈرک اچانک اٹھا تھا۔

”کون ہے؟“ اس نے آواز لگائی تھی۔ ”وہاں کون ہے؟“ اس نے پھر کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بھی سمجھ پاتا، ڈیزی کی کمرے سے نکل گئی تھی اور سنڈرک نے ایک سایہ سا کمرے سے لٹکا دیکھا تھا۔ وہ بیڈ سے اٹھ کر اس سائے کے تعاقب میں اسٹڈی تک آیا تھا اور سائے کی جھلک اسٹڈی میں غائب ہوتے دیکھ کر اس کے پیچھے خود بھی اسٹڈی



میں داخل ہو گیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سایہ کی لڑکی کا تھا۔ سیزڈرک نے اسٹڈی کی لائٹ آن کرنا چاہی تھی لیکن بلب روشن نہیں ہوا تھا۔

”اندرا جا سیزڈرک“ اسے ایک آواز سنائی دی تھی۔

”ڈیری! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ سیزڈرک نے کمرے کا دروازہ پورا کھولتے ہوئے کہا، جس سے ہلکی سی روشنی اندر آ رہی تھی، جس کی مدد روشنی میں اسے کمرے کے آخر میں ایک سایہ کرسی پر بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے بڑھ کر میز پر رکھے فون کا ریسورٹ اٹھالیا تھا۔

”میں پولیس کو فون کر رہا ہوں..... تم میرے گھر میں غیر قانونی طور پر داخل ہوئی ہو۔“ سیزڈرک نے کہا لیکن ڈیری نے اسے کوئی موقع نہیں دیا تھا اور تیزی سے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کر کے لاک کر دیا تھا۔ کمرے میں مکمل اندھیرا چھا گیا تھا۔

”اے..... آخر تم کیا چاہتی ہو؟ میں اندھیرے میں رہنا نہیں چاہتا۔“

”لیکن میں اندھیرے کا فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں کیونکہ تم جانتے ہو میں اندھی ہوں اور مجھے اندھیرے یا روشنی سے کوئی فرق نہیں پڑتا..... میں تم سے رالف کے قتل کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”اوہ نہیں..... اب پھر تم وہی ساری بکواس کرو گی.....“

”ہاں اور تمہیں میری بکواس سننا ہو گی..... اور میرے ساتھ کوئی چال چلنے کی کوشش مت کرنا۔ یاد رکھنا اس کمرے کا فرش چلنے میں آواز پیدا کرتا ہے جس کا فائدہ مجھے ہو گا اور تم یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ میرا نشانہ کتنا اچھا ہے اور میرے ہاتھوں میں پتھول ہے۔ تم ذرا بھی حرکت کرو گے تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گی۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے بولو تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتی ہوں..... یہ 1945ء کا ذکر ہے جس میں برطانیہ کو فتح ہوئی اور جرمنی نے ہتھیار ڈالے۔ جب سڑکوں پر ہر کوئی فتح کی خوشیاں منارہا تھا، میں نے فیصلہ کیا کہ یہ بہت اچھا موقع ہے کہ میں اپنے پرانے دوست میجر میتھ کو کال کروں، اسے فتح کی مبارکبادوں چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور پھر میں نے اس سے بھی یہ پوچھا کہ رالف کی موت کے بعد دوسری صبح اس کے کمرے میں جانے والا پہلا

فحص کون تھا، تو اس نے جواب دیا وہ شخص سیزڈرک کلنٹن تھا۔ ایئر وائس مارشل رپورٹ کلنٹن کا بیٹا، چنانچہ اس طرح مجھے اس پراسرار گروپ کی پیشین گوئی کی شناخت معلوم ہوئی اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ جب تم نے رالف کی تدفین کے موقع پر مجھ سے کہا کہ تم قاہرہ سے سیدھے واپس آ رہے ہو تب تم جھوٹ بول رہے تھے۔ تم پہلے ہی برطانیہ میں موجود تھے تاکہ چیک کر سکو کہ RAF میں کوئی اور کس کس کی موتیں ہوئی ہیں۔ پھر تمہیں وہ مخصوص قہر اس بھی حاصل کرنا تھا جس میں زہر لی کالی تھی، جسے تم نے زہر ملا دیا تھا لیکن وہ رائل وافر اس تھے۔“

”تم کیا بکواس کر رہی ہو؟ میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ وہ میں ہی تھا جس نے رالف کی لاش کا ٹیسٹ کروانے کی تجویز دی تھی اور ایئر وائس پر اس کی موت کی تحقیقات شروع کروائی تھی۔ تم میرے ان احسانات کو کیسے بھول سکتی ہو؟“

”یہ تمہاری چال تھی۔ تم مجھے دھوکا دینے کے لئے یہ سب کر رہے تھے۔“

”تم جو کچھ کہہ رہی ہو، وہ ثابت نہیں کر سکتیں۔“

”تم کچھ بھی کہو لیکن کہانی آگے بڑھتی ہے۔ میں نے اسی روز سیلفر وڈ ویلڈن سے بھی رابطہ کیا، جس نے تحقیقات کا حکم دیا تھا اور اس نے مجھے تمہارے اسکول کے پرانے ساتھی کا نام بتایا جو ایف بی آئی میں ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میرے اختیار میں جو کچھ تھا وہ میں نے کیا۔“ سیزڈرک نے چالاک سے کہا۔

”ہاں، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں اشخاص نے مجھے بتایا کہ رالف کی ٹیسٹ کی میڈیکل رپورٹ تم نے انہیں نہیں دی بلکہ چیف اسپیکٹر میٹل نے دی جو میں نے اسے دی تھی جبکہ تم نے مجھ سے رپورٹ یہ کہہ کر لی تھی کہ یہ تحقیقات میں مددگار ہو گی۔“

”لیکن جب ان کے پاس رپورٹ تھی تو میں کیوں دیتا

اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“

”جبکہ میں یہ سمجھتی ہوں کہ رپورٹ مجھ سے لے کر تم

ثبوت ختم کر رہے تھے۔ تم نہیں جانتے تھے کہ میں اس کی کالی

چیف اسپیکٹر کو بھی دے چکی ہوں۔ میں نے تمہیں اسکی

رپورٹ دی تھی۔“

”لیکن میں تو تمہاری مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”پھر میں نے ایک نوٹو گراف اپنے گواہ کو دکھائی.....“



رالف کے بیٹ میں کو اور اس نے کہا کہ وہ تم ہی تھے جو رالف کی موت کے بعد اس کے کمرے میں سب سے پہلے پہنچے تھے اور اس طرح مجھے حقیقت پتہ چل گئی کیونکہ میں اندر ہی ہوں چنانچہ میں نہیں بتا سکتی کہ کون کیا دکھائی دیتا ہے لیکن وکٹر نے مجھے تمہارا حلیہ بتایا۔“

”اوہ تو تم نے دوسروں کی شناخت جاننے کا جو کھیل یہاں اپنے آخری دن کھیلا تھا، وہ اس لئے تھا؟“ سنڈز رک نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا تم جانتی تھیں کہ میں کیا دکھتا ہوں؟“

”ہاں، لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ پراسرار گروپ کیپٹن تم ہی ہو، جو بعد میں جان گئی۔“

”میں کبھی بھی اس بات کو نہیں مانوں گا اور تم میرے خلاف کوئی ثبوت مہیا نہیں کر سکو گی..... میرے پاس تمہاری اہمقا نہ باتیں سننے کا کوئی وقت نہیں ہے۔ میں سو نے جا رہا ہوں۔“

”تمہارے پاس مجھے سننے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ اب اس معے کا آخری حصہ سنو۔ مجھے یہ کیسے پتہ چلا کہ قاتل نے رالف کو زہر کیسے دیا..... جب میں نے وکٹر کو رالف کی ڈائری دکھائی تو اسے یاد آ گیا کہ رالف نے اسے تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لئے کہا تھا کیونکہ تم نے رالف کے لیے بہت بڑھیا کافی بھیجی تھی اور اس کا پیٹ رالف نے ڈاک سے وصول کیا تھا۔ پھر وکٹر اپنے آفسر کے لئے وہ کافی تیار کرتا رہا تھا، اس کی موت واقع ہونے تک اور اس بات سے سے خبر تھا کہ وہ زہر لی تھی۔ یہ اس کہانی کا آخری حصہ ہے جو تمہیں مجرم ثابت کرتا ہے۔“

”اوہ ڈیزیز تم جانتی ہو میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“

”یہ جھوٹ ہے تم نے سب کچھ رالف کی دولت حاصل کرنے کے لیے کیا اور میں یہ سب کچھ بھول بھی جاتی اگر تم چار سال بعد دوبارہ میری زندگی میں نہ آتے۔ میں نے تمام حقائق سے پردہ اٹھانے کے بعد اور تمہیں مجرم کی حیثیت سے جان لینے کے باوجود بھی تمہارے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے سب کچھ خدا پر چھوڑ دیا تھا لیکن تم باز نہ آئے اور پھر مجھے یہاں لا کر اپنے منصوبے پر ایک بار پھر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس بار تم عشق کا ڈرامہ چاکر میرے ذریعے رالف کی دولت تک پہنچانا چاہتے تھے اور میرے نہ ماننے کے بعد تم نے مجھے وکیل سے ٹولس

بجھوایا کہ رالف کی دی ہوئی جائداد واصل تمہاری ہے اور میں اس فلیٹ کی بھی حقدار نہیں جو رالف نے میرے لئے خریدا اور جس میں، میں رہتی ہوں۔ تم مجھ سے محبت بھی کرتے ہو اور مجھے بے گھر بھی کرنا چاہتے ہو۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں تمہیں تمہارے انجام تک پہنچا دوں۔“

”کیا مطلب؟ کیا تم مجھے مارنا چاہتی ہو؟“ سنڈز رک نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... کیونکہ میں نے گواہوں کو بھی سن لیا اور تمام ثبوت بھی دیکھ لئے اور میرے سامنے مجرم بھی موجود ہے، چنانچہ کیوں نہ میں اسے کیفر کردار تک بھی پہنچا دوں؟“

”ایک منٹ..... میری بات سنو..... یہ مذاق نہیں ہے۔“ سنڈز رک نے گھبرا کر کہا۔

”تم میرے انتقام سے اب بچ نہیں سکتے۔“

”تم تمہیں میت سمجھو کہ تم اس بات کا فائدہ اٹھا لو گی کہ تم اندر ہی ہو اور مجھے قتل کر کے بچ جاؤ گی۔ تم کسی طرح بھی نہیں بچو گی۔“

”ارے اوہ..... اچانک ہی تمہیں پولیس اور قانون یاد آ گیا؟ لیکن جب تم رالف کو مارنے کا منصوبہ بنا رہے تھے، تب اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔ میں تمہیں بتاؤں کیا ہوگا؟ کل صبح جب تمہارے اسٹاف کا کوئی شخص تمہیں اسٹڈی میں مراپائے گا تو تمہارے ہاتھوں میں تمہاری پستول ہوگی اور یہ سیدھا سادا خودکشی کا کیس ہوگا۔“ ڈیزیز نے کہا اور اسی وقت سنڈز رک نے ڈیزیز کو بے خبر سمجھ کر اس پر چھلانگ لگائی لیکن یہ اس کی غلطی تھی۔ ڈیزیز نے اس پر فائر کیا تھا اور کوئی اس کی کٹائی پر گئی تھی۔ وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ ڈیزیز نے اطمینان انداز میں چلتی ہوئی اس کی لاش کے قریب آئی تھی۔ اپنے ہاتھ سے ایک دستانہ اُتار دیا تھا اور اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر دھڑکن محسوس کی تھی لیکن وہ غائب تھی۔ سنڈز رک مر چکا تھا۔ ڈیزیز نے اس کا پستول اس کے ہاتھ میں پکڑا تھا اور کمرے سے نکل گئی تھی۔ واپس جاتے ہوئے اس نے تہہ خانے کا ایک ٹرک بورڈ آن کر دیا تھا اور تہہ خانے کی کھڑکی سے باہر نکل گئی تھی۔

گھر سے کچھ فاصلے پر ایک کار اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ڈیزیز نے آہستہ سے کار کی چھت پر ہاتھ سے ٹکٹھٹایا تھا اور ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا تھا۔

”ہیلو ڈیزی..... کام ہو گیا؟“

کے رکنے پر کہا۔

”ہاں..... میں نے اپنا ہم لوڈ ٹھیک نشانے پر لگایا ہے..... وہ کبھی وضاحت نہیں کر سکے گا، کبھی معافی نہیں مانگ سکے گا۔“ ڈیزی نے کہا اور کاتیری سے آگے بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن سہ پہر کے وقت جب ڈیزی اسے آفس سے واپس آ گئی، جہاں وہ فریوے پر پھنس چکی تھی، تو اس کی پڑوسن سز مارس اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کے فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور سڑکیوں پر ان کے فلیٹ میں پکنے والے کھانے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

”ہیلو سز مارف، تم کیسی ہو؟“ انہوں نے ڈیزی کو دیکھتے ہی کہا۔

”میں ٹھیک ہوں سز مارس۔“ ڈیزی نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”تم نے آج کا اخبار دیکھا؟“ انہوں نے ڈیزی سے پوچھا۔

”نہیں، اخبار میں ایسا کیا خاص ہے؟“

”تمہارے لئے ایک دلچسپ خبر ہے۔“ سز مارس نے کہا۔

”ٹھیک ہے سز مارس، تم تو جانتی ہو میں روز کی نئی خبر شوق سے پڑھتی ہوں۔ تم اخبار لے کر آ جاؤ، میں کپڑے تبدیل کر لوں، پھر ساتھ بیٹھ کر خبر پڑھیں گے۔“ ڈیزی نے کہا اور فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

کچھ دیر بعد جب وہ کپڑے تبدیل کر کے اور چائے بنا کر میز پر چائے لگا رہی تب ہی سز مارس ہاتھ میں اخبار لئے اس کے پاس آ پہنچیں۔

”آج کے اخبار میں بوٹم ہاؤس کے بارے میں ایک خبر ہے ڈیزی۔ یہ وہی گھر ہے نا، جہاں تمہارا شوہر رالف پیدا ہوا اور پلا بڑھا تھا۔ تم اکثر اس کا ذکر کرتی رہی ہو؟“

”ہاں، بالکل سز مارس۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میرا شوہر وہیں پیدا ہوا، میں سننا چاہوں گی کہ ایسی کیا خبر ہے؟“ اس نے اندازے سے کہوں میں چائے ڈالتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہیں خبر سنائی ہوں۔“ سز مارس نے خبر کی شہ سرفی پڑھی۔

”ہاں ہاں پڑھیں، میں سن رہی ہوں۔“ ڈیزی نے ان

”ایک اچانک حادثے کی وجہ سے بوٹم ہاؤس کے وارث سیدرک کلنٹن اپنی جان کھو بیٹھا۔ وہ اپنے جنگلی ہتھیاروں کی صفائی کر رہا تھا جو کہ تمام لائسنس یافتہ اور جسرڈ تھے کہ اچانک اس کے ایک پستول سے گولی چل گئی اور اس کی کینٹی میں لگ گئی جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ اس کے پستول کا سیٹھی لاک کھلا ہوا تھا اور شاید اس بات سے سیدرک واقف نہیں تھا اور پستول لوڈ ہے، پولیس جائے حادثہ پر کافی دیر میں پہنچی۔“

”یہ چائے لیں سز مارس۔“ ڈیزی نے پُر سکون لہجے میں کہا اور چائے کا کپ ان کی طرف بڑھایا۔

”مجھے تو لگتا ہے سز مارف کہ سیدرک کلنٹن نے خودکشی کی ہے۔“ سز مارس نے کہا۔

”اوہ خدایا، سز مارس کیا آپ ایسا سمجھتی ہیں؟“

”ہاں، یہ ممکن ہے دراصل میں بوٹم ہاؤس کے اس نئے وارث کو کسی حد تک جانتی ہوں، تمہیں پتہ ہے وہ کوئی خوش باش آدمی نہیں تھا۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلا رہتا تھا.....“

”واہی سز مارس، چیزوں پر تمہاری نظر بہت تیز ہے۔ اگر تمہاری معلومات منظر عام پر آ جائیں تو ایک دلچسپ اور دلچسپ خبر بن سکتی ہے۔“ ڈیزی نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں بالکل۔“ سز مارس نے پھر سے گون آکر لے ہوئے کہا۔

”نہیں، آپ بتائیں۔“

”تم ہر چیز پر اپنی جتنی رائے رکھتی ہو۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ ڈیزی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے اندھے ہونے کے باوجود اپنے شوہر کی موت کا بدلہ یہ خوبی لے لیا تھا جبکہ انھیں رکھنے والے یہ کام کئی سال میں بھی نہ کر سکے تھے کیونکہ اس کے لئے اس محبت کی ضرورت تھی جو اسے رالف سے تھی، جس نے اسے تیار بنانا یاد دیا تھا۔

نومبر ۲۰۱۸ء



# گوشہ ابن صفی

ابن صفی..... مجدد عصر  
مشتاق احمد قریشی

سب سے پہلے میں نوجوان نسل کے عجمان ابن صفی و عاشقان ابن صفی کو سلام پیش کرتا ہوں، ان میں سر فہرست اردو بک ریوڈ ہل کے محمد عارف اقبال اور بزم عجمان ابن صفی کے محرک و منتظم سید اسد عادل، عبدالعلیم (فہد) اکیسینی بلکہ ان کی پوری ٹیم (صبیحہ یاسمین و یاسر حسنین) کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں، جن کی کوشش اور شوق نے نئی نسل میں ابن صفی اور اردو شناسی کا ذوق پیدا کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے، عجمان ابن صفی میں جس نے بھی جس طرح بھی کچھ کردار ادا کیا وہ سب میرے لیے قابل ستائش اور حوصلہ افزائی کا حق ہے۔

گزشتہ کی طرح اس بار بھی سید اسد عادل اور ان کے ساتھیوں نے پھر ایک مقالے کا انعقاد کیا ہے جس کا عنوان "ابن صفی ایک عہد ایک رجحان" 2018 تجویز کیا ہے اور ساتھ ہی مجھ ناچیز سے بھی کچھ لکھنے کی فرمائش کی گئی ہے، اس بار کچھ عنوانات بھی تجویز کیے گئے ہیں۔

ابن صفی کی تحریریں فن ناول نگاری کے آئینہ میں

اردو ناول نگاری کے ارتقاء پر جب بات ہوگی تو سب سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد کا نام آئے گا۔ کیونکہ وہی ہیں جنہوں نے اردو میں پہلی بار ناول نگاری کے تمام تقاضے پورے کئے۔ انہوں نے حقیقت نگاری اور سادگی کو پیمانہ بنایا اور سادگی میں ایک سحر پیدا کیا جو ناول کی اہم بنیاد قرار پاتا ہے۔ مرزا ہادی رسوا کا ناول "امرا جاں ادا" بھی اس زمرے میں آتا ہے۔ یوں تو ناول کی تعریف کئی طرح سے کی جاسکتی ہے لیکن ناول ایک انتہائی سنجیدہ تحقیقی سرگرمی کا نام ہے، ناول اپنے کردار کے قصے کو تمام تر تنوعات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ناول کی اہمیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے بڑے گہرے مسائل سے نبرد آزما ہوتا ہے، دراصل ایسی تحریروں میں کردار سانس لینے محسوس ہوں اپنے ارد گرد ماحول میں چلتے پھرتے معلوم ہوں، دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا بھر میں خصوصاً ہندوستان میں جو انقلابی تبدیلیاں آ رہی تھیں انہوں نے اس نے انسانیوں میں بے یقینی کو جنم دیا اور انسان خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگا۔

اسی احساس نے اسے خود غرضی، خود پسندی میں مبتلا کر دیا، یہی وجہ تھی کہ جنگ عظیم کے بعد تخلیق پانے والا ادب بھی ایسا ادب تھا جسے کہتے کہتے ناول ادب عالیہ کہا گیا، لیکن اس نے انسانی سوچ و فکر کو خود غرضی، خود پسندی کے صحرا میں دھکیل دیا۔ اسی ماہو کے ماحول میں ابن صفی نے ادب کی وہ صنف اختیار کی بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہو گا ایجاد کی جو حقیقت پسندانہ اور اجتماعیت کو فروغ دینے والی ہے، اسے اپنے خولوں میں بند وقت کے نامورادیبوں نے ابن صفی کے فن کی داد دینے کے بجائے فراری ادب کا نام دے کر اس کی تحقیر کی۔

کسی حد تک اہل نقاد و نظر کا یہ کہنا درست بھی تھا، ہاں ابن صفی نے فراری ادب تخلیق کیا خود غرضی اور خود پسندی، حقیقت سے فرار، ادب میں ابن صفی کا فرار دراصل اندیشوں اور خطرات سے آگاہی کے بعد ان سے نجات دلا کر حوصلہ اور ہمت دیتا ہے۔ انہوں نے انسانی نفسیات کو خوب اچھی طرح سمجھا اور اپنے قارئین کو انسانی نفسیات کی مثبت راہ



دکھائی ہے۔ لہذا اچھا اور مثبت ادب وہی ہے جو بڑھنے والوں کے شعور کی تطہیر کرے اور زندگی میں توازن پیدا کرے۔ ابن صفی نے اپنے قلم کا ہمیشہ مثبت استعمال کیا۔ قانون کی عظمت، بڑوں کی بزرگی کا احساس دلانا، ان کا پیغام دنیا میں پھیلے ہوئے معاشرے میں بدی و برائی کی اصلاح کے لیے ہے۔

ابن صفی کے ناولوں کا بنیادی مقصد معاشرے سے برائیوں کا خاتمہ اور لوگوں کو قانون کا احترام سکھانا تھا۔ وہ اپنے ناولوں کے ذریعے اپنے قارئین کو تخریب سے تحریک کی سمت مسلسل سفر کی تاکید کرتے ہیں اور ایک پاک صاف معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں۔ انہوں نے غیر فطری، جنسی، رومانی اور حقیقت سے دور لے جانے والی تحریروں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اردو ناول کی بالکل ہی نئی صنف کو روشناس کرایا ہے۔

صوبہ اول کے جاسوسی ناول نگاروں سے ابن صفی کے ناولوں کا تقابلی جائزہ

یہ موضوع ہی سمجھ سے باہر ہے۔ صوبہ اول کے جاسوسی ناول نگاروں میں ابن صفی سے پہلے کون کون سے جاسوسی ناول نگاروں کا نام آتا ہے؟ ابن صفی تو خود اس صنف کے بانی ہیں اردو میں جاسوسی ناول نگاری اور اسلوب کے۔ صوبہ اول میں تو وہ خود تنہا موجود ہیں۔ ان کا تقابل کس طرح ان کے پیروکار اور نقالوں سے کیا سکتا ہے؟

ابن صفی اردو کے ایک اعلیٰ مصنف تھے۔ انہوں نے اردو ادب میں ہی نہیں بلکہ ناول نگاری کے فن میں بھی ایک بڑا ہی کامیاب تجربہ کیا جو بہت کامیاب رہا۔ ان سے قبل اردو میں تمام تر جاسوسی ناولوں کے نام سے جو کچھ لکھا گیا وہ انگریزی جاسوسی ناولوں کے تراجم تھے یا ان سے ماخوذ ناول تھے، اور بنگل ناول نگار کوئی نہیں تھا۔

ابن صفی نے اردو ناول نگاری میں ایک بالکل نئی راہ اپنائی۔ انہوں نے اپنی ہی زمین کی مٹی سے اپنے ایسے کردار تخلیق کیے جو بڑھنے والوں کے ساتھ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کرداروں پر ان واقعات و معاشرتی ماحول پر بناوٹ کی جگہ حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ انہوں نے ناول اور افسانوں میں موجود جنسی آلائشوں اور بے راہ روی کے خلاف بڑے رساں سے شیخے اور اپنائیت کے لہجے میں اپنے قاری کو ادب، فلسفہ، سائنس، اخلاقیات اور دیگر علوم سے متعلق روشناس کراتے ہوئے ان کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

ایسے ہی منظر نگاری جو ناول کی ضروری روایت شمار ہوتی ہے انہوں نے اس سے ہٹ کر اپنے قاری کو کسی پیچ و خم میں الجھانے کے بجائے سیدھے سادھے، مختصر انداز اور کم سے کم الفاظ میں بیان کئے کہ ہر منظر لفظوں کا آئینہ و نگینہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کے مد مقابل اول تو کم از کم مجھے تو کوئی نظر نہیں آتا۔

ان سے متاثر ہو کر لکھنے والوں میں مسعود جاوید، اکرم الہ آبادی، ہمایوں اقبال اور انوار صدیقی ہی ایسے نام ہیں جنہوں نے ابن صفی سے متاثر ہو کر اپنے کرداروں کی ٹیم تو ان کی طرح بنائی لیکن نام اپنے رکھے۔ کہانیاں بھی دوسرے لکھنے والوں سے بدرجہ بہتر لکھیں، لیکن حدود و بارے ابن صفی والا ہی رکھا۔ جب کہ ان کے بعد کے ہزاروں سیکڑوں نقالوں نے تو نہ صرف کرداروں بلکہ تمام مقامات بھی وہی استعمال کیے اس لیے چوروں نقالوں سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ابن صفی صاحب کے کردار کہانی کو آگے بڑھاتے تھے۔ ان کے مکالمے مختصر اور جامع ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں مزاح مختصر جملوں میں ایسا ہوتا ہے کہ قاری کتابی خشک مزاج کیوں نہ ہو مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے مکالموں اور جملوں کا اثر بڑھنے والا شعوری و لاشعوری طور پر قبول کرتا ہے۔ جب کہ ان کے نقال اور ان سے متاثر ہو کر لکھنے والوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

تمام ہی لکھنے والے چاہے وہ جاسوسی ناول نگار ہوں یا سماجی رومانی معاشرتی ناول نگار ان کے یہاں ان کے کرداروں کو کہانی چلاتی ہے۔ ان کے یہاں طول طویل جملے اور مکالموں، منظر ناموں سے کردار اور کہانی کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔ مزاح اور وہ بھی ابن صفی جیسا کسی اور کے بس کی بات نہیں، بڑے بڑے جفاوری مزاح نگار ان جیسے مختصر جملوں کا پر اثر مزاح لکھنے سے قاصر ہیں۔



ابن صفی کو اللہ تعالیٰ نے بڑا خاص ہنر عطا فرمایا تھا۔ ان کا اپنا ایک مصرعہ ہے ”وہ جس کا سایہ گھٹا گھٹا ہے“ واقعی ان کے سائے سے سکڑوں نے فائدہ اٹھایا ان کا کوئی مد مقابل نہیں ہے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے ان کے درجات بلند کرے آمین۔

## ابن صفی کہاں ..... انفرادیت کہاں! ڈاکٹر حامد حسن حامی

السلام علیکم جناب!

میں کوئی بہت بڑا ناول نگار یا ادیب نہیں اور نہ ہی نقاد ادب ہوں کہ ابن صفی کی تحاریر پر فنی نقطہ نظر سے نگاہ ڈال سکوں۔ ایک عاشق ہونے کی حیثیت سے میں تو مدح سرائی ہی کر سکتا ہوں کہ ابن صفی صاحب اپنے فن میں یکتا تھے اور یکتا رہیں گے۔ ان کی ہمسری نہ بھی کوئی کر سکا اور نہ ہی بھی کوئی کر سکے گا۔

بنیادی بات جو ابن صفی صاحب کے ناولوں کا خاصا رہی وہ ”سراغ رسانی“ ہے۔ ذرا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔  
”اس خطی مصور کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”آدمی مشکوک معلوم ہوتا ہے۔“

”کیا آپ کو اس کی کہانی پر یقین آ گیا ہے؟“

”اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”آپ تو سگریٹ پیٹے نہیں پھر آپ نے اس سے سگریٹ کیوں مانگا تھا؟“

”محض یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ سگریٹ پیتا ہے یا نہیں۔“

”اسے معلوم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ معلوم کیے بغیر میں اندازہ لگا ہی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے یہاں رات کوئی آیا تھا یا نہیں۔“

حمید اس طرح ہنسنے لگا جسے فریدی نے کوئی بہت ہی بے ٹکی بات کہہ دی ہو۔

”اس طرح مت ہنسو پیارے..... میں نے وہاں ”کاروان اے“ سگریٹ کے دو تین جلمے ہوئے ٹکڑے دیکھے

تھے۔ میرے خیال میں اس قصبہ میں تو کوئی اس سگریٹ سے شوق نہ کرتا ہوگا۔“ حمید سنجیدہ ہو گیا۔

”حد ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ اتنی سی چیزوں پر نظر رکھتے ہیں۔“

جاسوسی دنیا: پراسرار راز جنمبی، ناول نمبر 09

اب اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ آج کے صف اول کے جاسوسی ناول نگاروں میں ”سراغ رسانی“ ناپید

ہے۔ بلکہ میرا تو ماننا ہے کہ فن سراغ رسانی ابن صفی مرحوم کے ساتھ ہی رخصت پذیر ہوا۔ ان کے بعد چند نکتی کے لوگوں

نے ہی سراغ رسانی پر لکھا اور ان میں سے ایک دوہی کچھ اچھے رہے لیکن ان کے بعد مجھے کوئی ایسا لکھاری نہیں ملا جس

نے سراغ رسانی پر لکھا ہو بلکہ اب تو جاسوسی کہانی سے مراد ”ایکشن و ہیجان خیزی“ ہی ہے۔

ان ناولوں میں ایسی منظر نگاری کی جاتی ہے کہ الفاظ کی گرفت کے زیر اثر قاری بھی دشمنوں سے مصروف پیکار ہے تو

کبھی ہیرو کے ہمراہ کسی ایڈوکیٹر کا حصہ۔ ایک الگ سی دنیا ہے جس کا قاری تجسس و تخیل سے بھی واقف ہی نہیں ہوا اس

ہیجان کا شیداء ہے اور تخیل کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ (یہی وہ لوگ ہیں جو ابن صفی کو پڑھنے میں ناکام رہتے ہیں۔) مندرجہ

بالا اقتباس سے کسی ہیجان پسند کو تسکین نہیں مل سکتی۔  
محترم ابن صفی صاحب کے بارے میں تقریباً ہر کوئی جانتا ہے کہ نفیسات ان کا مضمون تھا اور ہر نفسیاتی گمراہ کو لے کر





پیش رس: عمران سیریز، بڑول سورما، ناول نمبر 61

اس طرح ابن صفی کے قاری زندگی میں ایک مثبت رنگ ڈھنگ کے عادی ہو گئے جبکہ آج کے لکھاریوں نے جو ہیجان خیز اذہان تیار کیے ہیں وہ باتو ہیجان انگیز تھاریر سے حظ اٹھاتے ہیں یا کسی ایکشن سے بھرپور فلم سے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ایسے لوگ نہ زندگی میں کسی اور کے افکار قبول کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی دوسرا راستہ کہ جس پر چلنے سے ہیجان ”نشہ“ پورا نہ ہو۔

ابن صفی صاحب کی خامیوں کے بارے میں اگر کچھ کہنا چاہوں تو اتنا کہوں گا کہ ان میں صرف ایک خامی تھی اور وہ یہ کہ وہ جداگانہ کام کر گئے، ایسا کام کہ ان کے بعد کوئی ویسا کام نہیں کر سکا.....!

جو کہہ گئے وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرار  
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ چیز کیا ہوئی

## ابن صفی کی ناول نگاری فن ناول نگاری کے آئینے میں شاهد جمال

ابن صفی اور ان کی ناول نگاری پر بات کرنے سے قبل ہم ناول نگاری کے فن اور اصول پر ایک نظر ڈالتے چلتے ہیں کہ آیا ناول ہے کیا؟ اور اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اس کی ذرا وضاحت کر دی جائے تاکہ انہیں نکات پر ابن صفی کے ناولوں کو دیکھا اور پرکھا جاسکے۔

ناول کا لفظ اطالوی زبان سے مشتق ہے، سب سے پہلے یہ لفظ چودھویں صدی عیسوی میں سامنے آیا، اس کی اصل storianovella ہے۔ یہ اصطلاح تازہ کہانی کے مفہوم میں مستعمل تھی لیکن بعد میں ناول کا لفظ اس کہانی کے لئے مخصوص ہو گیا جو نثر میں لکھی گئی ہو اور جس میں رومانی اثرات ملیں۔ کچھ وقت بعد اس صنف کے ساتھ یہ لفظ بھی دوسری زبانوں میں پہنچا اور رفتہ رفتہ نثر میں قصہ گوئی کی ایک مخصوص ماہیت اور نوعیت کا ناول کا اصطلاحی نام دیا گیا۔ بعد میں مختلف عہد اور مختلف زبانوں میں ناول کی بے شمار تعریضیں کی گئیں چند ملاحظہ ہوں۔ انگلستان کی ایک ادیبہ کلارا ریوز ناول کے فن کے متعلق لکھتی ہیں۔

”ناول اس زمانے کی زندگی اور معاشرت کی سچی تصویر ہے جس زمانے میں وہ لکھا جائے۔“

ایک فرانسیسی مصنف فورٹیئر ناول کی ہیئت اور صورت سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ۔

”یہ ضروری ہے کہ قصوں کا مواد اور ان کے کرداروں کی سیرتیں ہماری سیرتوں سے اس قدر مشابہ ہوں کہ ہم ان میں اپنے روز آندہ کے ملنے والوں کو شناخت کر سکیں۔“

ناول کے متعلق وارث علوی کا کہنا ہے کہ۔

”ناول کا سب سے بڑا کام دریافت ہے، انکشاف ہے، صداقت کی تلاش ہے، حقیقت کی تھابہ پانے کی کوشش ہے۔ ناول کی تکنیک کے ذریعہ ناول نگار کردار کے باطن میں جھانکتا ہے۔ انسانی عمل کے حقیقی سرچشموں کی تھابہ پاتا ہے۔ جن باتوں کو وہ حقیقی زندگی میں سمجھ نہیں پاتا انہیں افسانہ کی حقیقی دنیا میں بھجتا ہے۔“

ورجینیا وولف نے کہا تھا کہ ناول ایک ایسا شمر مرغ ہے جو ہر چیز ہضم کر سکتا ہے۔ فارستر کے بقول ناول میں زندگی کے ہر موضوع کو برتا جاسکتا ہے۔ لارنس اسے ٹیلیویزیون کی دور بین سے بھی زیادہ اہم ایجاد مانتا ہے جب کہ رال فاکس نے ناول کو زندگی کا رزمیہ کہا ہے۔ تعریضیں اور بھی ہیں پھر بھی ایک اچھے اور عمدہ ناول کی عملی تعریف کر پانا ناممکن ہے۔ اور

اس کی سب سے بڑی وجہ ناول کا غیر محدود ہونا ہے درج بالا تمام تعریفوں کو یکجا کیا جائے تو ناول کے لئے چند عناصر مشروط ہو جاتے ہیں کہ اول تو وہ قصہ ہو، اس میں کردار ہواور حقیقت سے قریب تر ہو۔  
 یہ تو ہونی ناول کی تعریف۔ اب رخ کرتے ہیں جاسوسی ناول کی طرف۔ اردو میں جاسوسی ناول کی ابتداء فیروز دین مراد، منشی تیرتھ رام فیروز پوری، مرزا رسوا، اور ظفر عمر نے کی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی طبع زاد ناول نہیں لکھ رہا تھا بلکہ ان کے تمام ناول تراجم پر مبنی تھے۔ اگر طبع زاد کہانیوں کی بات کی جائے تو اردو میں طبع زاد جاسوسی ناول لکھنے کا سہرا ابن صفی کے سر جاتا ہے۔

ان کے ابتدائی چھ سات ناولوں کو الگ رکھ دیا جائے تو باقی تمام ناول طبع زاد ہیں ایک ایک سطر پہ ان کا دعویٰ ہے۔ ان کے ابتدائی ناولوں کے بھی صرف پلاٹ یا کہانی انگریزی سے مستعار ہیں ورنہ کردار، زبان و بیان اور اسلوب ابن صفی کی اپنی اختراع ہیں۔ اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ابن صفی کے ابتدائی ناول بھی تراجم کے زمرے میں نہیں آتے۔  
 اردو میں جاسوسی ناول کے فن اور اس کے عناصر ترکیبی پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے وہ نہ کے برابر ہے نیز اطمینان بخش بھی نہیں ہے، جاسوسی ناول کے فن پر چند تعریض ملاحظہ ہوں، اس ضمن میں احسن فاروقی و نور الحسن ہاشمی لکھتے ہیں۔  
 ”ایک قسم کے ناول اور بھی ہیں جن میں کوئی مجید ہوتا ہے، کوئی ایسا راز جن کا انکشاف مختلف طریقوں پر ناول کے پورے قصے کے ذریعے ہوتا ہے ایسے ناول کو جاسوسی ناول کہا جاتا ہے۔“  
 ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا بیان جاسوسی ناولوں کے متعلق کچھ یوں ہے۔

”جاسوسی ناولوں کی بنیاد تجسس اور اضطراب پر ہوتی ہے۔ ایسے ناولوں میں بالعموم انہونی باتیں اور مافوق الفطرت کردار پیش کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات جاسوسی ناولوں پر داستان کا گمان ہونے لگتا ہے۔“  
 درج بالا تعریفوں سے ہم جاسوسی ناولوں کے اجزائے ترکیبی مرتب کر سکتے ہیں۔ اوّل لڑکھٹریف میں کسی راز اور اس کے انکشاف کے ساتھ ساتھ طریقہ کار کی بھی بات کی گئی ہے جب کہ مؤثر لڑکھٹریف کا صرف پہلا جملہ ہی کارآمد معلوم ہوتا ہے یعنی جاسوسی ناولوں کی بنیاد تجسس پر ہوتی ہے۔

اب ہم ناول کے اجزائے ترکیبی کے ساتھ جاسوسی ناول کے درج بالا دو اجزاء یعنی طریقہ کار اور تجسس کو شامل کر کے جاسوسی ناول کے اجزائے ترکیبی مرتب کر سکتے ہیں۔ چونکہ ناول کے جو اجزائے ترکیبی مثلاً پلاٹ، کردار، وغیرہ ہیں وہ تو تمام قسم کے ناولوں کے لئے لازم و ملزوم ہیں، لیکن جاسوسی ناول کے لئے ناول کے اجزاء کے ساتھ جاسوسی ناول کے درج بالا ان دو اجزاء کا اضافی طور پر ہونا بھی مشروط ہے۔ اگر کسی جاسوسی ناول میں تجسس اور طریقہ کار نہ ہوں تو اسے جاسوسی ناول کے زمرے سے خارج سمجھا جائے گا۔ ذیل میں ہم ناول اور جاسوسی ناول کے عناصر ترکیبی پر گفتگو کریں گے۔  
 جاسوسی ناول کے اجزائے ترکیبی۔

پلاٹ:

پلاٹ واقعات کے اس خاکے کو کہتے ہیں جو ناول نویس کے پیش نظر شروع سے ہی رہتا ہے۔ قصہ کی ساری دلچسپیاں اسی کی ترتیب پر مبنی ہیں۔ پلاٹ میں ناول نگار اس بات کو ملحوظ رکھتا ہے کہ قصہ کی ابتدا کیسے کرنی ہے، قاری کی دلچسپی کیوں کر برقرار رہنی ہے۔ کہانی اور واقعات میں مد و جزر کہاں کہاں پیدا کرنا ہے۔ پلاٹ دراصل واقعات کی ہی ایک موزوں ترتیب ہے۔ یہ ایک قسم کا فن تعمیر ہے۔

ابن صفی اپنے ناولوں کے پلاٹ کی ترتیب کچھ اس مہارت سے کرتے ہیں کہ تمام واقعات ایک دوسرے سے مربوط رہتے ہیں۔ بعض ناولوں میں کسی ایک واقعے سے ہی قاری کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ شاید اسی واقعے نے ہی پورے پلاٹ کی تعمیر کی ہے۔ مثلاً ”دلچسپ حادثہ“ کا ابتدائی واقعہ ہی لے لیں۔ مسز پینا کیا عمران کو زخمی کرتی ہے، نتیجتاً عمران پہلے ہسپتال پہنچتا ہے اور وہاں سے گھسی۔



عمران کا کوٹھی جانا بھی پلاٹ کی موزوں ترتیب کا ایک حصہ ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ صرف گھر جانے کے لئے عمران نے ایسی حرکت کی تھی کہ سبز پٹھا کیا کے ہاتھوں زخمی ہونے کا وقوعہ وجود میں آیا۔ سبز پٹھا کیا والا وقوعہ اور عمران کے کوٹھی جانے کا ربط کچھ ایسا ہے کہ بعد میں قاری متحیر رہ جاتا ہے۔ اس قسم کے پلاٹ ابن صفی کے اکثر ناولوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ابتدا تو قاری کی سمجھ سے باہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہوا کیوں ہے نیز ایسے واقعے کو قاری مزاحیہ انداز میں لطف لیتا ہے لیکن ناول کے اختتام یا وسط میں ہی قاری کو اس واقعے کی نزاکت و اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔

کردار:

کردار ایک ایسی شے ہے یا ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ناول نگار اپنے خیالات و نظریات قاری تک پہنچاتا ہے۔ کردار چاندرا بھی ہو سکتا ہے اور غیر چاندرا بھی۔ چونکہ کردار ناول نگار کے لئے ترسیل کا ایک ذریعہ ہے اس لئے کردار ڈی روح ہو یا غیر ڈی روح، متحرک ہو یا ساکت و جامد اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اردو میں ایسے بہت سی مثالیں ہیں جس میں سورج، مرکز، درخت، بھوکا، گاڑی، پرندے، اور ٹرین وغیرہ کو کردار کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں شمس الرحمن فاروقی کا کہنا ہے کہ:

”کردار سے مراد کوئی انسان، یا کوئی بھی شے جسے ہم ڈی روح فرض کر سکتے ہوں یا ڈی روح جانتے ہوں اور جس سے دوچار ہونے پر ہم اس سے انسانی جذبات پر مبنی معاملہ کر سکیں۔ یعنی ہمیں اس سے ہمدردی، نفرت، اطمینان، محبت وغیرہ ہو سکتی ہو۔ ایسی صورت میں چالور، پھول، بھوت، پتھر، مکان کوئی بھی چیز کردار کا کام کر سکتی ہے لیکن عام طور پر کردار سے انسانی کردار مراد لیا جاتا ہے۔“

کرداروں کی تقسیم کو لے کر ناقدین کی مختلف آراء ملتی ہیں۔ ناقدین کی اکثریت نے عمومی طور پر کرداروں کو دو درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک سپاٹ کردار (بیک رقی کردار) تو دوسرا دور کردار (ہیروئیک کردار) کرداروں کی یہ تقسیم مجھے پسند نہیں ہوئی۔ سپاٹ ہونا یا دور ہونا کردار کی ایک اضافی صفت ہے کردار کی قسم نہیں۔ یہ صفات کسی بھی کردار میں ہو سکتی ہیں۔ کچھ ناقدین نے کرداروں کو مرکزی کردار اور ثانوی کردار میں بھی تقسیم کیا ہے کرداروں کی یہ تقسیم موزوں بھی ہے اور معقول بھی اس میں ذرا سے اضافے کے ساتھ کرداروں کو تین درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) مرکزی کردار

(ب) ثانوی کردار

(ج) ضمنی یا دلی کردار

(الف) مرکزی کردار:

مرکزی کردار ناول یا کہانی کا بنیادی کردار ہوتا ہے، اسے کہانی کا ہیرو بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک فعال اور متحرک کردار ہوتا ہے۔ کہانی کا سارا تانا بانا اسی کے ارد گرد بننا جاتا ہے اور پوری کہانی اسی کے آس پاس گھومتی ہے۔ اس کردار کے نفسی تشکیش اور قول و فعل سے کہانی یا واقعہ میں تہذیبی آئی رہتی ہے۔ یہ کردار بقیہ تمام کرداروں پر قول و فعل کے اعتبار سے حاوی رہتا ہے۔ ایک ہی ناول میں ایک سے زیادہ مرکزی کردار ہو سکتے ہیں اس کی کوئی قید نہیں ہے۔ ابن صفی کے چند مرکزی کرداروں میں فریدی، عمران، حمید، سنگ، بی، قمریسا، یوغا وغیرہ قابلِ فراموشی ہیں۔

(ب) ثانوی کردار:

ثانوی کردار کی بھی اپنی حیثیت مسلم ہے۔ کسی ناول میں صرف مرکزی کردار نہیں ہو سکتا۔ اس کے آس پاس دوسرے کرداروں کا وجود بھی لازمی ہے انہیں ہی ثانوی کردار کہا جاتا ہے۔ بظاہر تو ان کرداروں کا واقعات سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن واقعات اور مرکزی کردار کی تشہیر میں یہ کردار بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ثانوی کرداروں کا مرکزی کرداروں سے تعامل و تعامل ہی مرکزی کرداروں کی نفسیاتی گہرائی کو بڑھاتا ہے۔



بعض اوقات ان کرداروں سے ایسے افعال سرزد ہو جاتے ہیں کہ مرکزی کردار پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور قاری کے ذہن پر ثانوی کرداروں کا عکس نقش ہو جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ کردار ناول میں شروع سے آخر تک موجود ہوں۔ یہ کردار ایک طرح سے مرکزی کردار کی معاونت کرتا ہے اسی لیے اسے سپورٹنگ رول یا کیریکٹر بھی کہا جاتا ہے۔

صردر، جولیا، جردن، سلیمان، فیض، اسپنلر، یکسا، جگدیش، آصف وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

(ج) دلی یا مصلیٰ کردار:

دلی یا مصلیٰ کردار ہم ایسے کردار کو کہیں گے جو ناول میں وقتاً فوقتاً چند ساعت کے لئے ظہور میں آتے ہیں اور فوراً غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ کردار قاری کے ذہن پر کوئی نقش نہیں چھوڑتے نہ ہی قاری اسے یاد رکھتے ہیں۔ بعض اوقات ناول میں ان کی ضرورت ہوتی بھی ہے اور بعض دفعہ نہیں بھی ہوتی۔ ایسے کردار ملتے پھرتے راویہ کی شکل میں، دود کا مدار کی شکل میں، ڈرامہ کی شکل میں یا بھیڑ و جماعت کی صورت میں ناول میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ابن مصلیٰ کے کرداروں پر اگر ایمان داری سے لکھا جائے تو ایک مستقل کتاب کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ کردار نگاری میں ابن مصلیٰ کو جو ملکہ حاصل ہے وہ اردو کے کسی دوسرے ناول نگار کو نصیب نہیں۔ ان کے سارے مستقل کردار زندہ جاوید ہیں۔ یہ تسلیم کرنا ان کے ابتدائی کرداروں فریدی و حمید پر کچھ قارئین و ناقدین کو شرم لاک ہو گا ورنہ ان کا شبہ ہوا تھا لیکن یہ شبہ حقیقت کے مدارج کو نہیں پہنچ سکا۔ کیونکہ ان کی جماعت، ان کا رہن سہن، ان کا لنگر و احساس اور ان کے رویے خالص مشرقی ہیں۔

فریدی، استقامت، بردباری، ذہانت، جرأت، بے غری، شرافت و وقار کا پیکر ہے تو حمید، ہنسوز، لاہالی، پر غلوص، ذہین، لطیف، عاشق مزاج، بہادر اور دھم دھم ہے۔ عمران کے کردار پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ ابن مصلیٰ نے جب اس کردار کی تخلیق کی تو یہ شعوری کوشش کی کہ اس کردار میں فریدی و حمید کے چند اوصاف کے ساتھ ساتھ کچھ اضافی اوصاف بھی اس میں داخل کئے جائیں جو کہ صرف اسی سے مخصوص ہوں۔

یہ کردار ابن مصلیٰ کی طبعی و غلطی کا مظہر ہے۔ ابن مصلیٰ نے عمران کے اندر ہلاک ذہانت، ہر شے میں مطلب برآری کے عناصر اور جسم میں بھلی سی سرعت بھری ہے۔ یہ ایک ایسا واحد کردار ہے جو اپنی حماقت مآبی اور عیسیٰ صورت کے باوصف عناصروں کا عیار ہے نیز بے مہر کی اور مختلف فنون حرب کا ہمسہ ہے۔

قصہ پن:

ناول کا ایک اہم عنصر قصہ یا کہانی ہے۔ ہر کسی کہانی کے ناول کا وجود ہی ممکن نہیں۔ ای ایم فارمر نے قصہ کو ناول کی ریڑھ کی ہڈی کہا ہے۔ قصہ کی تعریف عام طور سے یوں کی جاتی ہے کہ وہ کچھ ایسے واقعات کا بیان ہے جو یکے بعد دیگرے ظاہر ہوئے ہوں اور کسی نتیجے پر پہنچتے ہوں۔ ہر قصہ میں یہ بیان ہوتا ہے کہ پہلے یہ ہوا پھر یہ ہوا اور آخر میں یہ نتیجہ ہوا۔ ہر قصہ میں کچھ ابتدائی واقعات ہوتے ہیں، کچھ درمیانی واقعات ہوتے ہیں اور آخر میں ایک خاص واقعے کے ساتھ انجام یا نتیجہ ہوتا ہے اس میں وقت کے سلسلے اور ترتیب کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔ قصے کی ایک ترتیب چلا کر کہلاتی ہے۔

مقصد حیات:

ایک ناول نگار جو کچھ بھی لکھتا ہے وہ کسی نہ کسی خاص مقصد، خاص نظریے کی تعلیم و تبلیغ کے لئے لکھتا ہے۔ اس کا مقصد تفریحی، تعلیمی، اقتصادی، اخلاقی، مذہبی یا سیاسی بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جتنا جس شخص کا نظریہ حیات اعلیٰ ہوگا اتنا ہی اس کا مقصد وسیع ہوگا۔ ایک فنکار اور معمولی لکھنے والے میں فرق صرف اتنا ہے کہ آخر لکھ کر اپنے مقصد کو واضح کر دیتا ہے اور اس کی تصنیف محض پروپیگنڈہ اور تبلیغ ہو کر رہ جاتی ہے۔ جب کہ اول لکھ کر جو اثر پیدا کرنا چاہتا ہے اسے واقعات کے بیان کی ترتیب سے حاصل کر لیتا ہے۔ وہ قاری کو آہستہ آہستہ باتوں میں لگا کر اپنے راستے پر لے آتا ہے اور ایک غیر محسوس طور پر اس کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔



ابن صفی نے اپنے ناولوں میں بھی اس بات پر زور نہیں دیا کہ قاری کو یہ محسوس ہو کہ وہ کسی نظریے کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ اگر کسی نظریے پر بات بھی کی ہے تو ایسے ہی بلکہ پھلکے انداز میں کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں تاکہ قاری کو یہ نہ محسوس ہو کہ وہ اس پر کسی قسم کا دباؤ بنارہے ہیں۔ قانون کی بالادستی و اس کا احترام، منشی طاقتوں و منشی عناصر کی سرکوبی اور مثبت رویوں کی پاسداری نیز ایک صحت مند سماج و معاشرے کا قیام ہی ابن صفی کا اولین مقصد ہے۔ کہیں کہیں طنزیہ طور پر مذہب سے ہماری بیزاری کو بھی نشانہ بناتے ہیں لیکن وہاں بھی قاری پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا کہ بھائی مذہب ہی تمہارے سر بلند ہونے کا واحد ذریعہ ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”اوہ.....!“ ہفتم الف کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ”آپ لوگ بہت مذہبی ہیں۔“

”بہت نہیں صرف میں فیصد..... اگر پچاس فیصد بھی ہو جائیں تو ساری دنیا میں کوئی ہم سے آنکھ نہ ملا سکے.....!“

شہباز کا سیراء، عمران سیریز

منظر نگاری:

ناول کا ایک اہم عنصر منظر نگاری بھی ہے۔ اس کی وجہ سے ہی ناول کے زمان و مکان کا تعین ہوتا ہے۔ منظر نگاری میں موسموں کا بیان، راستے، جنگل، سمندر، ندی اور پہاڑ وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔ جس جگہ واقعہ ہو رہا ہے اسی کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ منظر نگاری میں زیادہ تر قدرتی مناظر پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک ناول نگار کی سب سے اہم خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ واقعہ نگاری و منظر نگاری کو کچھ اس سلیقے سے بیان کرے کہ اس مقام کی ہو بہو تصویر قاری کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ منظر نگاری کا ایک اقتباس دیکھیں۔

”پچھلے پہر کی گھری ہوئی چاندنی جنگل کے سرسبز سینے پر محیط تھی۔ چاروں طرف ایک لامتناہی سکوت پھیلا ہوا تھا۔ ہولے ہولے چلنے والی خشک ہوا ایسی لگ رہی تھی جیسے سوئے ہوئے جنگل کی خواب آور اور بو محمل سائیس۔ دفعتاً تار جام والی سڑک پر کسی کار کی ہینڈ لائش کی روشنی دکھائی دی اور پھر سناٹے میں انجن کی ہلکی آواز انتشار پھیلانے لگی۔ انپکٹر فریدی کی خوبصورت کیڑی لاک سڑک کے سپاٹ سینے پر پھسلتی جا رہی تھی۔“

خون کا دریا، جاسوسی دنیا

زمان و مکان:

ایک ناول نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کا تعین کرے کہ واقعہ کہاں پیش آیا، کیسے پیش آیا، اس سلسلے میں جگہ اور مقام کی جزئیات اس سلیقے سے بیان کی جائیں کہ اس کے متعلق ساری معلومات قاری کو فراہم ہو جائیں۔ اس کے لئے حقیقت بیانی بھی لازم ہے۔ یہ نہ ہو کہ ٹائٹ کلب اور شراب خانے میں چائے و ٹی پلائی جائے۔ وہاں کا ماحول وہیں کے مطابق دکھایا جائے۔ زمان و مکان میں سماج کے نقشے، بازاروں، گلیوں، سڑکوں، کلبوں اور ہوٹلوں وغیرہ پر زیادہ توجہ دی جانی ہے۔ ابن صفی کے تمام ناولوں میں زمان و مکان کا ذکر اس خوبی سے ہوا ہے کہ طبیعت عیش عیش کر اٹھتی ہے۔ ابن صفی نے ان کے بیان میں اتنی صداقت سے کام لیا ہے کہ بہت سارے فرضی مقامات، سڑکیں اور ہوٹل و کلب وغیرہ ہماری تخیلاتی دنیا میں آج بھی موجود ہیں۔

اسلوب بیان:

اسلوب بیان سے مراد ناول نگار کی طرز تحریر ہے نیز کرداروں کے مکالمے بھی اسی کے تحت آتے ہیں۔ ناول نگار اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ قصے کا راوی کون ہے اور اس کا بیانیہ کیسا ہے۔ اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے ناول نگار اپنے اسلوب بیان یا طرز تحریر میں تبدیلی کرتا ہے۔ کرداروں کی زبان سے وہی جملے کہلواتا ہے جو اس کردار کے عین مطابق ہوں۔ آپ ذرا تصور کریں کہ اگر کسی بچے کی زبانی کسی جہانمیدہ شخص کے سے تجربات بیان ہوں یا کسی پناوڑی کے منہ سے قلعے کے موتی نکلیں گے تو قاری کا کیا حال ہوگا۔

ناول نگار کا کمال یہی ہے کہ کرداروں کی مناسبت سے ان کی زبان سے ایسے جملے کھلاتا ہے کہ قاری ذرہ برابر بھی تھکیک میں مبتلا نہیں ہوتا۔ ابن صفی کا یہ اختصاص ہے کہ انہوں نے جتنے بھی کردار پیش کئے ان سب کے درمیان ان کی مناسبت سے ہی زبان کا انفرادی قائم رکھا۔

ابن صفی کے ناول اپنے موضوع، پلاٹ، ایکشن، تجسس، ایڈوچر ہی نہیں زبان و بیان کے حوالے سے بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ابن صفی وہ واحد ناول نگار ہیں جن کے یہاں طنز و مزاح اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ سرافرسانی یا جاسوسی جیسے خشک موضوع کو ابن صفی نے زبان و بیان اور مکالمے کی مزاحیہ چاشنی کے ایسے گل بوٹے سے آشنا کیا کہ جاسوسی ادب کی یہ خشک و سنگلاخ وادی گل گلزار بن گئی۔

سادہ، دلکش، مختلفہ اور رواں نثر کے ایسے ایسے جواہر پارے ان کے ناولوں میں موجود ہیں جن کی چمک آج بھی قاری کو محسوس کئے ہوئے ہے۔ اس کی بنیادی وجہ لسانی سرچشموں سے ان کی گہری واقفیت ہے۔ ان کے ناولوں میں بعض جگہ پوری زبان بھی بڑی فنکارانہ چمک دہکتی سے استعمال ہوئی ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ ”ڈیڑھ مٹوالے“ کا شیخو عرف ثونی اس کی بہت عمدہ مثال ہے۔ انہوں نے زبان و بیان کے سلسلے میں بھی اپنے اختراعی جواہر دکھائے ہیں۔

استاد محبوب زرا لے عالم کی غزل ”قلبدنی“ کو کون بھول سکتا ہے نیز ان کی عربا فارسیا کی ہانک تو بالکل ایک نئی زبان ہی محسوس ہوتی ہے۔ ”عمران کا اغوا“ ناول میں اختراعی جواہر کی بے شمار مثالیں ہیں جنہیں طوالت کے خوف سے پیش کرنے سے معذور ہوں۔

تجسس: کسی اسپانی تحریر یا جاسوسی ادب کے لئے تجسس بہت اہم ہے۔ اس میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کہانی کے جو بھی اسرار ہیں وہ رفتہ رفتہ قاری پہ آشکار ہوں۔ یہ نہ ہو کہ قاری کی ساری دلچسپی ایک ہی بار میں ختم کر دی جائے۔ ناول نگار اس بات کو ملحوظ رکھتا ہے کہ قاری کے سامنے کوئی ایسی پہیلی کوئی ایسا کیس رکھ دیتا ہے کہ اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور قاری خود اس پہیلی کو سمجھانے کے لئے مختلف النوع خیالی داؤ پیچ آزمائے لگتا ہے۔ لیکن ناول نگار رفتہ رفتہ اس سہمی کو سمجھاتا ہے اور قاری تھمیر رہ جاتا ہے کہ ادھ..... کمال ہے، ایسا تھا..... اب تو میرے گمان میں بھی نہ تھا۔

ابن صفی کے ناولوں کو تجسس کے زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ ناول کی ابتدا ہی ایسے دتوے سے کرتے ہیں کہ قاری دلچسپی کے ساتھ قہر تجسس میں جا گرتا ہے۔ وہاں سے اس کا فرار بھی ممکن ہوتا ہے جب ابن صفی ناول کے اختتام پر کہانی کے اسرار سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے ایک ناول ”جنگل کی آگ“ کا ابتدا یہی ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے ناول کی شروعات ہی ایسے دتوے سے کی ہے کہ قاری تجسس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہی تجسس اسے پورا ناول پڑھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی فریدی نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔  
”ہیلو.....“

”فریدی..... میں عرفانی بول رہا ہوں..... بوڑھا عرفانی..... میں خطرے میں ہوں۔“  
”کیا بات ہے!“ فریدی نے پوچھا۔

لیکن جواب نہ دارو..... سلسلہ منقطع نہیں ہوا تھا۔ فریدی نے ریسیور کان سے لگائے رکھا۔  
”ہیلو..... ہیلو.....“ عرفانی صاحب..... فریدی بول رہا ہے۔“ فریدی نے دوبارہ کہا لیکن پھر بھی کوئی جواب نہ

ملا..... اور پھر فریدی نے ایک ہلکی سی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔  
”فائر.....!“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا اور اس نے ریسیور رکھ دیا۔



ناول کے یہ ابتدائی حصے قاری کے لئے دلچسپی و تجسس بنائے رکھتے ہیں عرفانی کون تھا؟ اس کو کون سے خطرات لاحق تھے؟ فریدی کو لائبریری کی آواز سنائی دی تھی تو کیا عرفانی کو کوئی ماروی گئی تھی یا فریدی کے خلاف کسی منصوبہ بند سازش کے تحت عرفانی سے ایسا کرایا گیا تھا؟ ان سارے جملہ سوالات و نکات کی طرف قاری کا ذہن متوجہ ہوتا ہے اور وہ ناول ختم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

طریقہ کار:

جاسوسی ناولوں کے لئے تجسس سے کہیں زیادہ اہمیت طریقہ کار کی ہے۔ طریقہ کار ہی قاری کی دلچسپی و تجسس بنائے رکھنے میں معاون ہیں یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ طریقہ کار ہی وہ واحد شے ہے جو جاسوسی ناولوں میں تجسس، ایجنٹ اور ایڈوکیٹ کا باعث بنتا ہے۔ طریقہ کار کو ہم تفتیش کا انداز کہہ سکتے ہیں۔ ایک سرافرساں کے لئے لازم ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے اپنے لئے اور اپنے مکیس کے حوالے سے کارآمد راہ کی باتیں معلوم کرے۔

جاسوس کی چھان بین کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے معلومات سے ہی وہ اس کے تفتیش کا لائحہ عمل مرتب کرتا ہے۔ ابن صفی کے ناولوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو طریقہ کار اور تفتیش کے دو اصول ہیں۔ ایک فریدی کا دوسرا عمران کا۔

فریدی ایک روایتی سرافرساں یا آفیسر کے انداز میں تفتیش کرتا نظر آتا ہے لیکن چند مقامات پر جہاں اسے ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ اپنی شناخت پر شدید رکھ کر معلومات حاصل کرتا ہے۔ جب کہ عمران کا کوئی طریقہ کار ہی نہیں۔ اس کی ریڈی میڈ کھوپڑی میں مین وقت پر جو سما جائے وہ اسی سچ پر تفتیش کرنا شروع کر دیتا ہے۔

عمران کا انداز روایتی سرافرساں سے کافی مختلف ہے وہ بھی اپنی شناخت ظاہر نہیں کرتا، عام انسانوں کی طرح معلومات حاصل کرتا ہے بالکل سادہ انداز میں، ہاں ضرورت پڑنے پر وہ بہت کچھ کر گزرنے سے بھی بچے نہیں ہٹتا۔ ”بحری عظیم خاں“ کی منہ بیا تو یاد ہوگی ہی جب عمران برجر کو پھانسنے کے لئے موسیقی کے پروگرام میں منہ بیا کو لے کر ہنگامہ کر دیتا ہے۔ ایسا اس نے پہلے سے مرتب کردہ منصوبے کے تحت نہیں کیا تھا۔ بس استاد کے بول سن کر ریڈی میڈ کھوپڑی تنگ مٹی تھی اور تمہ ظاہر ہے عمران کے حق میں رہا۔

دوسرے تو عمران واقعات کی مناسبت سے بھی اپنا طریقہ کار متعین کرتا ہے لیکن اس کا خاص انداز لوگوں کو یہ وقف بنا کر اپنا انوسیدھا کرنا ہے۔ ”کالے چراغ“ میں عمران کا وہ انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے جب کہیاں پکڑنے کے شغل سے عمارت و عمارت کے مالک کے متعلق معلومات حاصل کرتا ہے۔ ”جانیں ایک ہاون“ کے عمران کو کون بھول سکتا ہے جب ناول میں ایک کی جگہ دو پاگل نظرائے لگتے ہیں۔ ”مگیت اور خون“ میں فریدی کو بے وقوف بنا کر بہت سی کارآمد باتیں معلوم کرتا ہے۔ اس ناول میں قاری کو بھی احساس نہیں ہوتا کہ کھانے میں لہریلی اشیاء ملانا عمران کی کارستانی ہو سکتی ہے۔ وہ ایسا کر کے فریدی کی ہمدردی حاصل کر لیتا ہے اور حالات اس کے موافق ہو جاتے ہیں۔ تصور کیجئے اگر عمران کھانے کو دھراؤ دے دیتا تو کیا ناول اور کہانی کی نوعیت وہی رہتی؟ بالکل نہیں۔

اب تک ہم نے جتنی باتیں کیں وہ ساری ناول کے روایتی تنقیدی نظریات پر مبنی تھیں کہ ایک ناول میں فلاں فلاں فلاں اجزا کا ہونا لازم ہے۔ اب ایک قدر جدید و منفرد انداز سے گفتگو کرتے ہیں اور وہ ہے ہمایہ اس کو جدید و منفرد میں نے ان معنوں میں استعمال کیا ہے کہ ناقدین کی اکثریت اس حوالے سے بات کرنے سے گھرائی ہے۔ وہی روایتی انداز میں پلاٹ، کردار، اسلوب اور مکالمہ پر بات کر کے جان چھڑا لیتے ہیں۔ جب کہ کسی بھی لکشن کے لئے ہمایہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

اردو میں Narrative کا ترجمہ ہمایہ اور Narratology کا کیا نام کیا جاتا ہے۔ معاصر تنقید میں نقد ہمایہ اور اس کے نظریاتی مباحث کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں ہمایہ کیا ہے اور اس کا اطلاقی لکشن پہ



کیسے کیا جاتا ہے۔

اردو میں یہاں یہ کو متعارف کرانے میں ممتاز شیریں پیش پیش ہیں، وہ یہاں کے متعلق اپنے مضمون ”ناول اور السانے میں تکنیک کا تنوع“ میں لکھتی ہیں۔

”یہاں صبح معنوں میں کئی واقعات کی ایک داستان ہوتی ہے۔ جو بچے کے بعد وگھرے علی الترتیب بیان ہوتے ہیں۔ ہم یہاں یہ کہ بقول مسکری کہاں بھی کہہ سکتے ہیں۔“

ممتاز شیریں کی درج بالا تحریر کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان کے نزدیک یہاں سے مراد وہ تحریر ہے کہ کوئی شخص واقعات کو ترتیب دے کر کوئی کہانی لکھیں دے۔ جب کہ محض الرحمن فاروقی کا بیان ہے کہ۔

”یہاں سے مراد ہر وہ تحریر ہے جس میں کوئی واقعہ یا واقعات بیان کئے جائیں۔“

یہاں کی ان تعریضوں میں ایک لفظ واقعہ اور دوسرا بیان کرنے کا شرط ہونا قدر مشترک ہے۔ یعنی یہاں کے لئے واقعہ کا بیان ہونا شرط ہے۔ اب رہا سوال کہ واقعہ کیا ہے؟ اس ضمن میں فاروقی لکھتے ہیں۔

”وہ بیان جس میں کسی قسم کی تبدیلی حال کا ذکر ہو Event یعنی واقعہ کہا جائے گا۔“

قاضی انصالح حسین واقعہ کی تعریف میں کہتے ہیں۔

”جس عمل (حرکت) میں صورت حال تبدیل ہوتی ہو اسے واقعہ کہتے ہیں۔“

یعنی واقعہ کے لئے تبدیلی یا حرکت ہونا لازم ہے۔ واقعہ کی نوعیت کے اعتبار سے یہاں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اول ”السانوی یہاں“ دوم ”غیرالسانوی یہاں“ کوئی بھی بیان یا متن خود بخود وجود میں نہیں آتا بلکہ کوئی اسے بیان کرتا یا ترتیب دیتا ہے۔

واقعہ بیان کرنے والے کو اصطلاحاً راوی کہتے ہیں، یعنی ہر نوع کے یہاں میں ایک بیان کرنے والا یا راوی موجود ہوتا ہے۔ عام طور پر یہاں میں راوی دو طرح سے روایت کرتا ہے۔ ایک ”واحد حکلم“ دوسرا ”واحد قاعب“

واحد حکلم کا راوی کہانی ”میں“ سے شروع کرتا ہے جب کہ واحد قاعب کا راوی ”وہ“ سے۔ واحد حکلم سننے کا راوی عموماً کہانی کا کوئی کردار ہوتا ہے جو ہمیں کہانی سناتا ہے اور واحد قاعب کے راوی کو عام طور سے مصنف سے منسوب کیا جاتا ہے۔

یہاں محض واقعات کا بیان یا واقعات کا سلسلہ نہیں بلکہ واقعات کا باہمی سلسلہ ہوتا ہے۔ یہاں ہی یہ طے کرتا ہے کہ کسی کہانی میں مصنف یا راوی کے ادراکات کس حد تک سمجھے جائیں۔ اس سلسلے میں محض الرحمن فاروقی کا قول ملاحظہ ہو۔

”یہاں میں جب کوئی واقعہ بیان ہو جاتا ہے تو پھر اس میں مصنف کے ادراکات شامل نہیں ہوتے، بلکہ راوی کے ہوتے ہیں۔“

اس حوالے سے دیکھا جائے تو یہاں کے راوی اگر خود مصنف ہے تو یہاں میں اس کے ادراکات شامل ہونے کا گزیر ہیں لیکن راوی اگر واحد حکلم میں ہے یعنی ناول کا ہی کوئی کردار ہے تو مصنف یا ناول نگار سے اس کی لائقیت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس ضمن میں Booth C. Wayen کے ایک مضمون کا ترجمہ قاضی انصالح حسین نے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔

”بے شک واحد حکلم کا انتخاب بعض مرتبہ غیر ضروری تحدید قائم کرتا ہے۔ اگر ”میں“ کے پاس اطمینان بخل ضروری اطلاعات نہیں ہیں تو مصنف کہانی میں ناممکنات کی طرف بڑھ جاتا ہے۔“

یہاں کے درج بالا اصول و نکات پر ابن صلی کے ناولوں کا اطلاق کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن صلی کے تمام ناولوں کا یہاں واحد قاعب میں ہے سوائے ایک ناول ”ٹھنڈی آگ“ کے۔ ٹھنڈی آگ کا راوی حیدر ہے۔ ناول کی کہانی اپنے آپ میں جتنا بہت عمدہ، دلچسپ و دیگر سے منفرد ہے۔ اپنے موضوعاتی و نگری حوالے سے بھی اس ناول کو خاص



اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً فریدی و حید کی پہلی ملاقات کا ذکر اسی ناول میں ہوا ہے۔ حید کی زندگی کے غریب و فراز، اس کی نفسیاتی پیچیدگیاں، اس کے گھر کے حالات نیز اس کے اپنے والد سے تعلقات کا ذکر بھی اس ناول میں حید کی زبانی سننے کو ملتا ہے۔ لیکن تکنیکی طور پر اس ناول میں ایک قسم ہے۔ چونکہ ناول کا راوی حید ہے لیکن ہمیں قدم قدم پر یہ احساس ستاتا ہے کہ ہم حید کی زبانی کہانی نہیں سن رہے بلکہ ابنِ مافی ہمارا ہاتھ پکڑ کر ناول کی سیر کر رہے ہیں۔

واحد حکم ہونے کی صورت میں حید صرف اتنی ہی کہانی بیان کر سکتے کا اہل ہے جس کا وہ یقینی شاہد ہے یا جو اس کے اپنے خیالات و جذبات ہیں۔ وہ نہ تو دوسرے کرداروں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کر سکتا ہے اور نہ ہی پس منظر میں رہنے والے دوسرے کرداروں کے افعال و حرکات بیان کر سکتا ہے۔

ابن مافی نے ”مٹھنڈی آگ“ کے پیشرس میں لکھا ہے کہ۔

”اس کتاب کا پیشرس کسی کے اس مقولے سے شروع کر رہا ہوں کہ ”دیر آید درست آید۔“

اب اس ناول کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مقولے پر پیچیدگی سے غور کیا جائے تو غالباً ابن مافی نے دیر آید درست آید کا مقولہ اس لئے لکھا تھا کہ وہ یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ کہانی کا بیانیہ اس بار واحد حکم میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قارئین کے مطالبے کی بنا پر انہوں نے یہ ناول واحد حکم میں لکھا ہو۔ ورنہ پیشرس میں دیر آید کا مقولہ لکھنے کی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی (یہ میرا ذاتی مفروضہ ہے اور مفروضے میں اتفاق و انکار کی گنجائش بہر حال رہتی ہے۔

ابن مافی کا یہ تجربہ کامیاب تو رہا لیکن ان کو اس تجربے کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ملی ورنہ وہ واحد حکم کے پیچھے میں اور بھی ناول ضرور لکھتے۔ آگے اس کی وضاحت کروں گا کہ اس تجربے پر ان کو خاطر خواہ پذیرائی کیوں نہیں ملی۔ فی الحال ایک اقتباس پیش کرنا چاہوں گا جس سے میرے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ اس ناول کی سیر میں ہمیں کئی مقامات پر یہ احساس ہوا ہے کہ ہم ابن مافی کی انگلی تھامے ہوئے چل رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

”شام پر تو شاعری ہوتی ہے۔ نثر میں بھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے مگر زبان سے نہیں کہا جاسکتا۔ کیوں کہ آپ یہی سب کچھ کسی چوراہے پر کھڑے ہو کر کہنا شروع کر دیں تو ٹریفک کا شیل کسی قریبی دوا فروش کی دکان سے تھانے کو ضرور فون کرے گا کہ یہاں ایک بزرگوار ٹریفک کی نقل و حرکت میں خلل انداز ہو رہے ہیں اور پھر آپ کو وہاں پہنچا دیا جائے گا جہاں آپ ہی جیسے ہزاروں بھلے آدمی موجود ہوں گے۔ لیکن آپ ان کی نثر سنتے سنتے تنگ آ کر شاعری شروع کر دیں گے لیجئے میں پھر بہک گیا۔“

درج بالا اقتباس کے متعلق اگر میں کہوں کہ یہ تحریر ابن مافی کے ایک مزاحیہ مضمون ”شیطان صاحب“ سے مستعار ہے تو کچھ لوگ اسے سچ مان لیں گے اور کچھ لوگ تشکیک کا شکار رہیں گے۔ اور اگر میں کہوں کہ یہ تحریر ابن مافی کی ہے ہی نہیں تو آپ سبھی مجھ پہ پل پڑیں گے کہ او بالاقب یہ ابن مافی کی ہی تحریر ہے۔ خیر یہ شیطان صاحب سے نہیں بلکہ ایک ناول کے پیش رس سے مستعار ہے۔ اب کتنے لوگ ہیں جو اس سے انکار کریں؟

میرا خیال ہے کہ کتنی کے ایسے دوچار لوگ انکار بھی کر سکتے ہیں جنہوں نے ابن مافی کی تحریروں کو حفظ کیا ہوا ہے۔ باقی سبھی اسے ابن مافی کا پیش رس تسلیم کر لیں گے۔ اب میں یہ کہتا ہوں کہ درج بالا اقتباس ”مٹھنڈی آگ“ سے مستعار ہے نہ کہ پیشرس سے... درج بالا اقتباس یا جملے حید کی زبانی کہے گئے ہیں اور آپ نے دیکھا کہ ان جملوں پہ ابن مافی کی چھاپ قطعی گہری ہے۔ اب ذرا فاروقی صاحب کا وہ قول سامنے رکھیے جسے میں نے پیچھے کوٹ کیا ہے کہ بیانیہ میں جب کوئی واقعہ بیان ہو جاتا ہے تو پھر اس میں مصنف کے ادراکات شامل نہیں ہوتے، بلکہ راوی کے ہوتے ہیں۔ اس قول کی روشنی میں حید کے درج بالا جملے کا تجزیہ کیجئے، کیا اس اقتباس میں ابن مافی کے ادراکات شامل نہیں؟ کیا ہم نے حید کے نام پہ ابن مافی کی انگلی نہیں پکڑی؟ اگر ایک بھی جواب ہاں میں ہے تو پھر میں کامیاب رہا۔

اب آتے ہیں میرے اس جملے پہ جو میں نے کہا تھا کہ اس ناول پہ صرف اس کے واحد حکم پیچھے کی وجہ سے خاطر



خواہ پذیرائی نہیں مل سکی۔ کیوں نہیں ملی اس کی بھی وضاحت کرتا چلوں کہ ابنِ مثنیٰ نے پہلے پہل جب لکھنا شروع کیا تو یہ شعوری کوشش کی کہ آرتھر کونز ڈائل سے اپنی تحریروں کو مختلف بنا سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے ابتدائی ناول کے لئے اپنی کہانی کا کچھ مواد وہاں سے لیا لیکن کردار اپنے تخلیق کئے نیز کہانی کا بیانیہ بھی تبدیل کیا۔ جس میں انہیں کامیابی بھی ملی۔ انہوں نے اپنا انفرادی اختصاص بھی قائم رکھا۔

اب آئیے قاری کی طرف۔ ابنِ مثنیٰ کے تقریباً سو ناول بڑھنے کے بعد قارئین کے ذہن پر ان کی تحاریر، ان کے اسلوب، ان کی لفظیات اور ان کے انداز کی ایسی گہری چھاپ نقش ہو چکی تھی کہ ”مثنوی آگ“ میں جب اسی انداز کی تحریر، وہی لفظیات اور وہی مانوس جملہ حمید کی زبانی بولتے تھے تو قارئین اسے قبول نہیں کر سکے۔ وہ اس تحریر کو حمید کے خیالات سمجھنے سے منکر ہو گئے۔ ہونا بھی تھا۔ اگر یہ ناول ابنِ مثنیٰ کا پہلا ناول ہوتا تو قارئین اس کی بھی پذیرائی بالکل اسی انداز میں کرتے جیسی ”دلیر مجرم“ اور ”خوفناک عمارت“ کی کی تھی۔

اب ابنِ مثنیٰ کا کوئی بھی ایک ناول لیتے ہیں، کوئی بھی اس لئے کہ ”مثنوی آگ“ کے سوا باقی تمام ناولوں کا بیانیہ واحد غائب میں ہے۔ چلیں ”زمین کے بادل“ منتخب کرتے ہیں۔ اس ناول کا راوی واحد غائب ہے جو کہ عموماً مصنف سے منسوب کیا جاتا ہے۔ زمین کے بادل ابنِ مثنیٰ کے چند شاہکار ناولوں میں سے ایک ہے۔ اگر اس ناول کا راوی واحد متکلم میں ہوتا تو کیا زمین کے بادل کی کہانی، سسٹمس اور ایڈوچر ویسا ہی ہوتا؟ آپ کا جواب بالکل درست ہے کہ بالکل نہیں زمین کے بادل کی کہانی دوسرا ہی خطوط (پلاٹ) پر آگے بڑھتی ہے اور ناول کے وسط میں یہ دونوں خطوط یکجا ہو جاتے ہیں۔

ایک طرف فریدی کی ٹیم ہے تو دوسری طرف عمران کی۔ بیانیے کا راوی ایک بار فریدی داس کی ٹیم کی کارکردگی اور افعال و اعمال ہمارے سامنے رکھتا ہے تو ایک بار عمران کی ٹیم کے کارنامے سناتا ہے۔ فرض کیجیے اس ناول کا راوی واحد متکلم میں ہوتا تو کیا وہ اس دوہرے پلاٹ سے انصاف کر پاتا؟ جواب اب بھی انکار کی صورت میں ہی ہے۔ کیونکہ واحد متکلم بیانیہ کا راوی کسی ایک ٹیم ہی کے افعال و اعمال کا یعنی شاید ہو سکتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ واحد متکلم راوی کے ناولوں میں کہانی اتنی وسعت اور پھیلاؤ اختیار کرنے کی اہل نہیں ہوتی جتنی واحد غائب میں۔

ابنِ مثنیٰ کا انفرادی اختصاص۔

ابنِ مثنیٰ نے جاسوسی ادب کو صرف تھیر و تحس اور استعجاب تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے تمام ناولوں میں پس پردہ زمانے کی بغض پیمانہ کراس کی دھکتی ہوئی رگوں کو چھیڑا ہے۔ شاید ہی ہمارے ساج کا کوئی ایسا تاریک پہلو ہو جس پر ابنِ مثنیٰ نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول صرف تلاش و تحس اور فن و شخص کی وادیوں کی ہی سیر نہیں کراتے بلکہ حیات انسانی کے تپتے ہوئے صحرائیں لے جا کر اس کے تمام اسرار و رموز سے آشنا کراتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ان کے ناولوں میں جرائم اور مثنیٰ رویوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے لیکن جس کمال ہنرمندی سے انہوں نے جرائم پر قانون کی بالادستی، قانون کا احترام، متنی رویوں پر مثبت رویوں اور حق کو سر بلندی عطا کی ہے وہ قابل ستائش ہے نیز مایوسی و ناامیدی سے تنگ آکر جو افراد جرائم میں ملوث ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں انہیں غلط راستوں سے نکال کر صحیح راہ دکھانے کی بھی سعی کی ہے۔ ابنِ مثنیٰ کے ناولوں سے دو اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

”آدمی بھی کتنا عجیب جانور ہے..... جو صرف بچانے کے لئے بچاتا ہے.....“

ایلی تصویر، عمران سیریز

”حکومتوں سے سرزد ہونے والے جرائم، جرائم نہیں حکمت عملی کہلاتے ہیں۔ جرم تو صرف وہ ہے جو انفرادی حیثیت سے کیا جائے۔“

بیباکوں کی تلاش، عمران سیریز

درج بالا دونوں بلیغ جملوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ابنِ مثنیٰ اگرچہ ایک جاسوسی ناول نگار تھے مگر ان کا دماغ



لفظی نہ سورج کا حامل تھا۔ لالہ الذکر جملہ انسان کی انفرادی و اجتماعی نفسیات کی کیا خوب تر جمالی کر رہا ہے جب کہ مؤخر الذکر جملہ ایک پوری حکومت کا ترجمان ہے۔

ابن صفی اختراعی ذہن کے مالک تھے اور وہ دور رس نگاہ بھی رکھتے تھے۔ اس ضمن میں ان کے ناولوں کی سائنسی ایجادات اور آلات کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابن صفی نے اردو میں جاسوسی سائنس لکھن کی ایک نئی طرز کی بنیاد لی جو کہ صرف ان کی ذاتی اختراع تھی۔ اس میدان میں وہ تنہا نظر آتے ہیں کوئی بھی ان کے آس پاس بھی نہ ٹھہر سکا۔ بعد کے آنے والے ادبا نے یا تو ابن صفی کی تقلید کی یا ان کا چہرہ اڑایا۔

ابن صفی نے ایسے ایسے حیرت انگیز سائنسی آلات و ایجادات کا ذکر کیا ہے کہ قاری انگشت بدندان رہ جاتا ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ سائنسی ایجادات کے سلسلے میں انہوں نے ہوائی جہاز کی جگہ تمام سائنسی آلات و ایجادات کی سائنسی تشریح و توضیح بھی پیش کی ہے۔ فولادی کا ذکر ہو یا ایٹمی شعاعوں کا، نے گراڈ کا ذکر ہو یا الیکٹرومگس کا، مشعلے سورج کا ذکر ہو یا ڈاکٹر اسٹیلر کی میزائل کا، سمبرا آج ہو یا ریٹشوں کی پلغار، ڈیبرا بین کی برقی اسکرین ہو یا قمریسیا کا عصا، شوگر بینک کا پرو فیسر بندر ہو یا جنگل کی شہریت کا کلاسیکی ادب سے شغف رکھنے والا طوطا۔

یہ سب انسانی دماغ کا کارنامہ ہیں کوئی بھوت پریت یا ما فوق الفطرت ہستی کے کارنامے نہیں ہیں۔ ابن صفی نے اپنے ناول میں ایک ایسی ایٹمی شعاع کا ذکر کیا تھا جو لکھا میں ہی میزائل اور طیاروں کو جاہ کر سکتی ہے۔ کچھ دنوں بعد انہیں علم ہوا کہ روس نے یہ ایجاد کر لی ہے ابن صفی ”ہلاکت خیز“ کے پیشرس میں لکھتے ہیں۔

”اب دوسری سنیے آج ہی کے اخبار میں یہ خبر ملی حروف میں شائع ہوئی ہے کہ روس ایک ایسی ایٹمی شعاع بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے جو چین برائے مگسی میزائلوں کو نقصان میں جاہ کر دے گی..... لیکن میں پوری سچائی سے اعلان کرتا ہوں کہ ڈیرو لینڈ والوں نے یہ شعاع آج سے ایک ہفتہ قبل استعمال کی تھی..... اور اس کے سلسلے میں عمران کو دل کھول کر الو بنایا تھا۔ لیکن میری کون سے گا۔ کریڈٹ روس کو ہی جائے گا۔“

ابن صفی اور ان کے ناولوں کے انفرادی اختصاص پہ جتنا بھی لکھا جائے کم ہی رہے گا۔ انسانی زندگی کے کون سے اسرار و رموز ہیں جو ان کی نظروں سے پوشیدہ رہے ہوں، ان کے کسی نہ کسی ناول میں کسی نہ کسی صورت پیش ہوئی گئے ہیں۔ عمرانیات، سماجیات، اخلاقیات، نفسیات، مذہبیات، فلسفہ اور سائنس کوئی بھی موضوع ان کی گرفت سے نکل نہیں سکا۔ یہ تمام موضوعات انفرادی طور پر الگ الگ تحریر کے متقاضی ہیں۔ ابن صفی کی ناول نگاری پر منفرد موضوعات کے تحت سینکڑوں پی. ایچ. ڈی. بھی کم پڑ جائیں گی پھر میرا چند صفحات کا یہ مضمون ابن صفی اور ان کے ناولوں کا مکمل احاطہ کیسے کر سکتا ہے۔

یہ بات پورے وقوف سے کہی جاسکتی ہے کہ ابن صفی کو ادب میں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ عوام کے اذہان اور قلوب کی سب سے اونچی مسند پر تو ابن صفی براجمان ہیں لیکن اردو ناقدین نے ان کے ساتھ سوجھ بوجھ روا رکھا۔ اردو ادب کی یہ تنگ نظری ہی تھی کہ ایک انٹرویو میں انظار حسین نے ابن صفی کے نام تک سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کر دیا تھا۔ شاید ابن صفی کے دور میں ہی کچھ ناقدین جاسوسی ناول نگاروں پر دشنام طرازی کرتے رہے ہوں گے جیسی تو ابن صفی نے اپنے ایک ناول میں ان ناقدین پر بھرپور طنز کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

”پھر اب تم کیا کرو گے؟“

”اردو ادب کا کوئی نامور ناقدین کہ جاسوسی ناول نویسوں کو گالیاں دیتا پھروں گا۔“

جو تک کی وانجی عمران سیریز

خالہ اردو کے نام لہاد نقادوں کو یہ ذمہ رہا ہوگا کہ وہ اردو ادب کے چوٹی کے نقادوں میں شمار ہوتے ہیں جب کہ جاسوسی ناول عوامی ادب یا پاپولر لٹریچر میں شمار کیا جاتا ہے۔ اردو میں یہ ادب، عوامی ادب اور مقبول عام ادب کی حد

فاصل کس نے طے کی؟ ظاہر ہے انہی نقادوں نے۔ جب کہ ادب کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ادب، ادب ہوتا ہے یہ لامحدود ہے پھر اس میں یہ غیر ضروری تحدید چہ معنی دارد؟

چلیے یہ بات تسلیم کہ جاسوسی ناولوں میں انسانی معاشرت اور زندگی کے پیچیدہ و پوشیدہ حقائق اس طرح مکمل کر سامنے نہیں آتے جو عام طور پر کسی عمدہ ناول میں بیان ہوتے ہیں۔ یہ بھی تسلیم کہ کسی جاسوسی ناول کا موازنہ و مقابلہ ”امراۃ جان ادا“ سے نہیں کیا جاسکتا، تو پھر بھائی صاحب مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ”امراۃ جان ادا“ کا کسی عمدہ جاسوسی ناول سے موازنہ بھی فضول ہے۔ موازنہ و مقابلہ دو یکساں شے کا ہونا چاہئے نہ کہ شلوکار کا قلم سے اردو کوٹ کا چلون سے۔ یہی موازنہ کرنا ہی ہے تو چلون کا پا جاوے سے کریں کچھ تو مناسبت و یکسانیت ہو۔ اس سلسلے میں علی احمد ظلمی رقم طراز ہیں۔

”عمدہ سے عمدہ جاسوسی ناولوں میں اس امکان کی تلاش فضول ہے کہ جاسوسی ناول کے فن اور تقاضے ہی مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اور ناول سے ایک ہی قسم کا تقاضا یا ایک ہی قسم کی تریف کی طرح کے ناولوں پر منطبق کر دی جائے یہ بھی مناسب نہیں۔ دراصل یہ ہماری شعریات کی غلطی ہے کہ ہم نے ایک ہی قسم کی شعریات سے تمام قسم کے ناولوں کی جانچ پرکھ کی اور غلط قسم کے نتیجے نکالتے رہے اور اس غیر اصولی اور غیر تنقیدی عمل کا شکار ہوا عوامی ادب، جاسوسی ادب، ابن صفی اور دوسرے فنکار۔ یہ بالکل ایسے ہی ہوا جیسے غزل کی شعریات مرثیہ کی جانچ پرکھ ہو اور جب وہ شاعر اس معیار پر کھرا نہ اترے تو اسے بڑا شاعر کہہ دیا جائے۔“

خانم مولوی عہد الحق نے ابن صفی کے متعلق کہا تھا کہ اس شخص کا اردو پر بڑا احسان ہے۔ خیال رہے کہ اردو کے کسی دوسرے ادیب کے متعلق اس قسم کے تاریخی جملے اردو کی تاریخ میں کسی نے بھی نہیں کہے۔ کچھ تو بات تھی ابن صفی ہیں۔ اپنی تحریروں سے تین نسلوں کی آبیاری کرنا اور آنے والی نہ جانے کتنی نسلوں کی ذہن سازی بھی متوقع رکھنا، یہ اعزاز ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ مضمون کا اختتام مولوی عہد الحق کے ایک جملے سے کروں گا کہ

”اگر ایک اور ابن صفی پیدا ہو جاتا تو اردو کی کامیابی ہو جاتی۔“

عمر الحسنوس.....

ہزاروں سال زرخس اپنی بے لوری پہ روتی ہے  
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حواشی:

۱۔ بحوالہ، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی عباس حسینی، صفحہ 37۔

۲۔ ایضاً صفحہ 38۔

۳۔ پور ڈواڑی پور ڈواڑی، وارث علوی، صفحہ 37۔

۴۔ ناول کیا ہے، محمد احسن فاروقی، نور الحسن ہاشمی، صفحہ 114۔

۵۔ بحوالہ، ابن صفی فن اور شخصیت، راشد اشرف، صفحہ 149۔

۶۔ انسانے کی حمایت میں، مہش الرحمن فاروقی، صفحہ 227۔

۷۔ مشمولہ: تنقید، قاضی انصالح حسین، صفحہ 45۔

۸۔ انسانے کی حمایت میں، صفحہ 268۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ تنقید، قاضی انصالح حسین، صفحہ 195۔

۱۱۔ انسانے کی حمایت میں، صفحہ 234۔



### ابن صفی کے ناولوں میں طنز و مزاح فائزہ احمد، ناگپور مہاراشٹر، انڈیا

عروج آدم خاکی سے انجم پہنچ جاتے ہیں  
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

اس شعر کی مصداق ابن صفی کی مقبولیت، ہر عام و خاص میں ہے، ان کے ناولوں کی پسندیدگی سے کتنے ہی ادبا، سخن ور، نقاد اور مصنفین واقف ہو چکے ہیں، سہم جانے کی حد تک تو معاملہ ٹھیک ہے، لیکن ان کو ڈی گریڈ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دینا ان پر تنقید و تنقیص کے تیر بر سنانا، ان کے دلوں میں چھپی نفرت کو صاف ظاہر کرتا ہے۔ ایسے ادبا و نقاد سمجھتے ہیں کہ اگر ابن صفی کو ان کا مقام مل گیا تو خود ان کی عزت کم ہو جائے گی، کوئی ان کو پوچھنے والا بھی نہیں ہوگا، حالانکہ وہ غلط سوچتے ہیں، ان کا مقام اپنی جگہ اور ابن صفی کا اپنی جگہ، ابن صفی تو دلوں میں بستے ہیں، نکلنے کے نیچے، ہاتھوں میں، دل کے قریب پائے جاتے ہیں، ان جیسا مقام تو کسی کا نہیں ہو سکتا۔

ایک دنیا جانتی ہے کہ ابن صفی ہمارے عہد کے سب سے بڑے ناول نگار ہیں، وہ اپنے فن میں یکساں دیگانہ تھے اور رہیں گے، ان جیسا ادب شاید ہی کوئی تخلیق کر سکے، جہاں ایک طرف ہم کو ان کے ناولوں میں جرم و سزا سے متعلق کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں وہیں طنز و مزاح، تنقیر، تجسس اور ایڈ وچر بھی پڑھنے کو ملتا ہے اور یہی نہیں بلکہ ان کے ناولوں سے ہمیں نا صرف اخلاقی درس حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ نئی تفریح کا سامان بھی ملتا ہے۔

زیر نظر مضمون میں ہم ان کے ناولوں میں طنز و مزاح کا جائزہ لیں گے جو ان کے ناولوں کی ایک اضافی خصوصیت ہے کیونکہ بنیادی طور پر ان کے ناول سراغ رسانی اور جاسوسی سے بھرپور ہوتے ہیں، اس اضافی خوبی یعنی طنز و مزاح کی بات کی جائے تو ہم دیکھتے ہیں وہ اپنے کردار فریدی حمید، عمران، قاسم وغیرہ کے ذریعہ اپنے ناولوں میں مختلف مقامات پر ایسے انداز میں طنز کر جاتے ہیں کہ دوسرا دیکھتا رہ جائے اور سوچے کہ واقعی یہ ابن صفی کا کام تھا۔

ان کے ناولوں میں نا صرف حکومت بلکہ اکثر سماجی نظام اور افراد پر بھی مزاح کے لہادے میں لپیٹ کر طنز کیا جاتا ہے، وہ طنز یہ بات کو کچھ ایسے پیرائے میں بیان کرتے ہیں جو سیدھا قاری کے دل پر اثر کرتا ہے، خالص مزاحیہ باتوں میں بھی وہ اتنے دلچسپ لطفیے اور مثالیں پیش کرتے ہیں جس کا کوئی جواب نہیں، ان کے کچھ ناولوں سے طنز یہ اور مزاحیہ اقتباس یہاں پیش خدمت ہیں۔

”عمران نے ایک بوڑھے سائیکل سوار کو نظر میں رکھ لیا تھا جو دوسری طرف سے آ رہا تھا، اس کے سینے پر بڑی سی سفید داڑھی لہرا رہی تھی، عمران نے ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا، بوڑھا سائیکل سوار اتر کر عمران کو تحیرانہ انداز میں گھورنے لگا، وہ اس طرح روکے جانے پر کچھ خوفزدہ بھی ہو گیا تھا۔

”اتنی لمبی داڑھی لگا کر سائیکل چلاتے شرم نہیں آتی۔“ عمران نے کہا۔

”جی!“ بوڑھے کی آنکھیں اور زیادہ پھیل گئیں۔

عمران نے پھر وہی جملہ دہرایا۔

”آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔“ بوڑھے نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”میں ڈھنگ کی باتیں کرتا ہوں، آپ بے شرم ہیں۔“  
 ”آپ ہوش میں ہیں یا نہیں؟“ بوڑھے کی آواز تیز ہو گئی۔  
 ”میں بالکل ہوش میں ہوں، آپ کو شرم آنی چاہیے۔“  
 ”اپنی زبان کو لگام دے سچے۔“

”کیا میں گھوڑا ہوں کہ زبان کو لگام دوں..... آپ یا تو داڑھی صاف کرایے یا سائیکل پر بیٹھنا چھوڑ دیجئے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

بوڑھا سائیکل ایک طرف پھینک کر مرنے مارنے پر آمادہ ہو گیا، کئی راہگیران کے گرد اکٹھا ہو گئے۔  
 ”بڑے میاں ہوش کی دوا کرو..... سائیکل پر اتنی لمبی داڑھی ظلم کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔“  
 ”ابے چوپ۔“ بوڑھا حلق کے بل چیخا۔  
 ”باگل معلوم ہوتا ہے۔“ مجمع میں سے کسی نے کہا۔  
 ”تم خود پاگل۔“ عمران اس پر الٹ پڑا۔ ”تمہاری سات پشتیں باگل۔“  
 ”ہات تیرے کی.....“ ایک آدمی اس پر چھپٹا، عمران کا ہاتھ بھی محسوس کیا۔  
 اور پھر اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا، وہ سب عمران پر چڑھ دوڑے۔

ناول: گم شدہ شہزادی، عمران سیریز

مزاح اور مقصدیت دو الگ الگ چیزیں ہیں، لیکن یہاں معاملہ بالکل الٹ ہے، یہاں عمران بغیر کسی وجہ کے ایسی احقانہ حرکت نہیں کرتا جو بڑھنے والوں کو ہنسنے پر مجبور کر دے، مزاح کے پیچھے ایک بڑا مقصد کارفرما ہے، قاری جب اس مقصد تک پہنچتا ہے تو دنگ رہ جاتا ہے اور عمران کی اس حرکت پر جہاں اس نے قبضہ لگائے ہوتے ہیں وہیں اس کی دوراندیشی پر اسے بے ساختہ پیارا آ جاتا ہے، وہ انکشت بدعنوان رہ جاتا ہے۔

یہ اور اس جیسا بامقصد مزاح ہر ایک کے بس کی بات نہیں، یہاں عمران کے حلقہ انداز کے ساتھ اپنے پلان پر عمل کرنے کے طریقہ کار کو پیش کیا گیا ہے، وہ عمران جو محاکماتوں اور مسکراہٹوں کا مجموعہ ہے وہ دراصل اپنی ایسی حرکتوں سے قاری کے ذہن کو بھگا دیتا ہے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک احقانہ حرکت کے سوا کچھ نہیں، لیکن جب اس احقانہ حرکت کے پیچھے جیسے ہوئے پلان پر اس کی نظر جاتی ہے تو وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

اب آتے ہیں ایک اور اقتباس کی طرف، جو کہ ابن صفی کے کمال فن کا آئینہ ہے، ایسے اقتباس جہاں ہم کو ہنسنے پر مجبور کرتے ہیں وہیں سنجیدگی سے بہت کچھ سوچنے سمجھنے کی بھی دعوت دیتے ہیں، یہ نہیں کہ کتاب کو تفریح کے لیے پڑھا اور ختم کر کے ایک جانب ڈال ڈال دیا۔

”اگر میں اس سڑک پر تاجپنا شروع کر دوں تو تم مجھے دیوانہ کہو گے، لیکن لاشوں پر تاپنے والے سورا بکھلاتے ہیں، ان کی چھائیاں تمہوں سے سجائی جاتی ہیں۔“

ناول: خطرناک لاشیں، عمران سیریز

ذرا غور کیجیے، یہاں ایک بہت بڑی بات کو جس طنز یہ انداز میں بیان کیا گیا ہے کیا وہ ہمیں ایک دم سے سنجیدہ ہو کر غور و فکر کی دعوت نہیں دیتی؟ اس اقتباس میں عمران ان ملکوں پر طنز کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو اپنے مفاد کے لیے اپنے سے کمزور ممالک پر ظلم کرتے ہیں، ان کو جنگ کے دہانے میں جھونک دیتے ہیں، مغلوب ملک کے بے قصور لوگوں کو مارتے ہیں، ایسے لوگوں کو بہت بڑے بڑے اعزاز دیے جاتے ہیں، کیا یہ آج کی ایک تلخ حقیقت نہیں؟

”پھر کتے کیوں آتے ہیں۔ اگر کتے آتے ہیں تو بکرا بھی جائے گا۔“  
 ”بکرے کو دیکھ کر کتے بھونکنے لگتے ہیں۔“ منیجر نے کہا۔ ”میرے حال پر رحم کیجیے، آپ ایسی حرکتیں کرتے ہوئے



”مجھے کس معلوم ہوتے آپ بھی کافی معزز آدمی ہیں۔“  
”جی نہیں میں چمار ہوں، مگر مجھ سے ہدائیں ہو سکتی۔“

ناول: اندام میرے کا شہنشاہ، جاسوسی دنیا  
اس اقتباس میں حمید کی زبانی ایسے لوگوں پر طنز کیا گیا ہے جو کتے کی ہنسنی کو کسی انسان کے ساتھ سے بہتر سمجھتے ہیں، ساتھ ہی یہ بات جس مزاحیہ ہرائے میں بھی گئی ہے وہ بات کے وزن کو مزید موثر بنا دیتی ہے، یہ طنز مزاح کی ایک عمدہ مثال ہے۔

”آپ کو عجیب شریک ہوئے جارہے ہیں۔“ حمید نے کہا۔  
”آہ وائیں میرے عزیز خدا نشی تیرے تمام فیروز پروری کی مہفرت کرے کہ انہوں نے مجھے اردو میں لاکر بات بات پر آہ بھرنے پر مجبور کر دیا اور میری اس طرح مٹی پلیدی کہ اردو والے مجھے مولوی شریک ہوئے غلہ بھنے لگے۔“  
یہاں ابن صفی فریدی کی زبانی جاسوسی ناولوں کے اندھا دھند ترجمے کرنے والوں پر طنز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ترجمہ کرنا کوئی برائی نہیں، لیکن اس کی بھی کچھ حدود و قیود مقرر کی گئی ہیں، ان حدود سے تجاوز نہ کرنا چاہیے، ایک معاشرے کے کرداروں کو دوسرے معاشرے میں ڈال کر بنا دیا مشکل کام ہوتا ہے، ترجمہ کرنے والوں نے اس خاص بات کی طرف دھیان دینے بغیر اندھا دھند پیسے کمانے کی لالچ میں ان کرداروں ایسا ہڈا ڈالا کہ ان کا تخلیق کار بھی ان کو نہ پہچان سکے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب اردو میں جاسوسی ناولوں کی روایت صرف فاشی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، اردو میں خالص تفریحی ادب کا فقدان تھا، ان ترجموں میں کچھ ایسا خاص نہیں تھا جو سمجھنے والوں کو راہ راست پر لاتا، بلکہ اس نے تو معاشرتی بگاڑ کو مزید ہوا دی تھی، یہی وجہ تھی کہ کش ناولوں کی بازار میں بھر مار ہو گئی تھی۔

ابن صفی نے اپنے فن کے ذریعہ نہ صرف سمجھنے والوں کو تفریح فراہم کی بلکہ لوگوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی کی، ان کے ناولوں میں طنزیہ اور مزاحیہ ہرائے میں کی گئی باتوں کی چاشنی سیدھا پڑھنے والوں کے دل پر اثر کرتی ہے، لوگوں میں امید اور خوشی کا احساس جگاتی ہے، مایوسی کے عنصر کو کم کرتی ہے۔

یہ ابن صفی کی روشن خیالی اور انسانیت کو اخلاق کا درس دینے کی ایک عمدہ مثال ہے، ابن صفی کے ناولوں کے سر اوراق پر اکثر یہ جملہ بڑھنے کو مل جاتا ہے۔ ”مجھے سمجھنے سے بوجھل محوں کے لیے اکسیر۔“ جس نے بھی یہ جملہ لکھا خوب لکھا، اس سے سو فیصد متعلق ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

مندرجہ بالا اور اس جیسے سیکڑوں اقتباسات، طنزیہ و مزاحیہ اور ہام مقصد جملے آپ کو ہر ناول میں ملیں گے، ابن صفی کا مقصد ہی یہ تھا کہ اپنے ناولوں سے لوگوں کی تربیت کریں، پھر چاہے اس کے لیے ان کو طعنے کا سہارا لینا پڑے یا مزاح کو بنیاد بنا کر اپنی بات کہنا پڑے وہ کہہ جاتے تھے۔

جا بجا ناولوں میں انھوں نے اپنے اس مقصد پر روشنی ڈالی ہے جس کے لیے وہ ناول لکھا کرتے تھے، ایسا قلم کار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے، آہ ابن صفی، اب آپ کے بعد ہم کس کا انتظار کریں، آپ کا منظر دانہ از ایمان اپنے آپ میں یکتا تھا، آپ جیسا کوئی نہیں، اللہ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

ابن صفی - عہد رفتہ سے عہد حاضر تک

ایس ایم حسینی

اردو زبان میں سری ادب کا نام سنتے ہی ذہن کے پردہ پر ابھرے والا جگمگا تا نام ابن صفی کا ہے، ابن صفی وہ پہلے جاسوسی ناول نگار ہیں جنہوں نے جاسوسی ناول کو گونا گوں مسائل سے سے جوڑ کر ایک نئی جہت کا آغاز کیا، انہوں نے

اپنے ناولوں کو اس مقام تک پہنچایا کہ وہ محض تفریحی حوالی اور ہزاری ادب نہ ہو کر ادیبوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔  
تفریح و تعلق کے پیرائے میں زمانے کی وقتی رنگ کو محض اور سماجی و نفسیاتی پہلوؤں کی تصویر کشی کی، یہ الگ بات ہے  
کہ ادب حالیہ دہائیوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا،  
ادیبوں کی نظر میں ابن صفی ہمیشہ اس لئے نکلتے رہے کیونکہ ادیب ان کی تحریروں کی سادگی اور سادہ لوحی کو برداشت  
نہیں کر پاتے ہیں۔

بہت سے لوگوں نے خود تو اس سے نفع اٹھایا اور دوسروں کو سخت سنا کر پڑھنے سے منع کر دیا، ایسے ہی لوگوں کے  
متعلق ابن صفی اپنی ایک کتاب کے انتساب میں کہتے ہیں کہ ”ان لوگوں کے نام جو میری کتابوں کو چھپ چھپ کر  
پڑھتے ہیں اور دوسروں کے لئے نقصان دہ قرار دیتے ہیں۔“

حقیقت میں جاسوسی کا پیشہ قدیم ترین ہے، اپنے ملک و قوم کو مطمئن اور اس کے تحفظ کے لئے حکمران ہمیشہ سے  
جاسوسوں سے کام لیتے آئے ہیں، الف لیلہ کے تعلق سے مشہور ہونے والی شہزاد کی کہانی Apple Three The  
میں جاسوسی عناصر ملتے ہیں اسی طرح اردو ادب میں جاسوسی عناصر ”داستان امیر حمزہ“ میں بھی نظر آتے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جاسوسی ناولوں کی توجہ اور دلچسپی کا باعث بنے اور بیس رام پوری وغیرہ نے کئی  
جاسوسی ناول تحریر کئے، اردو میں جاسوسی ناول کا شاہدہ آغاز رسوا کے ناولوں سے ہوا جس میں ”خونی جورو“ ”بہرام کی  
رہائی“ اور ”خونی شہزادہ“ اہم ناول ہیں۔

قصہ مختصر جاسوسی ناولوں کا آغاز محضوں میں ابن صفی کے ہاتھوں ہوا جو اس کے موحد اور امام ہیں، 28 سال کی عمر  
میں جاسوسی ناول نگاری حیثیت سے مشہور ہونے والے اس ناول نگار نے دوسو پینتالیس (245) ناول لکھے جس میں  
ایک سو پچیس جاسوسی دنیا سریز اور ایک سو بیس عمران سریز کے، ان میں سے کم از کم ستر ناولوں کو سائنس فکشن ناول بھی کہا  
جاسکتا ہے۔

ابن صفی کے حوالے سے بات کی جائے تو آپ ایک ایسے جاسوسی ناول نگار ہیں جن کی کہانیوں میں پلاٹ فنی سطح پر  
مستحکم اور تہ دار ہے، تجسس پیدا کرنے کا ان کا اپنا ایک الگ طریقہ ہے، ان کی تحریروں میں تجسس کی دنیا اس لئے بے قرار  
رہتی ہے کہ قاری جس کو مجرم سمجھ رہا ہوتا ہے وہ مجرم نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسا شخص مجرم ہوتا ہے جسے ہم مقتول کا غیر خواہ سمجھ  
رہے ہوتے ہیں، جبکہ چند ناول اس کے برعکس بھی ہیں، لہذا انہیں دونوں اقسام کی تکمیل کے سبب آخر تک پھا لگانا  
مشکل ہو جاتا ہے کہ مجرم کون ہے؟ اور یہی چیز قاری کو تجسس میں ڈالے رکھتی ہے۔

جاسوسی ادب میں ابن صفی ایک ایسا معتبر ترین نام ہے جن کی مقبولیت کو اردو کا کوئی اور ناول نگار نہیں پہنچ سکا۔  
اظہار اثر، اکرم اللہ ہادی، حارف بارہروی، سراج انور، اور انج اقبال بھی اس میدان میں اترے لیکن جو پڑیرانی  
ابن صفی کو کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نہ مل سکی۔

ابن صفی، ابن صفی، نونہ صفی، نجمہ صفی اور اسی قسم کے جعلی اسماء نے بھی قارئین کو دھوکہ دے کر اپنی دکان چمکانے کی  
کوشش کی لیکن ابن صفی کے سامنے کسی کی پیش نہ چلی۔

ابن صفی کی آفاقی معنویت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اردو ناول کے قارئین کا اتحاد سچ حلقہ نہ اس سے  
قبل پیدا ہوا اور نہ ہی اس کے بعد، ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ان کے ناولوں کے مطالعے  
سے کیا اور بہترین ادیب بن گئے، ایک بڑی تعداد ان افراد کی بھی ہے جنہوں نے صرف ان کے ناول پڑھنے کے لئے  
اردو زبان سیکھی۔

میتھے از غرورے ابن صفی نے اپنی نایاب تحریروں سے اصلاح کی مہیں روشن کیں، جنسی لیٹرچر کے سیلاب پر بند



باعداً جو قاری کے دل و دماغ پر منفی اثرات مرتب کر رہا تھا۔

ابن صفی سماج اور معاشرے میں اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کے قائل اور اخلاقی اقدار کے پاسباں تھے، جس نے انہیں فریدی، حمید، انور، شارق، ایرج، معرب اور عمران اور اس جیسے لاتعداد کردار تخلیق کرنے پر ابھارا، وہ مغربی تہذیب اور وہاں کے آزادانہ ماحول کو ناپسند کرتے تھے، ابن صفی قدیم روایات کو سینے سے لگائے رہے، اور لوگوں سے دقیانوس ہونے کا طعنہ سنتے رہے۔

کرنل فریدی اور عمران نہ تو شراب کو ہاتھ لگانا پسند کرتے ہیں اور نہ ہی صنف مخالف کو حرص و ہوس بھری نظروں سے دیکھتے ہیں، حمید گرچہ عورتوں میں دلچسپی رکھتا ہے لیکن اپنی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کیا، برخلاف انگریزی جاسوس ادب کے، جیسے کہ جیمز بانڈ شراب پیتا ہے اور عورتوں کے سلسلہ میں اس کا کردار آلودہ ہے۔

چونکہ ابن صفی مشرقی اقدار و روایات کے پاسباں تھے اس لئے ان کے ناولوں کے ہیرو اخلاقی اقدار کے پابند ہوتے ہیں، ان کی تحریریں محض اس لئے اہم نہیں کہ وہ کتنے کتنے پوچھل محلوں کے لئے اکسیر ہیں، بلکہ اس لئے کہ وہ ہر عہد کے انتشار و ابتری اور گرد و پیش کی واقعی حالات سے جڑی ہیں۔

ابن صفی کو اس بات کا بہت افسوس ہے کہ انسان آج اپنی ایجادات سے ترقی کے منازل طے تو کر رہا ہے، لیکن وہ اپنے اقدار و روایات سے تہہ بہ تہہ پستیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے، وہ چاند پر تو پہنچ گیا لیکن اپنے معاشرے اور سماج کی پر امن زندگی کے لئے کچھ نہیں کر پایا، حرص و ہوس، خود غرضی، اور لالچ اس کے اندر سرایت کر گئی ہے۔

ابن صفی کا اصلی فن کردار نگاری میں ہے، انہوں نے فریدی، حمید اور عمران جیسے لازوال کرداروں کے ساتھ منفی اور ذیلی کرداروں کو جاندار بنا کر اس میں ایسی جاذبیت پیدا کی جن کو بھلا یا نہیں جاسکتا۔

کرنل فریدی ایک سنجیدہ آدمی ہے جس کا سن قانون کا تحفظ اور اس پر عمل کرنا اور کرنا ہے، کیپٹن حمید ایک ایسا فرد ہے جس کی مکمل شخصیت مزاح میں گم ہوئی ہے، یہ اپنی مزاحیہ باتوں سے قاری کو ہنساتا ہے اور کرنل فریدی کے لئے آسانی پیدا کرتا ہے۔

ابن صفی نے عمران کے نام سے ایک ایسا کردار تخلیق کیا جس کی ظاہری اور باطنی شخصیت تہہ دار اور پراسرار ہے، ایک ایسا جاسوس جو بحیثیت "ایکس ٹو" کام کرتا ہے، جس سے دوسرے ممالک کے خفیہ ادارے اور زیر زمین مجرم بھی بھی دہشت زدہ رہتی ہیں۔

ایکس ٹو کے رول میں عمران ایک سنجیدہ ترین شخص ہے، جس کی صرف آواز سن کر ہی اس کے ماتحت مودب ہو جاتے ہیں اور بالکل ویسا ہی احترام کرتے ہیں جیسا کہ ایک ماتحت اپنے چیف آفیسر کا کرتا ہے، عمران کی شخصیت عمران حماقت کے فلسفہ کا قائل ہے، وہ اپنی اسی حماقت اور مذاق مذاق میں اپنا مقصد پورا کر لیتا ہے، وہ خوش مزاج بھی ہے اور خوفناک حد تک بھیانک بھی، دراصل اس کردار میں فریدی اور حمید دونوں سما گئے ہیں۔

منفی کرداروں میں تمیریا، سنگ بنی، الفانسی، جبر اللہ شاستری، جابر، علامہ و شمشاک، ہمبک دی گریٹ بڑی اہمیت کے حامل ہیں، تمیریا اور سنگ بنی دونوں کردار کی اہم خصوصیات کے حامل ہیں، تمیریا زیرو لینڈ کی سربراہ ہے، اور سنگ بنی بدنام زمانہ چینی مفروز جس نے حکومت چین کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تھی اور تاناکامی کی صورت میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔

ابن صفی نے اپنے جھیل سے "زیرو لینڈ" نامی ایسے ملک کا تصور پیش کیا جو یوں تو بہت ترقی یافتہ ہے لیکن دنیا کے کسی بھی نقشہ پر اس کا وجود نہیں، اس کے باشندے ترقی اور ایجادات کے ذریعے پوری دنیا پر قابض ہونا چاہتے ہیں، یہاں ایسے پرندے پائے جاتے ہیں جن کی آنکھوں میں کیمرہ فٹ ہوتا ہے، ایسی اڈون ٹشریاں استعمال کرتے ہیں جسے

دوسرے ممالک کے لوگ راڈار سسٹمز پر دیکھ نہیں پاتے اور دھوکے میں ایلین کچھ بیٹھتے ہیں، زید ولینڈ والے ایسا آلہ بھی رکھتے ہیں جو گولیوں کا رخ تک بدل کر رکھ دیتا ہے۔

ابن مثنیٰ نے اپنے زمانے کے حساب سے الیکٹرونکس جیسی نئی چیز متعارف کرائی جو ہر چیز کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے، لیزر گن یا الیکٹرونکس جیسی چیز ابن مثنیٰ کے ناولوں میں اس وقت دکھائی دیتی ہے جب ان کا مکمل وجود نہیں ہوا تھا یعنی یہ سب چیزیں اپنے تجرباتی مراحل میں تھیں۔

ابن مثنیٰ کے کرداروں میں اپنی بیوی سے نالائک محکم قاسم نظر آتا ہے، زندگی سے اکتایا ہوا لیکن ذہانت سے بھرپور اور ہے، علاوہ ازیں فیاض، جوزف، صفدر، چوہان، جعفری، جولیا، بنکسن، ظفر الملک، تنویر، سلیمان، رشیدہ وغیرہ جیسے کرداروں نے بھی ان کے ناولوں کو سر بلندی عطا کی۔

ابن مثنیٰ سبزی ادب میں قدم رکھنے سے قبل ظفر فرغان، سگی سولجر، عقرب بہارستانی، اور برکاش سکینہ کے نام سے کافی سراپے کئے تھے، اور آپ نے شاعری میں اسرار ناروی کے نام سے بھی نام پیدا کیا تھا، لیکن سبزی ادب ان تمام چیزوں پر غالب آئی، اسی بنا پر آپ کے استاد عبدالحق ہمیشہ شاکی رہتے، البتہ قاری ابن مثنیٰ کی تمام تخلیقات میں ظفر فرغان، سگی سولجر، اور اسرار ناروی کا عکس صاف محسوس کر سکتے ہیں۔

اسرار احمد ابن مثنیٰ کی پیدائش اپریل 1928 کو اتر پردیش کے ایک شہر الہ آباد کے قصبہ تارہ میں ہوئی، اور وہ 26 جولائی 1980 کو کراچی پاکستان میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

ابن مثنیٰ اپنے قارئین کو ادب کے ذریعہ تخریب سے تعمیر کی طرف ہجرت کی تلقین کرتے رہے تاکہ جرائم سے پاک سماج کی تشکیل ہو، ان کی نگاہ ایک ادیب کی حیثیت سے سماج کی ہر چھوٹی بڑی اخلاقی برائیوں پر مبنی، انہوں نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر نشہ آور اشیاء، جنسی بے راہ روی کے نتیجے میں ہونے والے جرائم، نفسیاتی جرائم، اقتصادی جرائم، وطن فروشی، اور غداری کے ساتھ بے شمار موضوعات کو اپنے ناولوں میں سمیٹا۔

اپنے ایک پتھر میں خود کہتے ہیں: ”یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سکھے، میں ہر حال میں شر پر خیر کا پرچم لہراتا چاہتا ہوں، میں باطل کو حق کے سامنے سر بلند نہیں دکھانا چاہتا۔“

ابن مثنیٰ کے یہاں ماضی پرستی ممنوع ہے وہ حال سے مستقبل کو مربوط کرنے کی کوشش کرتے رہے، ان کی تحریروں میں مستقبل بنی واضح طور پر نظر آتی ہے، غرض یہ کہ جاسوسی ادب میں ابن مثنیٰ کی حیثیت ایک Legend کی ہے، انسان ایک نازک اور کمزور مخلوق ہے جسے ذرا سی بے توجہی نفسیاتی الجھنوں کا شکار کر دیتی ہے، انہوں نے انہی الجھنوں کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کی اور اپنے ناولوں میں مختلف انداز میں قاری کے سامنے رکھا، الحاصل نفسیات پر نگہری اور باریک نظر ہی ان کے ناولوں کو نگہری بلندی عطا کرتی ہے۔

## نادر عابی خان غوری

نادر نے نصیر آباد پہنچ کر سکون کا سانس لیا وہ اپنا سب کچھ بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا اپنی بدنامیاں، اپنی دولت، اپنا رعب، سب کچھ پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اب وہ پیچھے مڑ کر دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

وہ رام گڑھ سے آیا تھا رام گڑھ کے نادر سے تو وہ لوگ بھی واقف ہوتے جاتے تھے جن کا قیام وہاں عارضی ہوتا تھا نادر رام گڑھ کا زلزلہ تھا لوگ اس سے ڈرتے تھے چدر نادر کی موجودگی کا شبہ بھی ہو جاتا دھر سے مالدار لوگوں کا گزر کم ہی



ہوتا تھا رام گڑھ کا مالدار طبقہ خصوصیت سے اسے ہذا سمجھتا تھا۔

نادر کون تھا۔ ایک تعلیم یافتہ ہدمعاش جو محض اپنی فطری جھلاہٹ کی وجہ سے ہدمعاش بن گیا تھا وہ کافی ذہین اور باصلاحیت آدمی تھا اس لیے قانون کی ذمہ سے بچتا ہی رہتا تھا مقامی حکام سے بھی اس نے نہیں بگاڑی تھی اور ان کی خدمت ہی کرتا رہتا تھا۔ لہذا اسے چھوٹ لگتی تھی۔ ویسے وہ اس قسم کے حالات ہی نہیں پیدا ہونے دیتا تھا کہ مقامی حکام کی تو جہاں کی طرف مہذول ہوتی وہ علامہ لوگوں کو لوٹ لیتا تھا لیکن ایسے حالات پیدا ہونے کے بعد کہ وہ کسی سے فریاد تک نہ کر سکتے۔

اسی نادر کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب آیا اور اس انقلاب کا بانی وعظ ہوا تھا جو آج بھی اس کے کالوں میں گونج رہا تھا۔

”اور جب وہ فاتح کی حیثیت سے کے میں داخل ہوئے تو انہوں نے ان لوگوں سے انتقام نہیں لیا جو ان پر اوچھڑیاں بھینکتے تھے، ان کی راہ میں کانٹے بچھاتے تھے۔ ان پر ہتھیار بھینکتے تھے ان تمام لوگوں کے لئے مکی ہوئی معافی تھی جنہوں نے انہیں ہجرت پر مجبور کیا۔“

وہ انقلاب اس وقت ہوا تھا جب وہ ایک دشمن سے انتقام لینے جا رہا تھا اور وہ یقیناً اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا وہ اس رات اسی ارادے سے نکلا تھا لیکن راہ میں ایک واعظ کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا اسے مذہب سے ڈرہ برابر بھی لگاؤ نہیں تھا اور وہ بھی مذہبی جلسوں کی طرف رخ بھی نہیں کرتا تھا واعظ تقریر کرنے سے پہلے انتم پڑھ رہا تھا اور پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ نادر بے اختیار اس کی طرف مچپتا چلا گیا۔

وہ جلسہ گاہ کے ایک گوشے میں جا بیٹھا۔

انتم ختم ہونے پر تقریر شروع ہوئی اور نادر بس بونہی بیٹھا رہ گیا۔

تقریر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر مبنی نادر کا سر خود بخود جھٹکا چلا گیا اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے واعظ کا ایک ایک لفظ کالوں سے گزر کر اس کی روح میں تکمیل ہو رہا ہو اور پھر جب وہ اس موضوع پر آیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کوئی منگنا نہ کارروائی نہیں کی تو نادر کی حالت غیر ہو گئی۔

نادر نے یہ سب کچھ سنا بچوں کی طرح رو پڑا اس کا بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ کسی مجمع میں رو رہا ہے شاید وہ زندگی میں پہلی بار اس طرح رو رہا تھا رو تا تو بڑی بات بھی رونے کا خیال بھی اس کے ذہن کے ڈھکے چھپے گوشوں میں نہیں جھانکتا تھا کیونکہ اسے دوسروں کی گرہ و داری بھی متاثر نہیں کر سکتی تھی۔

مگر وہی نادر اس وقت بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

نادر کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں لیکن اس کے قدم گھر ہی کی طرف اٹھنے لگے وہ ایک بڑے اور خوبصورت مکان میں رہتا تھا اس کے پاس کار بھی تھی اور بظاہر رام گڑھ کا ایک خوشحال بروکرتھا لیکن حقیقتاً سمور کی دلالی پرانے نام کی دولت سمیٹنے کے ذرائع دوسرے ہی تھے۔ مثلاً غنیمت کی ناچاز تھارت، تمار بازی اور ٹریب دی وہ ایک قائل بھی تھا اتنا چالاک کہ بحیثیت قائل اس کا نام بھی نہیں لیا جاسکتا تھا۔

نادر نے ایک بے گناہ کا فیصلہ جیل سے لے کر عالم میں کیا تھا لیکن نشہ اترنے کے بعد بھی وہ اپنے فیصلے پر قائم رہا۔

اس نے سب کچھ چھوڑ دیا اس صراج کا پانی پینا بھی اسے اب گوارا نہ تھا جو اس وقت اس کے گھر میں موجود بھی جب تک وہ اس گھر میں ٹھہرا سڑک پر لگے ہوئے قیل سے پانی پیتا رہا اور اس وقت تک بھوکا ہی رہا جب تک کہ اپنے ایک شریف شناسا سے کچھ روپے قرض نہ لینے نادر کو وہ لباس کاٹ رہا تھا جو پہلے سے اس کے جسم پر موجود تھا اس نے قرض کے روپیوں میں سے اپنے لئے معمولی قسم کے ریڈی میڈ کپڑے خریدے اس طرح اس شخص سے نجات پائی جو پرانے لباس کی وجہ سے اس کی روح پر طاری تھی۔

☆☆☆☆

تادور کے لئے وہ زندگی بالکل نئی تھی قدم قدم پر دشواریاں سامنے آکھڑی ہوتیں بھانک کے قریب ملا دوسوں کے لئے تین چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں انہیں میں سے ایک میں تادور کو بھی رات بسر کرنی ہوتی تھی وہ زمین پر درزی وال کر لیتا اور اس وقت تک کروٹیں بدلتا رہتا جب تک کہ نیند جسمانی تکلیف پر حاوی نہ ہو جاتی ان دنوں اس کے اندر نیکی اور ہمدردی میں بڑی شدید جنگ ہو رہی تھی مگر وہ سوچتا کہ اس سے کتنی بڑی حماقت سرزد ہوگی ہے پیش کی زندگی پر لات مار کر یہاں اس سڑی ہوئی کوٹھری میں لوٹیں لگا رہا ہوں اور بھی اس کی قوت ارادی کسی خنڈی بچے کی طرح ان خیالات سے لپٹ جاتی اور ایسے خیالات دم ہی توڑ دیتے جن کی بنا پر اس کے ڈرگما جانے کے امکانات پیدا ہو سکتے تھے۔

ایسے مواقع پر اسے خود بھی اپنی روح کی پاکیزگی کا احساس ہونے لگتا ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی گندی اور کھٹن پیدا کرنے والی کوٹھری سے نکل کر مٹی ہو گیا ہو پیسے اس کا جسم تو اس وقت ایک گندی سی اور تنگ و تاریک کوٹھری میں مقید تھا لیکن روح بیکراں و مستحق کی نورانی لٹاؤں میں پرواز کر رہی تھی۔

☆☆☆☆

سلو پانے ٹھنڈی سانس لی "ارے بھرتھ نے بکسٹری نہیں لی۔"

"میں اپنی موجودہ حیثیت سے آگے نہیں بڑھنا چاہتا مادام۔"

"کیا مطلب....."

"مجھے وہی ہاسی روٹی کا ٹکڑا چاہیے جو روزانہ ملتا ہے۔"

"مجھے شرمندہ نہ کرو تادور۔"

"ہرگز نہیں مادام میں طفر نہیں کر رہا میرے مطالبے میں خلوص ہے۔"

"تم واقعی بہت شریف اور اونچے آدمی ہو تادور میں یقین نہیں کر سکتی کہ کبھی برے بھی رہے ہو گے آدمی اتنی جلدی خود کو نہیں بدل سکتا۔"

"میں آپ سے متفق نہیں ہوں مادام وہ آدمی جو دریاؤں کے رخ بدل سکتا ہو، پہاڑوں کے جگر چیر سکتا ہو کیا وہ خود کو نہیں بدل سکتا۔"

"ہاں الفاظ میں تو وہ بہت کچھ کر سکتا ہے مگر....."

"اگر وہ سوچ سکتا ہے تو کر بھی سکتا ہے مادام۔"

☆☆☆☆

تادور اب ایک شریف آدمی کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے مگر اب وہ سمجھا نہیں ہے ایک شریف عورت بھی اس کے ساتھ ہے سلو پانے تادور کی ازدواجی زندگی بے حد خوشگوار ہے اور اب وہ ماضی میں جھانکنا بھی پسند نہیں کرتے۔

تادور کا خیال ہے کہ ایک نہ ایک دن ہر برے آدمی کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ وہ فلفلہ راہوں پر آکھلا تھا اب اگر اس میں اتنی ہمت ہوئی کہ وہ اسی راہ پر واپسی کے لئے مڑ جائے تو دنیا اسے وہ راہ مل جاتی ہے جس سے بھگ کر فلفلہ راستے پر چلا نکلا تھا لیکن اگر اس نے یہ سوچا کہ اب واپسی کی رحمت کون گوارا کرے ہو سکتا ہے یہی راہ آگے جا کر اس راہ سے مل جائے جس پر اسے سفر جاری رکھنا چاہیے تھا تو وہ ہمیشہ دھوکے ہی میں رہے گا اور وہ راہ آہستہ آہستہ اسے اندھیروں میں دھکیلیں رہے گی۔



## ابن صفی اور شاعری، جیسے چاند اور چاندنی خوشی عابدی

حقیقت یہ ہے کہ ”کسی بھی انسان کو اس وقت تک کسی کارِ خالص کی ذمہ داری نہیں دی جاسکتی جب تک وہ اُس کام سے متعلق مکمل جانکاری نہ رکھتا ہو.....!“

اسی لئے جب سن 1948ء میں عباس حسینی نے ماہنامہ بکھت کا آغاز کیا تو شعبہ نثر کا مگر ان ابن سعید (پروفیسر مجاور حسین رضوی) کو بنایا جبکہ شعبہ شاعری ابن صفی کے ذمہ رکھا کیونکہ وہ ابن صفی صاحب کو بہت قریب سے جانتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ ابن صفی نہ صرف ایک بہترین شاعر ہیں بلکہ شاعری کے سبھی پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

اس ذمہ داری کے باوجود ابن صفی صاحب نے شاعری پر ہی تکیہ نہیں کیا بلکہ رفتہ رفتہ وہ مختلف فلمی ناموں سے طنز و مزاح اور مختصر کہانیاں بھی لکھنے لگے رہے، ان فلمی ناموں میں طنز لہ فرغان، سگی سو بجر اور عقرب بہارستانی جیسے اچھوتے نام شامل تھے جو ان کی شاعرانہ طبیعت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

اور پھر ابن صفی صاحب کی زندگی میں ایک ایسا موڑ بھی آیا جب وہ شاعری کے ”روشن ہیولی“ کو چھوڑ کر نثر کی ”کالی کھکشاں“ کی جانب عازم سفر ہوئے اور سری ادب کے ”پراسرار موجد“ بنے۔

گو کہ اب ان کا قلم مجرموں کی خطرناک حرکتوں، حالات کے ستائے لوگوں کی پریشانیوں اور جاسوس کی مشقتوں کو تحریر کرتا تھا پھر بھی قارئین کو ان میں ہر جگہ ان کے شاعرانہ ذوق کی جھلک ملتی رہی۔

جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کے عنوانات کو ہی لے لیجیے، ہر نام اپنے انداز میں ایک عجیب سی کشش رکھتا ہے کہ صرف عنوان پڑھ کر ہی آپ کا دل چاہنے لگے گا کہ آپ وہ ناول پڑھیں۔

جب میں نے ابن صفی کو پڑھنا شروع کیا تو اس وقت کی کتابوں سے پڑھا جب ان کے آخری صفحات پر گزشتہ ناولوں کی فہرست ہوا کرتی تھی اور وہ نام اتنے خوب صورت لگتے تھے کہ بار بار فہرست پڑھنا بھی اچھا لگتا تھا اور پھر ان ناموں سے متعلق سوچنا کہ کہانی کیا ہو سکتی ہے یہ بھی ایک مشغلہ تھا۔

یوں تو سب ہی عنوان زبردست ہیں لیکن میرا پسندیدہ عنوان ”معصوم درندہ“ ہے اور جب وہ ناول پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس سے بہتر اس ناول کا نام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اس کے بعد جس عنوان میں سب سے زیادہ نفسی محسوس ہوئی وہ ہے ”گیت اور خون“ اس کے علاوہ ڈیڑھ منٹ الے، خیر اندیش، خوشبو کا حملہ، مہکتے محافظ، لاش گاتی رہی، رات کا شہزادہ، ”صحرائی دیوانہ، ہولناک ویرانے، راقص کاغذ، سبھی ہوئی لڑکی، زمین کے بادل، پیاسا سمندر، ٹھنڈا سورج، ٹھنڈی آگ، زہریلا آدمی، شیطان کی محبوبہ، ظلمات کا دیوتا، پتھر کا آدمی، لرزتی لیکریں، متحرک دھاریاں، فرشتے کا دشمن، بیابانوں کی تلاش، لاش کا بلاؤ اور فرہاد 59 وغیرہ۔ یہ اور ان جیسے بہت سے نام، کہاں تک لکھا جائے، ایک سیریز اور بھی جس کے ناموں نے مجھے بہت متاثر کیا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے شاعرانہ ناموں کی وجہ سے ہی اس سیریز کو پڑھنے کے لئے بے چین رہی۔

جس طرح اس سیریز کے چاروں ناول کہانی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اسی طرح اس کے ناموں میں بھی ایک شاعرانہ ربط محسوس ہوتا ہے، ایسا شاعرانہ ربط شاید ہی کسی دوسرے مصنف کی کہانیوں میں ملے، پر چھائییں، سائے، اور ہمزاد کے مترادفات نے اس سلسلہ کے ناموں کو ایک اچھوتا سا شاعرانہ رنگ دے دیدیا ہے، آپ خود دیکھیں۔

شکاری پر چھائیاں  
پر چھائیوں کے حملے

ان چاروں ناولوں کے نام خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر موجود کہانی کے بہترین عکاس بھی ہیں اور اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ ابن صفی صاحب بنیادی طور پر شاعر تھے، ایک چیلنج کی صورت نثر (خاص کر سبزی ادب) کی طرف آئے تو ان کا شاعرانہ مزاج نثر میں بھی جھل مل کر رہا۔  
کپٹین حمید کی شاعرانہ تشبیہات، جمن مراٹھی کی بریکل شاعری، کپٹن ناشاد کی نوآموز شاعری اور مختلف کرداروں کے شاعرانہ جملے دراصل ان کے اندر موجود شاعر کے قلم کا اعجاز ہے۔

اکثر کرداروں کے منہ سے نکلے ہوئے جملے اتنے برجستہ ہوتے ہیں کہ گفتگو کے دوران فی البدیہہ گرہ کا تاثر پیدا کرتے ہیں، مثال کے طور پر ان کے یہ مکالمے اپنا جواب نہیں رکھتے، کسی شاعر کے اسٹائل کی مثال اس طرح دینی دے سکتا ہے جو خود بھی بنیادی طور پر شاعر ہوا اور شاعری کی باریکیوں کو بخوبی سمجھتا ہو۔  
”میں یقین نہیں کر سکتا کہ تم اپنی یادداشت کھو چکے ہو۔“

”یہ آئیڈیا بھی پرانا ہو چکا ہے..... کسی فلمیں بن چکی ہیں یادداشت کھو بیٹھے کے موضوع پر۔“  
”بڑی مشکلات میں سمٹنے والے ہو، سنبھل جاؤ۔“ فیاض آنکھیں نکال کر بولا۔  
”تم زمین میں دھنسنے والے ہو..... نکل جاؤ.....!“ عمران نے آغا حشر اسٹائل میں گرہ لگائی۔

ناول: دلچسپ حادثہ

”کیا بک رہے ہو.....؟ تم نے سنا نہیں..... یہ ایکس ٹوکا حکم ہے۔“  
”جولیا یہ عشق ٹوکا موسم ہے“

ناول: دھوکے کی تحریر

تنویر کا یہ جملہ اعتبار برجستہ اور ہم قافیہ ہے کہ بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے، کرداروں کی فطرت سے مطابقت رکھنے والے جملے اور مکالموں سے ابن صفی کے ناول بھری پڑے ہیں، بالکل اس طرح جس طرح یہ مکالمے تنویر کے مزاج کے مطابق ہیں۔

عمران کو دیکھ کر خالص کلاسیکی انداز میں کراہنے لگا۔

”آہ چرخ بگ رنار کو میری صحت ایک آنکھ نہ بھائی،

تقدیر نے حادثات سے چغلی کھائی،

اور اس بھوت کے آگے کچھ بن نہ آئی۔“

”میں تمہارے لئے توبہ انصوح لایا ہوں۔“ عمران نے آبدیدہ ہو کر کہا۔

”شکریہ..... شکریہ..... جناب..... پڑھنے کو کچھ بھی نہیں رہا۔“

ناول: سبز لہو

جسمیں کے جملے جگہ جگہ مضمون کی خوبصورتی بڑھاتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے اکثر قارئین اس دلچسپ انداز گفتگو کو اپنا لیتے ہیں، انہوں نے اپنے ناولوں سے عام آدمی کے طرز گفتگو کو بہتر بنادیا، یہ اقتباس دیکھیے، مصنف نے نثر میں شاعری کی ہے۔

ایک دن اُسے یاد آیا کہ اُس کے دادا کے کھاڑ خانے میں بھانت بھانت کی چیزوں کے علاوہ ایک دور بین بھی موجود ہے، اُس نے اُسے نکال کر صفائی کرنے کے بعد بہت احتیاط سے سوٹ کیس میں رکھ دیا اور منتظر رہا کہ دھوکے کی تصویر پھر کب سامنے والے پہاڑ کی چوٹی پر نمودار ہوتی ہے۔



سارا سارا دن ٹنگی لگائے چوٹی کی طرف دیکھتا رہتا، بھی سوچتا وہ جتنا کوئی ہے جتن روح ہے اور اسے رائیڈ رہ کر ڈکے بعض کردار یاد آئے لگتے جو عالم ارواح سے عالم اجسام میں آکر اپنے متعلقین کو اپنی ہند اسرار جھلکیاں دکھایا کرتے تھے اور اسے وہ عورت بھی یاد آتی جو ہزاروں سال سے زندہ اور جوان تھی، وہ جو اپنے محبوب کی تلاش میں ہر زمانے میں بھٹکتی بھرتی تھی۔

آج جب ہے وہ عورتیں کے مرفوے چوٹی سے اٹھنے شروع ہوئے، اور لوگ تو گھروں سے نکل کر اسی سمت دوڑ پڑے لیکن راجیل وہیں ایک درخت کے سنے سے ٹک کر کھڑا ہو گیا، دور بین اس کے ہاتھوں میں تھی، جب وہ عورتیں کے مرفوے ستار بھائی ہوئی عورت کے ہونے کی شکل اختیار کر چکے تو اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دور بین اوپر اٹھائی، اس کے ٹکسے ایلو جھٹ کے اور وہ عورتیں کے ہونے پر نظر جمادی۔

بل کھائی ہوئی وہ عورتیں کی وحندلی چادر میں کوئی متحرک چیز دکھائی دی، دل کی دھڑکن بڑھ گئی، ستار ہی تھا، جی جی کا ستار، اس عورت کی شکل وحندلی تھی اور وہ عورتیں کے مرفوے اس ترحیب کے ساتھ اس کے گرد پھلتے چلے گئے تھے کہ ایک بڑی تصویر بنی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی پر چھائیں کے پیش منظر میں بیٹھی ستار بھاری ہو۔

ٹھنڈک کے باوجود بھی راجیل کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئیں، دل اسے اپنی ٹھونڈی میں دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، دوسری بار اس نے دور بین اٹھائی اور پھر اسے دیکھنے لگا، زبان خشک ہو کر تالو سے لگ گئی تھی، وہ اسے دیکھتا رہا حتیٰ کہ آہستہ آہستہ وہ عورتیں کی تصویر لٹھال میں ٹھیکس ہو گئی، اب چوٹی پر کچھ نہیں تھا لیکن راجیل دور بین آنکھوں سے ہی لگائے رہا۔

ناول: شوگر بینک  
کتنی خوب صورت عکاسی ہے اس منظر میں، ناول کے آغاز سے کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ کہاں آئے جہاں کر ایک خطرناک "لفظی ہنگامہ" برپا کرے گی، ابن صلی صاحب کے قلم کی یہی جاشنی ہمیں آج تک سحر سے آزاد نہیں ہونے دیتی، جب جب ناول کا یہ اقتباس پڑھا، ذہن میں ایک الگ ہی تصویر ابھر کر آئی، نثر میں شاعری انہی کا کمال ہے۔

www.urdubooks.com

نثر میں شاعری کی ایک اور مثال اس منظر میں دیکھیے۔  
جمنسن کان پر ہاتھ کر دیر دیر رہنے لگا۔  
"چل چلیے دنیا دی اس نکلے جتنے سالانہ سالے دا ہاپ ہوئے۔"  
"چپ رہو دور نہ گلا گھوٹ دوں گا۔" عمران فرمایا۔  
"اب گالے بھی نہ دیتے گا۔"  
"اگر اسے متاثر ہی کرنا چاہے ہو تو ہیر وارث شاہ سناؤ..... مجھے بھی پسند ہے۔"  
"تھوڑی سی یاد ہے۔"  
"کچھ بھی کسی۔"

جمنسن نے مسجدی سے ہیر وارث شاہ شروع کی تھی، انہی ماحول کا سنا، لٹھالوں میں رہی ہی خوشبو میں تاروں کی چھاؤں اور ہیر وارث شاہ کی لہک، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان سے لٹھالوں کی بارش ہو رہی ہو، عجیب سی پاکیزگی کا حساس ہوتا تھا۔

جمنسن خاموش ہوا تو ایسا لگا جیسے زمین کی گردش ختم ہو، میر یا نام بخود تھی، تھوڑی دیر بعد مسجدی سے بولی۔  
معلوم میری سچ میں نہیں آیا لیکن تمہاری آواز بہت اچھی ہے، نے میں اجنبیت نہیں تھی لیکن میں نہ جانے کیا محسوس کر رہی ہوں۔"

پوائنٹ نمبر بارہ

اس منظر میں نہ تو ہیر وارث شاہ کے بول لکھے ہوئے ہیں اور نہ ہی ہر کسی نے یہ منظر چاندنی رات کے سنائے میں پڑھا ہوگا لیکن جس وقت بھی پڑھا گیا ہوگا قاری نے خود کو چاندنی رات کے لسوں میں سنائے میں پھیلی خوشبوؤں کے درمیان پایا ہوگا اور یہی شاعرانہ اعجاز ان کے ناولوں کی خوبی ہے، اگر کوئی اس منظر سے پڑھنا شروع کرے تو قیاس بھی نہیں کر سکتا کہ کچھ دیر پہلے یہ لوگ دشمن کے ہتھیار تباہ کر کے تھپ تھپا کر ادھر آئے ہیں۔

کئی جگہ کرداروں سے اشعار اس طرح کہلائے گئے کہ ان کی پہچان بھی ظاہر نہ ہو اور جس کو پہچاننا ضروری ہے وہ پہچان بھی لے، ایک ایسا شعر عمران سے کہلوانا کہ وہ فون پر اپنا نام بتائے بنا دوسری طرف سے پہچان لیا گیا، جیسے یہ منظر۔

”کون.....؟“ مٹلی غرائی۔

”جب سے پیدا ہوا ہوں ملک و قوم کے کسی نہ کسی طرح کا ام آوارہ ہوں..... لہذا ایک مدد فوری عرض ہے۔“

”حق تو کد طرح ایک ایک کی شکل تک رہا ہوں

بکسی ادھر بھی ادھر نہ جانے کیوں بھٹک رہا ہوں

”اوہ کبھی۔“ وہ دانت پیس کر بولی۔ ”تو یہ تم ہو۔“

ناول: غولی ننگار

یہ بھی دیکھتے یہاں ابن صلی صاحب نے اس موڈ کا تذکرہ بھی کیا جس میں شعراء کا عقل شعر کہنے لگتا ہے اور ساتھ میں ایک نصیحت بھی۔

”دس نصیحت میں پھنسا دیا تم نے..... اور پھر یہ نصیحت بھی نہ معلوم ہوا اگر تم روز ملتے رہو۔“

”یہی تو نصیحت ہے۔“

”اوہ تو یہ نصیحت ہے تمہارے لئے؟“

”بالکل ہے..... اسی لیے میں نے شاعری شروع کر دی ہے، کچھ لڑکیاں مجھے گھورتی ہوئی قریب سے گزری تھیں، کہا ہے۔“

اے دہرہ جبینوں مجھے اس طرح نہ دیکھو

میں ہوں تو تماشا مگر اتنا بھی نہیں ہوں

”اوہ تو تم بھی محسوس کر سکتے ہو کہ تمہیں کوئی گھور رہا ہے؟“

”جیسی گھورے جائیں گے تو ضرور محسوس کریں گے، ان میں مجھے ایک چھوٹے قد کی لڑکی بہت اچھی لگی تھی جو قالین کا ڈن پہنے بغیر گھر سے باہر نکلتی، میرا خیال ہے کہ تم بھی اپنے چست لباس پر گاڈن پہنے بغیر باہر نہ نکلا کرو۔“

ناول: بیباکوں کی تلاش

یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے خوب صورت اقتباس ان کی نثر کو دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں، یہ ان کا اپنے فن پر عبور تھا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ عین لطرت کے مطابق تھا، ایک ایک بات، ایک ایک جملہ دل میں اتر جاتا ہے۔

خیر آگے دیکھتے ان شاعروں کے بارے میں کتنے انوکھے اعجاز سے بیان کیا ہے جو شعر تو کہہ لیتے ہیں لیکن اشعار کی تخلیق اور بحر کے بارے میں معلومات نہیں رکھتے۔

سار جنت ناشاد ایک غزل کہہ رہا تھا، سامنے رکے ہوئے کافہ پر اس نے بہت سے توانی لکھ رکھے تھے، ان قالین میں ایک ایک مصرع کہہ کر گزر رہا تھا، اچانک ایک مصرع میں اسے گاڑی رکتی ہوئی سی محسوس ہونے لگی، اس نے اس کی تخلیق شروع کر دی۔



”علم جاناں..... اے کھٹ کھٹ..... لہو بن کر..... اے کھٹ کھٹ..... ہاں..... ٹھیک تو ہے..... علم جاناں لہو بن کر  
 لک آکھوں سے کچھ یوں بھی..... اے کھٹ کھٹ..... اے کھٹ کھٹ..... اے کھٹ کھٹ..... اے کھٹ کھٹ۔“

ناول: لڑکیوں کا جزیروہ  
 بہت سے ایسے نوآموز شاعر ہیں جو اسی طرح شعر کہتے ہیں لیکن یہ باتیں ایک شاعری لکھ سکتا ہے عام آدمی یہ  
 بکھیرے کیا جانے۔

یہ اقتباس اور یہ شعر بھی دیکھیں، شعر و شاعری سے متعلق پوسٹ میں اس عجیب و غریب شعر کا تذکرہ نہ ہو تو ادھر اور اپن  
 محسوس ہوگا۔

”لیڈی جہانگیر!.....“ عمران نے ایک طویل سانس لے کر مغموم لہجے میں کہا۔ ”میں بھی دریافت کرنے آیا ہوں  
 کہ آج کل وہ کیوں نہیں آتیں.....؟“

”مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہوں گے۔“ منیجر سکرایا۔  
 ”آہ۔“

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

”کیا نہیں گے آپ؟“ منیجر نے کھنٹی کے شن پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

خون جگر کے علاوہ آج کل کچھ اور نہیں پیتا

”اودہ تو آج کل آپ شاعر ہو رہے ہیں۔“

”ہاں..... آں.....“

گریاں پھاڑتا ہے، تنگ، جب دیوانہ آتا ہے

خدا جانے، کہاں سے، کس طرح، پروانہ، دیوانہ، مستانہ آتا ہے

”دوسرا مصرعہ تو کچھ بڑھا ہوا سا معلوم ہوتا ہے!“

”ہاں میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں، بے خودی میں مصرعہ بڑھ گیا ہوگا، جب سے میسی بیڈ فورڈ کے متعلق اخبارات

میں پڑھا ہے بھولی بھری یادیں تازہ ہو گئیں ہیں۔“

ناول: قبر اور خنجر

جب پہلی دوسری باری یہ ناول پڑھا تھا تو اس میں صرف مزاح ہی نظر آیا تھا، لیکن ابن صفی صاحب کے بارے میں

جاننے کے بعد جب بھی یہ ناول پڑھا تو اس اقتباس میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے انہوں نے اپنے محسوسات رقم کر

دے ہیں کہ قلم نشہ لکھ رہا ہے لیکن ذہن شاعری کی طرف مائل ہے، اور یہ کوئی اچھے کی بات بھی نہیں۔

دوسری چیز اس میں جو خاص ہے وہ یہ کہ دو الگ الگ مصرعوں کو اس طرح ایک دوسرے میں ملا دینا کہ کچھ نہ کچھ ربط

بھی محسوس ہو یہ انہیں کا کمال تھا، اسی کو پڑھ کر ہم کچھ دوستوں کے ساتھ شاعری کی محفل میں اس طرح اشعار میں پیوند

کاری کیا کرتے۔

مضمون کے اس موڈ پر یہ کہنا ضروری ہے کہ میرا موضوع ایسا ہے کہ ناول کے حوالوں کے بغیر اپنی بات کو سمجھانا

مشکل ہے، آپ لوگ ان سے محظوظ نا بھی ہوں گے اور پھر دوبارہ ناولوں کو اس نظریہ سے پڑھنا بھی چاہیں گے۔

یہ مناظر دیکھیے۔

منظر نمبر (۱)

”وہ آدمی کون تھا اور ہائی ٹس؟“ جنسن نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔“

”دیکھو اب شامت کہاں لے جائے؟“

”تم عورتوں کے سے انداز میں کیوں گفتگو کرنے لگے ہو؟“

”اے چھوڑے جناب والا، میں بہت سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کرنے لگا ہوں۔“

”کس مسئلے پر؟“

”اگر آپ نے اس سر پرچے آدمی کا ساتھ نہ چھوڑا۔“

”خاموش.....!“ ظفر آہستہ سے بولا۔ ”اگر تم نے کسی کا نام لیا تو گلا گھونٹ دوں گا۔“

”میں کسی پردہ نشین خاتون کا نام لینے نہیں جا رہا تھا کہ آپ اس طرح برا فروختہ ہو گئے۔“

”برا فروختہ کیا؟“

”مطلب یہ کہ آپ سے باہر ہو گئے، خیر اے بھی چھوڑیے، اس بات پر ایک شعر یاد آ گیا۔“

داور حشر میرا نامہ اعمال نہ دیکھ

اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

منظر نمبر (۲)

دوسری صبح وہ فریدی کے بچھوڑنے پر ہی بیدار ہوا، خانم بھی بیدار ہو چکی تھی اور وہ اس وقت رات سے زیادہ حسین

لگ رہی تھی، جمیداشتے ہی گفتگو نہ لگا۔

شب وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ لے دوست

تیرے جمال کی دوشیز کی نکھر آئی

فریدی اس پر چراغ پا ہو گیا لیکن جمید گفتگو نہ کیا، پھر بولا۔

”آپ خفا کیوں ہوتے ہیں؟ جن صاحب کا یہ شعر ہے اب وہ بھی عورتوں سے عشق کرنے لگے ہیں، خدا آپ کو بھی

توفیق عطا فرمائے۔“

”یکو اس مت کرو۔“

www.urduubooks.com

ناول: تیسرا شعلہ

منظر نمبر (۳)

لیکن یہ نمائش اپنی نوعیت کی انوکھی نمائش تھی، یہاں صرف پرندوں کی تصاویر رکھی گئیں تھیں، دنیا بھر کے خوبصورت

اور بد ہیئت پرندے، صرف پرندوں کی اڑائیں تھیں یہاں، ایسی کوئی اڑان نہیں تھی کہ شاعر کو دل تھام کر کہنا پڑتا۔

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن

بھوتا ہی نہیں عالم تیری اگلائی کا

لہذا نمائش گاہ میں جہاں تل رکھنے کو جی چاہے، وہاں تل کی بوریاں بھی رکھ دیتے تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

ناول: تصویر کی اڑان

منظر نمبر (۴)

آخر کار عمران نے کہا۔ ”مجھے تمہاری میم صاحب سے محبت ہو گئی ہے۔“

”کیا؟“ دفعتاً میرا سنجیدہ ہو کر اتنی زور سے اچھلا کہ کرسی الٹ گئی۔

وہ اس طرح عمران کو آنکھیں پھاڑ دے دیکھ رہا تھا جیسے عمران نے اسے قیامت کی آمد کی اطلاع دی ہو۔

”کرسی سیدھی کرو.....!“ عمران نے دردناک لہجے میں کہا۔ ”ورنہ میری ویلیری ڈائرنگ تمہیں کچا چبا جائے گی۔“



میرے نے کرسی سیدھی کی اور چپ چاپ کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا، وہ مختیر ہونے میں لگتی تھی، مجاہد تھا، وہ بھی سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ عمران جیسا ہانکا بھلا لوجوان دلیری جیسی سیاہ لہام بدھیا پر عاشق بھی ہو سکتا ہے۔  
عمران پھر اظہار پڑھنے میں مشغول ہو گیا، میرا آئینہ ڈیو کیٹر اسو چتر رہا، پھر کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر دوبارہ عمران کے قریب آیا۔

”مگر صاحب.....!“ اس نے پوچھا۔ ”آپ سیم صاحب کے دھندے میں کیوں گھسلا کرتے ہیں؟“  
”ہائے.....“ تم نہیں سمجھ سکتے۔ ”عمران نے سینے پر ہاتھ مار کر شعر پڑھا۔

معت مقلی و الفاظ میں لائی نہیں جاتی  
یہ وہ نازک حقیقت ہے کہ سمجھائی نہیں جاتی

ناول: دھوئیں کی قربر

منظر نمبر (۵)

فریدی برآمدے کے کپڑوں میں اتر گیا، حید پر ابھی بھی اسی لڑکی کی کشدگی کی فکر سوار تھی، وہ سوچ رہا تھا کہ آخروہ اس طرح اور اتنی جلدی کہاں غائب ہوگئی، اب وہ پھر مختیر کے کمرے کی طرف جا رہا تھا، مختیر نے اسے دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی اور کرسی کی پشت سے ٹک گیا، حید نے اس بار اس سے کوئی براہرتنا نہیں کیا۔  
”کیا تم نے اسے کمرے سے نکلنے دیکھا تھا؟“ حید نے اس سے پوچھا۔  
”پر واندہ کچھ کپتان صاحب پر سنگ دل ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

دیکھیں مختیر میں ان سے کیا ٹھہرے  
تھے وہی بت وہی خدا ٹھہرے

منظر نمبر (۶)

”لیکن یہ کام بہت خاموشی سے ہونا چاہیے۔“ بوڑھے نے ملتحملاً انداز میں کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ میرے بیٹوں کو مجھ پر جتنے کا سوچ لے۔“  
”آپ مطمئن رہیں کسی کو کانٹوں کا ٹھنڈا ہونے پائے گی۔“  
پھر بوڑھے کے چلے جانے کے بعد فریدی ٹھنڈی سانس لے کر بولا تھا۔ ”یہ بیماری کسی عمر میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔“  
حید نے لہک کر شعر پڑھا۔

پھر مجھے بدل کے ساتھ رہے پاسان مقل  
لیکن مجھی بھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

”بہی بھی سے کیا مراد ہے؟“ شعر پڑھ کر اس نے فریدی سے پوچھا۔

”کان نہ کھاؤ۔“

”علامہ اقبال کا شعر ہے۔“

”انہیں سے پوچھو جا کر۔“

منظر نمبر (۷)

”کرل صاحب بھی یہاں تشریف رکھتے ہیں۔“ اس نے کہا اور لڑکی کو گھورنے لگا۔

”کہاں تشریف رکھتے ہیں؟“ حید بوکھلا گیا۔

”ہاں میں.....“ ہو سکتا ہے انہیں علم ہو گیا ہو کہ آپ ایک سروگزار شباب کے ساتھ یہاں قدم رچھ فرمائیں گے۔“

”شٹ اپ۔“ حمید جھنجھلا گیا۔

”ارے نہیں کپتان صاحب۔“

دل ہلبل شیدا کا ہے نازک گلہیں  
پھول گلزار میں یوں توڑ کرہ آواز نہ ہو

”فریج پر نوٹ لے کی آواز پسند کرو گے؟“ حمید آگے بڑھتا ہوا بولا۔

منظر نمبر (۸)

اس کی ٹائی کھول کر اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ دے رکھے اور حمید زمین پر بیٹھا گرہیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا،  
جب گرہیں کسی طرح نہ کھلیں تو اس نے کان پر ہاتھ رکھ کر گانا شروع کر دیا۔

ہلبلو مت روو یہاں آسو۔ بھانا ہے منع  
ان گلشن کے قدیوں کو گل چھانا ہے منع

”او ہلبلوں کے بچے میں تمہارے حلق میں کپڑا ٹھونس دوں گا۔“ فریدی بڑبڑاتا ہوا بولا۔

”تم مجھے رونے بھی نہیں دیتے، ہائے ہائے رے ظالم زمانہ۔“ اس نے کان پر ہاتھ رکھ کر پھر ہانک لگائی اور فریدی  
نے آگے بڑھ کر اس کے گالوں پر پھڑپھڑا کر شروع کر دیے۔

یہ سبھی اقتباسات اور ان کے علاوہ بھی متعدد مناظر ایسے ہیں کہ جن میں اشعار کا بر محل استعمال ایک طرف نثر کی  
خوبصورتی کو بڑھاتا ہے تو دوسری طرف ابن صلی صاحب کے مزاج میں موجود شاعری، جھلکیاں دکھاتا ہے، نثر کے  
دوران بار بار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا قلم شاعری کا زمانہ یاد کر رہا ہو۔ (جیسا کہ کچھ لوگوں نے ان سے شکایت کی تھی  
کہ آپ نے شاعری چھوڑ کر اچھا نہیں کیا)

میں نے جب ان کا یہ شعر پڑھا تو بالکل ان کی ذات کا ترجمان نظر آیا۔

چاند کا حسن تو زمین سے ہے  
چاند پر چاندنی نہیں ہوتی

اگر وہ صرف شاعری ہی کرتے رہے ہوتے تو یقیناً ایک الگ انداز کے شاعر ہوتے مگر ان کا کلام ان کے شاعرانہ  
اوصاف صرف شاعری پسند لوگوں تک ہی پہنچ پاتے جب کہ سری ادب کے موجد بن کر وہ نثر کے آسمان کا دستکا ہوا  
مہتاب بن گئے اور ان کے نثر پارے عام انسان کے نگینوں کے لیے پہنچ گئے۔

آج بھی ان کی چاندنی کا چھانچا نظر آ رہی ہے کہ چاندنی کا حسن تو زمین پر ہی ہے اور سب لوگ اس کی دمک محسوس کر  
رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، اگر وہ صرف شاعری ہی کرتے رہے ہوتے اور نثر (لازوال سری ادب) کی طرف نہیں  
آئے ہوتے تو شاید (بلکہ یقیناً) عام انسان ان کے مزاج کی چاشنی اور ان کے شاعرانہ انداز گفتگو سے محروم رہ جاتے  
اور نہ ہی ان کے قلم کے جوہر ان کے قارئین کی گفتگو اور ترجمان میں نظر آتے۔

ان کی نثر ادب کا بہترین سرمایہ ہے اور یہ چاندنی کی طرح آسمان ادب کے چاند سے نکل ڈھنوں کو منور کرتی رہے گی،  
ابن صلی صاحب کے ناولوں کے لیے بطور خاص یہ شعر:

یہ نئے اور سنائے جاتے ہیں  
رات بھر کئی کہانیاں ہیں یہ

آخر میں شکریہ کے ساتھ ان کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

ابن صلی اردو ادب کا روشن ستارہ

مرزا صہیب اکرام



دنیا کا سب سے مشکل کام سورج کو چراغ دکھانا ہوا کرتا ہے۔ جو آج میں نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اپنی کم علمی اور قلیل مطالعہ کے ساتھ ادب کے سب سے روشن سورج ابن صفی صاحب پر کچھ تحریر کرنا اس لحاظ سے مشکل ہے کہ کہیں ان کی شان اور عظمت بیان کرتے وقت میرا قلم چوک نا جائے۔

ابن صفی صاحب جن کو میں مرشد کہا کرتا ہوں ان پر لکھنے، کہنے کو میرے سینے میں الفاظ کا ناکی جذبات کا ایک بحر بیکراں موجزن ہے۔ اپنے جذبات کو قلم کی روشنی سے منظر قریطاس پر نقش کرنے کو دل بے چین و بیتاب ہے۔ عشق نگاری کے بدترین دور میں اچانک ایک لہر مرشد کی صورت اُٹھی۔ یار لوگوں نے روکا بھی ہوگا۔ کون جسم کی گری پر روح کی تازی کو ترجیح دے گا۔ مگر ابن صفی صاحب نے لفظوں کے طلسم سے دنیا کو بتایا کہ اگر کردار زندقہ ہوں تو کہانی بول پڑتی ہے۔ پڑھنے والوں میں دلیر بھرم سے بھرموں کا چھچھا کرنے کا ایک ایسا شوق و شعور جنم لیتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

ابن صفی صاحب صرف ایک جاسوسی ناول نگار ہی نہیں تھے۔ وہ ایک مکمل ادیب، شاعر اور نہایت اعلیٰ پایے کے نفسیات دان بھی تھے۔ ان کے ہر ناول میں جہاں فن جاسوسی کے اسرار بکھرے پڑے ہیں۔ وہیں وہ ہر کہانی میں انسان کی نفسیات کا گہرائی سے مشاہدہ کرتے نظر آتے ہیں۔ زندگی کے تمام پہلو ان کے سامنے ہوتے ہیں اور وہ ایک ایک کر کے گرہ بھولتے جاتے ہیں۔

”یہی آدمی کی معراج ہے کہ وہ مشین بن جائے، ہر دکھ درد سے آزاد۔“ اس ایک جملے میں پوری انسانی ترقی کو بیان کرتے ہوئے مرشد بتا رہے ہیں انسان دکھوں سے مشین بن کر ہی چھٹکارا پاسکتا ہے۔ ساری سائنس اس کام میں سالہا سال سے مصروف عمل ہے مگر ناکام ہے۔

سلویا کا کردار کس کو بھول سکتا ہے۔ جو آزادی کے خواب دیکھتی ہے۔ نادر کی زبان سے کہلایا گیا یہ جملہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ ”سنو..... ایک پرندے کو نفس میں بند کر کے دنیا کی ساری نعمتیں اس کے لئے مہیا کر دو تو کیا وہ پرندہ تمہیں دعائیں دے گا.....؟“

ان کی تحریروں میں ہر رنگ بکھرا پڑا ہے، ہر سطر میں معجزانہ معانی کا طلسم برپا ہے۔ بس اپنی اپنی وسعت ہے کوئی کیا لیجی رہا ہے۔

”میں خود کو دنیا کی آنکھ سے نہیں دیکھتا، میری اپنی بھی آنکھیں ہیں۔“ اس سے مکمل جملہ اور کیا ہوگا.....! دنیا کو راضی کرتے کرتے ہمیں بیت جاتی ہیں۔ خود کو راضی کر لیا جائے تو دنیا ہی بدلی بدلی محسوس ہونے لگتی ہے۔

”حماقت پر افسوس کرنا سب سے بڑی حماقت ہے۔“ اتنا بڑا انقیابی مسئلہ ایک سطر میں بیان کر دینا ابن صفی صاحب کا ہی خاصہ تھا۔ حماقت کے ادراک کے بعد افسوس احمقانہ پن کے علاوہ اور ہوجی کیا سکتا ہے۔ قانون کی حکمرانی سے محبت ان کا ایمان تھی۔ ان کی کہانی جرم کی بجائے قانون کو معاشرے میں جلا بخشی تھی۔ یہ جملہ ان کی اسی محبت اور آئینہ بل معاشرے کی جانب اشارہ ہے۔

”اگر تمہارا باپ بھی کوئی جرم کرے تو قطعی بھول جاؤ کہ تم اس کے نطفے سے ہو۔“ ابن صفی صاحب ہر لمحہ صرف انسانی سوچ میں نکھار پیدا کرنے کی فکر میں لگے رہے کہانیوں کا مقصد بہت زیادہ وسیع رہا۔ وہ بتاتے رہے کہ انسان کی معراج انسانیت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اپنوں سے زیادہ اپنا کوئی نہیں۔ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

”جب انسان کو اپنی ہی چھت کے نیچے پناہ نہیں ملتی تو وہ تاریک گلیوں میں بھونکنے والے کتوں سے ساز باز کر لیتا ہے۔“ ملک سے محبت، امن پسند معاشرے کی جدوجہد، قانون کی حکمرانی، عام آدمی کے مسائل اور اس کے ساتھ ساتھ مجرموں کی زندگی میں سدھار لانے کا خواب، یہی ہیں وہ موضوعات جن کی جانب ابن صفی صاحب ہماری توجہ مبذول

کرواتے ہیں۔

گلی محلے اور ایک عام آدمی کے مسائل سے لے کر عالمی طاقتوں کی گیمیں چالیں اور امن کے نام پر دنیا کو تباہ کرنے والوں کے چہروں سے نقاب الٹ کر برصغیر کے قاری کے سامنے اس دنیا کا حقیقی نقشہ پیش کرتے ہیں۔ جو آنے والے سالوں میں ہو کر رہتا ہے۔

ابن صفی صاحب کے ہاں اتنے موضوعات ملتے ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا کسی ایک مضمون یا کتاب میں تو ممکن نہیں، خواتین کے حقیقی آزادی کے حوالے سے وہ کیا خوب فرماتے ہیں۔

”جب تک ہمارے سماج کا پورا ڈھانچہ نہیں بدل جاتا، عورتوں کی آزادی کوئی معنی نہیں رکھتی۔“

مرشد زندگی کی معنویت پر لکھتے ہوئے کہتے ہیں بڑھتی عمر کا تعلق بڑھاپے سے نہیں ہوتا، سوچ و فکر اگر جوان ہو آدمی کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ ”بڑھاپا وغیرہ بیوقوفی کی باتیں ہیں، زندگی صرف زندگی ہے، اس پر ادوار کی چھاپ نہیں لگتی چاہیے۔“

طاقت کے نشے میں غمخوروں کی حقیقت ایک جیلے میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”جب ایک آدمی پاگل ہو جاتا ہے تو اسے پاگل خانے میں کیوں بند کر دیتے ہیں اور جب پوری قوم پاگل ہو جاتی ہے تو طاقتور کیوں کہلاتی ہے؟“ اور ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”طاقت کا صحیح مظاہرہ یہ نہیں ہے کہ تم کمزوروں کو مسل دو، بلکہ طاقت کا صحیح مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم اپنے نفس سے جنگ کرتے ہیں۔ اپنے اندر بھرے ہوئے وحشی کو ابھرنے نہیں دیتے۔“

ابن صفی صاحب نے جاسوسی ادب کو ایسے لازوال کردار عطا کئے کہ جب تک جاسوسی ادب لکھا اور پڑھا جاتا رہے گا، ابن صفی صاحب کا نام بڑھتا رہے گا۔ انھوں نے علی عمران، کرمل احمد کمال فریدی، حمید، جولیا، صفدر، روشی، قاسم جیسے عظیم کردار تخلیق کئے جنہوں نے اردو ادب کو نئی زندگی عطا کی۔

عمران کا کردار جو بظاہر شرارتی احمق اور تنجید کی سے کوسوں دور نظر آتا ہے مگر ذہانت، امانت اور دیانت اس کا وصف خاص ہے۔ وہ ایک اینڈیل معاشرے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر چکا ہے، ہتے ہتے وہ زندگی اور انسان کی ایسی حقیقت بیان کر جاتا ہے کہ پڑھنے والا ششدر رہ جاتا ہے۔ ایک جگہ عمران جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ۔

”اس سے کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ آدمیت کا جامہ درندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، چاہے اس میں اخلاقیات کی کتنی ہی کشیدہ کاری کیوں نہ کر لی جائے۔“

ایک اور جگہ ایسی بات کہہ جاتا ہے جس میں انسان اپنا چہرہ دکھ سکتا ہے۔ ”وہ (جانور) آدمی سے افضل ہیں کیوں کہ وہ صرف پیٹ بھرنے کی حد تک جانور ہیں لیکن آدمی ہر جذبے کی تسکین کے لئے جانور بن جاتا ہے۔“

زندگی جینے کا جو سبق عمران دیتا ہے وہ دل موہ لیتا ہے، ہتے کھلتے رلا جاتا ہے جب کہتا ہے۔ ”ارے میں تو قلندر ہوں..... جب تک زندہ ہوں دھمال جاری رہے گا، جب مرنا ہوگا خاموشی سے مر جاؤں گا۔“

ایک اور جگہ زندگی جینے کا ہنر کچھ یوں بیان کرتا ہے۔

”آدمی تنجید ہو کر کیا کرے جب کہ وہ جانتا ہے ایک دن اسے اپنی تنجید کی سمیت دفن ہو جانا پڑے گا۔“

ہزاروں باتیں، ٹیکسٹوں کا جواب جیلے مرشد کے ناولز میں بھرے پڑے ہیں۔ ایسے ایسے کردار بنا دیئے جو ہم نے اپنے معاشرے میں جا بجا دیئے ہیں۔ وہ تمام افراد کہیں نا کہیں راہ چلتے ہی بارہم سے ٹکراتے ہیں اور ہر کردار ہمارے لئے ایک سبق ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ ایک کردار کا تذکرہ کروں گا۔ ڈاکٹر نارنگ کا کردار بھلا کون بھول سکتا ہے جو دنیا سے بدلہ لینا چاہتا تھا کیوں کہ دنیا اسے حرامی کہتی ہے، اس کے آخری الفاظ شاید کبھی کوئی بھول پائے گا، جب ڈاکٹر نارنگ چھانسی کے سنتے پر کہتا ہے۔



”ایک معمولی سی خواہش پوری کر دو، میرے مرنے سے پہلے یہی کہہ دو کہ ڈاکٹر نارنگ حرامی نہیں ہے۔“  
ڈاکٹر داغ جیسے ذہین مگر نفسیاتی بیمار انسان کی نسل امتیاز کی نفرت کیسے اس کو موت کی وادی میں لے جاتی ہے۔ گوری  
چڑی کی ذہنیت کا عکاس کر دو داغ جب یہ جملے ادا کرتا ہے۔ ہم کو صدیوں کی تاریخ یاد آ جاتی ہے۔  
”مصلح اس لئے کہ میں ایشیا کے سیاہ فام جانوروں کو ترقی کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ تم صدیوں سے ہمارے غلام رہے ہو۔  
ہم سے سبقت نہیں لے جاسکتے۔ میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ میں تم جانوروں کو آدمی نہ بننے دوں گے۔“  
جذباتِ انعام و جن ترین انسان کو بھی براہِ یاد دیتا ہے یہ بات علامہ دہشت ناک کو دیکھ کر سمجھ آتی ہے۔ اس کر دار کو پڑھنے  
کے بعد انسان سمجھ ہی نہیں پاتا کہ اس کو کیا کرنا چاہیئے۔ علامہ دہشت ناک کے جیل کے یہ الفاظ دل چیر کر کھدے پتے ہیں۔  
”ماں..... ماں..... بابا..... بابا..... میرے بابا.....“

یہ الفاظ عمران کے ساتھ تمام قارئین کو بھی رلا دیتے ہیں۔ زمانے میں دہشت کی علامت بنا انسان کیسے انعام کی  
آگ میں جل کر فنا ہو جاتا ہے۔ مگر فیملی کا کردار اور الفاظ جو باوجود مجرمانہ زندگی گزارنے کے مجرم نہیں ہے۔ بلکہ اپنے  
دوران بچپن اور اجڑی جوانی کا بدلہ لینے کی آس میں زندہ ہے۔ ذہنی حالت میں جب اس کا اندر کا معصوم بچہ باہر آتا  
ہے۔ قاسم اور حمید کے ساتھ ہر پڑھنے والے کی آنکھ نم کر جاتا ہے۔  
”میں گلے میں لعنت کا طوق ڈال کر دنیا سے رخصت ہو رہی ہوں۔ میں نے بہت برا کیا کیپٹن..... وہ بد راقب تو میں  
ہی کہاں کی اچھی تھی۔ میری ساری زندگی مکشش میں گزری۔ کبھی بھی اچھی بننے کی کوشش کرتی تھی۔“  
اور کبھی.....

”کیپٹن..... اچھے کیپٹن..... تم یہاں ہو مرنے..... بھیا..... خدا کے لیے مجھے معاف کر دو ارے تم رور ہے ہو  
کیپٹن..... اللہ..... اللہ میں اکیلی نہیں ہوں مجھے بھیج لو کیپٹن..... تم میرے باپ ہو تم میرے لیے رور ہے ہو۔ میرے  
بابا..... تم میری ماں ہو..... مجھے بھیج لو..... او کتنی چیز بارش ہو رہی ہے..... ماں مجھے بھیج لو..... ماں مجھے بھیج لو۔ ماں  
بارش..... ماں بارش.....“

ابن صفی صاحب کی ہر کہانی میں کئی کردار ایسے ضرور ملتے ہیں جن کو پڑھ کر انسان دنیا کو سمجھتا ہے۔ ان کا کوئی کردار  
بے وجہ کہانی کا حصہ نہیں ہوتا۔ وہ نا صرف جاسوسی ادب تخلیق کرتے رہے، بلکہ وہ اصلاح معاشرہ بھی کرتے رہے۔ ان  
کی کہانی کا مجرم ہم کو انسان نظر آتا ہے مگر مجرم ہوتا تو مجرم ہی ہے۔ جہاں علامہ دہشت ناک نظر آتا ہے اور حرامی نادر کا  
کردار بھی ملتا ہے جو برائی چھوڑ کر اچھائی کے مشکل راستے کا چناؤ کرتا ہے۔

ابن صفی صاحب کی کہانیوں میں جہاں زندگی جینے کا ہنر ملتا ہے وطن سے محبت کا درس ملتا ہے وہیں اخلاق کی اعلیٰ  
قدروں کو سمجھنے کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ قانون سے محبت اور جرم سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ہم بجا طور پر کہہ سکتے  
ہیں کہ ابن صفی صاحب وہ سیکرہ ادب ہیں جس سے ہر کوئی اپنی طلب کے مطابق پیاس بجھانے چلا آتا ہے۔  
ابن صفی صاحب کسی ایک نسل یا عہد کے ادیب نہیں تھے۔ اردو زبان کی ترقی کے ساتھ اگر ناول نگاری میں کوئی نام نہا  
صرف زندہ و جاوید رہے گا بلکہ بدھستا چلا جائے گا اپنے ہونے کا احساس دلاتا چلا جائے گا۔ جس کی روشنی و جاشنی مزید تیز  
ہوتی چلی جائے گی، جس پر ناگزیر رے و قوتوں کی گرو چڑھے گی، جو نا کبھی بوسیدہ ہوگا، جو کسی ایک خاص عمر کے نہیں، بلکہ  
تمام شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کا نمائندہ ہوگا، وہ صرف ابن صفی صاحب کا قلم ہوگا۔  
آخر میں یہی کہوں گا۔

آدمی و طوفان راستہ روکیں  
جلا صفی کے قلم کی مدہم بلبل ایل مخنی

